کتنے پاکستان

کملیشور

کتنے پاکستان

کملیشور

مترجم

خورشید عالم

مکتبہ استعارہ

۲۳۸، غفار اپارٹمنٹس، غفار منزل ایکسٹینشن
استعارہ لین، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

© جملہ حقوق بحق استعارہ محفوظ

"KITNE PAKISTAN"
(Novel)
by
Kamleshwar

نام کتاب	:	کتنے پاکستان
مصنف	:	کملیشور
پتہ	:	۵/۱۱۶، ایروز گارڈن، سورج کنڈ روڈ نئی دہلی۔۱۱۰۰۴۴
تعداد	:	۱۰۰۰
سال اشاعت	:	۲۰۰۳
کمپوزنگ	:	محمد اکرام خان
طابع	:	شارپ پرنٹنگ ایجنسی، دریا گنج، نئی دہلی ۲
زیر اہتمام		استعارہ، ۲۳۸-غفار اپارٹمنٹس، غفار منزل ایکسٹینشن استعارہ لین، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵ ٹیلی فون: ۲۳۱۸۱۲۹ ای میل: isteara001@rediffmail.com
قیمت	:	Rs.350.00

تقسیم کار:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ممبئی، علی گڑھ
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی
- ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
- الکتاب، یتیم خانہ کمپلیکس، ارریا ۸۵۴۳۱۱
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
- آزاد کتاب گھر، ساکچی بازار، جمشید پور

صلاح الدین، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو
تمھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ تمہارا گھر
اس زمین کے جغرافیے میں کہیں نہیں ہے
تم! اتہاس کا ایک بھولا بسرا ہوا واقعہ ہو
جو کتابوں میں لکھا جاتا ہے اور بچے اسے پڑھ کر خوش ہوتے ہیں
اور وہ بھی غلط ہوتا ہے،
کیونکہ تاریخ لکھنے والے ہماری طرح منافق اور جھوٹے ہوتے ہیں

صلاح الدین، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو
کیا تم بنگلہ دیش سے بھاگے ہوئے شرنارتھی ہو
جسے آسام کے جنگلوں میں قتل کر دیا گیا ہے
دن دہاڑے، جب تم اپنے نوزائیدہ بچے اور بیوی کے ساتھ
ملک کے درشن کو جا رہے تھے
کہ تمھیں چاول کا ڈونگا اور ایک مچھلی کا چھلکا مل جائے
آہ! تمہاری حفاظت کے سارے وعدے اور ساری قسمیں
ذمہ داری کے حلیف باکس میں اسٹیمپ لگا کر دفنا دی گئیں
اور تم نے اذان دینے سے پہلے ہی
اپنی موت کی نماز پڑھ لی

صلاح الدین، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو
کیا تم تل ابیب سے بھاگے ہوئے شرنارتھی ہو
جسے لبنان کے سوئمنگ پول میں، برہنہ عورتوں کے درمیان قتل کر دیا گیا
تمہاری بیوی کی آواز کا ایک دروازہ بند ہوا
اور ہجوم نے اس کا دوسرا دروازہ کھول دیا
سرخ خون سے لکھا ہوا سارا فلسطین زمین پر پھیل گیا

تمہارے بچے نے بندوق تھامی تو آسمان پر دوڑتے ہوئے طیارے نے
اسے زمین کی کشتی پر سلا دیا...
تھا گیا!
صرف ایک معصوم، ننھی سی آواز آئی
گولی کسی کو نہیں لگی
بس پناہ کے سرٹیفکیٹ لیے ہوئے شرنارتھیوں کے
خیمے دھڑا دھڑ جلنے لگے ——— !!

صلاح الدین، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو
کیا تم ایران سے بھاگے ہوئے شرنارتھی ہو
یا ———
عراق سے بھاگے ہوئے مسافر ہو
تم جو بھی لیکن تمہاری آنکھوں سے خون بہہ رہا ہے
تمہارے تیل کے سارے کنوئیں خالی ہو گئے ہیں
اور تمہاری بیویاں بچے جننے کے بجائے
بارود اور خوف جننے لگی ہیں

صلاح الدین، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو
تم سنی اور شیعہ کب سے ہو گئے ہو
تم ہندوستان سے بھاگ کر پاکستان پہنچے
لیکن پاکستان سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟
ایک کربلا کا قصہ ابھی ختم نہیں ہوا
کہ تم نے ہزاروں کربلاؤں کو جنم دے دیا
لوگوں نے تمھیں بانٹ دیا
.... اور تم بٹ گئے!!

(صلاح الدین پرویز کی نظم — 'کنفیشن' سے)

یہ ناول

یہ ناول من کے اندر متواتر چلنے والی ایک جرح کا نتیجہ ہے۔ دہائیوں تک سب کچھ چلتا رہا۔ میں کہانیاں اور کالم لکھتا رہا۔ نوکریاں کرتا اور چھوڑتا رہا۔ ٹی وی کے لیے کشمیر کی دہشت گردی اور ایودھیا کی بابری مسجد اختلاف پر درجنوں فلمیں بناتا رہا۔ سماجی حالات نے کچوکے لگائے تو شمالی خودسوزی پر 'جلتا سوال' اور کانپور کی بہنوں کی خودکشی کے حادثے پر 'بند فائل' جیسے پروگرام بنانے میں الجھا رہا۔ اس درمیان ایک آدھ فلمیں بھی لکھیں۔ چندرکانتا، ٹیگ، بیتال، ویراٹ جیسے طویل سیریلوں کو لکھنے میں لگا رہا۔

اس درمیان ہندوستانی زراعت کی تاریخ پر ایک طویل سیریل لکھنے کا موقع ملا۔ کئی تہذیبوں کی تاریخ اور فروغ کی کہانیوں کو پڑھتے پڑھتے عینک کا نمبر بدلا۔ ایک ایک گھنٹے کی ۲۷ کڑیوں کو لکھتے لکھتے بار بار دماغ آدی کال اور آریوں کی آمد کو لے کر سوچتا رہا۔ ذہن اور دل کا بیچ موہن جوداڑو، ہڑپا تہذیب اور آریوں کے درمیان قائم کیے گئے 'جدوجہد کے نظریے' کو قبول کرنے سے احتراز کرتا رہا۔ اس اپنی سوچ کو میں نے کئی بار لکھا۔ ایک بار تو میں نے جھنجھلا کر، کام نپٹانے کی نیت سے مغربی عالموں کے 'آریہ کے حملے' کے نظریے کو قبول کر کے وہ حصہ لکھ ڈالا۔ پھر لوک مانیہ تلک کے اس نظریے اور تصور سے بھی الجھتا رہا کہ آریہ بھارت کے اصل باشندے تھے۔ میں نے اس مفروضے کو لے کر وہ حصہ پھر سے لکھا۔ لکھنے کے بعد بھی اطمینان نہیں ہوا۔ یہی محسوس ہوا کہ یہ بات بھی تخلیق کے ممکنہ سچ تک نہیں پہنچاتی۔ سچ کو اگر پہلے سے ہی سوچ کر قابل قبول بنا لیا جائے تو یہ سچ کا احساس تو دے سکتا ہے، لیکن داخلی اتفاق تک نہیں پہنچاتا۔ شاید تب، تخلیق اپنے ممکنہ سچ کو خود تلاش کرتی ہے۔ اسی تلاش نے مجھے یہ بتایا کہ آریوں کے جارح ہونے کا کوئی سبب نہیں تھا۔ وہ جارحیت پسند نہیں تھے۔ وہ قدیم زراعت سے واقف خانہ بدوش قبیلے تھے جو متحمل فطرت اور زرخیز زمین کی تلاش میں نکلے تھے۔ وادیٔ سندھ میں متحمل فطرت تو تھی ہی، زرخیز زمین کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس لیے حملہ یا جنگ کی ضرورت نہیں تھی۔ آریہ آئے ہوں گے اور ادھر اُدھر بس گئے ہوں گے۔

ویدوں میں اسوروں سے جنگوں کی جو بازگشت ملتی ہے، وہ یقیناً، اقتدار، سماج، تحول اور زندگی کے نظام کی قائمیت کے بعد کی کہانی ہے۔ دنیا کی تہذیبوں کی تاریخ میں، کسی جارح ذات، طبقے نے ویدوں جیسے تخلیقی صحیفوں کے لکھے جانے کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے۔ ایسے صحیفے، امن، سکون اور اعتقاد کے دور میں ہی لکھے جا سکتے ہیں، جنگوں کے دور میں نہیں۔ تخلیق کے اس ممکنہ سچ نے مجھے تسلی دی۔ تب میں 'کرشی کتھا' تحریر کر سکا۔

ان اور ایسی تمام تحقیقات، خیالات، تاریخ کے سیکڑوں تخلیقی دستکوں اور تعطل کے درمیان رُک رُک کر 'کٹتے پاکستان' کا لکھا جانا جاری رہا۔ ان تمام اصناف کی تخیلی تخلیقیت کا فائدہ بھی مجھے ملا رہا۔ لفظ کی توقیر پر روک لگا رہا۔

اسے میں نے مئی ۱۹۹۰ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ مجھے جنگل کے بیچ ڈیرہ دون کے جھاجرا فاریسٹ گیسٹ ہاؤس میں سبھاش پنت نے انتظام کرا دیے تھے۔ رسد وغیرہ نیچے سے لانا پڑتا تھا۔ گاکری ساتھ تھی ہی۔ ساتھ میں ہم اپنے چار برس کے نواسے اننت کو بھی لے گئے تھے۔ ایک کتا وہاں آتا تھا، اس سے اننت نے دوستی کر لی تھی۔ اس کا نام موتی رکھ لیا تھا۔ کبھی کبھی وہاں کثیر رنگی جنگلی مرغ بھی آتے تھے۔ اننت انہیں دیکھنے کے لیے دور تک چلا جاتا تھا۔

جنگل کی پگڈنڈیوں سے کبھی کبھار آدی واسی لکڑہارے گزرتے رہتے تھے۔ ایک دن اننت مرغوں کا پیچھا کرتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گاکری بہت زیادہ فکرمند ہو گئی۔ تلاش کیا، آوازیں لگائیں۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دوڑے بھاگے لیکن اننت کا کہیں کوئی پتہ نہیں چلا۔ تبھی اِدھر سے گزرتے ایک بوڑھے نے بتایا کہ اس نے جنگل میں کچھ دور پر ایک چھوٹے بچے کو لکڑہارے کے ساتھ جاتے دیکھا تھا... یہ سن کر گاکری تو منحوس اندیشے اور خوف سے لگ بھگ بے ہوش ہی ہو گئی۔ قدیم قبیلوں کی نربلی (انسانی قربانی) والی روایت کی پڑھی ہوئی معلومات نے گاکری کو پریشان کر دیا تھا۔ اندیشے میں مبتلا میں بھی تھا۔ میں گاکری کو سنبھال کر، پانی پلا کر، اسے نوکر کے حوالے کر کے فوراً باہر نکلا۔ بوڑھے نے جس طرف بتایا تھا، اُدھر والی پگڈنڈی پر اتر کر تیزی سے چلا تو کچھ دور پر دیکھا— ایک لکڑہارے کے کندھوں پر پیر سامنے لٹکائے اس کی پگڑی پر بانہیں باندھے، کلکاری مارتا اننت بیٹھا تھا۔ لکڑہارے کے بائیں ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور وہ اسے لیے ہوئے سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ جان میں جان آئی۔ پتہ چلا، وہ اننت کو ہرن اور بھالو دکھانے لے گیا تھا۔

اس واقعہ نے مجھے قدیم قبائلیوں کو جاننے، پہچاننے اور ان کے بارے میں پڑھتے ہوئے

حقیقت سے الگ تجرباتی ایک اور ہی سوچ دی تھی۔ سات، آٹھ سال بعد تجربے کے اسی حصے نے میرا ساتھ تب دیا جب میں ناول میں مایا تہذیب کے حوالے سے گزر رہا تھا۔ بہر حال ...

میری دو مجبوریاں بھی اس ناول کی تحریر سے وابستہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی ہیرو یا عظیم ہیرو سامنے نہیں تھا، اس لیے وقت کو ہی ہیرو، عظیم ہیرو اور ولن بنانا پڑا۔

اور دوسری مجبوری یہ کہ اسے لکھتے وقت مسلسل یہ احساس ہوتا رہا کہ جیسے یہ میری پہلی تخلیق ہو... تقریباً اسی ان کہی بے چینی اور اپنی معذوری کے احساس سے میں گزرتا رہا... آخر اس ناول کو کہیں تو رکنا تھا۔ رک گیا۔ لیکن من کی جرح ابھی بھی جاری ہے...

دہلی: ۲۹ر دسمبر ۱۹۹۹ء

کملیشور

انسانیت کے اتھاہ درد کی کراہ

کملیشور کا ناول 'کتنے پاکستان' ماضی اور حال کے منظرنامے کا ایک مونتاج ہے۔ یہ اندر کی گھٹن اور باہر کی زہریلی ہوا سے پریشان ایک تخلیق کار کی داخلی، باطنی اور ذہنی کشمکش کا اظہاریہ ہے۔
ایک ایسے تخلیق کار کی جو تیسری آنکھ سے ماضی، حال کا منظرنامہ ہی نہیں بلکہ مستقبل کی پرچھائیاں بھی دیکھ رہا ہے اور اس منظرنامے کے بدلتے رنگوں کو اپنے دل کے کینوس پر ابھار رہا ہے۔ وقت کے بہاؤ میں جو تغیرات اور تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جو تعبیرات سامنے آرہی ہیں، انہیں دیکھ کر ایک تخلیق کار عہد حاضر کے منظر پر سارے واقعات، حادثات اور المیے رقم کر رہا ہے اور ان واقعات کے تانے بانے سے اس سچائی اور اس صداقت کو تلاش کر رہا ہے جو کسی تشکیک کے صحرا یا بدگمانی کے بادلوں میں کھوگئی ہے یا غلط فہمیوں کے غبار میں گم ہوگئی ہے۔ ایک تخلیق کار جس کا تعلق بالمیکی، ویاس، کالی داس، کبیر، میرا کے خاندان سے ہے اور وہ اس خاندان کا وارث ہے۔ وہ اپنی اس فکری وراثت کو سنبھالتے ہوئے، اپنی تخلیقی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے تاریخ کے ان سارے لمحوں کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہے، جن لمحوں کی وجہ سے انسانی تقدیر میں تاریکی لکھ دی گئی ہے اور انسان ذہنی اور فکری طور پر ایک ایسے چوراہے پر کھڑا ہے جہاں اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ سچ کیا ہے، غلط کیا ہے؟— کملیشور کا یہ ناول وقت کے ماورائے زمان و مکاں تصور پر محیط ہے اور اس میں تاریخ کی کئی صدیاں، کئی یگ اور پوری کائنات ایک ساتھ جاگ اٹھے ہیں۔

جب اندر باہر ہر طرف گھٹن ہو، راستے سب بند ہوں تو تخلیق کار اپنے لئے ایک نئی راہ تلاش کرتا ہے۔ اپنے باطن میں ایک موسم اُگاتا ہے، ایک فضا تشکیل دیتا ہے۔ وہ موسم جو نہ زہر آلود ہوتا ہے اور نہ ہی حبس زدہ۔ کملیشور کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ایسی زہریلی فضا میں پرندے آخر جائیں تو کہاں جائیں؟— ہیئت اور فارم کی سطح پر کملیشور نے بالکل نیا تجربہ کیا ہے اور یہ تجربہ کملیشور جیسے خطر پسند طبیعت والے ہی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ناول کو ایک نئے فارم اور ایک نئی ہیئت میں لکھا

ہے۔ اس ناول میں تہذیبی، قومی، عمرانی شناخت کے بحران کو پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے تاریخی، تہذیبی، سیاسی، سماجی تناظر میں لکھے گئے اس ناول میں حقیقت اور فسانے کا بہترین فسوں ہے۔ فیکٹ کو فکشنلائز کیا گیا ہے اور اس طرح کہ یہ ناول ہمارے عہد کی تاریخی، معاشرتی، سیاسی، تہذیبی دستاویز بن گیا ہے۔ ہم اپنے عہد، اپنے ملک، اپنی مٹی کا چہرہ ہی نہیں بلکہ پوری کائنات کا چہرہ اس ایک ناول کے صنم خانے میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں ہمارے عہد کے المیے بھی درج ہیں اور ماضی کے وہ خونچکاں واقعات بھی جن کی وجہ سے ہمارا حال اور مستقبل دونوں شکست خوردہ اور لہولہان لگتے ہیں اور وہ حادثات اور واقعات بھی جو ماقبل کے زمانہ میں وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں۔ اس سے آج اور گزرے کل سے آنے والا کل بھی جڑا ہوا ہے۔ "کتنے پاکستان" تینوں زمانوں کی ایک مربوط اور منظم داستان ہے۔ وقت کی دھڑکنوں کو سننے اور اپنی ہتھیلیوں پر اپنے عہد کے ضرب کو محسوس کرنے کی یہ ایک سچی تخلیقی کوشش ہے۔

تہذیبی، تاریخی اور ثقافتی تناظرات کے حوالے سے یہ ناول کافی معنی خیز اور اہمیت کا حامل ہے۔ تہذیبی تصادم (Clash of Civilisations) اور اس سے جڑے ہوئے اور بھی بہت سے فکری نوعیت کے مسائل اس ناول میں آ گئے ہیں۔ ازمنۂ قدیم، آریہ عہد اور مغلیہ دور کی خوں ریز داستانوں کو رقم کرنا اور اُسے فکشن میں ڈھالنا اور اس طرح ڈھالنا کہ حقیقت بھی مجروح نہ ہو اور دلچسپی بھی برقرار رہے، کم معمولی بات نہیں ہے۔ اس ناول میں انسانی کائنات کی پوری تہذیبی تاریخ آنکھوں میں رقص کرنے لگتی ہے۔ یہ ناول چونکہ ایک تخلیق کار کے ذہن کی جرح سے اپجا ہے۔ اس لیے اس ناول میں ہر جگہ ایک سچائی کی تلاش اور صداقت کی جستجو نظر آتی ہے۔ یہ جرح محض ذہنی مشق نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت حال کی دریافت سے عبارت ہے۔ وقت کی عدالت میں ماضی کے واقعات پر ایک تخلیق کار کی جو ذہنی جرح ہو سکتی ہے، اس کی روشنی میں ایک پورے ناول کے تانے بانے کو بنا گیا ہے اور فریقین کے دلائل، شواہد کو سامنے رکھ کر نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ناول میں زیادہ تر حقیقی اور زندہ کردار ہیں۔ ان حقیقی کرداروں کے حوالے سے گفتگو کرنا، انہیں اپنے تخلیقی عمل اور سوچ میں شریک کرنا ایک انوکھا تجربہ ہے۔ سچے کرداروں کے حوالے سے بات کرنے کا رمز یہ ہے کہ اس میں جو کچھ ہے فرضی یا گڑھا ہوا نہیں ہے، بلکہ وقت کے سینے پر جو کچھ بھی ہوا یا جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اُسے ایک حساس انسان یعنی تخلیق کار کی دھڑکنیں کس طور پر محسوس کر سکتی ہیں، انہی دھڑکنوں کو اس ناول میں سمو دیا گیا ہے۔

کملیشور نے تہذیب، تاریخ، ثقافت، سنسکرتی کے حوالے سے دوٹوک باتیں کی ہیں۔ بیباک، بے خطر، جرأت مند، باضمیر اور حق گو صحافی اور مشاہد کی طرح جرح کی ہے اور خسروانِ مملکت کے جبر و ستم، تخویف و تہدید کی پرواہ کیے بغیر وہ سارا سچ اگل دیا ہے، جو ایک باضمیر انسان کا صحیح منصب ہوتا ہے۔

یہ داستان ست یگ سے شروع ہوتی ہے اور اُس عہد سے ہمارے آج کے عہد تک یہ کہانی چلتی رہتی ہے جس میں بہت سارے مناظر، مقامات، ممالک، اماکن، اشخاص آتے ہیں۔ گویا پوری پانچ ہزار سالہ بلکہ اس سے بھی زیادہ کی تاریخ زندہ ہو کر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ وقت کی اس عدالت میں بابر بھی ہیں، اکبر، شاہ جہاں، اورنگ زیب اور دارا شکوہ بھی ___ شبلی نعمانی بھی ہیں اور ہر دور کے مورخین بھی اور ضمیر کی عدالت میں زبردست جرح ہوتی ہے اور تب کوئی غور طلب نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ دراصل سارا مسئلہ انسان کی بقا اور اُس کی فلاح و بہبود سے جڑا ہوا ہے۔ انسان مخالف قوتوں اور تخریب کاروں کے حوالے سے بھی اس میں بہت ساری باتیں ہیں۔ مہابھارت کے اٹھارہ دنوں کا یدھ بھی اس ناول میں موجود ہے اور ہمارے عہد کی جنگیں بھی اور وہ ساری جنگیں جو انسانیت کی تباہی اور بربادی کا باعث بنیں، انسانی تہذیب اور انسانی مستقبل کو تباہ کرنے والی جنگیں، سب اس ناول میں موجود ہیں۔ اُن جنگوں کی وجوہات اور ان جنگوں سے پھیلنے والی تاریکی، اور دکھ درد سب مذکور ہے اور اس موت کے ملبے سے ایک تخلیق کار زندگی تلاش کر رہا ہے۔

بے سود اور غیر ضروری موت سے نجات پانے کے لیے زندگی کی تلاش بھی ایک ضروری عمل ہے۔ جب انسانیت کو تباہی کے غار میں ڈھکیل دیا گیا اور انسانوں سے اُس کی زندگی سلب کرنے کی کوشش کی گئی اور آسمانی دیوتاؤں نے انسانی کائنات کو نیست و نابود کرنے کے لیے سازشیں شروع کر دیں تو تبھی سے انسان میں بغاوت کے جذبے نے جنم لیا، اُسی وقت جل جامیش نے یہ اعلان کیا کہ میں درد سے لڑوں گا، اذیت سہوں گا۔ کچھ بھی ہو موت کو شکست دوں گا۔ یہ جل جامیش ہر عہد میں جنم لیتا ہے۔ ہمارے آج کے عہد کا جل جامیش تخلیق کار ہے۔ ایک سچا تخلیق کار جو موت کے اندھیروں میں زندگی کی روشنی تلاش کرتا ہے۔ جل جامیش کی آواز کو ختم کرنے کا فرمان تو دیوتاؤں کی طرف سے جاری ہوا تھا۔ مگر آج کے عہد کے جل جامیش کی آوازوں کو ارضی دیوتا، منافرت کے تاجر قتل کرنا چاہتے ہیں۔ جل جامیش کی آواز کو ایک سچا فنکار ادیب ہی زندہ رکھ سکتا ہے۔ آج پوری دنیا میں جہاں ہر طرف آگ کا تانڈو ہو رہا ہے، جہاں ہر طرف موت کی فصل اُگ گئی ہے،

کھیتوں میں بارود اور بندوقیں اُگ گئی ہیں اور دور دور تک لاشوں کے انبار اور خون کے دھبے نظر آتے ہیں، وہیں جل جاتیش کی آواز بھی گونجتی ہے۔ اس سناٹے کو توڑتی ہوئی، ویرانے کو چیرتی ہوئی۔ درحقیقت یہ ناول ہمارے عہد کی مرتی ہوئی قدروں اور انسانیت کے بجھتے ہوئے چراغوں کو روشن رکھنے کی کوشش ہے۔ اس نفرت پرور، علیحدگی پسندانہ، انسانیت دشمن ذہنیت کو ختم کرنے کی ایک تخلیقی کوشش ہے، جو انسانی وجود میں حلول کر گئی ہے۔ جس ذہنیت کی جڑیں ازمنۂ قدیم سے عہد حاضر کے منظر نامہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔

فنکار کا کہنا ہے کہ پاکستان ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو نہیں بنا تھا بلکہ انسانی تاریخ میں اس سلسلے کا وجود بہت پرانا ہے۔ جب جب جنگیں ہوتی ہیں تب تب ایک نفرت جنم لیتی ہے۔ پوری دنیا میں علیحدگی پسندی اور نفرت کا یہ سلسلہ چل پڑا ہے۔ امریکہ، روس، جرمنی، فرانس ہر ملک میں ایک نئی انسانیت سوز نفرت کی بنا پر کشمکش شروع ہوگئی ہے اور اب یہ حال ہے کہ اسرائیل، فلسطین، کوسوو، سربیا، لبنان، یوگوسلاویہ ہر طرف ایک نئی انسانیت کش نفرت، انسان سے انسان کا خون کرا رہی ہے۔ تبھی تو اس ناول کا ایک کردار یہ کہتا ہے:

"ہندوستان بنگالیوں کو ان کا پاکستان بنانے میں مدد دے رہا ہے۔ ابھی یہ خود پاکستان میں سے کتنے پاکستان پیدا ہوں گے۔ پنجاب کے سرائیکی نیا صوبہ مانگ رہے ہیں۔ پرانے سندھی اپنا سندھو دیش بنانا چاہتے ہیں... پختون اپنا پختونستان چاہتے ہیں۔ عطاء اللہ مینگل آزاد بلوچستان مانگ رہا ہے اور اپنے مہاجر بھائی کراچی میں اپنا ایک اور پاکستان بنانا چاہتے ہیں۔ سنا ہے کہ وہاں ہندوستان کے ہندو بھی ہندوستانیوں سے اپنا ہندوتو وادی پاکستان مانگ رہے ہیں... لنکا میں تمل اپنی لنکا الگ کرنا چاہتے ہیں۔" (ص: ۳۳۰)

دنیا کے ہر خطے میں ایک نئی علیحدگی کا ظہور پوری کائنات اور انسانیت کی تباہی کا اشاریہ ہے۔ اسی انسانیت سوز علیحدگی کے لیے ہر طرف جنگیں لڑی جارہی ہیں۔ ایٹم بم، ہائیڈروجن بم تیار کیے جارہے ہیں اور انسانیت کش ہتھیاروں کی تجارت ہورہی ہے۔ سائنس داں اپنے اپنے تجربہ گاہوں میں انسانیت کو غیر فطری موت کے گھاٹ اتارنے کے نئے نئے تجربے کررہے ہیں۔ یہ سب کچھ صرف نفرت کے کاروبار کے لیے ہورہا ہے۔ کملیشور نے اپنے اس ناول میں یہ داستان کرب قلم سے لکھی ہے کہ اگر اسی طرح انسانیت کٹتی رہی تو پوری دنیا تباہ و برباد ہوجائے گی اور کائنات میں کوئی بھی انسان نہیں بچے گا۔ اس لیے انہوں نے اس انسانیت کشی کے مسئلے کو وقت کی عدالت میں پیش

کیا ہے اور اس وقت کی عدالت میں وہ سارے افراد اور مجرم بھی موجود ہیں جنھوں نے برصغیر میں نفرت اور خون کا کاروبار کیا ہے۔

کملیشور نے اُن سارے افراد کو وقت کی عدالت میں پیش کیا ہے تاکہ ہمارے عہد کو وہ بتاسکیں کہ سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے اور آج تک تاریخ میں جتنے بھی واقعات رونما ہوئے ہیں یا حادثات وقوع پذیر ہوئے ہیں، اُن کی ذمہ داری کس پر ہے۔ وقت کی عدالت میں ازمنۂ قدیم سے آج کے عہد کے سارے افراد موجود ہیں جو ماضی کے اُن واقعات پر جرح کرکے اس سچ کو تلاش کررہے ہیں جو سچ کھو گیا ہے اور جس کے کھونے کی وجہ سے آج انسانی دلوں میں بھے، خوف، تشدد اور جارحیت نے جنم لیا ہے۔ کملیشور کی اس تخلیقی عدالت میں ہندوستان کا ماضی بھی موجود ہے اور حال بھی۔ اس میں آریہ عہد بھی ہے اور مغلیہ دور بھی اور تقسیم کے بعد کا وہ دور بھی جس دور کو خود کملیشور نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک درد کا دریا، آگ کا سمندر اور اس تقسیم کے نتیجے میں چلنے والی وہ کالی آندھیاں جو مہابھارت کے یدھ کے دوران چلی تھیں، وہی کالی آندھیاں ہمارے دور تک بھی پہنچی ہیں۔ جب جب ظلم وستم، جبر و اذیت کا دور چلتا ہے تب تب یہ کالی آندھیاں چلتی ہیں جو انسانیت کو تباہ و برباد کر ڈالتی ہیں۔ اب یہ کالی آندھیاں، سائنس دانوں کی وجہ سے چل رہی ہیں جنھوں نے ایٹمی اسلحہ سازی کو فروغ دے کر بہت سے ملکوں کو شمشان بنا ڈالا ہے اور انسانی تہذیب کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ کملیشور جی نے اس ناول میں انسانی تہذیب کی تقسیموں، تاریخ کی تقسیموں، کو اپنے تخلیقی سیاق و سباق میں پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ تہذیبوں کی تقسیم کرنے والے ہی انسانیت کے دشمن ہیں۔ دراصل تہذیبوں کی تقسیم ہی نے مہامرتیو کا سائنسی فارمولا عطا کیا ہے اور آج پوری کائنات میں اسی فارمولے پر عمل ہورہا ہے۔ تہذیب اور انسانیت کی موت ہورہی ہے۔ ایسے میں ایک تخلیق کار کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس زہریلے ماحول کو پاک، صاف ستھرا رکھنے کے لیے وہی درخت لگائے جسے بودھی درخت کہتے ہیں۔ بھنگ منگا کبیر کہتا ہے:

"میں پہلے پوکھران جاؤں گا۔ پھر چاغی جاؤں گا اور میں پوکھران جاکر بودھی درخت لگاؤں گا۔ میرے اس جھولے میں اس کا پودا ہے۔ بودھی درخت کی جڑیں نیل کنٹھ کی طرح سارا زہر پی لیتی ہیں۔ پہلا بودھی درخت میں پوکھران میں لگاؤں گا پھر سرحد پار کرکے دوسرا درخت میں چاغی کی پہاڑیوں میں لگاؤں گا۔"

کملیشور کا ناول بہت بڑے کینوس کا ہے اور یہ ناول لکھنے والا غیر معمولی علم وعرفان رکھنے والا

شخص ہی ہو سکتا ہے جسے انسانی تہذیب کا بھی ادراک ہو اور بشری عمرانیاتی علوم کا بھی۔ یہ ایک ذہن علوی ناول ہے جس کے اندر تخلیق کار نے صرف اپنے دل کی دھڑکنیں نہیں رکھی ہیں بلکہ اپنے گیان کے دیے بھی جلائے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ اور تہذیب کا بہت ہی گہرائی اور ارتکاز کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور صرف مطالعہ نہیں بلکہ ایک متجسس ذہن کی طرح حقائق کی جستجو کی ہے اور تب تمام تہذیبی روایتوں، ثقافتی سلسلوں اور انسانی تاریخوں سے گزرتے ہوئے ایک نیا تہذیبی، تاریخی منظرنامہ تشکیل دیا ہے جس میں برسوں کا گیان دھیان ہے اور ریاضت اور تپسیا — ایسا ناول کوئی معمولی ذہن رکھنے والا فرد لکھ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس میں بہت ہی باریک بینی کے ساتھ تمام ادوار کا تہذیبی ثقافتی مطالعہ کرتے ہوئے ایک نئے نتیجے اور ایک نئی صداقت کی جستجو کی کوشش کی گئی ہے۔

اس میں پرانی قدیم تہذیبوں، یونان مصر و روما کی تہذیبوں کے حوالے سے بھی باتیں کی گئی ہیں اور ان تہذیبوں کے سیاق و سباق میں انسانی تاریخ کو جاننے اور عہد حاضر کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آج جو پرانی تہذیبوں کو نیست و نابود اور قدیم ثقافت کو سبوتاژ کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں، وہ کوششیں بھی انسانیت سوز ذہنیت کی غماز ہیں۔ اس ناول میں کلیشور نے وقت کی عدالت میں تمام تہذیبوں کے نمائندوں اور مذہبوں کے غازیوں سے بھی ملاقات کروائی ہے اور اُن کے خیالات، احساسات کی بنیاد پر ایک نئے سچ کی تلاش کی ہے۔ دراصل کلیشور نے اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہا ہے بلکہ سارا کچھ وقت، تہذیب اور تاریخ کے منہ سے اگلوایا ہے اور اس سچ کو ہمارے عہد کے سامنے پیش کر دیا ہے جو سچ تاریخ کی کتابوں میں اور تعصب زدہ ذہنوں کی تاریکیوں میں کھو سا گیا تھا۔ وقت کے اُس اندھیرے سے کلیشور نے اُس سچ کو ہمارے حوالے کر دیا ہے کہ ہم چاہیں تو اس سچ کی روشنی میں اپنے مستقبل کا منظرنامہ ترتیب دے سکتے ہیں۔

کلیشور کا یہ ناول اظہار و بیان کی تمام تر بوقلمونی لیے ہوئے ہے۔ پہلی سطر سے آنکھوں کا جو رشتہ قائم ہوتا ہے وہ آخری سطر پر جا کر ہی ختم ہوتا ہے۔ یہی اس ناول کی کامیابی ہے اور یہی اس ناول کی کشش بھی۔ کلیشور جی نے الف لیلوی انداز میں پوری کہانی بنی ہے اور کہانی در کہانی یہ سلسلہ ازمنہ قدیم سے ہو کر ہمارے آج کے حاضر تک پہنچا ہے۔ تمام تر تاریخی حوالوں، تہذیبی اشاروں، ممالک و مقامات کے اندھیروں، روشنیوں کو لیے ہوئے آج کے عہد کو اُس پرانے عہد سے مربوط کر کے انہوں نے دیکھا ہے اور وقت کا فیصلہ انسانی تقدیر کے ماتھے پر درج کر دیا ہے۔ وہ وقت جو نہ ہندو ہے نہ مسلمان، سکھ ہے نہ عیسائی۔ وقت بڑا ظالم ہے جو تاریخ کے اندھیروں سے روشنی نچوڑ

لیتا ہے۔ اسی وقت نے بتایا کہ بابری مسجد کا قصوروار بابر نہیں، ابراہیم لودھی تھا۔ ہندوستان میں نفرت کے بیج بونے والے مغل نہیں، انگریز تھے اور اسی وقت نے یہ بھی ثابت کیا کہ اس ملک کی مٹی کو، اس کی وراثت کو، اس کی تہذیب کو مغلوں نے نہیں یا باہری حملہ آوروں نے نہیں بلکہ انگریزوں نے تقسیم کیا تھا۔ وقت نے اپنی آنکھوں سے ہماری مٹی کا ہر رنگ دیکھا ہے اور اسی وقت نے ہمیں یہ بتایا ہے:

> "بھارت مہادیش بھارت ہی رہا۔ دشمن اور دوست اسی بھوکھنڈ کا حصہ رہے۔ سکندر، محمد بن قاسم کسی نے اس ملک کو نہیں توڑا۔ دوسرا ملک ایجاد نہیں کیا۔ غوری، نادر شاہ، ابدالی تک نے اس دیش کے نقشے کو نہیں بدلا — ترک آئے، افغان آئے، وہ چاہتے تو اس دیش کو توڑ کر ترکستان یا کوئی دوسرا افغانستان بنا لیتے۔ مغلیہ سلطنت نے ہمیشہ اس دیش کی اکھنڈتا کو پہچانا اور منظور کیا۔ انہوں نے اس مہادیش میں اپنے کسی دیش کی تعمیر نہیں کی... یہاں تک کہ اورنگ زیب چاہتا تو اپنی سلطنت سے غیر مسلموں کو اپنی طاقت اور تلوار سے خارج کر کے ایک اسلامی دیش کو الگ کر لیتا اسے اسلامستان کا نام دے دیتا لیکن وہ تا زندگی اسی ایک ہندوستان کے لیے لڑتا، جیتتا اور ہارتا رہا۔ یہ کہتے ہوئے راجہ ٹوڈرمل نے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہوا کہ انگریزوں کی سوداگر قوم کے ہاتھوں پانچ ہزار سالہ پرانا یہ مہادیش اپنی تاریخ میں پہلی بار تقسیم در تقسیم کا شکار ہوا۔" (ص ۲۷۳)

اور وقت نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ انگریزوں نے اس ملک کو تقسیم در تقسیم کر کے ہندو، مسلمانوں میں علیحدگی پسندی اور نفرت پھیلا کر ۱۸۵۷ء کے ہندو مسلمان اتحاد کا بدلہ لے لیا۔

کلیشور کے ناول "کتنے پاکستان" میں ایک آفاقی تصور Cosmic Vision ہے۔ انہوں نے صرف ہندوستانی تاریخ و تہذیب کے حوالے سے نہیں بلکہ پوری انسانی تاریخ کے حوالے سے اپنے ناول میں گفتگو کی ہے اور انسان پر بپا ہونے والی قیامتوں اور عذابوں کا دردناک احوال رقم کیا ہے کیونکہ بنیادی طور پر ادیب، دنیا کے ہر دیش کا باشندہ ہوتا ہے اور ایک سچا تخلیق کار کسی جغرافیائی سرحد میں محدود نہیں ہوتا۔ دنیا کا ہر دیش اُس کا اپنا دیش ہوتا ہے۔ اس لیے کائنات کے سینے پر جو بھی تیر لگتے ہیں، وہ سب تیر لوٹ کر تخلیق کار کے سینے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف ہندوستانی تاریخ، تہذیب کا درد نہیں ہے بلکہ پوری کائنات کا درد ہے جو اس تخلیق کے سینے میں سمایا ہوا ہے۔

معلوم نہیں کملیشور نے کتنے برس انسانیت کے اس اتھاہ درد کی کراہ کو اپنے اندر بھگتا ہوگا۔ نیل کنٹھ کی طرح اس کا زہر پیا ہوگا اور پھر اسے تخلیق کے امرت میں بدلا ہوگا۔ سچا تخلیق کار بار بار مرتا ہے اور بار بار اپنے لفظوں کے ذریعے جی اٹھتا ہے۔ کملیشور اس تخلیقی پل صراط سے نہایت کامیابی اور ادبی حسن کاری سے گزرے ہیں جس کے لیے بڑی ریاضت، بڑی پامردی، بڑی تپسیا، بڑے تیاگ اور حد درجہ محنت و ہمت و حوصلے کی ضرورت تھی۔ یہ اتنا بڑا کام ہے اور اتنے بڑے کینوس پر کیا گیا ہے کہ یگوں یگوں زندہ رہے گا اور اس کی داد زمانہ دے گا۔

میں صلاح الدین پرویز اور مکتبہ استعارہ کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اس کو اردو قارئین تک پہنچانے کا بیڑہ اٹھایا۔ استعارہ نے دیکھتے ہی دیکھتے ادبی صحافت کی دنیا میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ اسی طرح مکتبہ استعارہ بھی نہایت فعال ادارہ ہے۔ خدا کرے کہ زندہ ادب کو پیش کرنے کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے۔ آمین!



پروفیسر شمیم حنفی

سوالوں کی زنجیر

شعور کی تختی پر کچھ لمحے اور کچھ واقعے ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتے ہیں۔ کملیشور کے اس ناول کو پڑھتے ہوئے بھی، سب سے پہلے ایک گزرے ہوئے لمحے اور اداسی میں ڈوبی ہوئی ایک شام کا خیال آیا۔ اس شام کو موہن راکیش کی موت اور آخری رسوم کی ادائیگی کے بعد ایک سوال کے جواب میں، کملیشور نے کہا تھا: ''وہ جو میرے لیے بہت قیمتی تھا، کھو چکا ہے۔ اب میں زیادہ فکر مند ([illegible]) نہیں ہوں!''

کملیشور کی آواز، لہجہ اور شام کے اس لمحے کی اداسی میرے حافظے میں آج بھی پوری طرح زندہ ہے۔ اب اس واقعے کو زمانہ گزر چکا ہے، مگر اس زمانے سے مربوط کچھ باتیں ابھی تک دھندلی نہیں ہوئیں۔ انہی باتوں میں یہ بات بھی ہے کہ ایک لمبی مدت تک کملیشور اور موہن راکیش ہماری اجتماعی تخلیقی توانائی اور ہمارے عہد کی حسیت کے دو بہت روشن نشان تھے۔ ان کی الگ الگ تخلیقی کامرانیوں کے ساتھ ساتھ، ہم انہیں اس حیثیت سے بھی جانتے تھے کہ ادبی نظریات کی زبردست کھینچا تانی اور اصولوں کی جنگ کے دور میں تخلیقی استعداد اور تخلیق کار کے سماجی سروکاروں اور ذمے داریوں کو ہمارے جن لکھنے والوں نے ایک نئے معیار سے روشناس کیا، ان میں کملیشور اور موہن راکیش دونوں پیش پیش تھے۔ ان دونوں کا تعلق ایک ایسی ادبی روایت سے تھا جو باہر سے درآمد کئے جانے والے تصورات کے پھیر میں اپنے مخصوص اور منفرد رویوں، اپنے 'Native vigour' اپنی وراثت کے شعور سے دست بردار نہیں ہوتی۔ اپنی فنی ترجیحات کا تعین اپنے آس پاس کی دنیا کے حساب سے کرتی ہے۔ یہ ادبی روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت (اور مابعد جدیدیت) کے معاملات کا علم رکھنے اور انہیں سمجھنے کے باوجود نظریاتی بحثوں کو بس ایک ضمنی اور ثانوی حیثیت دیتی ہے۔ اس روایت کا بنیادی تعلق، لکھنے والے کی تخلیقی ذمے داری کے احساس اور اپنی ذمے داری کے دیانت دارانہ اظہار سے ہے۔ اس روایت کے مطابق ہر سنجیدہ ادبی تخلیق، انسانی روح کو درپیش کسی اہم مسئلے کا بیان اور اس پر گزرنے والے کسی معنی خیز واقعے اور تجربے کا بیان ہے، محض زبان و بیان کا تجربہ نہیں ہے۔ کملیشور اور موہن راکیش دونوں میں یہ وصف مشترک ہے کہ ان کی تخلیقات زبان و

بیان سے آگے، احساس وادراک کی سطح پر ہی ہمارا مسئلہ بنتی ہیں۔

تاریخ کے گھیرے میں رہتے ہوئے بھی ایک کھلی فضا میں سانس لینا اور اپنی تخلیقی ہنرمندی کے واسطے سے خود کو آزاد کر لینا آسان بات نہیں ہے۔ تقسیم کے ادب یا Partition literature کے نام سے ہندوستانی زبانوں میں فکشن کا جو سرمایہ سامنے آیا، اس کا بیشتر حصہ معمولی اور رسمی قسم کا ہے۔ لیزلی فلیمنگ نے منٹو پر اپنی کتاب "An other lonely voice" میں فسادات کے پس منظر میں لکھی جانے والی کچھ کہانیوں (کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹھنڈا گوشت وغیرہ) کو "Partition stories" کا نام دیا ہے۔ لیکن کیا یہ کہانیاں صرف ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کی کہانیاں ہیں؟ اپنے زماں اور مکاں کے دائرے سے یہ کہانیاں کیا باہر نہیں نکلتیں؟ ان کہانیوں کے ذریعہ منٹو نے جس انسانی واردات کا بیان کیا ہے، کیا وہ صرف تقسیم اور ہماری اجتماعی تاریخ کے ایک مخصوص دور کی تاریخ ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ تاریخی ناول یا کہانی کی اپنی حدیں ہوتی ہیں اور لکھنے والے کی نظر ان میں صرف ایک معینہ دور کے واقعات اور کرداروں پر مرکوز ہوتی ہے۔ اس کی بصیرت کا دائرہ محدود اور واقعات سے اس کے بندھے ہوئے تخیل کا پابند ہوتا ہے۔ تاریخی فکشن کے ذریعے، لکھنے والا ہمیں گزرے ہوئے ایک خاص زمانے میں واپس لے جانا چاہتا ہے۔ اس کی وابستگی صرف ایک بندھے ٹکے ماضی سے ہوتی ہے۔ حال اور مستقبل اس کی مملکتِ احساس سے باہر رہتے ہیں، اور بڑی حد تک ایک رومانی رویے کی پابندی کے باعث انسانی صورتِ حال کی ازلی اور ابدی جہتوں سے اس کا تعلق برائے نام ہی کہا جا سکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے "آگ کا دریا" کو ہم تاریخی ناول کی صف میں شمار نہیں کرتے۔ تاریخ سے اپنا بنیادی مواد اخذ کرنے کے باوجود یہ ناول تاریخ سے آزاد بھی ہے اور ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے تجربے کو اپنا اختتامیہ بنانے کے باوجود یہ ناول صرف "تقسیم کے ادب" کا حصہ نہیں ہے۔

یہاں "آگ کا دریا" کا حوالہ میں نے اس لیے دیا کہ کملیشور کی زیرِ نظر کتاب کے ساتھ اردو اور ہندی کی مشترکہ روایت سے باخبر قاری کا دھیان اس طرف ضرور جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے، "کتنے پاکستان" کی اشاعت کے چند روز بعد جب اس پر بحثیں شروع ہو چکی تھیں، ہندی کے ایک سربرآوردہ نقاد اور ہندوستانی ادبیات کے ایک ممتاز عالم نے کہا تھا "کملیشور کا یہ ناول "آگ کا دریا" کے پیٹرن (Pattern) پر لکھا گیا ہے اور لگ بھگ اسی طرح کے مسئلوں میں الجھا ہوا ہے۔" میرا خیال ہے کہ اس قسم کی سرسری رائے قائم کر لینا ایک طرح کی فکری سہل پسندی کا اظہار ہے۔ ایک ہی موضوع اور ایک جیسی انسانی صورتِ حال پر مبنی ہر تخلیقی تحریر ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی۔ بنیادی نوعیت رکھنے والے انسانی تجربوں کی فہرست بھی بہت طویل نہیں ہوتی۔ کب سے وہی سکھ دکھ، زندگی

اور موت، امید اور مایوسی، شکست و فتح اور بناؤ بگاڑ کے قصے چلتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن ان تجربوں کی طرف ردِعمل کی صورتیں بے شمار ہوتی ہیں۔ ہم اپنے ہی ملک اور ماحول کے سیاق میں دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ تقسیم کے تجربے، فسادات اور انسانی تاریخ میں انسانوں کی سب سے بڑی ہجرت سے وابستہ واقعات، بہت سی نظموں، غزلوں، کہانیوں، ناولوں، ڈراموں اور ادبی و غیر ادبی تحریروں کا موضوع بنے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان کے ساتھ ساتھ انیسویں اور بیسویں صدی کی ذہنی بیداری، سماجی، معاشرتی اور سیاسی اتھل پتھل اور نشاۃ الثانیہ کے تصور کو بھی صرف ہمارے اجتماعی ماضی کے واقعات کی شکل میں نہیں دیکھا جاتا۔ ہماری قومی زندگی اور اجتماعی تاریخ پر ان واقعات نے بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہ ماضی بار بار ہمارے حال کو متاثر کرتا ہے اور اپنے مستقبل کی تعیین و تعبیر کے عمل میں بھی ہم بار بار اپنے اس ماضی سے استفادہ کرتے ہیں۔ ایک گزرے ہوئے زمانے اور گذشتہ تاریخ سے اپنے حاضر اور آئندہ کا اتنا گہرا تعلق شاید آج سے پہلے کبھی بھی اس طرح ہمارے شعور کا حصہ نہیں بنا۔ ہجرت کا ادب، نوسٹلجیا کا ادب، ایک وسیع اور پیچیدہ انسانی صورتِ حال پر مبنی فرقہ وارانہ منافرت اور تشدد کے ملبے سے نمودار ہونے والا ادب، ہماری موجودہ ادبی روایت کا بہت اہم اور ناگزیر حصہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان (اور اب تو بنگلہ دیش میں بھی)، دونوں ملکوں میں فریڈرک جیمسن کے لفظوں میں ایک طرح کی "قومی تمثیل" (National allegory) مرتب کرنے کے میلان کو پچھلے چند برسوں میں نمایاں ترقی ملی ہے۔ اردو میں خاص طور پر قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے یہاں یہ کہانی بار بار اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" انتظار حسین کے ناول "بستی"، "تذکرہ" اور "آگے سمندر" ہے، خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" اس سلسلے کی خاص کڑیاں ہیں۔ مشترکہ تہذیبی ماضی اور غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ کو مڑ مڑ کر دیکھنے کے چلن میں ادھر خاصی تیزی آئی ہے۔

کملیشور کے اس ناول 'کتنے پاکستان' کو اسی سیاق میں رکھ کر پڑھنا چاہیے۔ لیکن عام تاثر کے برعکس، اس حقیقت پر توجہ ضروری ہے کہ 'کتنے پاکستان' کا دائرہ صرف ہمارے اجتماعی ماضی کے گرد پھیلا ہوا نہیں ہے۔ یہ ناول تاریخی ناولوں سے الگ ایک نئی سطح پر، جس کا حوالہ بے شک ہماری پچھلی تاریخ اور موجودہ سیاسی و معاشرتی صورتِ حال ہے، ہم سے اپنی تفہیم اور تعبیر کا تقاضہ کرتا ہے۔ میں اس ناول کو ایک فیوچرسٹ (Futurist) یا مستقبل اساس تخلیق کے طور پر دیکھتا ہوں۔ یہ ناول ایک ساتھ ہماری گذشتہ، موجودہ اور آئندہ زندگی، ہماری مشترکہ جدوجہد اور معاشرتی تاریخ کے مبہم امکانات کا احاطہ کرتا ہے۔

کملیشور کا امتیاز یہ ہے کہ ہمارے عہد کے بیشتر نئے لکھنے والوں کے برخلاف وہ نہ تو سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھتے ہیں، نہ اپنی موجودہ صورتِ حال کو سیاست سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے اجتماعی تجربوں کی سیاسی جہت کی طرف اُن کا رویہ روایتی ترقی پسندوں کے رویے سے مختلف ہے۔ ایک طرح کی ارضیت کا عنصر ان کی تحریروں میں ہمیشہ موجود اور نمایاں رہا ہے۔ اس کی وجہ سے شدید جذباتی اور تخیلی تجربوں کے بیان میں بھی کملیشور کے یہاں حقیقت پسندی کا پہلو خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت پسندی کا یہ پہلو روایتی قسم کی سماجی حقیقت پسندی سے الگ ہے اور ایک مختلف تناظر کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ چنانچہ 'کتنے پاکستان' میں حقیقت اور واہمے (Illusion) یا مشاہدے اور تخیل کا عمل ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس میں بیان کردہ واقعات کی ایک سطح تو وہ ہے جو چھوئی اور ٹٹولی بھی جا سکتی ہے اور سچائی کی اوپری پرت سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری سطح، واقعات کی باطنی یا اندرونی سطح ہے جہاں روح کے اندر جاری رہنے والی ایک پیکار یا ایک داخلی کشمکش، ایک طرح کے باطنی منظر نامے (Inner landscape) کا نقشہ سامنے لاتی ہے۔

کملیشور نے 'کتنے پاکستان' کے پلاٹ کا تانا بانا بڑی مہارت کے ساتھ تیار کیا ہے۔ واقعات کی ترتیب تدریجی یا تاریخی تسلسل کی پابند نہیں ہے۔ سامنے کے واقعات بیان کرتے کرتے دیو مالائی تلمیحات کی شمولیت سے وہ قصے میں ایک ساتھ کئی جہتیں پیدا کرتے جاتے ہیں۔ چنانچہ پڑھنے والا اپنے آپ کو ایک ساتھ تاریخ کا پابند بھی دیکھتا ہے اور تاریخ سے آزاد بھی۔ ہندی ایڈیشن کے فلیپ پر (غالباً) ناشر کی طرف سے اس ناول کے بارے میں جو عبارت دی گئی ہے، اس کا کچھ حصہ اس طرح ہے۔ ''کملیشور — اسے لگ بھگ ایک دہائی سے لکھ رہے ہیں اور اس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ اُن کے باطن میں لگاتار چلنے والی ایک جرح کا نتیجہ ہے جو ابھی بھی جاری ہے اور جس کے تحت آدمی اور اس کی ذات، قبیلے، قوم، تہذیب، مذہب وغیرہ مختلف گروہوں کی آپسی جان لیوا کشمکش کے مسئلے سے وہ ہمیشہ جوجھتے رہے ہیں۔ وقت اور تاریخ ہی ان کے اس انوکھے ناول کے ہیرو اور ولن ہیں۔ اس میں انہوں نے مصنف یعنی ادیب کی کچہری بٹھا کر دنیا بھر کی سبھی تہذیبوں میں چلنے والی کشمکش کے مسئلوں کو اٹھایا ہے جو ادب کی تاریخ میں اپنی طرح کا پہلا اور زیادہ بامعنی تجربہ ہے — ہندوستان کی موجودہ تاریخ میں ہندو مسلم تنازعہ، پاکستان کی شکل میں ملک کی تقسیم وغیرہ واقعات کو بھی انہوں نے تفصیل کے ساتھ برتا ہے اور ان کے وسیلے سے ملک کے مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔'' مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقیقت، کا ایک نیا اسطور (myth) بنانے کی تخلیقی جستجو ہے تاکہ ہم اپنے عہد کو، اس عہد کے مسئلوں کو (اور اپنے آپ کو بھی) ذرا دور سے، ذرا

الگ ہو کر دیکھ سکیں۔ ایک خاص زمانے اور مکاں (Space) کے ایک خاص دائرے میں رونما ہونے والے واقعات کو اُن واقعات کی سطح سے اوپر اٹھ کر، ایک زیادہ وسیع تناظر میں دیکھ سکیں۔ انفرادی تجربے اور اجتماعی تجربے کی دوریوں پر قابو پا سکیں۔ یوں بھی جب ہماری شخصی واردات کے بیان میں دوسرے کرداروں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے تو ہمارا قصہ صرف نجی اور شخصی نہیں رہ جاتا۔ ہماری روداد اپنے آپ ہی زمانے کی روداد بن جاتی ہے۔ چنانچہ 'کتنے پاکستان' کی کہانی بھی صرف ہماری اور ہمارے عہد کی کہانی نہیں ہے۔ یہ صرف سیاسی اور تہذیبی مسئلوں کی کہانی بھی نہیں ہے۔

ایک گہری محبت کی کہانی اور نازک حساس انسانی رشتوں کے بیان سے شروع ہونے والی اس قصہ در قصہ داستان میں دور پاس کے بہت سے واقعات، کردار، مقامات اور مسئلے سمٹ آئے ہیں۔ گویا کہ یہ ناول ایک خواب نامہ ہے۔ مختلف گروہوں، قبیلوں، فرقوں میں بٹے ہوئے انسان کو ایک عالم گیر وحدت کے طور پر دیکھنے کا۔

اس لحاظ سے 'کتنے پاکستان' ایک تصوراتی (Conceptual) ناول ہے۔ یہ مسئلوں اور واقعات کا بیانیہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُن پر ایک غیر مبہم تبصرہ بھی ہے۔

'کتنے پاکستان' کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ کملیشور نے یہ سارا انسانی تماشا اپنے ضمیر کی عدالت میں، کبیر کی شبدا ولی کے مطابق اپنی ''پلکوں کے جھروکے'' سے دیکھا ہے اور کسی بیرونی نظریے، مسلک، معاشرتی اور سیاسی تصور، اوپر سے عائد کردہ کسی اخلاقی موقف کی مداخلت کے بغیر دیکھا ہے۔ لیکن، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اس ناول کی حیثیت ایک نجی دستاویز یا شخصی اعتراف نامے کی بھی نہیں ہے۔ یہ اصطلاحی معنوں میں ایک وجودی (Existential) ناول بھی نہیں ہے۔ ہربرٹ ریڈ نے کہیں لکھا تھا کہ سوشلسٹ نظریات میں یقین رکھنے والا شخص بعض اعتبار سے وجودی (Existentialist) بھی ہوتا ہے، رسمی قسم کے وجودیوں اور انفرادی تجربے یا تخلیقی آزادی کا علم اٹھانے والوں سے زیادہ وجودی ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دوسرے انسان بھی اس کی نظر میں اتنی ہی اہم وجودی اکائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جتنا کہ وہ خود ہے، وہ صرف تجرید (Abstraction) نہیں ہوتے۔ کملیشور کے اس ناول میں بھی چھوٹے سے چھوٹے کرداروں اور بظاہر معمولی دکھائی دینے والے انسانی تجربوں کے سلسلے میں ہمیں وہی رویہ ملتا ہے جسے منٹو نے فکشن لکھنے کی پہلی اور بنیادی شرط بتایا تھا، یعنی یہ کہ سڑک کے کنکر پتھر بھی اس کی نظر میں غیر اہم نہ ہوں اور وہ کسی دوسرے کو اپنے سے کم تر نہ سمجھے۔ اس رویے کے باعث 'کتنے پاکستان' میں ہر جگہ انسانی عنصر حاوی نظر آتا ہے اور انسانی دردمندی کا ایک رچا ہوا احساس پورے ناول میں جاری و ساری ہے۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کسی حساس لکھنے والے کے لیے سب سے زیادہ مشکل مسئلہ خود اپنے عہد کے بارے میں لکھنا ہے۔ آس پاس کے دنیا کے مسئلوں میں الجھتے وقت اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھنا، واقعات سے ایک معروضی فاصلہ قائم رکھنا، اپنی ترجیحات (اور تعصبات) سے اپنے آپ کو شدید جذباتی لمحوں میں بھی آزاد رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں کملیشور جذباتی تو ہوئے ہیں اور رومان پروری کی ہلکی سی پرت بعض واقعات پر پھیل گئی ہے، مگر ان کا مجموعی رویہ ایک انسان دوست ادیب کی حقیقت پسندی کا ہے اور اپنے عہد کے واقعات کی بابت بھی وہ منصفانہ وقائع نویسی کی شرطوں کو پورا کرتے ہیں۔ جہاں کہیں وہ حال کے واقعات (مثلاً بابری مسجد کے انہدام) میں ماضی کی کسی ایسی ہی واردات (مثلاً سومنات پر محمود غزنوی کے حملے) کی گونج سنتے ہیں۔ وہاں بھی وہ کسی طرح کی مصنوعی معروضیت کا تاثر مرتب کرنے کے بجائے انسان کی خلقی اور فطری کمزوریوں کے جبر اور انسانی تجربے کی تکرار سے پردہ اٹھاتے ہیں، وہ بھی اس طرح کہ مماثل واقعات ایک دوسرے کا جواز نہ بننے پائیں۔ انسانی سوز اور دردمندی کی کیفیت نے اسی لیے واقعات کو کہیں بوجھل نہیں ہونے دیا ہے، نہ ہی ان کے بیان میں جذباتیت کو ذرا سی بھی راہ مل سکی ہے۔

زمینوں کی مصنوعی تقسیم اور جبریہ ہجرت کے نتیجے میں رونما ہونے والا اپنی جڑوں کے اکھڑنے اور ٹوٹنے کا تجربہ جو ایک طرح کی عالم گیر معنویت رکھتا ہے اور جس کی سرگوشی ہمیں اردو ہندی سے قطع نظر، دنیا بھر کے ادب میں سنائی دیتی ہے، 'کتنے پاکستان' کی روداد کا حصہ بھی بنا ہے۔ اس کے بیان میں کملیشور نے تخیل کے ساتھ ساتھ حقیقی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور تاریخی شہادتوں سے بھی مدد لی ہے۔ اس کی ایک واضح مثال موریشس کے سفر کی تفصیلات میں ابھیمنیو انت (موریشس کے ایک ہندی ادیب) کا حوالہ ہے۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں 'کتنے پاکستان' کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں جن میں تاریخ اور تخیل کے باہمی ربط نے حقیقت اور ماورائے حقیقت کی ایک مستقل دھوپ چھاؤں کا منظرنامہ ترتیب دیا ہے۔ نتیجتاً 'کتنے پاکستان' کا مجموعی تاثر ایک تخلیقی واردات، ایک دیومالا (myth) کا بھی ہے اور ایک آپ بیتی کے واسطے سے سامنے آنے والی جگ بیتی کا بھی۔ تاریخ اور مافوق التاریخ (meta-history) دونوں کی یکجائی نے کتنے پاکستان کو انسانی تجربوں کی ایک ایسی روداد بنا دیا ہے جو بیک وقت حقیقی بھی ہے اور خیالی بھی۔

کملیشور کے بارے میں ایک عمومی قسم کا تاثر جو اس ناول کے مطالعے سے پہلے بھی میرے شعور کا حصہ بن چکا تھا، اسے اس کتاب سے مزید تقویت ملی۔ یہ تاثر ہے ایک انتہائی بے چین، سرگرم اور اندوہ پرور روح سے شناسائی کا جو تضادات سے بھرے ہوئے ایک دور، ایک سراسیمہ

اور اضطراب آسا انسانی معاشرے کی تماشائی بھی ہے اور آپ اپنا تماشا بھی۔ صحافت، فلم سازی اور ماس میڈیا سے لے کر صرف اپنے شب چراغ کے ساتھ اپنی تنہائی سے الجھتی ہوئی ایک روح جس کے لیے ادراک اور اظہار کا کوئی بھی وسیلہ، کوئی بھی مرحلہ آخری وسیلہ اور مرحلہ نہیں ہے، جس کے لیے لکھنا اور مختلف زاویوں سے اپنا اظہار کرنا، ایک سماجی مشن بھی ہے اور ایک داخلی مجبوری بھی۔ اسی لیے کملیشور کی ہر تخلیق کی طرح، 'کتنے پاکستان' سے بھی ایک ساتھ معنی کی کئی جہتیں نکلتی ہیں اور ہم بیک وقت متعدد سطحوں پر ان سے مکالمہ قائم کر سکتے ہیں۔ ایک ادیب، ایک دانشور، ایک سماجی مفکر اور کارکن، ایک حقیقت پسند اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک خواب پرست وقائع نویس جس کی جھولی میں کئی زمینوں اور زمانوں کے تجربے یکجا ہو گئے ہیں اور سفر سے لوٹے ہوئے پرانے ہسپانوی جہاز رانوں کی طرح وہ ہمیں جس دنیا کا چہرہ دکھانا چاہتا ہے، وہ صرف اس کی اور صرف ہماری دنیا نہیں ہے، بلکہ اس زمین پر بسنے والے بھانت بھانت کے لوگوں کی دنیا ہے۔ ان سب کو ایک حقیقت ایسی بھی ہے جو ایک ہی مرکز پر سمیٹ لاتی ہے۔ وہ حقیقت ہے کائنات میں انسان کی حیثیت اور منصب کے ساتھ ساتھ بذات خود اس کائنات کے مستقبل اور اس کے انجام کی:

"ادیب دیکھتا رہ گیا۔ وہ کہنا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ پوکھرن کے بعد ہمارے مور، یا تو ختم ہو گئے یا دیس چھوڑ کے چلے گئے... لیکن کیا چاغی کے بعد تمہارے کھجور کے پیڑوں پر مدھ مکھیاں ابھی بھی آتی ہیں..."



ہاں بودھی درخت... میرے اس جھولے میں اسی کی پود ہے۔ بودھی درخت کی جڑیں نیل کنٹھ کی طرح سارا وش (زہر) پی لیتی ہیں... پہلا بودھی درخت میں پوکھرن میں لگاؤں گا، پھر سرحد پار کر کے دوسرا درخت میں چاغی کی پہاڑیوں میں لگاؤں گا... تو میں چلوں...

اور اس طرح یہ کہانی اپنے حاضر سے آئندہ کی طرف سفر کرتی ہے، اس دنیا کی طرف جس کے خدوخال ابھی متعین نہیں ہوئے اور جو ابھی ہم سب کے لیے غیر یقینی ہے۔ لیکن بہرحال، ہم اپنے اس دہشت اور درد سے بھرے ہوئے حاضر کی چوکھٹ پر ٹھہر تو نہیں سکتے۔ آگے جانا اور کچھ سوالوں کے جواب ڈھونڈنا ہماری اور 'کتنے پاکستان' کے قاری کی مجبوری بھی ہے اور مقدر بھی ہے! ان سوالوں سے پیدا ہونے والی کشمکش میں ہمیں سرحد پار سے انتظار حسین کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔



کتنے پاکستان

(۱)

ایک بھولی ہوئی داستان اُسے یاد آتی ہے۔

وہ تو ایک بنجر زمین سے آیا تھا۔ خاموش کشش کی دنیا سے، جہاں کچھ بھی کہا نہیں جاتا۔ دل ہی دل میں کچھ ارمان کروٹیں لیتے ہیں۔ تشنہ خواہشیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں... اور قصباتی خواب چھتوں پر پھیلے کپڑوں کی طرح دھوپ اُترتے ہی بٹور لیے جاتے ہیں۔ کچھ ان کے دھندلے سے عکس یادوں میں اُلجھے رہ جاتے ہیں جو نہ گھٹتے ہیں نہ بڑھتے ہیں۔ بس، پانی کے داغ کی طرح وجود کے لباس پر نقش ہو جاتے ہیں۔

اس کا پورا قصبہ، اس کے قصبے کا اپنا محلہ، محلے کی کئی کھڑکیاں بھی اسے خاموش حسرت سے دیکھتی دکھائی دی تھیں۔ کبھی کبھی برسات کے دنوں میں لوٹتے ہوئے پاؤں کے نشان دکھائی پڑ جاتے تھے۔ زیادہ بارش ہوئی تو نشان پہلے تو بھری آنکھ کی طرح ڈبڈباتے تھے، پھر دیکھتے دیکھتے مٹ جاتے تھے۔ واپس گئے پیر پھر نظر نہیں آتے تھے۔ کچھ آنکھیں تھیں جو کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھیں، پر انہوں نے کبھی کچھ کہا نہیں تھا۔ کہیں کوئی کاجل لگی آنکھ اُلجھی تھی۔ کسی کھڑکی میں ہلکی سی کوئی پرچھائیں۔ کسی میں اشارہ کرتی کوئی انگلی۔ کہیں شرما کے لوٹتے ہوئے ادھورے ارمان اور کہیں کسی مجبوری کی کوئی داستان...

عجب دن تھے
نیم کے جھڑتے ہوئے پھولوں کے دن
کیکر میں آتی زرد کلیوں کے دن
نہ بیتنے والی دوپہریوں کے دن
اور پھر ایک کے بعد ایک، لگاتار بیتتے ہوئے دشاہین دن

اُن دنوں مستقبل کہیں تھا ہی نہیں۔ ایک بے معنی حال ساتھ تھا جو بس، چلتا جاتا تھا۔ یہ آزادی سے ٹھیک پہلے کا دور تھا۔ ریل گاڑی میں ریزرویشن کی سہولت اور انتظام نہیں تھا۔ اب اسے یاد نہیں ۔۔۔ وہ یا شاید سائنس میں تھی، لیکن چھٹیاں ساتھ ساتھ ہوتی تھیں اس لیے وہ الٰہ آباد اسٹیشن پر مل ہی جاتے تھے۔ وہ یا تو فتح گڑھ کی تھی۔ بیچ تیوہار اور پھر گرمیوں کی چھٹیاں۔ اپنے اپنے گھر جانے کے لیے ایک آدھ بار تو اس سے ایسے ہی ملاقات ہوئی، پھر جب بھی کوئی چھٹی آتی تو اسٹیشن پر ایک دوسرے کا انتظار کرنے لگتے۔ نہ معلوم یہ کیسا لگاؤ تھا کہ پلیٹ فارم پر، ایک تب تک رہتا تھا جب تک دوسرا آ نہیں جاتا تھا۔ بغیر کہے یہ طے ہو گیا تھا کہ چھٹی ہونے والے دن کی صبح، پہلی پسنجر گاڑی

سے ہی سفر کیا جائے گا۔ ان دنوں بھی کچھ تیز ایکسپریس گاڑیاں چلتی تھیں، لیکن انہیں پسنجر ہی پسند تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی اور ہر اسٹیشن پر رکتی تھی۔

اُن دونوں کو ساتھ ساتھ سفر کرتے، چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کے نام یاد ہو گئے تھے۔ اب بمرولی آئے گا، اب منوری، اب سید سراواں اور پھر بھرواری اور سراتھو۔ اس کے بعد فتح پور اور پھر کانپور... پھر اسٹیشنوں کے نام ساتھ ساتھ پڑھتے تھے اور کس اسٹیشن پر کتنی گنجائش والی پانی کی ٹنکی ایک بڑے گھڑے کی طرح کھڑی ہے، یہ بھی انہیں یاد ہو گیا تھا۔ انجن کس اسٹیشن پر پانی لے گا، یہ بھی انہیں پتہ تھا۔ کچھ ایسا بھی تھا جو دونوں کو ایک ساتھ محسوس ہوتا تھا۔ ان کے دل کی اُن کہی خواہشوں کے پل یکبارگی ایک ساتھ جڑ جاتے تھے۔ اب یہی، جیسے بھرواری اسٹیشن کے سموسے، ابھی وِدّیا کہنے کو ہی ہوتی تھی کہ وہ بول پڑتا تھا — کھٹی چٹنی... یا پھر فتح پور کی دہی کی پکوڑیوں پر میٹھی چٹنی۔

کبھی کبھی وہ بھاگتے پیڑوں میں سے کسی ایک کو اچانک ایک ساتھ دیکھتے تھے۔

پھر کچھ اسٹیشنوں کا ساتھ اور... چاہتے تو دونوں نہیں تھے، لیکن کانپور آ ہی جاتا تھا۔ وِدّیا وہیں اُتر کر فتح گڑھ والی گاڑی بدلتی تھی۔ کانپور سے اسے چھوٹی لائن پکڑنی ہوتی تھی، جس کا پلیٹ فارم آخری تھا۔ بیچ میں بڑی لائن کے کئی پلیٹ فارم تھے۔ اُن دنوں 'ٹاٹا' اور 'بائے بائے' نہیں ہوتا تھا۔ فلائنگ کس تو تھا ہی نہیں۔ خاموشی کی گہرائی ہی شاید لگاؤ کا پیمانہ تھا۔ وِدّیا چپ چاپ اترتی تھی۔ وہ اس کا جھولا یا ان کا چھوٹا بکس یا کتابوں کا بستہ اٹھا کر تھما دینے میں مدد کرتا تھا۔ ان دنوں لیٹ ہوتے پر گاڑیاں بھی ایک دوسرے کا انتظار کر لیتی تھیں۔ وِدّیا 'اچھا' کہہ کر پل پر چڑھ کر اپنی گاڑی والے پلیٹ فارم پر چلی جاتی تھی۔ وہ اسے چھوڑنے یا رخصت کرنے نہیں جا پاتا تھا کیونکہ تب تک اس کی مین لائن کی گاڑی چھوٹ سکتی تھی۔

کانپور سے اس کا سفر شکوہ آباد جنکشن تک جاری رہتا تھا، جہاں سے وہ برانچ لائن کی گاڑی پکڑ کراپنی مین پوری پہنچا کرتا تھا، ماں کے پاس۔ شکوہ آباد سے مین پوری تک کے تین اسٹیشنوں کے نام تو اسے یاد تھے، لیکن کہاں، کس اسٹیشن پر پانی کی ٹنکی تھی اور چھوٹے سے سفر میں کون سے پیڑ ساتھ دوڑتے تھے، یہ اسے یاد نہیں تھے۔ وِدّیا بھی سفر میں ساتھ ہوتی تو شاید اُسے وہ پیڑ یاد رہتے۔

چھٹیوں سے لوٹنے کا دن اور الٰہ آباد تک جانے والی پسنجر گاڑی بھی، ان کے طریقے سے طے ہو گئی تھی... وہ لوٹتے وقت کانپور تک مین لائن کی گاڑی سے آتا تھا، لیکن کانپور سے پسنجر ہی پکڑتا تھا۔

چھوٹی لائن سے آ کر وِدّیا اسے انتظار کرتی ملتی تھی۔

ملنا، انتظار اور ساتھ ساتھ سفر کرنا، یہ دو سال تک چلتا رہا۔ پھر وہ سال بھی آیا۔ گرمی کی لمبی چھٹیاں ہوئیں۔ وہی الٰہ آباد اسٹیشن، وہی پسنجر گاڑی۔ لیکن اس بار اسٹیشنوں کا نظارہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ گاڑی میں چڑھنے والے مسافر اوسط سے زیادہ خاموش تھے۔

سید سراواں اسٹیشن پر سارے اسٹیشنوں سے زیادہ بھیڑ ملی۔ سفر میں زیادہ تر مرد ہی ملتے تھے لیکن اس بار ان کے ساتھ عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ٹن کے بکسوں، بوروں، گٹھریوں، پوٹلیوں والا سامان بھی ضرورت سے زیادہ تھا۔ گاڑی چھوٹی تو پلیٹ فارم پر رک کر کوئی 'خدا حافظ' کہہ کر رخصت کرنے والا نہیں تھا۔ مسافروں کے آپسی بات چیت سے پتہ چلا تھا کہ وہ کسان خاندان پہلے علی گڑھ جا رہا تھا، وہاں سے پاکستان چلے جائیں گے۔

آخر کانپور اسٹیشن کا یارڈ گزرنے لگا۔ گاڑی کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ وِدّیا کو تو یہیں اترنا تھا۔ پلیٹ فارم آیا، وِدّیا اتری۔ ہمیشہ کی طرح اتر کر اس نے وِدّیا کو سامان تھمایا۔ تب وِدّیا نے اتنا ہی کہا تھا —

— شاید آگے کی پڑھائی کے لیے اگلے سال نہ آسکوں۔

— کیوں؟

— گھر والے یہی چاہتے ہیں۔

یہ ایک فطری اطلاع تھی۔ جس سے دونوں نے کچھ غیر فطری سا محسوس کیا تھا۔ اُن کے درمیان غیر تحریری اور پوشیدہ جذبات کا رشتہ تو شاید بہت گہرا تھا، لیکن کہیں کچھ ایسا نہیں تھا جو انہیں کوئی جواب مانگنے کے لیے مجبور کرے۔

آخر چھوٹی لائن کی اپنی گاڑی پکڑنے کے لیے وہ پل پر چڑھنے لگی۔ وِدّیا کی گاڑی چھوٹنے کا وقت ہو رہا تھا اور اس کی گاڑی بھی چھوٹنے والی تھی۔

اور بس، تب اس داستان میں اتنا ہی ہوا تھا کہ پل پر پہنچ کر، اپنے پلیٹ فارم کی طرف مڑنے سے پہلے وِدّیا نے اپنا رومال اوپر سے گرایا تھا...

اس کی گاڑی اسی وقت آخری سیٹی دے کر کھسکنے لگی تھی۔ اس کا ڈبہ بھی کافی آگے تھا۔ اس نے رومال کو گرتے ہوئے دیکھا تھا، اس کے لیے وہ رکا بھی تھا، لیکن پلیٹ فارم چھوڑتی گاڑی کو وہ نہیں چھوڑ پایا تھا۔ سفر تو سفر تھا اور پھر ڈبے میں اس کا جھولا لاوارث پڑا تھا، جس میں اس کی کتابیں،

کاپیاں اور قلم تھے۔

وڈیا کا رومال تو وہ نہیں اٹھا پایا لیکن اپنے سفر کو بھی نہیں توڑ پایا۔ چلتی گاڑی میں وہ چڑھا اور اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ آگے کا سفر جاری تھا۔ اس کا بھی اور ان مسافروں کا بھی جو علی گڑھ ہوتے ہوئے پاکستان جا رہے تھے۔ وڈیا کا بھی جو گاڑی بدل کر فتح گڑھ کی طرف چلی جا رہی ہوگی۔ بیٹھے بیٹھے وہ یہی سوچتا رہا کہ اگلے سال اب وڈیا نہیں آئے گی، اس کا سیدھا مطلب یہی ہے کہ اس کے گھر والوں نے کہیں اس کا رشتہ طے کر دیا ہوگا اور انہی گرمیوں میں اس کی شادی ہو جائے گی...

شکوہ آباد جنکشن آیا تو وہ اتر پڑا۔ اسے مین پوری والی گاڑی پکڑنی تھی۔ پاکستان جانے والے مسافروں کا سفر علی گڑھ کی طرف جاری تھا۔

ان گرمیوں کے بعد پھر وڈیا اسے نہیں ملی۔ پتہ نہیں وہ کہاں کس سفر پر نکل گئی۔

بس، اتنا ضرور ہوا کہ زندگی کے اس طویل سفر میں جب بھی وہ کانپور اسٹیشن سے گزرا تو وہ رومال ہمیشہ اسے گرتا ہوا دکھائی دیتا رہا، دکھائی ہی نہیں دیتا رہا... وہ رومال بیچ بیچ گرتا رہا... وہ رومال آج بھی گرتا ہے...

پھر کئی برسوں کے بعد، جب وہ کئی نوکریوں اور کئی شہروں کو چھوڑتا ہوا شہر بمبئی میں ٹک کر کام کرنے لگا، تو اسے ایک عجیب سا پُراسرار خط ملا۔ اس کا لفافہ خود اپنے سفر کی کہانی بتا رہا تھا۔ وہ اس کے پچھلے کئی پتوں سے ری ڈائرکٹ ہو کر اس تک پہنچ ہی گیا تھا۔ اس نے کئی بار کٹے ہوئے پتوں کو دیکھا تھا۔ صرف اس کا نام جوں کا توں تھا۔

مہربان ہاتھوں نے الگ الگ تحریروں میں اس کا نیا پتہ درج کیا تھا۔ تب اسے لگا تھا کہ خط اگر دل سے بھیجا جائے تو کئی جنموں کے بعد بھی پہنچنے والے تک پہنچ ہی جاتا ہے۔

پانچ پتوں سے لوٹے ہوئے لفافے کو اس نے بہت احتیاط سے چاک کیا تھا۔ مضمون پڑھا تو راز اور بھی پُراسرار ہو گیا تھا۔ لکھا تھا—

ادیب عالی!

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

کیا غم خوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

خدا حافظ...

خط میں کوئی نام نہیں تھا، پتہ بھی نہیں تھا۔ اسے خط کے طرزِ تخاطب نے بھی چونکایا تھا۔

یکبارگی اس کا دھیان وڈیا کی طرف گیا۔ مضمون میں بات کی جو بازگشت تھی... وہ اس کی ہو سکتی تھی اور پھر ادیب عالی والا تخاطب۔ شاید وہ اس کی زندگی کی کھوج خبر لیتی رہی ہو۔ انداز سے اس نے پہلا پتہ لکھا ہو کہ شاید خط پہنچ جائے... پھر تو پتے مہربانوں نے بدلے تھے...

لیکن سب سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی بات یہ تھی کہ وڈیا تو سائنس کی طالبہ تھی، اسے ہندی تو پھر بھی آتی تھی لیکن اردو کا تو ایک حرف بھی نہیں آتا تھا اور پھر آخر میں— خدا حافظ...

نہیں... نہیں... یہ وڈیا تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ اور کوئی بھی ہو وڈیا نہیں ہو سکتی۔

اور تب یہ داستان اور زیادہ پُراسرار بن گئی تھی... حیران کن اور عجیب و غریب۔ ہوا یہ تھا کہ...

(۳)

ہوا یہ تھا نہیں... سر! پہلے یہ سنیے کہ ہوا کیا ہے...

اس نے چونک کر آواز کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا 'ایک میں تین'— معاون، اسٹینو اور اردلی محمود اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیلی پرنٹر سے آئی خبروں کے کچھ کھردرے کاغذوں کے ٹکڑے تھے۔

— کیا ہوا ہے؟ اس نے پوچھا۔

محمود نے خبریں اس کے سامنے رکھ دیں۔

خبروں پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے شیشے کی دیوار سے باہر دیکھا۔ ہال میں لمبے ڈیسک کے آس پاس شام کی شفٹ کے سارے صحافی تیز طرار باتوں میں الجھے ہوئے تھے اور دونوں نیوز ایڈیٹر تیزی سے اس کے کیبن کی طرف چلے آ رہے تھے۔ پہلا سٹی ایڈیشن مشین پر جانے والا تھا۔ بیسمنٹ میں مشینوں کے چلنے کی ہلکی تھرتھراہٹ وہ محسوس کر رہا تھا۔ تب تک دونوں نیوز ایڈیٹر اس کے کیبن میں آ گئے۔

— سر! اس وقت تو آپ کے فرنٹ پیج ایڈیٹوریل کی ضرورت ہے...

— ابھی آپ ڈکٹیٹ کر دیں سر، تو پہلے ایڈیشن میں چلا جائے گا۔ ضروری بھی ہے...

— ٹھیک ہے... کیبنٹ روم میں بول دو۔ تیار رہیں... ایک پیالہ کافی لے آؤ۔ اس نے کہا تو محمود حکم بجاتے چلا گیا۔ اس نے بزر دے کر اسے واپس بلایا۔

پھر اس نے جلدی جلدی ڈسپیچز پڑھے... وہی پھر ہوا تھا... ۱۹۴۸ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۲ء کی طرح۔

کارگل کے علاقے میں دراندازوں کے نام پر پھر پاکستانی فوجیوں نے غیر اعلانیہ حملہ کر دیا ہے... لداخ میں کارگل، بٹالک، دراس، مشکوہ، تورتک، زوجیلا، کاکسر، چلڈیال، گھوگھر، ہوتا پال علاقے کی کنٹرول لائن کو توڑ کر پاکستانی فوجیوں نے کئی کئی میل اندر تک اپنے اڈے اور بنکر بنا لیے ہیں۔ ویسے پاکستان کے فوجی افسروں کا کہنا ہے کہ وہ درانداز اسلامی مجاہدین ہیں لیکن اصلیت یہی ہے کہ مجاہدین کے بھیس میں وہ پاکستانی فوجی ہیں۔

— اتنا ہی نہیں سر! نیوز ایڈیٹر نے کہا — پاکستانیوں نے ۱۹۷۲ء کے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ اسی سال دوستی، بھائی چارے اور بیوپار کے لیے کئے گئے 'لاہور اعلانیہ' کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ فوجوں کی موومنٹ تو وزیر اعظم کے لاہور سفر سے بہت پہلے شروع ہو چکی ہے، لیکن دشمن اونچی پہاڑیوں پر قابض ہو چکا ہے، اس لیے اپنی جان مال کا بہت نقصان ہوا ہے...

— تو نجم سیٹھی کو فون ملاؤ۔

— نجم سیٹھی؟

— ہاں، ہاں... نجم سیٹھی، ایڈیٹر فرائیڈے ٹائمس' لاہور پاکستان! منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ لاہور پاکستان میں ہے...

— جی، وہ تو ہے، لیکن... سر... نجم سیٹھی اس میں کیا کریں گے؟

— وہ پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف سے پوچھیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟

— سر! پاکستانی وزیر اعظم اور ان کے وزیر خارجہ نے کہا ہے کہ ہماری فوج کا دراندازوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے... یہ مسئلہ بھارت کا ہے۔

— اگر یہ مان بھی لیا جائے تو بھی وہ آئے تو پاکستان کی سرزمین سے ہیں...

— یہی تو سر! اگر پاکستان لاہور اعلانیہ میں دی گئی دوستی کی شرط سے متفق ہے، تب تو اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ دراندازوں کو اپنے علاقے سے گزر کر بھارت کی سرحدوں میں پہنچنے سے روکے۔

— سر! اگر یہ حملہ جنگ میں بدل گیا، تب تو بڑا نقصان ہوگا!

دونوں ملکوں میں نقصان صرف عوام کا ہوگا... اسی لیے تو میں فوراً نجم سیٹھی صاحب سے بات

کرنا چاہتا ہوں... کیونکہ پاکستان میں ان جیسے دانشمند اور عوام پرست صحافیوں کی آوازیں ہی اس خون خرابے کو روکنے کا ماحول بنا سکتی ہیں...

تب تک دوسرا نیوز ایڈیٹر کارگل میں مارے گئے جوانوں کی فہرست لے آیا۔

— سر! یہ ہے ہمارے اب تک کے شہید سپاہیوں اور ہوائی فوجیوں کی فہرست، جنہوں نے آج کی تاریخ تک اپنی قربانی دی ہے... ناگالینڈ کے سپاہی سے لے کر کورا جستھان، ہریانہ کے جانباز فوجیوں اور ہوا باز شہیدوں کے نام اس میں درج ہیں...

— اردلی! اس نے آواز لگائی۔

— یس سر! محمود نے حاضری دی۔

— ڈکٹیشن لو... لکھو...

محترم وزیر اعظم اور وزیر دفاع!

(۳)

جناب وزیر اعظم اور وزیر دفاع صاحب! آپ دونوں کے نام ہم یہ کھلا خط بہت بھاری دل اور افسوس کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ ہم نے گذشتہ ہفتہ اپنے قارئین کو کارگل کی بھیانک جنگ کی صورت حال کی خبریں اور معلومات دی تھیں جس سے آپ دونوں بے خبر بنے ہوئے تھے۔

ہم نے کہا تھا کہ یہ رویہ خود کشی جیسا ہے اور ملک کے شہریوں کو اطلاع دی تھی کہ کانگریس ملکی، غیر ملکی (سونیا گاندھی کو لے کر) کے مسئلے میں الجھی ہوئی ہے۔ بھاجپا اور اس کی معاون پارٹیاں اپنے ذاتی پروگراموں میں مصروف ہیں۔ کارگزار وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی، جگجیت، گلزار کے کیسٹ 'سرگم' کی رسم اجرا کر رہے ہیں۔ اخبار ورلڈ کپ کی خبروں سے بھرے ہیں... جو اطلاعات ملک کو فوری ملنی چاہیے اس کے سروں کو سنبھالنے والے وزیر اطلاعات و نشریات پرمود مہاجن پرسار بھارتی کو ختم کرنے کی مہم میں مصروف ہیں۔ وزیر خارجہ جسونت سنگھ کارگل سرحد پر چل رہی غیر ملکی گولہ باری سے بے خبر وسط ایشیا کے ملکوں سے دوستانہ تعلقات بنانے میں مصروف ہیں اور ہمارے وزیر دفاع جارج فرنانڈیز یوگوسلاویہ پر ہو رہے ناٹو امریکی حملوں پر بین الاقوامی کانفرنس کر رہے ہیں... کوئی بھی پارٹی، لیڈر یا قومی رہنما ملک کے شمالی سرحد پر چل رہے اس دھماکہ خیز جنگ پر نہ تو فکر ظاہر کر رہا ہے، نہ کوئی بیان دے رہا ہے، جب کہ شمالی سرحد پر کارگل دراس کے علاقے میں پاکستانی توپیں پچھلے پندرہ دنوں سے اپنے بارود کی زبان مسلسل درج کر رہی ہیں۔ دراندازوں کو کنٹرول لائن کے اس

پار کھدیڑنے کا کام تبھی کیا جاسکتا ہے جب ملک کی برسر اقتدار حکومت اپنے سیاسی فیصلے کا اعلان کرے... یہ لاپروائی ہمیں بھاری پڑ سکتی ہے۔

تو وزیر اعظم صاحب، یہ تنبیہ چھپنے کے بعد آپ کے صلاح کار جناب برجیش مشرا جی کا چہرہ اسٹار نیوز میں پہلی بار دکھائی دیا اور باتوں کے علاوہ ان کے بیان میں یہ بھی رواتھا کہ کارگل، دراس، بٹالک علاقوں میں دہشت گرد دراندازوں کی موجودگی کو لے کر سرکاری خفیہ ایجنسی بے عمل تھی۔ اتنا ہی نہیں، مشرا جی نے فوج کی خبر رساں ایجنسی کو بھی اشارتاً ملزم قرار دیا تھا۔

اور اس کے بعد پھر ملک کو اعتماد میں لینے کے لیے 'آفینسو آپریشنس' کے ڈائرکٹر ایر کموڈور سبھاش بھوجوانی اور ''آرمی آپریشنس' کے ڈپٹی ڈائرکٹر بریگیڈیر موہن بھنڈاری کو دہلی میں منعقدہ پریس کانفرنس میں سامنے لایا گیا اور ان سے یہ خبر دلوائی گئی کہ آج صبح پاکستان حمایتی دراندازوں کو ہندوستانی علاقوں سے کھدیڑنے کے لیے کارگل علاقے میں ہوائی حملہ کیا گیا۔ ساتھ ہی ہندوستان نے تنبیہ کی کہ اس کارروائی میں آکر پاکستان نے مداخلت کی تو ہندوستانی فوج 'مناسب جواب' دے گی۔

دونوں فوجی افسروں نے یہ بھی بتایا کہ ہوائی حملے کے نتیجے میں دراندازوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ انھیں حاصل ہونے والی (پاکستان سے) کسی بھی طرح کی (یعنی راشن، گولہ بارود، زخمیوں کے لیے دوائیں وغیرہ) سپلائی روک دی گئی ہے۔ بھاگنے کے ان کے راستے بھی بند کردیے گئے ہیں۔ یہ سب اطلاعات فوج کے خفیہ حوالے سے دی گئیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ۱۶۰ پاکستانی درانداز مار گرائے گئے ہیں۔

تو وزیر اعظم صاحب! یہ تو آپ کے اخلاقی زوال کا عروج ہے کہ جب آپ کی حکومت گرائی گئی تھی تو دوسرے ہی دن آپ ملک کے عوام کو پیغام دینے کے لیے دوردرشن پر موجود تھے، لیکن جب شمالی سرحد پر اسکواڈرن لیڈر اجے کمار آہوجہ مارا گیا، فلائٹ لفٹنٹ نچکیتا اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ٹوٹے ہوئے جہاز سے کودا جب کارگل میں ہی ایئرفورس کا ہیلی کاپٹر خراب ہوا اور چار افراد پائلٹ مارے گئے، ساتھ ہی سرکاری آنکڑا کی معتبریت مشکوک ہونے کے باوجود یہ بتایا گیا ہے کہ ہماری فوج کے ۲۹ جوان مارے گئے ہیں۔ ۱۳۸ زخمی ہیں اور ۱۲ لاپتہ ہیں، جب اس ملک کو اعتماد میں لینے کے لیے اور اس پریشانی دکھ میں شامل ہونے کے لیے آپ کو دوردرشن پر آنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ بے حسی کی انتہا ہے۔

اور— آپ کے یہ وزیر دفاع جارج فرنانڈیز تو اول جلول بیان دینے کے ماہر بن چکے ہیں۔ پوکھرن کے ایٹمی دھماکوں کو مناسب قرار دیتے ہوئے انھوں نے چین کو دشمن نمبر ایک اعلان

کرنے میں دیر نہیں کی تھی اور اپنی خفیہ اطلاعات کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے یہاں تک کہہ ڈالا تھا کہ چین نے ہندوستان کے خلاف تبت میں میزائلیں تعینات کر رکھی ہیں لیکن اس بار ان کی خفیہ ایجنسی پاکستانی دراندازوں کی جانکاری نہیں دے سکی، جو تب سے وہاں پہنچ چکے تھے، جب سے شمالی سرحد کے پہاڑوں کی برف پگھلی ہے...

اور اوپر سے طرہ یہ کہ وزیر دفاع نے اپنے بیہودے اور غیر ذمہ دارانہ بیان میں یہاں تک کہہ ڈالا کہ اس دراندازی میں پاکستان کے وزیر اعظم اور پاکستانی فوج کے خفیہ ایجنسی آئی۔ ایس۔ آئی کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ دراندازی پاکستانی فوج کی کرتوت ہے۔ ہندوستان کے وزیر اعظم کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ایک مضحکہ خیز بیان ہے بلکہ لگتا تو یہ ہے کہ محترم وزیر دفاع کا اوسط شعور اور سمجھ کند ہو چکا ہے۔

اگر واقعی ایسا ہے کہ پاکستان میں انتظامیہ اس کی دیگر ایجنسیوں اور فوج کے درمیان آپسی تال میل نہیں ہے، اگر وہ اپنے فیصلے لینے کے لیے ایک دوسرے سے آزاد ہیں تب تو یہ اور بھی خطرناک صورت حال ہے۔

آج جب کہ دونوں ملک ایٹمی قوت سے مالا مال ہیں، تو کیا ہمارے بیمار دماغ وزیر دفاع ہمیں یہ اشارہ دے رہے ہیں کہ آج اگر ہندو پاک جنگ ہو جاتی ہے (جس کے خلاف دونوں ملکوں کے عوام ہیں) تو اس کا فیصلہ پاکستان کی سرکار کے ہاتھوں میں نہیں، بلکہ پاکستانی فوج کے ہاتھوں میں ہوگا۔ عوام کے ذریعہ دو تہائی ووٹ سے منتخب نواز شریف کی پاکستانی سرکار کے ہاتھوں میں نہیں۔

اتنا بے بنیاد، غیر منطقی، غیر ذمہ دارانہ بیان اور تجزیہ اگر ملک کے وزیر دفاع کی طرف سے سامنے آئے تو دونوں ملکوں کے امن پسند عوام کو اس کا بھگوان یا اللہ ہی بچا سکتا ہے۔ وزیر دفاع کے اس بیان سے پاکستان کے امن پسند جمہوریت پسند عناصر کی بے چارگی ظاہر ہوتی ہے اور ہندوستان کے جمہوریت پسند عناصر کو یہ بیان کنفیوژ کرتا ہے۔ دونوں طرح سے دونوں ملکوں کے جمہوریت پسندوں کا نقصان کرتا ہے۔ شیطانی چالاکی پر مبنی یہ بیان ممکن حد تک سچ کا احساس پیدا کر کے پاکستانی فوج کو ہوّا بناتا ہے اور بغیر کہے یہ کہتا ہے کہ اس کا سامنا اور مقابلہ فوجی طاقت کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ پاکستان کی موجودہ سرکار کا کوئی کنٹرول اپنی فوج پر نہیں ہے۔ سچ کا احساس دیتے ایسے معصوم بیان بات چیت کے راستوں کو غیر اعلانیہ طریقے سے بے مطلب اعلان کرتے ہوئے کٹر پنتھی مڈبھیڑ کرنے والوں کے ہاتھ کا ہتھیار بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا بیان کوئی پاگل وزیر دفاع ہی دے سکتا ہے اور اگر وہ پاگل نہیں ہے تو یقیناً بہت بڑا دھوکے باز ہے۔

اب آپ اتنا تو کیجیے کہ فوج کا ساتھ دیجیے اور فوج کے جو بہادر جوان اور ایئر فورس کے جانباز پائلٹ اپنی جان داؤں پر لگا کر ملک کی حفاظت کے لیے تیار ہیں، انھیں آپ کی لاپروائی کی قیمت اپنی قربانیوں سے نہ چکانی پڑے۔

آپ لوگوں کے پاؤں میں آئی موچ تک کا علاج ملک کے خرچ پر غیر ممالک میں ہوتا ہے جو ۱۴۸ فوجی زخمی ہوئے ہیں، انھیں بدیش بھیجنا تو ممکن نہیں ہوگا، لیکن ملک میں ہی اچھے سے اچھے ہسپتالوں میں ان کے علاج کا انتظام کیجیے۔

بھٹنڈہ میں شہید اسکواڈرن لیڈر اجے آہوجہ کی آخری رسومات ادا کی گئی۔ وہاں تو آپ اور آپ کے وزیر دفاع اظہار افسوس کرنے پہنچ نہیں پائے۔ کیونکہ آپ دونوں ہی بہت مصروف ہیں اور پھر وزیر دفاع تو اس انداز میں کارگل کا دورہ کرنے چلے گئے جیسے کہ وہ فوجی انتظامیہ کے ماہر ہیں۔ انھیں واپس بلائیے اور آپ دونوں کوٹہ (راجستھان) جا کر شہید اجے آہوجہ کے غمگین خاندان کو دلاسہ دیجیے۔ ویسے کسی مشکوک یا مجرم کردار کے نیتا، راج نیتا کے یہاں کوئی موت ہو جاتی ہے تو وہاں اظہار افسوس کرنے کے لیے آپ کی برادری کے لوگ پہنچ ہی جاتے ہیں۔ یہاں تو ایک جانباز سپاہی ملک کے لیے شہید ہوا ہے۔

فلائٹ لفٹننٹ نچکیتا کی بہنیں، ماں باپ اور گھر والے، پچھلی کئی راتوں سے سو نہیں پائے ہیں۔ نچکیتا کو پاکستان سے واپس لا کر اسے اس کے گھر والوں کے حوالے کیجیے اور اپنی سیاسی لاپروائی کی اس بڑی غلطی کے لیے اس کے خاندان سے معافی مانگیے۔

۱۴ لاپتہ جوانوں کا پتہ لگائیے اور آج صبح تک جو ۳۹ جوان شہید ہوئے ہیں ان کے لیے اس ملک سے معافی مانگیے۔

امید ہے کہ آپ ابھی پوری طرح بے حس نہیں ہوئے ہیں۔ اقتدار کی ہوس میں لاپروائی برتنے کا جو بڑا جرم آپ سے ہوا ہے اس کے لیے آپ اتنا تو کر ہی سکتے ہیں۔

—ملک کے غم زدہ وقت میں شامل ایک ادیب اور صحافی۔

(۴)

خط بھیجنے کے بعد ادیب بہت پریشان تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے بیان اور خیالات کہیں ملک کی حفاظت کے نام پر دوسروں کے لیے موت تو پیدا نہیں کرتے۔ کیا ایک کے زندہ رہنے کے لیے دوسرے کی موت ضروری ہے؟

موت!

ساری جنگیں اور جنگِ عظیم یہی تو بتاتی ہیں کہ موت کے اعداد و شمار کی بنیاد پر ہی ہار جیت طے ہو سکتی ہے۔

تم کتنی موت دے سکتے ہو، وہ کتنی موت اٹھا سکتا ہے۔ جب تک دوسرا زندہ رہتا ہے، پہلا نہیں جیتتا۔ موت ہی شکست و فتح کو طے کرتی ہے۔ ہر جنگ و جنگِ عظیم کی یہی تو ہار جیت ہے... پھر وہ چاہے کروکشیتر میں آریوں کے مہابھارت کی جنگ رہی ہو یا آریانا کے ڈریس اور یونانی ملاڈ یاڈس کا میراتھن کے میدان میں ہوئی جنگ۔

ابھی ادیب یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ زمین سے طوفانی شور اٹھنے لگے۔ کالی آندھیاں چلنے لگیں اور سارا آکاش اندھیرے میں ڈوبنے لگا۔ نہ معلوم ایسے میں سورج جیسی حقیقی روشنی بھی کیوں مدھم پڑ جاتی ہے۔

طوفان باد، کالی آندھیاں! جنگل کے صوبوں میں مچا کہرام۔ ادھر اُدھر پریشان سے بھاگتے جنگلی جانور۔ اتنا زیادہ شور و غل و چیخ و پکار۔ ادیب نے دونوں کانوں پر ہتھیلیاں رکھ کر اپنے ذرائع سماعی بند کر لیے اور چیخا— محمود!

کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ پھر چیخا۔ پھر بھی اسے کوئی جواب تو نہیں ملا، لیکن دیکھا سامنے سے گرتا پڑتا، ہانپتا محمود چلا آ رہا ہے۔

— کہاں تھے تم؟

— حضور... میں پچھلی صدیوں میں چلا گیا تھا۔

— پچھلی صدیوں میں... کیوں؟

— میں اپنے اسلاف سے ملنے گیا تھا۔

— اسلاف سے! ادیب نے حیرانی سے پوچھا۔

حضور اعلیٰ! آپ کو اتنا تعجب کیوں ہو رہا ہے... ہمارا مذہب سب سے نیا ہے، ہم نے اسے سب سے بہتر پایا۔ تبھی تو ہم پرانے مذاہب کو چھوڑ کر اسلام میں آئے ہیں... اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارے اسلاف نہیں ہیں۔ وہ چاہے جیسے بھی رہے ہوں... ناپاک یا پاک، لیکن ہیں تو ہمارے اسلاف ہی۔

— یہ بحث اس وقت چھوڑو... سب سے پہلے یہ معلوم کرو کہ کالی آندھیاں کیوں چل رہی ہیں... یہ جنگلی جانور پریشان ہو کر کیوں بھاگ رہے ہیں؟ یہ ہاہاکار کیوں ہو رہا ہے؟

— شاید اس کی وجہ شمبوک کا قتل ہوگا۔

— شمبوک؟

— ہاں حضور! میں خود اپنے بزرگ راجہ رام چندر کو دیکھ کر آیا ہوں... جب جب اس سرزمین پر مذہب کا نقصان ہوتا ہے، تب تب یہ کالی آندھیاں چلتی ہیں... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے... صبح کا وقت تھا حضور... ایودھیا کا قومی محل وید منتروں کی مقدس آوازوں سے گونج رہا تھا۔ ایودھیا کے راجہ رام چندر اشومیدھ یگیہ کا اعلان کرنے محل سے ابھی باہر آئے ہی تھے کہ یگیہ کے اعلان سے پہلے انہوں نے ایک برہمن کی دردانگیز روتی ہوئی آواز سنی... وہ حیران رہ گئے۔ ہمارے رام راج میں یہ دردانگیز رونا کیسا اور کیوں؟

ایک وزیر نے آگے بڑھ کر روتے ہوئے برہمن کو ان کے سامنے کر دیا— مہاراجادھیراج! یہ برہمن ہی رونے کی وجہ بتا سکتا ہے...

وہ برہمن اپنے بیٹے کے مردہ جسم کو چھاتی سے لگائے راجہ رام چندر کو کوسنے لگا— ایودھیا پتی رام! باپ کے سامنے بیٹے کی موت! یہ کیسا رام راج ہے تمہارا؟ تم قاتل ہو میرے بیٹے کے، تم!

— تبھی حضور اعلیٰ! لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ یہ تو سراسر گناہ ہے۔ برہمن کا بیٹا مر جائے اور چھتری راجہ کچھ نہ کر سکے، یہ تو بدشگنی کی علامت ہے۔

— ست جگ میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کی کوئی وجہ ہونی چاہیے...

— وجہ میں بتاتا ہوں۔ تبھی نارد جی نے ہمیشہ کی طرح حاضر ہو کر راجہ رام چندر جی کو بتایا— مہاراجہ دھیرج رام! دھرم شاستروں کے مطالعے، تپ اور ریاضت سے نجات حاصل کرنے کا حق صرف برہمن، چھتری اور ویش ورنوں کو ہے لیکن بھگوان! آپ کے رام راج میں ایک مہاپاپ کا حادثہ واقع ہوا۔ اس کی وجہ ہے شودر ونش کا شمبوک جو اپنے داس دھرم (پسماندگی) کو چھوڑ کر نجات کے لیے عبادت کر رہا ہے... اس مہاپاپ کی وجہ سے ہی برہمن کے بیٹے کی موت ہوئی ہے مہاراج! نارد جی نے اطلاع دی۔ بس پھر کیا تھا ادیب عالی! راجہ رام چندر جی نے چھتری مذہب کا استعمال کیا اور برہمن مذہب کی حفاظت کے لیے شودر شمبوک جیسے رشی اور عبادت گزار کی گردن کاٹ کر جسم سے الگ کر دی۔ یہ طوفان اور کالی آندھیاں رام راج کے اسی خطرناک جرم اور گناہ کی وجہ سے چل رہی ہیں۔

— تم کس دور کی بات کر رہے ہو محمود؟

— حضور! یہ ست جگ کی بات ہے... میں اسی عہد کے درمیان سے ابھی لوٹا ہوں۔ لوٹتے

وقت ویدک عہد بھی راستے میں مل گیا... وہ اپنا سر پیٹ رہا تھا۔

— کیوں، ایسی کیا بات تھی؟

— حضور! ہر دور اپنے برے اعمال پر پچھتاتا ہے... یہی کچھ وہاں ہو رہا تھا تاکہ اگلی صدیاں خود کو گناہ سے بچا سکیں۔

— ہاں محمود... شاید پشیمانی کا حوصلہ رکھنے والی تہذیبیں ہی زندہ رہتی ہیں... اور وہ زندہ تہذیبیں ہی تمدن کی شکل میں قائم ہو پاتی ہیں۔ عمل اور برے عمل کے پیمانے قائم کر لینا معمولی بات نہیں ہے... ادیب نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ پھر پوچھا— تو تم جب لوٹ رہے تھے تب ویدک دور اپنا سر کیوں پیٹ رہا تھا؟

— حضور! وہ محویت اور عیاشی و زنا کی داستان ہے... رشی گوتم کی بیوی اہلیا بے حد خوبصورت ہے۔ اپسرائیں بھی اس کے سامنے کچھ نہیں ہیں۔ ویدک دیوتا اندر اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس نے رشی گوتم کا بھیس بدلا، چوکسی کے لیے اس نے چندرما کو ساتھ لیا۔ اسے آشرم کے دروازے پر تعینات کیا اور... اور رشی کی بیوی اہلیا کے ساتھ تب اندر نے مجامعت کی...

ادیب نے کچھ لمحہ سوچا... پھر وہ غصہ سے بھر گیا۔

— کہاں ہے وہ زانی اندر! اسے میرے سامنے حاضر کرو! ادیب چیخا۔

— حضور! آپ کوئی عدالت تو نہیں کہ آپ اندر پر زنا کا مقدمہ چلا سکیں۔

— مت بھولو محمود! کسی بھی دور کے ظلم و جبر کے خلاف کھڑا ہونے والا کوئی نہ کوئی ادیب ہمیشہ ایک اخلاقی عدالت بن کر موجود رہتا ہے۔

— لیکن حضور! رشی گوتم تینوں کو سزائیں سنا چکے ہیں... اندر کو انہوں نے شراپ دیا ہے۔ اے بداعمال اندر!... تیری تنزلی ہوگی! جس محویت کی وجہ سے تو نے میری بیوی اہلیا کے ساتھ زنا کیا ہے، ایسے ہزاروں گناہ تیرے جسم میں ظاہر ہو کر تجھے تاعمر شرمسار کرتے رہیں گے...

— اور چندرما کو کیا سزا ملی؟

— رشی گوتم نے اسے بددعا دی ہے کہ تیرے جسم پر ہرن کے چمڑے کے داغ ہمیشہ بنے رہیں گے... تجھے تپ دق ہوگا۔ مہینے میں صرف ایک دن تجھے تکلیف حاصل ہوگی، باقی دنوں میں تو ایک بیمار کے طور پر گھٹتا بڑھتا مرجھایا ہوا رہے گا! پھر رشی گوتم نے اپنی بیوی اہلیا کو دیکھا اور بددعا دی...

— لیکن اہلیا کو کیوں؟ ادیب نے ٹوکا۔

وہ اس لیے حضور کہ عیاش آریوں نے عورت کو ہمیشہ مرد کی جائیداد مانا ہے... اپنی بیوی اہلیا کو

دیکھتے ہی وہ بھڑک اٹھے — تو کیسی شوہر پرست بیوی ہے... تجھے کسی کی عیاری کا پتہ نہیں چلا... تو غیر مرد اور اپنے شوہر کا فرق نہیں جان پائی! حسن پر غرور کرنے والی بے رحم! جا... پتھر کی سل بن جا! اہلیا نے بےقصور ہونے کی بات کہہ کر کئی بار معافی مانگی، تب رشی گوتم نے رحم کر اتنا ہی کہا کر ٹھیک ہے۔

ایک کلپ (۴ ارب ۳۲ کروڑ سال کی مدت) کے بعد تریتا یگ میں جب وشنو کی شکل میں رام کا اوتار ہوگا اور ان کے قدم تیرے پتھر جسم پر پڑیں گے، تبھی تیری نجات ہوگی!

— یہ تو انصاف نہیں ہے... ان برہموں نے اپنے مزدوروں کو شودر تو بنایا ہی، انہوں نے عورت کو بھی سزا دے کر شودرا کے درجہ میں ڈال دیا۔

— اسی لیے تو میں کہتا ہوں حضور کہ جب ناانصافی، ظلم اور بداخلاقی ہوتی ہے، تب تب انسان کے شعور اور روح کو یہ قیامت خیز طوفان جھنجھوڑتے ہیں اور کالی آندھیاں چلتی ہیں...

— لیکن آج تو وہ دور نہیں... پھر بھی یہ قیامت خیز طوفان! یہ کالی آندھیاں... شکارگاہوں میں بے چین سے بھاگتے جنگلی جانور... یہ کہرام... شور...

— حضور! یہ سب کچھ تباہ کر دینے والی مہابھارت کی جنگ کا شور ہے۔ ہستناپور سے کورو افواج کروکشیتر کے میدان جنگ کے لیے کوچ کر چکی ہیں۔ جمنا کو پار کر کے شمال مغرب میں کوروؤں کی گیارہ اکشے ہنی افواج اپنی قلعہ بندی کر رہی ہیں... اور ادھر دکن مشرق سے متسیہ پردیش، الور، ویراٹ اور جند کے علاقوں سے آگے بڑھ کر پانڈوؤں کی سات اکشے ہنی فوج خیمہ زن ہو چکی ہیں...

— محمود! مجھے اس تباہ کرنے والی جنگ عظیم کی تفصیل چاہیے۔

ٹھیک اٹھارہ دن بعد محمود لوٹا۔ اس نے رپورٹ پیش کی — حضور! کورو ہار گئے ہیں... ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچا ہے... کوروؤں کے پہلے سپہ سالار بھیشم پتامہ تھے۔ پہلے دن کوروؤں کی جیت ہوئی۔ پانڈوؤں کا طاقت ور سپاہی ویراٹ ولد اتم کمار مارا گیا۔ تیسرے دن ارجن نے کوروؤں کے ماہرین — بھیشم، درون، اشوتھاما، چترسین، شترو دمن، بے درتھ، کرپ، بھوری شرواشل اور شلیہ پر کامیابی حاصل کی... کورو ناامید ہو گئے۔ تیسرے دن...

ادیب نے ٹوکا — مجھے ہر دن کی تفصیل نہیں چاہیے... صرف یہ بتاؤ کہ کل کتنے بہادر اور فوجی مارے گئے ہیں!

— اس کا حساب تو میں نے نہیں رکھا حضور... لیکن شاید یم راج بتا سکیں یا مہاراج چترگپت... جو ہر پل مرنے والوں کا حساب رکھتے ہیں!

— یم راج سے تو میں کبھی ملنا چاہوں گا... لیکن مہاراج چترگپت سے لو... وہ اپنا رجسٹر لے کر فوراً حاضر ہوں!

چترگپت جی کو آنے میں دیر نہیں لگی۔ بےحد وزنی ہونے کی وجہ سے وہ رجسٹر اور فائلیں تو نہیں لا سکے تھے، لیکن ان کے پاس ایک عجیب چھوٹی سی مشین تھی... اس میں سب کچھ درج تھا اور وہ پلک جھپکتے ہی بڑی سے بڑی تعداد کا جوڑ یا ضرب حاصل بتا سکتے تھے۔

— مہابھارت کی جنگ میں مرنے والوں کی تعداد کتنی تھی؟ ادیب نے پوچھا۔

— لاتعداد اور ان میں سے پانچ پانڈوؤں اور شری کرشن کے علاوہ کوئی زندہ نہیں بچا ہے۔ چترگپت بولے، ان مرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اسے بیان کرنے میں بہت وقت ضائع ہوگا... بس اتنا جان لیجیے کہ دونوں طرف سے کل اٹھارہ اکشے ہنی فوجیں جنگ میں اتری تھیں اور ایک ایک اکشے ہنی فوج میں ایک لاکھ نو ہزار پچاس پیدل سپاہی، اکیس ہزار ہاتھی اور پینسٹھ ہزار چھ سو دس گھوڑے ہوتے ہیں یعنی اتنے ہی بہادر اور ان میں اٹھارہ سے ضرب کر دیجیے تو... چترگپت نے اپنی مشین کی طرف دیکھا۔

— رہنے دیجیے — رہنے دیجیے! ادیب بولا، موت کی اتنی تعداد کی بات سوچ کر ہی میرے ہوش اڑے جا رہے ہیں... مجھے چکر آ رہے ہیں... کہتے ہوئے ادیب سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیں۔ دونوں ہتھیلیاں گیلی ہو گئیں... مہاراج چترگپت کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ روپوش ہو گئے...

جھکڑ، کالی آندھیاں پھر چلنے لگیں۔ جنگل کے صوبوں میں کہرام مچلنے لگا۔ تبھی ایک لاغر اندام بزرگ ادیب کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ادیب نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ بےجان لاغر اندام بزرگ نے اسے دیکھا۔

— آپ! آپ کون ہیں؟ ادیب نے پوچھا۔

— میں تمہاری ہی طرح ایک عام آدمی ہوں... تم لکھتے ہو، میں لکھتا نہیں، لیکن میں بھی اسی طرح کا کام کرتا ہوں... اس بزرگ نے شانت آواز میں کہا۔

— کیسا کام...؟

— میں ایک تجربہ گاہ ہوں۔ میں ہر محروم، استحصال زدہ، عذاب کا شکار اور موت کے شکار انسانوں کے آنسو جمع کرتا ہوں...

— تو آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

— تمہارے آنسو! بزرگ نے کہا۔

— میرے آنسو!

— ہاں، انسان کے آنسوؤں سے پاک کچھ بھی اس دنیا میں نہیں ہے ادیب! میں انہیں پاک آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر لے جاتا ہوں... میں ان آنسوؤں کا مطالعہ کرتا ہوں... ان کی حدت، دکھ، درد اور عذاب کی حرارت کی پہچان کرتا ہوں...

— آپ تو بہت حیران کن تجربہ کر رہے ہیں بابا... اس سے کوئی نتیجہ بھی نکالا ہے آپ نے؟

— ہاں، لیکن میرے نتائج پر کوئی دھیان نہیں دیتا... نہ دکھ ختم ہوتا ہے، نہ دکھوں اور غیر مساوات کی وجوہات... میری بات کوئی سنتا ہی نہیں... بس... میں آنسوؤں کو جمع کرتا جاتا ہوں...

— کہاں؟

— آنسوؤں کے سمندر میں...

ادیب کچھ چونکا۔

— صدیوں سے میں یہی کر رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں... صدیوں انسان قدرت کا استحصال کرتا رہا۔ قدرت بانجھ ہوگئی تو انسان ہی انسان کا استحصال کرنے لگا... اس لیے اب آنسوؤں کا سیلاب آگیا ہے... کیونکہ انسان نے انسان کے خلاف اب مشین ایجاد کرلی ہے...

ادیب نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

— دیکھو ادیب! کائنات کی غیر مجسم قوت نے کمزور ہوگئے جسم سے روح کی فطری نجات کے لیے ایک عام قانون بنایا تھا، لیکن جب سے انسان نے موت ایجاد کی ہے تب سے جنگوں میں غیر فطری اموات ہونے لگی ہیں... قتل و غارت ہونے لگے ہیں... میں کچھ نہیں کر پاتا... بے بس ہوں... اس لیے ادیب! ہر غیر فطری موت کے ساتھ میں مرتا ہوں... میں ایک ہی وقت میں ہزاروں موتیں قبول کرتا ہوں... میں کروکشیتر کے میدانِ جنگ میں لاکھوں، کروڑوں بار مرا ہوں... میں میراتھن کے جنگ میں بھی بار بار مرا ہوں اور آبیلا کے جنگ میں بھی... اس کے بعد جہلم، کینے، سومناتھ، ترائن، کریمی، پانی پت جیسی سیکڑوں جنگوں میں میں ہی مرتا رہا ہوں... میں کروڑوں پدم اور نیل کی تعداد میں بار بار اور ہر بار مرتا رہا ہوں... کیونکہ انسان کے قاتل انسان نے ایک غیر فطری موت کی تخلیق کرلی ہے...

— تو اس غیر ضروری موت کا کفارہ کیسے ادا ہوگا بابا؟

— میں موت کے بدلے زندگی تلاش کر رہا ہوں ادیب۔ اور اسی تلاش کے لیے مجھے تمہارے آنسوؤں کی ضرورت ہے۔ آنسو ہی زندگی کو زندہ رکھ سکتے ہیں... کہتے ہوئے اس لاغر اندام بزرگ نے ادیب کی آنکھوں کے آنسو نچوڑ لیے اور بولا، ان آنسوؤں کا میں مطالعہ کروں گا... نتیجہ نکالوں گا اور انہیں اپنے پاس رکھ لوں گا... جانتا ہوں میری بات کوئی سنے گا نہیں... بس، کوئی روئے گا تو اس کے آنسو لینے چلا جاؤں گا، نہیں تو میں آنسوؤں کے اسی سمندر کے کنارے بیٹھا رہوں گا اور سنتا رہوں گا کہ کون رویا ہے... اسی سے مجھے پتہ چلتا رہے گا کہ کون غیر فطری موت سے مارا گیا ہے...

— تب تو اس بے سود اور غیر ضروری موت سے نجات پانے کے لیے زندگی کی بامعنی تلاش میں کسی کو نکلنا ہی پڑے گا۔

— اس تلاش کے لیے سمتی تہذیب کا جل جامیش نکل چکا ہے... اس نے اعلان کیا ہے— میں درد سے لڑوں گا، عذاب برداشت کروں گا... کچھ بھی ہو میں موت کو شکست دوں گا!



اور تبھی یوروک کے شہنشاہ جل جامیش نے اعلان کیا—

— میں درد سے لڑوں گا... عذاب برداشت کروں گا... کچھ بھی ہو میں موت کو شکست دوں گا... میں موت سے نجات کی دوا ڈھونڈ کر لاؤں گا...

شہنشاہ جل جامیش کی یہ بردبار اور سنجیدہ آواز کائنات میں گونجنے لگی۔ تبھی لونیا، میسوپوٹامیا، سمیری اور وادیٔ سندھ کی تہذیب کے دیوتا کانپنے لگے۔ یوروک کی وہ عظیم دیوار تھرتھرانے لگی جسے خود زمین کے شہنشاہ جل جامیش نے دیوتاؤں کے لیے بنوائی تھی۔ وہ مندر بھی کانپنے لگے جن میں اس نے دیوی اینا کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ایشور انو اور اعلیٰ دیوی اشتر کی مورتیاں نصب کی تھیں۔

شہنشاہ جل جامیش نے دوبارہ اعلان کیا—

میں درد سے لڑوں گا... عذاب برداشت کروں گا... کچھ بھی ہو میں موت کو شکست دوں گا...

میں موت سے نجات کی دوا کھوج کر لاؤں گا۔

شہنشاہ جل جامیش کا اعلان سن کر ہر تہذیب کے دیوتاؤں کی دنیا میں افراتفری مچ گئی۔ سمیری تہذیب کا بے حد عیاش دیوتا نو بک چیخنے لگا—

— سنا آپ سب نے سمراٹ جل جامیش کا اعلان! وہ موت سے نجات کی دوا کھوجنا چاہتا ہے!

— غلطی ہماری ہے! سمیری تہذیب کے دوسرے دیوتا زیوں نے اونچی آواز میں کہا— جب

عظیم قوت نے زندگی کو پیدا کر کے زندگی کی لالچ، سکھ کا بے روک حق اور آگہی کی طاقت دی تھی، تب ہم نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی! یہی بنیادی غلطی ہم نے کی تھی!

—تو عظیم قوت سے ہمیں پوچھنا چاہیے کہ انسان اگر ہم دیوتاؤں کی طرح جاودانی حاصل کرلے گا تو کائنات کا کیا ہوگا؟ تب تو یہ فنا اور برباد ہو جائے گی۔ انسان گناہ اور سکھ وعیاشی کی داستا میں شامل ہو کر بے لگام ہو چکا ہے۔ انسان کی کائنات میں سب کچھ ناجائز ہے... اگر وہ موت کو جیت کر ہماری کائنات میں آبسا تو ہماری یہ جنت جیسی خوبصورت دنیا آلودہ ہو جائے گی... تبھی لونیا کا ڈرا ہوا دیوتا ہیولوتس دیگر تہذیب کے دیوتاؤں کو آگاہ کرنے لگا اور کہنے لگا—

—عظیم قوت سے ہم دیوتاؤں کو اس کا جواب مانگنا چاہیے! اور سنو— سندھو تہذیب کے سب سے طاقتور آریہ دیوتا اِندر کا فوراً پتہ کرو اور اُن سے کہو کہ وہ عظیم قوت سے جواب لے کر آئیں!

تبھی دیوتاؤں کی اس صحبت میں تین پیغامبر حاضر ہوئے۔ ایک پیغامبر نے اپنی رپورٹ اور خفیہ معلومات پیش کیں—

—جناب! اُیوروک کا شہنشاہ جل جامیش بے حد بدکردار انسان ہے... وہ بے حد عیاش ہے۔ وہ عالم فتح کرنے نکلا تو کوئی بہادر اس سے لوہا نہیں لے پایا۔ فتح کے اس سفر میں اس نے ہزاروں کنواری لڑکیوں کی بے حرمتی کی۔ شکست خوردہ فوجیوں کی بیویوں اور عورتوں سے اس نے ہم بستری کی... وہ داستا میں مبتلا بے حد عیاش شہنشاہ بے جواب یکبارگی پاک روح بن کر موت سے نجات کی دوا حاصل کرنے کا ناٹک کر رہا ہے...

تینوں تہذیبوں کے دیوتاؤں نے یہ بیان سن کر دوسرے پیغامبر کی طرف دیکھا تو ہیولوتس نے کہا—

—لیکن جل جامیش کچھ بھی کر سکتا ہے... اسی لیے میں کہتا ہوں ان آریہ قبیلوں کا پتہ کرو جو اپنے دیوتاؤں کے ساتھ نہ جانے کن سمتوں کی طرف چلے گئے ہیں... کیونکہ جل جامیش کو آریہ دیوتا اِندر ہی شکست دے سکتے ہیں!

—جناب! آریوں کے وہ قبیلے جو ہزاروں صدیوں پہلے کروشیا کے وندیجا علاقے سے چلے تھے، ان میں سے کچھ تھک کر روس کے جنوب میں گھاس کے میدانوں میں رک گئے تھے۔ جن قبیلوں کا ساتھ قدرت نے نہیں دیا، وہ مصر کی طرف نکل گئے، لیکن آریوں کے بڑے بڑے قبیلوں کو مشرق کا سورج زیادہ مسحور کر رہا تھا۔ انہوں نے سورج کی سمت، مشرق کی طرف بڑھنا ہی پسند کیا۔

تاریکی کے بعد طلوع ہو کر مشرق کا سورج انہیں پکارتا تھا... اس لیے وہ آریہ قبیلے فرات اور دجلہ ندیوں سے ہوتے ہوئے، اس پار جا کر تبریز اور تہران کے راستے وادیٔ سندھ کی طرف بڑھ گئے۔

—اس کا مطلب ہے کہ آریہ کئی قبیلوں میں بٹ گئے ہیں...

—ہاں جناب! آریہ قبیلوں کا دوسرا کارواں مشہد کے علاقے کو چھوڑتا ہوا ہرات اور بلخ کے راستے بولن درّے سے صوبہ سندھ میں داخل ہوا تھا۔ آریوں کا تیسرا کارواں جو خیبر درّے کو پار کر کے وادیٔ سندھ میں داخل ہوا وہ موہن جوداڑو اور ہڑپا کے علاقے میں بس گیا ہے... شاید انہیں آریوں کا راجہ ہے اِندر اور وہ بھی شہنشاہ جل جامیش کی طرح بے حد عیاش ہے...

—ہمیں اس کی عیاشی سے لینا دینا نہیں ہے! ہمیں تو اس عظیم قوت سے سوال کرنا ہوگا کہ اس نے انسان کو عرفان کی طاقت کیوں دی ہے؟

اور تب اس سوال کے جواب میں سپت سندھو کی آریہ تہذیب سے اِندر کا جواب گونجتا ہوا آیا تھا—

سنو! وہ عظیم قوت خاموش ہے... وہ شکستہ ایٹم کی بنیادی شکل ہے۔ وہی کائنات کا اصل جوہر ہے۔ کائنات اسی کی توانائی سے بنتی، اسی میں شامل رہتی ہے اور اسی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ وہ آغاز وانجام سے پرے ہے۔ لامحدود اور ناقابل پیمائش ہے، ناواقف اور ناقابل فہم ہے، انوکھا ہے۔ روحانی اور غیر روحانی ہے۔ دائمی ہے، جاوداں اور ابدی ہے۔ نور کا انبار ہے۔ کائنات کے ہزاروں سورج سے زیادہ جلالی! شے اسی میں پیدا ہوتی اور اسی میں تحلیل ہوتی ہے۔ جو کچھ زمین عالم اور خلا میں قائم ہے، وہ سب وہی ہے۔ اس سے پرے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی ہے حس، توانائی یا ابتدائی جوہر کی روحانی طاقت! ہم نے ہماری تہذیب نے اسے برہم پکارا ہے۔ برہم ہے یہ طے ہے، لیکن وہ کیا ہے، یہ غیر یقینی ہے... وہ شکل وشبیہ سے پرے ہے۔ وہ ناقابل تشریح، لاثانی، ناقابل فہم اور احدیت ہے! وہ سوالوں سے ماورا ہے...

سندھو تہذیب کا یہ پیغام پا کر دیوتاؤں کے ہجوم میں خاموشی اور مایوسی چھا گئی۔ وہ جانتے تھے کہ برہم شکتی یا ابتدائی ایٹمی طاقت کو لے کر جتنے قریبی اور الوہی تحقیقات سندھو تہذیب نے کیے ہیں، اتنے کسی دیگر تہذیب نے نہیں۔ ان روحانی طاقتوں سے متعلق اس فلسفیانہ تشریح کی نفی مشکل تھی۔ دیوتاؤں کی محفل میں خاموشی چھا گئی۔

سب کے سامنے ایک ہی سوال تھا— سمیری تہذیب کے عظیم شہنشاہ جل جامیش کو آخر کون روکے گا؟ کون؟

تبھی سمیر کے پہاڑوں سے نکل کر عظیم طاقتور انو حاضر ہوا۔ فکر مند دیوتاؤں کو اس نے ڈھارس بندھائی۔

—دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے... حالانکہ سمراٹ جل جامیش نے یوروک میں اینا کا مندر بنوا کر اس میں میری اور جنگ کی دیوی اشتر کی عظیم مورتیاں نصب کی ہیں، لیکن جب اس نے اپنے گناہ، بدکرداری اور ظلم سے تباہی مچا دی، لوگوں کے رونے کی دردناک آواز جب مجھے سنائی دی تو میں نے اس غیر معمولی اور سمراٹ جل جامیش کو ختم کر دینے یا معمولی کر دینے کا پروگرام بنایا۔ میں نے آسمان کے بیٹے انکیدو کو انسانی پیدائش دے کر زمین پر بھیجا...

انکیدو ایک دم جنگلی، جانوروں کی طرح بے رحم تھا۔ اس کے جسم پر جنگلی جانوروں کی طرح بال تھے۔ وہ جنگلی جانوروں کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ انہیں کی طرح کچا گوشت کھاتا تھا اور ضرورت پڑنے پر گھاس بھی کھا لیتا تھا۔

ایک دن ایک شکاری جنگل میں شکار کے لیے پہنچا۔ وہاں یکبارگی اس نے انکیدو کو دیکھا تو خوف زدہ ہو گیا جو کچھ بھی شکار اس کے ہاتھ لگا تھا، اسے اٹھا کر وہ گھر کی طرف بھاگا۔ اس کے منہ سے بول نہیں پھوٹ رہے تھے۔ کانپتے ہکلاتے اس نے اپنے پتا کو بتایا—

—جنگل میں میں نے ایک بھیانک اور عجیب انسان کو دیکھا ہے۔ وہ جنگلی جانوروں کے ساتھ رہتا ہے۔ انہیں کی طرح گھاس پات کھاتا ہے، لیکن اسے دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ وہ مبعوث مرد ہے!

—میرے بیٹے! پتا نے کہا— تم فوراً یوروک جاؤ اور شہنشاہ جل جامیش کو مطلع کرو۔ اسے یقیناً دیوتاؤں نے زمین پر بھیجا ہوگا کیونکہ دیوتا لوگ ہمارے شہنشاہ جل جامیش سے خوف زدہ ہیں... شہنشاہ جل جامیش کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہمارے شہنشاہ بہت چالاک، ذہین اور طاقتور ہیں۔ انہیں دنیا کے بے شمار راز معلوم ہیں... شہنشاہ جانتے ہیں کہ یہ دیوتا لوگ کاہل اور ناکارے ہیں۔ یہ متوسل ہیں جو عوام اور اعلیٰ اقتدار کے درمیان نصب ہو گئے ہیں... وہ ہمارے شہنشاہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں... تم فوراً اس عجیب مبعوث جنگلی مرد کی اطلاع شہنشاہ کو دو اور سنو، اس جنگلی مبعوث مرد کو بس میں کرنے کے لیے تم اینا کے پریم مندر کی سب سے خوبصورت دیوداسی کو لے کر جنگل میں جاؤ۔ دیر مت کرو... جاؤ...

وہ شکاری یوروک کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے ساری اطلاع شہنشاہ جل جامیش کو دی، تو شہنشاہ نے کہا—

—یہ یقیناً میرے خلاف دیوتاؤں کی سازش ہے... تمہارے پتا نے ٹھیک کہا ہے۔ تم اینا کے پریم مندر کی سب سے خوبصورت دیوداسی روتا کو لے کر جنگل میں جاؤ۔ میں نے ان دیوتاؤں کی طرز زندگی دیکھی ہے۔ یہ لوگ عورت کے لیے فوراً فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی واسنا جاگ پڑتی ہے اور یہ اپنی ریاضت، مقصد کو بھول جاتے ہیں۔ یقیناً میرا وہ دشمن بھی عورت کی خوبصورتی سے فریفتہ ہو جائے گا تب جنگلی جانور اسے اپنے سماج میں رکھنے سے انکار کر دیں گے۔ سپت سندھو کی آریہ تہذیب بھی اپنے دیوتاؤں کو بس میں رکھنے کے لیے اپسراؤں کا استعمال کرتی ہے۔ تم فوراً بے حد خوبصورت دیوداسی روتا کو لے کر جنگل میں جاؤ اور اس مبعوث جنگلی آدمی کو اس عورت کا غلام بنا دو...

حکم پا کر وہ شکاری اس بے حد خوبصورت دیوداسی روتا کو لے کر جنگل میں پہنچا اور ایک جھیل کے کنارے انکیدو کا انتظار کرنے لگا۔ تین دن بعد جنگلی جانوروں کا ایک جھنڈ اس جھیل کے کنارے آیا۔ اس جھنڈ میں انکیدو بھی تھا۔ شکاری اسے دیکھ کر خوف زدہ بھی ہوا اور خوش بھی۔ اس نے دیوداسی کو بتایا—

—یہی ہے وہ! اب تم اپنے استنوں کے استر کو ہٹا دو... شرماؤ نہیں، دیر مت کرو۔ تمہیں برہنہ دیکھ کر وہ تمہاری طرف کھچا چلا آئے گا اور تب تم اسے اپنے قابو میں کر لینا...

دیوداسی روتا نے اپنے آپ کو برہنہ کیا اور بالآخر اس نے انکیدو کو متوجہ کر لیا۔ دیوتا انو نے کہانی روک کر بتایا— حیران کن بات یہ تھی کہ لطف مباشرت کے بعد بھی انکیدو اس دیوداسی سے الگ نہیں ہوا... وہ اسے اپنی گداز بانہوں میں لے کر طرح طرح سے دیکھتا رہا تھا۔ نہ معلوم وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں کیا تلاش کرتے رہے... مجھے تو لگتا ہے کہ یہ محبت کا جذبہ تھا جو انسان نے عورت میں تلاش لی ہے... میرا ماتھا تبھی ٹھنکا تھا۔ انکیدو محبت کی اس محویت میں یہ بھی بھول گیا کہ وہ انسان کی شکل میں آکاش دیوتا کا بیٹا ہے... میں اسے یہ کیسے یاد دلاتا۔ میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

انکیدو اور دیوداسی چھ دن اور سات راتوں تک ساتھ ساتھ رہے، تب ایک دن دیوداسی نے کہا—

—تم کتنے چالاک اور ذہین ہو انکیدو... تم اوتار پرش ہو، لیکن میں تمہیں ایک عام انسان کی شکل میں زیادہ پسند کروں گی۔ ان جنگلی جانوروں کا ساتھ چھوڑ دو اور چلو میرے ساتھ۔ میں تمہیں یوروک کی عظیم دیوار اور عظیم مندر دکھاؤں گی۔ وہاں انو اور اشتر قیام کرتے ہیں۔ وہاں شہنشاہ جل جامیش ہیں... وہ بے حد طاقتور ہیں... وہ ہم جیسے انسانوں کی تخلیق کر رہے ہیں۔ آخر دیوداسی روتا نے انکیدو کو عام انسان کی طرح بنا لیا۔ اس کے جنگلی جانوروں کے بال کو صاف کیا۔ اپنے کپڑوں کا ایک حصہ دیا۔ دودھ پینا اور کند مول کھانا سکھایا اور اسے لے کر یوروک کے لیے روانہ ہو گئی۔

جب دیوداسی روما انکیدو کو لے کر شہر میں داخل ہوئی تو اسے دیکھنے کے لیے بے پناہ ہجوم امڈ پڑا۔ عظیم دیوار کے دروازے پر انکیدو کا سامنا جل جامیش سے ہوا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو جلتی آنکھوں سے دیکھا۔ انکیدو کے نتھنوں سے زوروں کی گھر گھراہٹ نکلنے لگی۔ جل جامیش بھی بجاروں کی طرح ڈکارا اور دونوں ایک دوسرے سے سانڈوں کی طرح بھڑ گئے۔ دھرتی دھمکنے لگی... مندر کے دروازے ٹوٹ گئے...

انو نے آگے بتایا—

—میں ان دونوں کی زبردست نورا کشتی دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ انکیدو فاتح ہوگا، لیکن حیرانی کی بات کہ جل جامیش نے انکیدو کو ایسا دبوچا کہ وہ چھٹپٹانے لگا۔ اس نے انکیدو کے گھٹنوں کو مروڑا اور اسے اٹھا کر ہوا میں پھینک دیا... کافی دیر تک انکیدو ہوا میں سوکھے پتے کی طرح چکراتا رہا، پھر جب وہ دھرتی پر گرنے لگا تو اسے جل جامیش نے اپنی بانہوں میں سنبھالا اور سامنے کھڑا کرلیا اور پوچھا— بتا میری تباہی کے لیے تجھے کس نے بھیجا ہے؟

ابھی انکیدو انسان کی ریاکاری اور چالاکی سے دور تھا۔ اس نے میرا نام لے دیا۔ جل جامیش بھڑک اٹھا۔ اس نے میرے لیے کچھ سخت بدکلامی کی۔ وہ چیخنے لگا— تو دیوتا انو نے تمہیں میری تباہی کے لیے بھیجا ہے! وہی دیوتا انو، جس کے لیے میں نے عظیم دیوار اور مندر بنوایا تھا! جسے میں نے عقیدت سے دیوتا کا عہدہ دیا تھا! جس کے لیے میں نے اپنی ساری رعایا سے کہا تھا کہ اس کی پوجا کرو! مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ دیوتا انو اتنا احسان فراموش نکلے گا! وہ یہ بھول گیا کہ سارے دیوتاؤں کا وجود فقط مجھ جیسے انسان کی وجہ سے ہے!

یہ سن کر سارے دیوتا غصے میں آگئے۔ وہنن تو بھڑک ہی اٹھا— تو شہنشاہ جل جامیش اتنا مغرور ہوگیا ہے! اس کے اس غرور کو توڑنا ہی ہوگا!

—یہ اب ناممکن ہے، کیونکہ شاندار دیوار کے پاس ہوئی اس مڈبھیڑ میں انکیدو کو شکست دینے کے بعد، نہ معلوم کیوں شہنشاہ جل جامیش نے انکیدو سے دوستی کرلی۔ وہ دونوں خاص دوست ہوگئے ہیں۔

—یہ تو خطرناک خبر ہے۔ اکادی تہذیب کا دیوتا سورو گھبرا کر بولا۔

—یہی تو... یہی تو... دیوتا انو نے کہا— خطرناک بات یہ ہے کہ شہنشاہ جل جامیش نے دوستی نام کے عنصر کو بھی تلاش لیا...

یہ سن کر سارے دیوتا بے حد فکرمند اور مایوس ہوگئے۔ تب میسوپوٹامیا کے دیوتا الوونیس نے

پریشان آواز میں کہا— دیوتاؤں کے دیوتا انو! ہماری کمزوری یہی ہے کہ ہم نے محبت اور دوستی جیسے عناصر کی تلاش نہیں کی... ساری دیویاں صرف ہماری ہوس کو سیراب کرنے والی تالاب ہیں اور ہم دیوتاؤں میں کوئی بھی کسی کا دوست نہیں ہے... اس لیے انسانی محبت اور دوستی جیسے عناصر کی کھوج بہت ہی ہیبت ناک ثابت ہوسکتی ہے۔ یہ ہم دیوتاؤں کے وجود کے لیے بھیانک خطرہ بن سکتی ہے۔ یہ صورت حال دھماکہ خیز ہے...

وہاں موجود سارے دیوتاؤں نے الوونیس کے فکر کی ایک آواز سے تائید کی اور دیوی تانیا نے تب انہیں آگاہ کرنے والی عالمانہ تقریر کی—

دجلہ، فرات اور ڈینیوب کی سرزمین کے سارے دیوتاؤ! تم سب آج فکرمند ہو کیونکہ انسان نے محبت اور دوستی کے نئے عناصر کو ڈھونڈ لیا ہے، لیکن تمہیں کس نے روکا تھا؟ تم سب بے حد انانیت پسند ہو! تم یہ بھول گئے کہ انسان نے ہی تمہیں تخلیق کیا ہے۔ انسان کے بغیر تمہاری اور ہم جیسی دیویوں کی کوئی وقعت یا وجود نہیں ہے۔ تم سارے دیوتا محبت سے عاری اور ضدی شخص ہو۔ تم سب عورت پر فریفتہ ہو کر اس کی بے حرمتی کرسکتے ہو؟... غیرقانونی اولادیں پیدا کرسکتے ہو کیونکہ تم مغرور ہو۔ تم بے حد خودغرض ہو۔ تمہارے پاس دوستی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ تم ایک دوسرے کے مخلص نہیں ہو۔ تم ہمیشہ ایک دوسرے سے حسد کرتے ہو۔ تمہارے سارے کردار بداخلاق ہیں، اسی لیے تم کسی جائز تہذیب یا تمدن کی تشکیل نہیں کرسکتے ہو۔ تم سب بھول رہے ہو... زمین کے انسان نے محبت اور دوستی کے علاوہ افزائش نسل کی جائز روایت بھی ایجاد کرلی ہے! اسی لیے انہیں سنسکار جیسی عظیم طاقت بھی حاصل ہوگئی ہے... تمہارے پاس صرف واسنا ہے، محبت نہیں ہے۔ صرف ذاتی عظمت کی حسد ہے۔ اسی لیے دوستی نہیں! تم نے عورت کی صرف بھوگیا مان کر نا جائز اولادوں کا دیولوک قائم کرلیا ہے، لیکن اس دیولوک کے پاس کوئی سنسکار یا روایت نہیں ہے...

—دیوی تانیا! تم اپنے ہی اولادوں کی بے عزتی کررہی ہو! تمام دیوتا اور کچھ دیویاں ایک ساتھ چیخ اٹھے۔

—میں توہین نہیں صرف تمہیں آگاہ کررہی ہوں... انسان نے زندگی کے جن عناصر کی تلاش کی ہے اور آئندہ تلاش کرے گا وہ ہماری موت کا اعلان ہوگا... دیوی تانیا نے کہا اور روپوش ہوگئی۔

سارے دیوتا خاموش اور حیران رہ گئے اور تب اپنے وجود کی حفاظت کے لیے پرم دیوتا انو نے مشورہ دیا—

—وجود کے مشکل کی اس گھڑی میں ہمیں سپت سندھو کے آریہ دیوتاؤں سے رابطہ کرنا

چاہیے... ہمارے پاس صرف تین ندیاں ہیں — دجلہ، فرات اور ڈینیوب۔ ہمیں صرف ان تین ندیوں کی جاگیر ملی ہے۔ ان کے پاس سپت سندھو کی سات اہم ندیاں ہیں — سندھو، وِتستا، اسکنی، پروشنی، وپاش، شتدری اور سرسوتی!

— اتنا ہی نہیں دیوا جی دیو! پیغامبر نے احترام سے سر جھکا کر کہا۔ وہ آگے کچھ کہتا، اس سے پہلے ایک دیوتا نے ٹوکا — تم کون؟

— جناب! ہم تو گھومنے والے چرواہے ہیں، لیکن آپ کے پیغامبر کا کام بھی کرتے ہیں۔ ہم تو سپت سندھو سے لے کر آپ کے صوبے تک اور یہاں سے لے کر بلیشیا، پاشان علاقے سے لے کر باسفورس اور وزہ دانیال تک ہمیشہ گھومتے ہی رہتے ہیں... ہمیں سے ہو کر تو آریہ قبیلے وادیٔ سندھ تک گئے ہیں... انھیں میں سے کچھ قبیلے آریانا میں بس گئے ہیں جو آگے بڑھتے گئے وہ سندھو، سرسوتی اور درشدوتی ندیوں کو پار کر کے جمنا کے مدھیہ دیش تک پہنچ چکے ہیں... اُسے وہ برہماورت کے نام سے پکارتے ہیں۔ پورب کی طرف ان کی سرحد جو ندی بناتی ہے، اس ندی کا نام ہے گنگا! آریہ دیوتاؤں نے حکومت قائم کر لی ہے۔ اُن کی حکومت میں شمال مغرب کی مزید چار ندیوں کی جاگیر بھی موجود ہے۔

— کیا آریوں نے اُن ندیوں کی نامزدگی کر لی ہے؟

— ہاں جناب! انہوں نے ان کی نامزدگی کر کے اپنی جاگیر بنالی ہے۔ آریانا کے آریہ اسی لیے پچھڑتے گئے، کیونکہ انہوں نے نامزدگی کا طریقہ نہیں اپنایا۔ آریوں نے شمال مغرب کی ندیوں کو نام دیے ہیں — کابل کی کرمو، کرم، گومتی کوبل اور سوات، سوواستو!

— اتنے طویل نام؟

— ہاں جناب! ندیوں کی نامزدگی کے ساتھ ساتھ انہوں نے زمین کے حصوں کو بھی درج کر لیا ہے۔ ہم تو گھومنے والے ہیں، جب بھی آریہ صوبوں تک جاتے ہیں تو قاندھاری ضلع سے جانوروں کے بال لے آتے ہیں۔ جنت میں پہنچتے ہیں تو بہتر شراب پینے کا لطف اٹھاتے ہیں... پھر ہم ان کے دروبیہ اور گزدش صوبوں میں رکتے ہیں، تو جو اور غلہ بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ ان صوبوں کا اناج بے مثال ہے۔ جناب! آریوں کے پاس پانی کی جاگیر کے علاوہ خوبصورت صبح کا سورج ہے۔ پہاڑ، بجلی، بادل اور بے تحاشہ بارش ہے... انہوں نے اپنے علاقے کو ویدک گروہ اور لوگوں میں تقسیم کر رکھا ہے... اُن کے پاس گھوڑے ہیں، گائے ہیں اور دوسرے جانور بھی ہیں۔ وہ زراعت کا کام کرنے لگے ہیں!

— یہ محنت کیا آریہ دیوتا خود کرتے ہیں؟ دیوتا انو نے پوچھا۔

— نہیں جناب! آریہ دیوتا بھی آپ سب کی طرح بے عمل ہیں۔ انہیں محنت کی ضرورت ہی نہیں... محنت تو ان دیوتاؤں کی انسانی ذات ہی کرتی ہے۔

— پرم دیوا انو! تبھی ایک دیوتا نے مداخلت کی۔ ہمیں پیغامبر کی تفصیل میں نہیں الجھنا چاہیے۔ ہماری مصیبت تو شہنشاہ جل جامیش ہے جو موت کی دوا تلاش کرنے کا اعلان کر چکا ہے!

— محترم! پیغامبر نے انہیں خاموش کیا — میں آپ کے اس اہم مسئلے کے لیے ہی ساری تفصیلات دے رہا ہوں، تاکہ آپ اس مسئلے کو پورے پس منظر میں سمجھ سکیں... دیکھیے، یہاں آ کر انکیدو بھول گیا کہ وہ آسمان کا بیٹا ہے۔ انسان بنتے ہی اس نے محبت نام کے اضطراب کی تلاش کی اور قائم کر لی۔ شہنشاہ جل جامیش نے دوستی جیسا رجحان کھوج لیا اور اُدھر آریہ انسان نے زمین کے عظیم عنصر محنت کو ڈھونڈا اور ظالم قدرت کو قابو میں کرنے کے لیے اس نے امن جیسی عظیم قوت کو ایجاد کر لیا ہے... امن کے بعد اگر انسان کو آخری طور پر کچھ تلاش کرنا ہے تو وہ ہے، موت کی دوا! محترم! آپ دیوتاؤں کی شکست یقینی ہے!

پیغامبر کی یہ بات سنتے ہی گروہ کے ہر دیوتا کی بھنویں تن گئیں۔ ان کی آنکھوں سے غصہ برسنے لگا۔

— غصہ مت ہوئیے محترم! سچ کو قبول کیجیے... انسان نے جن عظیم قوتوں کو ایجاد کیا ہے وہ آپ کے پاس نہیں ہیں۔ اس نے ایجاد کر لیا ہے — زندگی، عمل، محنت، محبت، دوستی اور امن جیسے زندگی کے عظیم عناصر کو... اس لیے اب اس کی جاودانی کی خواہش غیر مناسب نہیں ہے!

— نہیں! نہیں! اب اس کی یہ خواہش ہمیں قبول نہیں ہے! سارے دیوتا ایک ساتھ چیخنے لگے... پھر الگ الگ اعلان کرنے لگے —

— ہم عمل کو لاعمل بنا دیں گے۔

— ہم محنت کو ناقابل محنت بنا دیں گے۔

— ہم محبت کے خلاف نفرت کی تشکیل کریں گے۔

— ہم دوستی کو دشمنی میں بدل دیں گے۔

— ہم امن کو بدامنی سے مسمار کریں گے۔

— ہم زندگی کو موت سے آزاد نہیں ہونے دیں گے۔

تبھی تین دیویاں ایرا، سسوتی اور کلپا وہاں داخل ہوئیں۔ انہیں دیوتاؤں نے حیرانی سے

دیکھا۔ دیوتا انو نے ان سے سوال کیا— تم تینوں اس وقت یہاں کیوں آئی ہو؟ کوئی خاص وجہ؟

—ہم تینوں دیولوک چھوڑ کر مرتیولوک جا رہی ہیں۔ ہم عورتیں تمہارے گناہوں سے پریشان ہیں۔ تم نے ہمیں صرف بھوگیا بنا رکھا ہے... محبت کا وہ پاس و لحاظ جو انسان نے ایجاد کر لی ہے۔ اس کا تھوڑا بھی حصہ تم میں نہیں ہے۔ تم سب عیاش ہو اور تمہیں نہیں، سندھ تہذیب کے دیوتا بھی تمہاری ہی طرح ہیں۔ اپسراؤں کو دیکھتے ہی ان کی ریاضت ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ انزال کرنے لگتے ہیں۔ تمہارے دوست بھی اس وقت بھی پاشان صوبے کے مندر میں دیوداسی اینلا کے ساتھ ہم بستر ہیں... دیوتا سوبوگ ڈینیوب ندی کے کنارے دیوی پرتی کے ساتھ مباشرت میں محو ہیں... سندھ تہذیب کا برہما اپنی بیٹی شت روپا سرسوتی پر فریفتہ ہو کر گذشتہ سو ماورائی سالوں سے اس کے ساتھ مجامعت میں ملوث ہیں۔ تم سب بھی سورج کو پوجتے ہو، آریہ بھی پوجتے ہیں۔ اسی سورج نے اپنے بھائی وشوکرما کی بیٹی سنگیا کو اپنی بیوی بنا رکھا ہے۔ چاند کو بھی تم دونوں کی تہذیبیں پوجتی ہیں۔ آریہ تہذیب میں وہ برہمنوں، دواؤں اور سیاروں کا شہنشاہ ہے۔ جانتے ہو، اس نے تربھون کو جیت کر راجسویگیہ کیا تھا۔ اس مہا یگیہ میں تربھون سندری، دیوتاؤں کی گورو پتنی تارا بھی آئی تھی۔ چاند گورو پتنی پر اس قدر فریفتہ ہو گیا کہ اس نے طاقت کے زور سے تارا کو اغوا کر لیا۔ دیوگورو برہسپتی نے اپنی بیوی لوٹا دینے کے لیے چاند کو کئی بار گذارش کے ساتھ سمجھایا، لیکن چاند تو شہوت پرست تھا۔ وہ گورو پتنی تارا کے ساتھ زنا اور عصمت دری کرتا رہا۔ آخر بھیانک جنگ کے بعد حاملہ تارا کو چاند سے جیت کر لایا گیا... کہاں تک گنایا جائے! تم دیوتاؤں کی ساری تہذیبیں بے شرم ہیں۔ گورو کی پتنی سے مباشرت کرنے کے بعد بھی تم نے اسے مجرم نہیں ٹھہرایا...

پرم دیوتا انو کے ساتھ ہی سارے دیوتا خاموش تھے... ان میں ہمت نہیں تھی کہ وہ تینوں دیویوں اینا، سرسوتی اور کلپا سے کوئی بحث مباحثہ کر سکیں یا سوال پوچھ سکیں۔ کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد پرم دیوتا انو نے اتنا ہی پوچھا— تم تینوں تو دیویاں ہو... طویل عمر والی ہو۔ موت سے آزاد ہو... ہم دارِ فانی میں محدود عمر والے فانی انسانوں کے ساتھ کیسے اور کب تک رہ سکو گی؟ کتنے مردوں کے ساتھ زندگی گزارو گی؟

—اس کی ضرورت نہیں پڑے گی... تمہیں نہیں معلوم... تم سب کی چہیتی دیوی تمہارے جنت کی رانی، اینشتر خود شہنشاہ جل جامیش جیسے انسان کے پاس شادی کی درخواست لے کر گئی تھی! جانتے ہو تب اس فانی جل جامیش نے کیا کہا تھا؟ یہی کہ یہ ناممکن ہے... میں تم سے محبت نہیں کرتا، اس لیے میں تمہاری عصمت کی حفاظت نہیں کر پاؤں گا... کہتے کہتے اینا کی سانسیں تیز ہو گئی تھیں، اس

نے انہیں ملامت کرتے ہوئے پوچھا— کہاں ہے تم دیوتاؤں کے پاس شیشے جیسا استقلال اور عظیم اخلاقیات؟

دیوتا سہمے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ تبھی سرسوتی بول پڑی— پرم دیوتا انو میں بھی اتنا حوصلہ نہیں کہ یہ اینشتر کے ساتھ ہوئے اس واقعہ کا سچ بتا سکیں... لیکن وہ سچ میں بتاتی ہوں— شہنشاہ جل جامیش کے انکار کو اینشتر برداشت نہیں کر سکی تھی۔ ذلیل اینشتر تب انہیں کے پاس پہنچی تھی اور اس نے جل جامیش پر تہمت لگائی تھی— پرم دیوانو! فانی انسان شہنشاہ جل جامیش نے میری بے عزتی کی ہے... دیولوک کی دیویوں کو اس نے رذیل کہا ہے۔ اس نے الزام لگایا ہے کہ ہم دیویاں نہیں عیاش کسبیاں ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ ایک دیوی کتنے دیوتاؤں کی آغوش میں رہی ہے! کہتے ہوئے سرسوتی نے آواز اونچی کر کے پرم دیوانو سے پوچھا— بولیے! یہ واقعہ سچ ہے یا نہیں!

تبھی موجود دیوتا پرم دیوانو کو شک کی نگاہ سے دیکھ ہی رہے تھے کہ دیوی کلپا نے بات اور تہمت کا سرا پکڑ لیا— اینکیدو کے تبدیلیٔ قلب کے بعد تب انہیں پرم دیوانو نے شہنشاہ جل جامیش کو ختم کرنے کے لیے ایک خوفناک اور ہیبت ناک سانڈ کو جنم دے کر زمین پر بھیجا تھا... یہیں پر دوستی نام کے قدر کا امتحان پہلی بار ہوا تھا۔ اس پاگل ہیبت ناک سانڈ نے جیسے ہی جل جامیش پر حملہ کیا، تو دوستی کا فرض نبھاتے ہوئے اینکیدو نے اس سانڈ کو سینگوں سے پکڑ لیا۔ ان میں گھمسان مڈبھیڑ ہوئی۔ سانڈ نے اینکیدو کے چہرے پر جلتی ہوئی آگ اگلتے ہوئے کہا— اینکیدو! کیا تو بھول گیا کہ ہم دونوں کو ایک ہی پرم دیوتا انو نے جنم دے کر زمین پر بھیجا ہے... کیا تو بھول گیا کہ ہم دونوں کا مقصد جل جامیش کا قتل ہے!

تب اینکیدو نے اس کے بڑے سر کو سینگوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا— اے سانڈ! تو بے ضمیر جانور ہے... تجھے تو کیا، دیوراج انو کو بھی نہیں معلوم کہ دوستی کس چڑیا کا نام ہے! میرے زندہ رہتے میرے دوست جل جامیش کو کوئی نہیں مار سکتا۔

یہ سنتے ہی سانڈ نے مست ہو کر بھیانک حملہ کیا تو شہنشاہ جل جامیش نے سانڈ کی گردن اور پیچھے کے حصے پر تیزی سے وار کیے... بالآخر وہ سانڈ مارا گیا۔ لیکن اینکیدو بری طرح زخمی ہو گیا تھا، اس کی حالت ایک مردہ جیسی ہو گئی تھی۔ جل جامیش نے یونان کے بڑے سے بڑے ویدوں اور حکیموں کو بلا کر علاج کروایا۔ دیوداسی روتا نے، جس نے اینکیدو سے محبت کی تھی، بہت خدمت کی۔ جل جامیش اپنے بستر مرگ پر پڑے دوست کو تسلی دیتا رہا۔ دوست اینکیدو! تم زندہ رہو گے...

اُراور کیش کے قبرستانوں میں اب کوئی انسان دفن نہیں ہوگا... انسان زندہ رہے گا...! پھر اس نے انکیدو کو دیکھا تو اس کا دل کانپ اٹھا۔ وہ اُسے چھو چھو کر رونے لگا— دوست انکیدو! کیسے ہو تم؟ کیسی نیند ہے یہ؟ اس نیند نے تمھیں کیوں جکڑ لیا ہے؟ انکیدو میرے دوست! تو سیاہ کیوں پڑ گیا ہے؟ تو میری آواز کیوں نہیں سنتا؟

جل جامیش کے رونے کے باوجود انکیدو نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ جل جامیش نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا، اس کی حرکت بند تھی... وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا— دوست انکیدو... تو نے میرے لیے درد سہا ہے۔ میرا عذاب تو نے اپنے اوپر لیا ہے... تو نے دوستی کے ناطے موت کو گلے لگایا ہے اور تب اپنے آنسو پونچھ کر شہنشاہ جل جامیش نے اعلان کیا—

— سنو دیوتاؤ! سنو! زمین کے شہنشاہ جل جامیش کی آواز! یہ دوسری آواز ہے! یہ عیاش اور جانوروں جیسی عیاش آواز نہیں، یہ انسان کے درد، دکھ، اذیت، محنت اور موت سے اُسے آزاد کرنے کی آواز ہے!

اینا کانپی— آگے سنو... سنو... اور جل جامیش کی آواز پھر گونجنے لگی۔

— میں درد سے لڑوں گا... اذیت برداشت کروں گا... کچھ بھی ہو میں اپنے دوست اور فقط انسان کے لیے موت کو شکست دوں گا۔ میں موت سے نجات کی دوا کھوج کر لاؤں گا!

شہنشاہ جل جامیش کے اعلان سے ایک بار پھر دیولوک کانپنے لگا... دیوتا بھی حیران رہ گئیں۔ تبھی اینا نے اعلان کیا— قیامت کے وقت آریہ تہذیب کی ایک منیہ کنیا نے جل جامیش کو جاودانی حاصل کرنے کا راز بتایا تھا... منیہ کنیا کے کہنے کے مطابق جل جامیش نے موت کے خلاف جینے کی طاقت رکھنے والے سبھی جوہروں اور ذرّوں کو اپنی ناف میں چھپا لیا تھا۔ اسی لیے وہ پانی کے طوفان میں زندہ رہ سکا۔ اس منیہ کنیا نے ہی اسے شوروپک شہر کے جیوسدو کی جانکاری دی تھی جس کے پاس موت سے نجات کی دوا موجود تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ سیلاب کے بعد شوروپک کا وہ جیوسدو اس دوا کو لے کر کہاں چھپ گیا تھا۔ تو سنو میر تہذیب کے دیوتاؤ! شہنشاہ جل جامیش شوروپک کے اس جیوسدو کا پتہ لگا کر رہے گا... اس دوا کو حاصل کر کے رہے گا، جو انسان کو جاودانی دے گی... اس لیے ہم تینوں تمہارا دیولوک چھوڑ کر عالم فنا میں جارہی ہیں! کیونکہ شہنشاہ جل جامیش اس سمندر تک پہنچ گیا ہے، جہاں سے وہ پانی والا راستہ جاتا ہے۔ جہاں پانی کی گہرائی میں شوروپک کا جیوسدو موت سے نجات کی دوا لیے چھپا بیٹھا ہے...

یہ اطلاع سنتے ہی دیوتاؤں کے گروہ میں پھر بھونچال آگیا۔ اب کیا ہوگا؟ کیا دوسری قیامت

ہوگی؟ شور اور زبردست شور کے درمیان پرم دیوتا انو نے اعلان کیا— اس سے پہلے کہ جل جامیش سمندر کی بے پایاں گہرائیوں میں اتر سکے، اسے قیدی بنایا جائے!

— اب تم اس کی پرچھائیں کو بھی قیدی نہیں بنا سکتے! اینا نے کہا۔

— رکو، رکو! پرم دیوتا نے اپنی کائنات کے زہریلے جانداروں کو پکارا— زہریلے جانورو! جل جامیش کو اپنی قید میں لے لو۔ اپنے زہریلے دانت سے اس کے جسم کو بے جان کردو...

اور تب تینوں دیویوں نے دیکھا— سمندر میں چھلانگ لگانے کے لیے پریشان جل جامیش کے جسم پر سیکڑوں زہریلے سانپ لپٹ گئے تھے۔ انھوں نے اسے جکڑ لیا تھا۔ سیکڑوں بچھو اس کے جسم پر ڈنک مار رہے تھے...

یہ منظر دیکھ کر دیویاں منحرف ہو اٹھیں۔ لیکن تبھی جل جامیش نے ان زہریلے جانوروں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی طاقتور بانہوں کو پھیلایا... اور... اور... اُس نے اُس سمندر میں چھلانگ لگا دی...

سمندر نے اپنی بے چین لہروں میں اس کا استقبال کیا اور کہا— زمین کے بیٹے! جب تک تیرے جسم کا ایک بھی حصہ کام کرتا رہے گا، تب تک ان زہریلے جانوروں کا زہر بے اثر ہوتا جائے گا... میرا پانی زمین کے ہر زہر کی سرکوبی کرتا ہے... تو پاتال لوک کا اپنا سفر پورا کر!

اور جل جامیش اتھاہ پانی کی اُس گہری دنیا میں نیچے اترتا گیا... اترتا چلا گیا۔

صدیاں بیت گئیں اور اب تک جل جامیش کا سفر جاری ہے... دوا کی تلاش میں وہ اب بھی سمندر کی گہرائیوں میں اترتا جارہا ہے...

(۲)

صدیاں گزر گئیں۔ موت سے نجات کی دوا لے کر انسان شہنشاہ جل جامیش ابھی لوٹا نہیں ہے۔

لیکن دیوداسی روہا اور جنگلی مرد انکیدو نے محبت نام کے جس اضطراب کی تحقیق پہ آسانی کرلی تھی، اسے موت کا خوف نہیں تھا۔ انسان ذات میں وہ زندہ، بیدار اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم ہوگیا تھا۔ اُسے موت مار نہیں سکتی تھی، آگ جلا نہیں سکتی تھی، ہوا اڑا نہیں سکتی تھی، ہتھیار اُسے کاٹ نہیں سکتا تھا، سمندر اُسے ڈبو نہیں سکتا تھا... موت کی طرح یہ ناقابل تردید سچ اسی دن قائم ہوگیا تھا جس دن مصر کے ایک مندر کی پتھریلی دیوار پر کسی دھات کے نکیلے قلم سے یہ جملہ منقش ملا تھا— 'مجھے تمہارا

انتظار ہے!

یہ دنیا کی پہلی محبت کی داستان تھی! اس پہلی محبت کی کہانی کے بعد مصر کے پیرامڈ بنے تھے۔

پیرامڈوں کی تاریخ سے زیادہ بڑی اور پرانی ہے انسانی محبت کی تاریخ۔ دیوداسی رودا اور جنگلی مرد انکیدو کے وہ تنہا لمحے، جب واستا کے بعد انھوں نے اپنے وجود کی تلاش کی تھی اور اُسے حاصل کیا تھا۔ محبت کی یہی قدیم کہانی تب سے سانس لے رہی ہے!

۷

اسی کہانی میں شامل ہے بوٹا سنگھ اور ریت پری کی یہ کہانی!

راجستھان کا تپتا ریگستان...

کوئی چیخا— بن گیا سالا پاکستان...

آسمان کی آنکھیں سوکھی ہوئی تھیں۔ اُن میں ایک بوند بھی پانی نہیں تھا۔ محکمہ موسم کے سائنسدانوں نے اطلاع دی تھی کہ اس بار زمین کی سینچائی بارش کے پانی سے نہیں انسانی خون کی برسات سے ہوگی...

اسی اعلان کے درمیان پچاس پچپن سال کا سکھ کسان بوٹا سنگھ اپنے بنجر کھیتوں کی طرف سے لوٹ رہا تھا۔ اُس کے تین بھائی تھے، لیکن کھیتوں کی جائیداد کا بٹوارہ نہ ہونے پائے، اس لیے انہوں نے بوٹا سنگھ کی شادی نہیں ہونے دی تھی۔ وہ ابھی تک کنوارہ تھا۔ اس ریگستانی دھرتی کی طرح، جس پر بارش کی ایک بوند تک نہیں گری تھی۔ وہ بوٹا سنگھ اپنے بانجھ کھیتوں کی طرف سے گھر کو واپس جا رہا تھا...

آوازیں گونج رہی تھیں...

—بن گیا سالا پاکستان...

—جو بولے سو نہال... ست سری اکال...

—نعرۂ تکبیر... اللہ و اکبر...

—ہر ہر مہادیو...

بوٹا سنگھ کو پتہ نہیں تھا کہ محکمۂ موسم کے سائنسدانوں نے کیا اطلاع دی تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ آزادی کے اس سال پانی کی جگہ خون کی برسات ہونے والی تھی۔ بوٹا سنگھ ریت پر راستہ بناتا چلا جا رہا تھا۔ یہ راستہ وہ روز بناتا تھا جو روز مٹ جاتا تھا... گھر پہنچنے کی بھی اُسے کوئی

جلدی نہیں تھی۔ کسی کی آنکھیں اس کے لوٹ کر آنے کا راستہ نہیں دیکھتی تھیں۔

تبھی پیٹھ پیچھے سے ایک ڈری ہوئی کم سن آواز سنائی دی— بچاؤ... بچاؤ...

بوٹا سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سولہ سترہ سال کی لڑکی اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے اس کی طرف دوڑتی چلی آرہی تھی۔ اُس کے کپڑے تار تار تھے۔ بال بکھرے ہوئے اور وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ ایک پرتشدد سا نوجوان اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ نیم برہنہ لڑکی بوٹا سنگھ کے پیروں پر آگری۔ مجھے بچاؤ... مجھے بچاؤ... یہ درندہ میری عزت لوٹنا چاہتا ہے۔ کہتی ہوئی وہ اٹھی اور بوٹا سنگھ سے چپک کر ہانپنے لگی۔

—تو بچ کے کہاں جائے گی! اس پرتشدد نوجوان نے لڑکی سے کہا، پھر وہ بوٹا سنگھ سے بولا— اسے میرے حوالے کردو!

—نہیں... اسے میں تمہارے حوالے نہیں کروں گا!

—تمہیں کرنا ہوگا... یہ میرے حصے میں آئی ہے!

—حصے میں... بوٹا سنگھ نے آنکھیں ترچھی کر کے پوچھا— تیرے حصے میں؟

—ہاں! ہندو مسلمان کا بٹوارہ ہو چکا ہے۔ پاکستان بن چکا ہے۔

— کہاں بن چکا ہے پاکستان؟

—تیری ڈھانڈی کے اُس پار... پاکستان بننے کی لکیر کھنچ چکی ہے۔ اسی لکیر کے بعد یہ مسلمان لڑکی میرے حصے میں آئی ہے... میں اسے قافلے والوں سے چھین کر لایا ہوں... اسے میرے حوالے کردو!

—نہیں! بوٹا سنگھ نے اس نیم برہنہ لڑکی کو پیٹھ کے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا— ہندوستان پاکستان کی لکیر کھنچ گئی تو کھنچ جائے... لیکن ہندو مسلمان کے نام پر عورت کی عزت کا بٹوارہ تو نہیں ہو سکتا!

اس پرتشدد نوجوان نے تیز نظروں سے بوٹا سنگھ کو دیکھا اور بولا— تم چاہو تو اس کی عزت خرید لو!

—خرید لو! بوٹا سنگھ نے حیران ہوتے ہوئے کہا— تم بیچنے کو تیار ہو؟

—ہاں!

— کتنے میں؟

—نقد پندرہ سو! اس پرتشدد نوجوان نے بوٹا سنگھ کی اوقات دیکھ کر جچے تلے دام بتائے۔

—ٹھیک ہے! اتنے پیسے تو کر لوں گا... آؤ میرے ساتھ گھر تک چلنا پڑے گا۔

تینوں لوگ گھر کی طرف چل دیے۔ پرتشدد نوجوان بوٹا سنگھ کے ساتھ آگے آگے چل رہا تھا اور لڑکی سر جھکائے اُن کے پیچھے پیچھے۔

گھر پہنچ کر بوٹا سنگھ نے ایک کونے میں جا کر پرانے گھڑوں اور ہانڈیوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر پیسے تلاش کیے لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ وہ نوجوان انتظار میں کھڑا تھا۔ نیم برہنہ لڑکی اپنا بدن چھپائے، دونوں بانہیں لپیٹے، گٹھری بنی دوسرے کونے میں بیٹھی تھی۔ آخر آڑے کر بوٹا سنگھ نے ریت ہٹا ہٹا کر اس میں گڑی ایک ہنڈیا نکالی۔ میلے سے کپڑے کے ٹکڑے میں بندھی اس نے امانت والی اپنی پوٹلی نکال کر کھولی اور مڑے تڑے میلے کچیلے نوٹ گننے لگا۔ کچھ سکے بھی تھے۔ آخر پیسے پورے پڑ گئے۔

پرتشدد نوجوان نے پیسے گنے، اپنی پگڑی میں رکھے اور لڑکی پر نظر ڈال کر بولا— بڈھا ہے... آرام سے رہے گی...

لڑکی ویسی ہی گٹھری بنی بیٹھی رہی۔ وہ چلا گیا تو وہ صرف اتنا ہی بولی— میری خاطر تم نے اتنی بڑی رقم اس ظالم کو کیوں دے دی؟

بوٹا سنگھ کچھ نہیں بولا۔

دن ڈوب رہا تھا۔ رات ہوئی تب لڑکی مشکل سے سامنے آئی۔ وہ ضرورت سے زیادہ ننگی تھی۔ دن میں تو ٹھیک لیکن رات میں ایسے کیسے رہے گی۔ بوٹا سنگھ نے مشکل حل کی— کوئی کپڑا تو ہے نہیں، تم میرا پچھنا لپیٹ لو...

—تب تم ننگے ہو جاؤ گے!

لڑکی نے بے بسی سے کہا

بوٹا سنگھ کو تب یکایک خود پر شرم آئی۔

تم ٹھیک کہتی ہو... ایک طریقہ دھیان میں آیا ہے... کہتے ہوئے بوٹا سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے ریت ہٹا ہٹا کر گڈھا بنانا شروع کر دیا۔

لڑکی اس کا ڈھنگ سمجھ گئی۔ وہ چپ چاپ اُسے گڈھا بناتے دیکھتی رہی۔

—ادھر مڑو گی یا کھڑی رہو گی؟ بوٹا سنگھ نے پوچھا۔

— کھڑی رہی تو نیند کیسے آئے گی...

—تب اتنا بہت ہے... بوٹا سنگھ نے گڈھے کی گہرائی دیکھ کر کہا— آجاؤ...

لڑکی اسی طرح عریاں ہی ٹانگوں کے سہارے دھیرے دھیرے گڈھے تک کھسک آئی اور خود ہی اس میں کمر کے بل ادھ لیٹی ہو گئی۔ بوٹا سنگھ نے اس کے جسم کو ریت انڈیل کر گلے تک ڈھانپ دیا اور اُسے دیکھتے ہوئے بولا— اب ٹھیک ہے!

لڑکی نے اُسے ایک بار بھرپور نظروں سے دیکھا۔ بوٹا سنگھ نے بھی کندھے سے داڑھی کھجلانے کا بہانہ کرتے ہوئے اُسے اسی طرح بھرپور نظروں سے دیکھا۔ آخر لڑکی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان آئی اور اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ گردن تک ریت میں دبی وہ ریت پری سی لگ رہی تھی۔

—ارے، ابھی تک ہم نے پوچھا ہی نہیں... نام کیا ہے تمہارا؟ بوٹا سنگھ نے جاننا چاہا۔

—زینب!

—گاؤں؟

—ڈیارڈھاڑی!

—ذات؟

—ہندوراج پوت!

—دھرم؟

—مسلمان!

—تم اس کے ہاتھ کیسے پڑ گئیں؟

—ہم گھر چھوڑ کر پاکستان جا رہے تھے... ویسے ہمارے گھر میں سب کچھ تھا۔ ہمارے ابا بٹائی پر کھیتی کر کے آرام سے رہتے تھے۔ گھر میں گائے، بھینس، بیل تھے۔ ہم گائے کا گوشت نہیں کھاتے... بھینس یا بیل کا بھی نہیں۔ سب آرام سے چل رہا تھا۔ پھر پاکستان کی لکیر کھینچی تو ڈھاڑی میں رہنا مشکل ہو گیا۔ گاؤں ڈھاڑی کے سارے مسلمان کارواں بنا کر اس لکیر کے پار پہنچنے کے لیے چل پڑے۔ پھر بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اپنی ڈھاڑی کیوں چھوڑ رہے تھے۔

—ایسے جھگڑے، کہا سنی اور بول ٹھول تو پہلے بھی ہوتے رہتے تھے... میں کارواں سے پیچھے چھوٹ گئی۔ تب اس نے مجھے پکڑ لیا۔ ادھ ننگا، ننگا کر دیا جیسے تیسے میں اس سے بچ کر دوڑی، تبھی تم مجھے دکھائی دیے... کہتے ہوئے ریت پری زینب نے بوٹا کو احسان بھری نظروں سے دیکھا۔

بوٹا سنگھ نے اسے تب خاموشی سے دیکھا۔

صبح ہوئی تو بوٹا سنگھ کے بھائیوں کو پتہ چلا کہ اس کے گھر میں کوئی لڑکی آ گئی ہے۔ تو گاؤں

کے بڑے بوڑھوں نے صلاح دی — بوٹا سنگھ! اب یہ لڑکی تمہارے گھر آہی گئی ہے تو تم اس سے شادی کرلو!

اس وقت بوٹا سنگھ چار کوس دور کے بازار سے زینب کے لیے کپڑے لینے جا رہا تھا۔ اُس نے چلتے چلتے بڑے بوڑھوں سے کہا — پہلے اُس کے لیے کپڑے تو لے آؤں...

۸

بوٹا سنگھ جب زینب کے لیے کپڑے لینے نکلا تب تک پاکستان نام کی لکیر تو کھنچ چکی تھی۔ محکمۂ موسم کے ماہرین کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ خون کی بارش ہو رہی تھی۔

ریت پری زینب ابھی بھی گردن تک ریت میں دبی ہوئی ہے۔

بوٹا سنگھ اس کے لیے چار کوس دور بازار سے کپڑے لینے گیا ہوا ہے۔

شہنشاہ جل جامیش کے لوٹنے تک، موت کے ہاتھوں مرتے ہوئے بھی انسان نے زندگی کی زنجیر بنائی ہے۔ وہ اپنی خواہشیں، قول اور خواب اپنی آل اولاد کو سونپ کر چلا جاتا ہے۔ تب سے یہ روایت مسلسل چلی آرہی ہے، کیونکہ جل جامیش کو لوٹنا ہے۔ ابھی تو وہ صدیوں کا وقت پھلانگتا، منصبوں کی گہرائیوں میں بسے پاتال لوک کی طرف مسلسل پانی کو چیرتا، گہرائیوں کو ناپ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ پکارتا اور بتاتا ہے — انسانوں میری مت کھونا... زہریلے سانپ، بچھو ابھی بھی مجھ سے لپٹے ہیں۔ ان کے داغوں نے مجھے نیلے رنگ کا بنا دیا ہے لیکن سمندر ایک دوست کی طرح میرا ساتھ دے رہا ہے... انکیدو کی ایثار سے دوستی کی جو روایت شروع ہوئی ہے، اُسے سمندر نباہ رہا ہے... اسی لیے ان بدعنوان دیوتاؤں نے بددعا دے کر اسے نمکین بنا دیا ہے، تاکہ اس کا پانی انسان کے کام نہ آسکے... لیکن فکر کی کوئی بات نہیں ہے... میں شوروپک کے جیوسدو تک پہنچنے کے لیے سمندر کی گہرائی میں صدیوں تک اترتا ہی چلا جاؤں گا۔ پتہ نہیں ابھی اور کتنے پانی کے سال لگیں گے... تب تک تم لوگ موت کی مخالفت کرتے رہے ہو۔ زمین سے اپنا سلسلہ بنائے رہو... مر مر کر اپنی اولادوں میں زندہ ہوتے رہو... میں دوا لے کر ہی لوٹوں گا... میرا انتظار کرو...

— انتظار کرو... انتظار...

وہی آواز کائنات میں گونجنے لگی۔

— میں دوا لے کر ہی لوٹوں گا... میرا انتظار کرو...

دیوتاؤں کی دنیا پھر بے چین ہوگئی۔ بابی لونیا کا دوسرا دیوتا زیا بتو گھبرا اٹھا۔ میسوپوٹیمیا کا

دیوتا کروٹوس اور کیمیر کا الو بے چین ہو اٹھا۔ دیوی افروڈائٹ کا بیٹا ایروس اپنے محل سے باہر آکر آواز کی سمت کا اندازہ لینے لگا۔ دیوتا جیس بھی نکل آیا۔ دونوں جڑواں دیوتا بھائی کیسٹر اور پولکس بھی باہر آگئے۔ لافانی دیوی یوروپا اور لیڈا کے ساتھ دیوی ہیرا بھی خوف سے باہر نکل پڑی۔ دیوی ایسٹریا اور فلیرا ابھی چین سے نہیں بیٹھ سکیں۔ مصر کا دیوتا ہاپی مضطرب ہو اٹھا۔

ساری تہذیبوں کے دیوتا اور دیویاں شہنشاہ جل جامیش کی آواز کو تلاش کرنے لگے۔ اپنے اپنے فرشتوں اور دیودوتوں کو دیوتاؤں نے حکم دیا — جاؤ اور اُس آواز کو پکڑو!

انہوں نے چاروں سمت چھان ڈالے لیکن انہیں جل جامیش کی آواز کہیں نہیں ملی۔

وہ مایوس اور ناکام لوٹ آئے۔ تب جیس نے کہا — پھر تلاش کرو... جہاں بھی ہے جل جامیش کی آواز... اُس آواز کو ختم کرنا بے حد ضروری ہے۔ اگر اس انقلابی آواز کو پکڑا نہ گیا تو ہماری کائنات برباد ہو جائے گی... اس آواز کو قید کرنا ضروری ہے۔

— ہوش سے کام لو! ہوش سے! یہ کراہتی آواز پرمتھیو کی تھی۔ جس نے انسان کے لیے جیس کے محل سے آگ چرانے کا 'جرم' کیا تھا۔ وہ آگ جس پر دیوتاؤں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہی پرمتھیو کراہتا ہوا بول رہا تھا — جل جامیش کی آواز کو قیدی مت بناؤ!

— جیس کے ساتھ ساتھ سارے دیوتاؤں نے دیکھا۔ آگ چرانے کے جرم میں صدیوں سے قید پرمتھیو زنجیروں میں جکڑا کھڑا تھا۔ اس کے کندھے پر جیس کا گدھ اب بھی بیٹھا اُس کے گوشت کو نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔ گوشت کے تمام لوتھڑے جیل کے فرش پر پڑے تڑپ رہے تھے...

خوف زدہ اور پریشان دیوتاؤں نے پرمتھیو کو حقارت سے دیکھا اور وہ ایک آواز میں بولے — تو لعنت کے قابل ہے... چور ہے... مجرم ہے...

— انا پسند اور عیاش دیوتا! جرم تو تمہارے طے ہوں گے... پرمتھیو نے رستے زخموں سے خون پونچھتے ہوئے کہا — تم ظالم ہو... تم نے قدرت کی بے قید اور لامحدود عظیم قوت کو ایشور/خدا کا جامہ پہنا کر خود کو اس کا پروہت اور اولاد بنا رکھا ہے۔ وہ بے قید اور لامحدود عظیم قوت اپنی سرگرمی سے مسلسل انسان کے لیے اپنے راز افشاں کر رہی ہے... وہ تمہاری ماتحت نہیں ہے...

— موت! موت! اسے موت دو! دیوتا چیخ اٹھے۔

— چلاؤ مت! پرمتھیو نے کہا — چاہے مجھے موت دے دو، لیکن تم کچھ بھی کرو، تم جل جامیش کی آواز کو قید نہیں کر سکتے... آواز فرار ہو چکی ہے! پرمتھیو نے اعلان کیا — دیوداسی روتا محبت، دوستی، امن اور انقلاب کے ساتھ ساتھ جل جامیش کی آواز کو لے کر فرار ہو چکی ہے... اب تم اُسے

نہیں پکڑ سکتے! ان قدروں کی تمہیں ضرورت نہیں تھی، اس لیے دیوداسی روتا انہیں لے کر دارالفنا کی طرف روانہ ہو چکی ہے... وہ دیکھو! دارالفنا میں اُس کا نزول!

۹

وحشت زدہ دیوتاؤں نے دھرتی کی طرف دیکھا۔ وہ سکتے میں آ گئے۔ دیولوک کے سارے سفید پروں والے پرندے دیوداسی روتا کو لے کر دارِفانی پر اُتر رہے تھے۔

نزول کے وقت اُس کے ساتھ کئی طرح کے چرندو پرند شامل ہوتے گئے تھے۔ اُن میں اَنجن اور چندرواک تو تھے ہی، کنک پرندوں کے ساتوں خاندان شامل تھے، مور تھے، پرندے، سارس، نیل کنٹھ، دواک، پنچ ورنی ہنس، بھابک، پانڈو، جل کاگ، سوپرن، وھنیش، کرنچ خاندان کے بھی فرد اور کوئل اپنے سارے آل اولاد کے ساتھ شامل تھی... اُن کے گیتوں اور گاتی آوازوں سے فطرت جھوم اٹھی تھی۔ دیوداسی روتا پرندوں کے پروں سے اُتر کر فوراً آدم ادیب کے گھر کی طرف چل دی... وہ اُس کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اس نے دیکھا، اس کے دستک دینے سے پہلے تمام دستکیں وہاں موجود تھیں... اور بے حد پریشان ادیب اپنا ماتھا پکڑے بیٹھا ہوا تھا۔ ایک اردلی اس کی داہنی طرف ادب سے کھڑا دستکوں کو پکار پکار کر انہیں ادیب کے سامنے پیش ہونے کی اجازت دے رہا تھا، لیکن تبھی ادیب نے سر اٹھا کر دیوداسی روتا کو دیکھا اور پوچھا— تم کہاں کی دستک ہو؟

—ادیب عالی! میں بے ایمان ہو گئے دیوتاؤں کے لوک کی دستک ہوں۔ میں انسان کے لیے پیار دوستی، شانتی اور انقلاب کی قیمت اور شہنشاہ جل جامیش کی آواز لے کر آئی ہوں... میں نے اُس وقت اس آواز کو اپنی ناف میں چھپا لیا تھا، جب کبھی تہذیب کے دیوتا اسے قیدی بنانا چاہتے تھے... انسان کی یہ سب سے بڑی امانت ہے... یہ بے لوث، بے خوف آواز! ابھی میں آپ کو سونپنے آئی ہوں۔ اسے قبول کیجئے... کیونکہ کوئی ادیب جیسا سیدھا سادہ اور ایماندار شخص ہی اسے زندہ رکھ سکتا ہے اور صدیوں کے بعد تک اس کی حفاظت کر سکتا ہے...

ادیب نے دیوداسی روتا سے آواز کی سوغات لے کر اُسے اپنی شریانوں کے خون میں پیوست کر لیا... اور دیوداسی روتا سے بیٹھنے کی گذارش کی۔

دیوداسی روتا کے بیٹھتے ہی دستکوں کا شور بڑھ گیا۔ دستکیں... دستکیں اور دستکیں... آخر ایک دستک کی طرف دیکھتے ہوئے ادیب نے پوچھا... تم کہاں کی دستک ہو؟

—ادیب عالی! میں ڈینوب ندی کی گھاٹی میں بسے اس سربیا کے کوسووصوبہ کی دستک ہوں،

Library
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

جہاں سے آپ صدیوں پہلے چل کر سندھو کے کنارے پر آ بسے تھے... ڈینوب ندی آج بھی آپ سب کو یاد کرتی ہے... وہاں کے مردے آج بڑے درد اور تکلیف سے آپ کو یاد کر رہے ہیں...

—ایسا کیا حادثہ ہوا ہے کہ کوسوو کی ہماری اولاد تکلیف سے ہمیں یاد کریں؟ ادیب نے سربیا کی دستک سے پوچھا۔

—تہذیب کی اس قدیم گھاٹی میں بھیانک جنگ چل رہی ہے۔ وہ جنگ یکطرفہ ہے۔

—یکطرفہ جنگ!

—جی ہاں ادیب عالی! ہماری سرزمین پر ناٹو نام کے ایک رشاسن نے جنم لیا ہے... سمندر پار کا ایک اور راکشس ان کا سرغنہ ہے۔ انہوں نے مل کر سربیا اور یوگوسلاویہ پر حملہ کر کے مجھے شمشان بنا دیا ہے... سربیا اقتدار والا میرے ہی یوگوسلاویہ کا حصہ ہے اور کوسوو اسی آزاد سرزمین سربیا کا علاقہ ہے... لیکن ناٹو کے راکشسوں اور اُس کے سرغنہ نے اپنے مفاد کے لیے ہمیں برباد کر دیا ہے۔ وہ راکشس آگ کا ناچ کر رہے ہیں، وہ میرے خود مختار ملک کو تقسیم کر کے، کوسوو کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتے ہیں۔

—لیکن کیوں؟ آخر یہ قابو کرنے کی سیاست کیا ہے؟ ادیب نے دستک سے پوچھا۔

—ادیب عالی! قابو میں کر کے روحوں کا توڑا جاتا ہے... پھر انہیں تقسیم کیا جاتا ہے... اُن میں ثقافتی دفاع کی طاقت کو شکستہ کیا جاتا ہے اور تب بازار پرست جونکیں اس تقسیم شدہ قوم کا سارا خون چوس لیتی ہیں۔ شکستہ تمدن کے شمشانوں میں تب جشن کے بازار قائم ہوتے ہیں... مذہب اور تاریخ کا استحصال کرنے والوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر ناچتے گاتے، جشن مناتے اپنے ہی تقسیم شدہ حصہ کے دشمن اور اپنی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں... بڑی تہذیبوں کو توڑ کر انہیں قیدی بنانے کے لیے تقسیم کا یہی راستہ اُن غیر مہذب اور بدتہذیبوں نے چنا ہے... جن کے کھیتوں میں صرف بارود اور بندوقیں اُگتی ہیں... اسی کے چلتے کوسوو اپنی لاکھوں اولادوں کی موت دیکھ چکا ہے اور لاکھوں لاکھ لوگوں کی ہجرتوں کی وجہ سے ویران ہو چکا ہے۔ لاکھوں پناہ گزیں ادھر اُدھر بھٹک رہے ہیں... ناٹو راکشسوں کے یکطرفہ میزائلی حملے جاری ہیں۔ تیل کے ذخیرے اور کیمیائی کارخانے دھو دھو کر کے جل رہے ہیں... کرۂ باد اور آپ کی قدیم ندی ڈینوب کا پانی زہریلا ہو گیا ہے... موت پاگلوں کی طرح زندگی کا پیچھا کر رہی ہے۔ سربیا میں اس وقت لاکھوں معصوم بے موت مر رہے ہیں...

—ان بے رحم درندوں کو کسی نے روکا کیوں نہیں؟ ادیب نے سوال کیا، پھر خود ہی خفگی سے

پوچھا— کہاں ہے اقوامِ متحدہ کا وہ سکریٹری جنرل کوفی عنان؟ اُسے عدالت میں پیش کیا جائے۔

اردلی حکم لے کر چل پڑا۔

— حضور! دجلہ، فرات کی وادی میں بھی یہی ہوا ہے... موقع پا کر ایک اور دستک نے عرض کیا۔

— اس کا جواب بھی کوفی عنان دے گا! ادیب نے کہا۔ اُس کے آنے کا انتظار کرو... اسی درمیان دیگر دستکیں بے چین اور شور مچانے لگیں تو ادیب نے انھیں شانت کیا اور دیوداسی رونا کی طرف مخاطب ہوا... جل جامیش کی یہ آواز تم نے مجھے سونپ دی، اس کے لیے بہت بہت شکریہ... میں نے اسے اپنے لہو میں ملا کر محفوظ کر لیا ہے۔ جب تک انسان ہے اُس کی شریانوں میں دوڑتا ہوا خون ہے، تب تک یہ آواز زندہ رہے گی۔

— ہوشیار رہنا ادیب! اسی لیے اب انسان مخالف طاقتیں خون پینے اور خوں ریزی کی روایت شروع کریں گی... دیوداسی رونا نے کہا— حالانکہ دیوتاؤں کی تہذیب بیمار، رذیل اور عیاش ہوگئی ہے، پھر بھی وہ بزدل لوگ آواز کو چھیننے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں، اس لیے ادیب! ہوشیار رہنا...

تبھی اردلی حاضر ہوا۔ کوفی عنان اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اُسے اکیلا دیکھ کر پارہ چڑھ گیا—
تم کوفی عنان صاحب کو نہیں لائے!

— حضور! یہ پتہ لگتے ہی کہ آپ نے انھیں طلب کیا ہے، کوفی عنان صاحب کے سینے میں تیز درد اٹھا، انھوں نے شکایت کی کہ انھیں سانس لینے میں بھی تکلیف ہو رہی ہے... اس لیے فی الحال وہ ہسپتال میں داخل ہو گئے ہیں... ایسی حالت میں انھیں لانا بھی مناسب نہیں تھا اور ممکن بھی نہیں...

— تو ہسپتال میں جا کر کوفی عنان سے کہو کہ دنیا کے سینے میں جو تیز درد بار بار اٹھتا ہے... اور اُسے سانس لینے میں جو تکلیف مسلسل ہو رہی ہے، اس کے علاج کے لیے انھیں اس دنیا کا کام کاج سونپا گیا تھا، لگتا تو یہاں تک ہے کہ ایک قطبی طاقت کے حق میں انھوں نے اپنے وہ اخلاقی ہتھیار بھی ڈال دیے ہیں جو بڑی امیدوں سے انھیں سونپے گئے تھے... اسی کا نتیجہ ہے تقسیم اور خوفناک سرکوبی کا یہ دور... اگر کوفی عنان بھول گئے ہیں تو انھیں یاد دلاؤ کہ معاشی تہذیبوں کی جدوجہد کے نام پر جو جنگیں ہوئیں اور ہو رہی ہیں وہ ہر ملک اور تہذیب کے عام آدمی کی تباہی کا سبب بن رہے ہیں... وہ اندھیری تاریخ اور مذہب کے اندھے عقائد کو جنم دے کر عوام اور نسل کی تباہی کے حامل

بن گئے ہیں۔ جب تک یہ جنگیں چلتی رہیں گی، تب تک اپاہج نسلیں پیدا ہوتی رہیں گی... جینے کے لیے ناجائز اور غیر اخلاقی ذرائع کی دنیا قائم ہوتی چلی جائے گی... ڈینیوب جیسی ندیوں کی مچھلیاں بار بار مرتی رہیں گی۔ انسانی لہو سے آبپاشی کیے ہوئے کھیتوں میں اناج نہیں، زہریلے دھتوروں کی کانٹے دار فصلیں اگیں گی۔ اُن ذاتوں کی عورتیں عیاشی اور زنا کے لیے مجبور ہوں گی... اولادیں ذہنی بیماری اور امراض میں مبتلا ہوں گی... مذہب کے نام پر لامذہب کی آندھیاں چلیں گی اور اقتدار کے تخت پر انسانی کھوپڑی کی مالا پہنے کوئی بے لگام اجارہ دار حکمراں قابض ہو جائے گا! کوفی عنان سے جا کر پوچھو، کیا اسی مستقبل کے لیے انھیں قوموں کی متحدہ جمہوریت سونپی گئی تھی؟

— حضورِ عالی! میں آپ کی اس طویل اور پُرجوش تقریر کو لے کر جاؤں گا لیکن شاید کوفی عنان صاحب کو اس کی باریکیاں سمجھا نہیں سکوں گا۔ بہتر یہی ہوگا کہ جب وہ عدالت میں حاضر ہوں تب آپ انھیں اس تقریر کا مطلب سمجھا دیں!

— میں جانتا ہوں، وہ کبھی بھی یہاں حاضر نہ ہوں گے... کیونکہ یہ انسان کے دل کی قدیم عدالت ہے... قانون کے نام پر قانون اور مذہب کے نام پر مذہب کا بیوپار کرنے والوں کے پاس اتنی ہمت نہیں کہ وہ اس عدالت میں حاضر ہو سکیں!

دیوداسی رونا نے تب جانے کی اجازت مانگی۔

اُسے رخصت کرتے ہوئے ادیب نے اتنا ہی کہا—

— دیوداسی رونا! اپنا خیال رکھنا... کیونکہ دیولوک کے دیوتا اب تمھیں معاف نہیں کریں گے... پرمتھیو تو اب تک انسان کے لیے آگ چرانے کے جرم میں صدیوں سے سزا بھگت رہا ہے... اب انسان کے مفاد میں جل جامیش کی آواز چرانے کے جرم میں وہ تمھیں کیا سزا دیں گے، یہ سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں... میں تمہاری بہتری کی دعا کرتا ہوں...

نیک خواہشات لے کر دیوداسی رونا روپوش ہو گئی۔

اُسی کے ساتھ دستکوں کا شور بڑھنے لگا۔

ادیب کے کان کے پردے پھٹنے لگے۔ اُس نے دونوں ہتھیلیوں سے کانوں کو دبا لیا۔ پھر اردلی سے بولا—

— کہیں اور چلو... مجھے یہاں سے کہیں اور لے چلو... کہیں بھی۔

— کہاں لے چلوں ادیبِ عالی؟ باہر تو شور اور بھی زیادہ ہے... چیخ پکار، آگ زنی، اجتماعی قتل، زنا، چیخ پکار، اغوا، غیر مولود بچوں کے لوتھڑے، کیڑے پڑے، بج بجاتی پھولی ہوئی لاشیں، بم

زندہ اور مردہ جسموں کا گوشت کھا کھا کر تھکتے ہوئے لگ رہے تھے، کتے، گدھ اور خونریزی کا منظر! یہ تو ہزاروں سال پہلے ہوئے سیلاب سے بھی خوفناک منظر ہے۔

— کچھ بھی ہو... مجھے یہاں سے لے چلو! ادیب نے کہا تو اردلی کو حکم کی تعمیل کرنی ہی تھی۔

وہ ادیب کو ایک ناؤ میں بٹھا کر خون کا سمندر پار کرنے لگا... لیکن اس کا کہیں اختتام ہی نہیں تھا... خون بہت گاڑھا تھا، اس لیے اسے کشتی چلانے میں بہت دقت ہو رہی تھی۔ بہت دور نکل جانے پر اردلی کو اچانک لاشوں کا ایک پہاڑ نظر آیا۔ وہ بھی خون کے سمندر میں جوار چلاتا چلاتا بے حد تھک گیا تھا۔ لاشوں کی ایک چٹان سے اس نے ناؤ باندھ دی۔ ادیب اس چٹان کے سائے میں بیٹھ گیا۔ اس کے کانوں میں کچھ گونجنے لگا... اس نے اشارے سے اردلی کو پاس بلایا اور پوچھا — تمہیں الفاظ کی کوئی بازگشت سنائی پڑ رہی ہے؟

— نہیں حضور...

— لیکن میرے کانوں میں بے شنکر پرساد کے الفاظ گونج رہے ہیں: ہم گری کے اتنگ شکھر پر، بیٹھ شلا کی شیتل چھانہ ایک پروش بھیگے نینوں سے، دیکھ رہا تھا پرلے پرواہ! مجھے میری تہذیب کی دیوی ایلنا کی چیخ بھی سنائی پڑ رہی ہے — وہ چیخ رہی ہے — کیا میری آل اولاد مرنے کے لیے ہے؟ اس طرح کی غیر فطری موت سے مرنے کے لیے ہے؟

اردلی نے اسے غور سے دیکھا۔

— مجھے لاطینی، یونانی کتھاؤں کے دیوتاؤں کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے۔ وہ سیلاب سے بچنے کے لیے اولمپس پہاڑ پر جمع ہو گئے ہیں۔ عیسائیوں کے خدا کہہ رہے ہیں — نوح! زمین پر انسان کی ریاکاری بہت بڑھ گئی ہے۔ میں نے جس انسان کی تخلیق کی ہے، اسے ہی نہیں، میں سارے جانداروں کو مٹا دوں گا، کیونکہ زمین تشدد سے بھر اٹھی ہے۔ جانداروں کے طور طریقے خراب ہو چکے ہیں... میں زمین پر سیلاب لا کر سارے جانداروں کا خاتمہ کر دوں گا... مجھے خوشی ہے نوح کہ میری اس کائنات میں تو اکیلا بااخلاق بچا ہے۔ میں تیری حفاظت کروں گا، اس لیے تو تین تل والے کاٹھ کی ایک کشتی بنا لے اور اس میں داخل ہو جا... اس سیلاب میں صرف تو ہی زندہ رہے گا!

اردلی نے ادیب کو فکر سے دیکھا۔

— یاد ہے تمہیں؟ ادیب نے اردلی سے کہا — زمین کی فنا کے لیے دیوتا جس نے بادلوں کا آسمانی راستہ کھول دیا تھا۔ تب چین میں یونے قیامت کے پانی کے بہاؤ کے لیے راہ بنا کر انہیں سمندر میں بہا دیا تھا اور پیلی ندی کی مٹی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا، تاکہ قیامت کے بعد بیج ڈال

کر انسان کے لیے اناج پیدا کیا جا سکے... یاد ہے تمہیں؟

— نہیں حضور... مجھے تو ایسا کچھ بھی یاد نہیں۔ اردلی نے بے رخی سے کہا۔

— نہ بھی یاد ہو، تو بھی کیا کوئی چین کے یو کی طرح ہمارے دور میں پیدا نہیں ہو سکتا جو اس خون کی قیامت کو روک سکے؟

— حضور... گاندھی جی نے کوشش تو بہت کی تھی، لیکن وہ اکیلے پڑ گئے...

— ہاں... ادیب نے کہا... اس خونی قیامت کے بعد جب بھی آگ کی قیامت آئے گی جو دور نہیں ہے تب ہم گاندھی جی کی اہنسا اور آئنسٹین کی عدامت کی بہت ضرورت پڑے گی۔

— آئنسٹین کون؟

— وہی جنہوں نے قدرت کے راز کو بھید کر توانائی کے متواتر دھاکوں کا سلسلہ کھوج نکالا تھا... محمود علی!... سمجھ میں نہیں آتا ہر عظیم شخص کی زندگی ایک ماتمی گیت کی طرح ہی کیوں ختم ہوتی ہے... کیوں ہر بڑے خیال اور ایجاد کے بعد حیوانوں کا عروج ہوتا ہے؟... جب سیلابی قیامت آئی تھی تب حیوان ہیگر یو ویدوں کو چرا لے گیا تھا۔ تب شرنگی مچھلی نے صرف پانی کے ذریعہ زندگی بسر کرنے والے راجا ستیہ ورت کو زندہ رہنے کا منتر دیا تھا اور اسی شرنگی مچھلی نے راکشس ہیگر یو کا قتل کر کے وید کے علم سے نجات دلائی تھی... لفظ کی حفاظت کی تھی... تبھی قیامت کے بعد ستیہ ورت کو ارادت ملی تھی اور انسانی کائنات کا آغاز ہوا تھا۔ ساری تہذیبیں آبی قیامت کی شاہد ہیں، لیکن اس خونی قیامت کے شاہد صرف ہم ہیں... صرف یہ دھرتی لہو کے اس پہاڑ کو سوکھ کر ہموار بنا رہی ہے۔ لہو کی سطح دھرتی میں سماتی جا رہی ہے... یہ خون اور پانی گھٹ رہا ہے لیکن نہ معلوم اس خونی قیامت کے بعد کائنات کی تخلیق ہوگی یا نہیں؟ ہوگی بھی تو کیسے ہوگی؟

آپ فکر کیوں کر رہے ہیں ادیب عالی... آدی منو ستیہ ورت اور شردھا کی طرح بونا سنگھ اور زینب نے یہ ذمہ داری سنبھال لی ہے...

۱۰

بونا سنگھ نے کپڑوں کا جوڑا لا کر زینب کے پاس رکھ دیا اور پوچھا — نکالوں!

— تم باہر جاؤ، میں نکل آؤں گی...

دھیرے دھیرے زینب ریت کے گڈھے سے نکل آئی۔ اس نے تار تار ہوئی کرتی کو اتارا اور وہیں سنبھال کر رکھ دیا۔ نہ جانے کب ضرورت پڑ جائے۔ گھاگھرا تو اس نے نوچ ڈالا تھا۔ اس میں

نیفے کے سوا کچھ بچا ہی نہ تھا۔ اُسے کھول کر اس نے ایک طرف پھینک دیا۔ پھر اس نے بازار سے لائے بوٹا سنگھ کے کھا گھرے کو دیکھا اور اُسے پہن کر ازار بند باندھنے لگی۔

تبھی اس کی پیٹھ پر بوٹا سنگھ کی آواز آئی — بننے سنورنے میں کیا اتنی دیر لگتی ہے؟

زینب نے وہیں سے کہا — ابھی باہر رہنا — اور کانچلی کو پہلے پیٹ پر ٹھیک کیا پھر باہر جھانکتی چھاتیوں کو اندر دبا دیا۔ کرتی پہن کر اوپر سے اوڑھنی ڈالی۔ تب اس نے آواز لگائی — آ جاؤ!

بوٹا سنگھ اندر آ کر بیٹھ گیا۔ عادت کے مطابق وہ بدبدایا — اونکار... اونکار... ست نام... اس کے ہونٹوں سے آواز تو نہیں پھوٹی تھی، پر زینب نے اندازہ لگا کر کہا — واہے گورو کا ورد کر رہے ہو؟

— کر تو رہا ہوں، لیکن تم نے کیسے جانا؟

— کبھی کبھی ہمارے یہاں سندھ صوبے کے نانگی آ کے ٹھہرا کرتے تھے... انہیں سے سنی تھی واہ گورو کا نام... ہمارے گھر کے اوسارے میں سنگت بھی ہو جاتی تھی۔

— تب تو ٹھیک ہے — بوٹا سنگھ نے بے فکری سے کہا — اگر حکم ہو تو ایک بات کہوں!

— کپڑے پہنا دیے ہیں تو کچھ بھی کہہ سکتے ہو — زینب نے کہا، لیکن اس کی بات میں کوئی پیچ نہیں تھا۔

— نہیں... عورت کے کپڑے تو کوئی مرد اتار دے گا، پر ڈھاڑی کے دو ایک بزرگ کہہ رہے ہیں کہ تم آ ہی گئی ہو تو تم سے بیاہ کر لوں... ساتھ رہ کر دور دور رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔

— جیسی تمہاری اور ڈھاڑی کے بزرگوں کی مرضی! زینب نے کہا۔

— لیکن ایک بات ہے؟

— کیا؟

— میرے سگے بھائی نہیں چاہتے کہ میں شادی کروں!

— تم شادی شدہ ہو کیا؟

— نہیں، شادی تو میری آج تک نہیں ہوئی... جو بھی رشتہ آیا اُسے میرے بھائی ٹالتے رہے۔ اصل میں انہیں میری شادی منظور ہی نہیں تھی۔

— کیوں؟

— ویسے بھی کھیتوں میں پیداوار نہیں ہے۔ جو کچھ ہوتی ہے اُس سے انہیں کے بال بچوں کا پیٹ بھر جائے، یہی کافی ہے۔ میری شادی ہوتی، بال بچے ہوتے تو غریبی اور بڑھ جاتی... کھیتوں کا بٹوارہ ہوتا۔ زندہ رہنے کی مارا ماری میں کچھ بھی ہو سکتا تھا... اسی لیے وہ لوگ ہماری شادی کے

خلاف ہیں... کہہ کر بوٹا سنگھ ریت کو ہتھیلیوں میں اٹھا اٹھا کر چھاننے لگا۔

— تم پریشان مت ہو! زینب نے کہا — میں بغیر شادی کے بھی تمہارے ساتھ بھری پوری زندگی گزار لوں گی۔ اولاد تو بعد کی بات ہے۔ تم اپنے بھائیوں کی وجہ سے شادی نہیں بھی کرو گے، تو بھی مجھے تمہارے ساتھ رہنا منظور ہے!

— نہیں زینب... میں تم سے شادی کروں گا! نہیں تو میں تازندگی ہر رات تمہیں ریت کے گڈھے میں گاڑ کر تمہارا ساتھ دوں گا...

— آمین! زینب نے اپنی ہتھیلیاں آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

اور تب گاؤں کے بڑے دوشالی سنگھ نے یہ ضروری سمجھا کہ بوٹا سنگھ اور زینب کی شادی ہو جانی چاہیے۔ بوٹا سنگھ کے بھائی بھابھیوں نے یہ سنا تو اُن کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ دوشالی سنگھ کے پاس سمجھانے بجھانے اور شادی کی مخالفت کرنے پہنچے۔ بزرگوں نے نہیں مانا بلکہ انہیں ڈانٹ بھی دیا... کیسے بھائی بھابی ہو تم لوگ... اپنے مفاد کی وجہ سے اُسے بغیر بیاہ کے رکھا۔ اب ایک عورت اس کے گھر آ ہی گئی ہے تو شادی بیاہ کر کے اس کا ساتھ ساتھ رہنا سہی ہوگا۔ آخر عورت کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے...

بزرگوں نے زینب کی عزت رکھی۔ بھائیوں کی مخالفت پر کان نہ دے کر، انہوں نے پاس گاؤں کے گوردوارے میں دونوں کو لے جا کر گورو گرنتھ صاحب کو شاہد بنایا اور بوٹا سنگھ کی زینب کے ساتھ شادی ہو گئی۔

واہے گورو کی کرپا ہوئی۔ وقت آنے پر زینب نے بوٹا سنگھ کو ایک ننھی منی بیٹی کا باپ بھی بنا دیا۔ دونوں نے مل کر بٹیا کا نام تنویر کور رکھا۔

جس سال بٹیا تنویر پیدا ہوئی، اُن سردیوں نے ایک بہت ہی خوبصورت نظارہ دیکھا۔ شمال کے ملکوں سے اُڑ کر ہزاروں لاکھوں پنچھی اُن کے دیس میں آئے تھے...

11

اس وقت جب زینب اپنی زندگی کا فیصلہ ریگستان کی اس ڈھاڑی میں کر رہی تھی، اس سے پہلے ہندوستان کا آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن دلی میں وائسرائے ہاؤس کے ذاتی خواب گاہ میں اپنی بیوی ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن سے گھٹی گھٹی آواز میں غصے میں کہہ رہا تھا — تم تقسیم کے ستائے، برباد ہوئے، مارے گئے لوگوں کی حمایت کرو... سامراجیوں کی تاریخ میں یہ معمولی واقعات ہیں...

اور سنو ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن! تم اب ایڈوینا ایشلے نہیں ہو... تم انڈیا کے وائسرائے اور گورنر جنرل کی شادی شدہ بیوی ہو... اس لیے برٹش سامراج کی روایتوں پر عمل کرو... مہاجرین کی تکلیف اور ہمارے فیصلے کے تحت بنائے گئے پاکستان کی سرحد پر جو قتل و غارت گری ہو رہی ہے، اُس پر آنسو بہانا بند کرو... برٹش سامراج آنسوؤں کی مداخلت کو منظور نہیں کرتا۔

— برٹش سامراج کے پاس آنسو نہیں ہے... یہ مجھے معلوم ہے... لیکن لوئس! تقسیم کا جو المیہ، غیر انسانی المیہ تم نے پیدا کیا ہے، اُسے دیکھ کر ایلپس اور پرینیز کی پہاڑی چٹانیں بھی رو پڑتی... ایڈوینا نے کہا — لوئس! کیا تمہاری عیسائیت کی رحم دلی بالکل مر گئی ہے؟

— رحم، رحم کی بات چھوڑو ایڈوینا! اور سنو... ان ہندوستانی مہاجروں اور مردوں کے لیے تمہاری آنکھوں میں جو آنسو آتے ہیں وہ برٹش شاہی خاندان اور برٹش نسل کے لیے داغ ہیں۔ انہیں سکھانے اور راحت پانے کے لیے تم بھارت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کے کندھے پر سر رکھ کر، ان کے سینے سے چپک کر برٹش سامراج کی پشیمانی کا اظہار کرو، یہ مجھے بالکل برداشت نہیں...

— ڈکی! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ ایڈوینا نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس کے گھریلو نام سے پکارا، جو بچپن میں ان کی بڑی بہن، عظیم برطانیہ کی ملکہ نے انہیں دیا تھا۔

وائسرائے لارڈ لوئی نے خود کو سنبھالا۔

اپنی بڑی خوفناک اور دل کو دہلا دینے والے خون سے لپٹے المیے میں شاہی اخلاق کے رومال نہیں، دوستوں اور اجنبیوں تک کے کندھے کام آتے ہیں... سمجھے ڈکی! ایڈوینا نے ترشی سے کہا۔

انہیں لگا کہ وہ جو کچھ کہہ گئے تھے، شاید وہ مناسب نہیں تھا، اس کا احساس انہیں ہوا۔ انہوں نے ایڈوینا کو شرمسار نظروں سے دیکھا۔ ایڈوینا نے انہیں۔ تب وہ بولے — ایڈوینا... سچ تو یہ ہے کہ اتنی قتل و غارت دیکھ کر میں بھی پریشان ہوں... دوسری عالمی جنگ میں برما کے فرنٹ پر بھی اتنا خون خرابہ نہیں ہوا تھا، جتنا اس تقسیم میں ہوا اور ہونے جا رہا ہے... میں انڈیا کو متحد رکھنا چاہتا تھا... مہاتما گاندھی، نہرو، پٹیل، غفار خاں اور یہاں تک کہ جناح بھی تقسیم کے مسودے کو لے کر اداس تھے...

— جناح بھی! ایڈوینا نے تعجب سے کہا — یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

— ہاں ایڈوینا... ہاں!

— لیکن ۲ جون والی تمہاری میٹنگ میں تو جناح نے کیبنٹ مشن پلان کو نامنظور کرتے ہوئے ہندوستان کے اتحاد کی تجویز کو ٹھکرا دیا تھا... انہیں تقسیم چاہیے تھا اور تقسیم کے سوا اور کچھ نہیں۔

— یہی تو المیہ ہے... پہلی جنگ عظیم کے بعد مجبوراً ہی سہی سامراجیت کو زیادہ فراخ دل اور ذمہ دار بننا پڑا ہے... اور گاندھی کے ساتھ دنیا میں پہلی بار جو عوامی تحریکیں شروع ہوئی ہیں انہوں نے اقتدار کے مرکز کو بدل دیا ہے۔ گاندھی نے پہلی بار اقتدار کو حاصل کرنے کے جواز کے طور طریقے کو شاہی خاندان سے چھین کر عوام کو سونپ دیا ہے۔ یہیں سے اس دنیا کا روپ بدلنا شروع ہوا ہے...

ایڈوینا نے سوالیہ نگاہوں سے لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن کو دیکھا۔

— یہیں سے دشواریاں پیدا ہونی شروع ہوئیں... کوئی حکمراں اپنے فیصلوں کو کئی بہانوں اور طریقوں سے بدل سکتا ہے۔ وہ وزیر اعظم، سینیٹ یا اصلاح کاروں کا سہارا لے کر اپنی عزت بچا سکتا ہے... لیکن عوام کے لیڈروں کی جڑی جماعت آئی ہے وہ اپنے عوامی مطالبے میں جو کچھ کہہ جاتی ہے، اُن سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی... یہی محمد علی جناح کا المیہ اور ٹریجڈی ہے۔ انہوں نے ایک بار عوامی طور پر انڈیا کے تقسیم کی مانگ کی تو پھر ان کا دل چاہے جتنا افسوس کرتا رہے، لیکن وہ اس مانگ سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے... ہٹیں گے تو وہ اپنی لیڈرشپ کھو دیں گے... کسی نیتا کو یہ گوارہ نہیں ہوتا۔ عوام کے جذبات کو ابھار کر پیدا کی گئی تحریکوں کی یہی طاقت اور کمزوری ہے... ایک بار جو کہہ دیا گیا وہ بعد میں چاہے غیر مناسب اور غلط لگے، پر اُسے بدلا نہیں جا سکتا... اگر بدلا گیا تو فرسودہ اور گھٹیا طاقتیں تبادل خیال کی دشمن بن کر سامنے آجاتی ہیں... ایڈوینا! میں گواہ ہوں... یہی جناح کے ساتھ ہوا ہے! انہوں نے بڑی شدت سے پاکستان مانگا اور جب تمام امکانات کو تلاش کرنے اور خارج کرنے کے مشکل عمل سے گزرنے کے بعد میں۔ نے اُن کے سامنے پاکستان اور تقسیم کی تجویز رکھی تو وہ خاموش اور اداس تھے... انہوں نے نہ ہاں کیا، نہ نا کیا!

— تب؟

— تب میں نے ان سے کہا تھا کہ آخر میں نے انہیں وہی دیا ہے جو انہوں نے مانگا ہے... اور میں نے تقسیم کی ضرورت کو پنڈت نہرو، سردار پٹیل، آچاریہ کرپلانی سے منظور کرا لیا ہے۔ اتنا ہی نہیں، تقسیم سے جن سکھوں کو سب سے زیادہ تکلیف اور نقصان اٹھانا پڑے گا، اُن کے نیتا سردار بلدیو سنگھ کو بھی میں نے بالآخر راضی کرا لیا ہے، تو اب انہیں پاکستان کی تشکیل کے تاریخی موقع سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے... تقسیم کو منظور کرنا چاہیے!

— تب... تب انہوں نے کیا کہا؟

— تب کچھ پلوں تک وہ خاموش رہے، پھر انہوں نے پوچھا — کیا گاندھی تقسیم کو منظور

کرتے ہیں؟ تو میں نے کہا تھا، مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ منظور کریں گے... تقسیم کے فیصلے کو لے کر گاندھی ہی سب سے بڑا مسئلہ ہیں... اگر آپ، لیاقت علی، خان، عبدالرب نشتر یہ تقسیم منظور کر لیں تو انڈیا کی آزادی کا مسئلہ ابھی اور یہیں حل ہو سکتا ہے۔

— اس پر ان کا کیا ردِعمل تھا؟

— انھوں نے کہا کہ اپنی پارٹی مسلم لیگ سے صلاح مشورہ کرنے سے پہلے وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تب مجھے ناراضگی سے کہنا پڑا تھا کہ مسلم لیگ تو خود آپ ہی ہیں۔ آپ کے بغیر مسلم لیگ کہاں ہیں؟ اس دلیل کے بعد بھی جناح خاموش رہے...

تاریخ رکی ہوئی تھی۔ اُسے کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ پوچھتا تو انسان ہے، تاریخ نہیں۔

گل قاسم جان میں اپنے نصیب کو کوستا ستار بیٹھا ہوا بحث کر رہا تھا— پاکستان تو بن گیا... اب جناح صاحب خاموش رہیں یا بولیں... کیا فرق پڑتا ہے۔ جس دن رام دیال میرے سلام کا جواب دیے بنا، کترا کے نکل گیا، میں جان گیا تھا، پاکستان بننے کی شروعات ہو گئی ہے...

— وہ ٹھیک ہے... لیکن ان انگریز کے بچوں کو سوچنا چاہیے... صدیوں پہلے سوداگروں کی طرح سلام کرتے آئے تھے، ویسے ہی سلام کرو اور اپنے ملک لوٹ جاؤ... جو کما لیا وہ تمہاری قسمت... لے جاؤ... پر جو ہمارا ہے وہ تو خوشی خوشی چھوڑ جاؤ...

— اور کیا... ریاستوں نوابوں کے جھگڑے تو تب بھی تھے، جب تم آئے تھے۔ اب چودھری بن کر تمہیں جھگڑے سلجھانے کا کیا حق؟ ارے بھئی، تم ہمیں خدا کے حوالے چھوڑو، دعا سلام کرو اور جاؤ!

— کبھی کبھی کانگریس کے مہاتما گاندھی جی کھری بات کہہ دیتے ہیں... وہ بھی بالکل یہی کہہ رہے ہیں... نجمل نے کہا۔

— سنا ہے ووٹ پڑے گا تب ہی پاکستان بنے گا... مہاتما جی کی بات تو ہندو بھی سنتا ہے اور تھوڑا بہت مسلمان بھی... مزہ آ جائے اگر مہاتما جی ہندوؤں کا سارا ووٹ پاکستان کی خاطر ڈلوا دیں، تب جناح صاحب کیا کریں گے؟

— جب جناح صاحب جہانگیری چھوڑ کر اپنی بیرسٹری کرنے کی خاطر بمبئی لوٹ جائیں... اور کیا...

— تو ہم بھی سوچ رہے ہیں، اپنے گنگولی لوٹ جائیں... حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔ یہاں کون بسا لائے ہیں، اُسے تو کوئی بھی لوٹ سکتا ہے... پر گنگولی کی ہماری زمین تو کوئی نہیں لوٹ

سکتا۔ نہ معلوم جناح صاحب کیا کروا کے رہیں گے!

اور دوسرے ہی دن ستار نے غازی پور والی گاڑی پکڑ لی۔

●●

وقت پھر پریشان اور فکرمند عوام کے درمیان سے اٹھ کر وائسرائے ہاؤس کے شاندار اسٹڈی میں پہنچ گیا۔ وہاں وائسرائے ماؤنٹ بیٹن اور محمد علی جناح موجود تھے۔ اُن کی طرف دیکھتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن نے کہا— آپ کل تک اپنی مسلم لیگ سے مشورہ کر لیجیے...

— مسلم لیگ سے مشورہ کرنے میں مجھے کم از کم ایک ہفتہ لگے گا... جناح نے کہا۔

— دیکھیے مسٹر جناح... فیصلہ لینے میں اتنا وقت برباد نہیں کیا جا سکتا...

— لگتا ہے آپ ہم سے زیادہ جلدی میں ہیں!

— آپ جو بھی کہیں، دیکھیے آج ۱۹۴۷ء کے جون مہینے کی ۲ تاریخ ہے اور میں کل ۳ جون کو ہندوستان کے تقسیم کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں... آپ پاکستان مانگ رہے تھے۔ ہم آپ کو پاکستان دے رہے ہیں۔ دنیا جانتی اور مانتی ہے کہ پاکستان کبھی نہیں بن سکتا... لیکن برٹش کراؤن طشتری میں پاکستان رکھ کر آپ کو پیش کر رہا ہے... اب آپ جھجک کیوں رہے ہیں؟

جناح صاحب خاموش رہے۔ وہ کچھ نہیں بولے۔

— کل کی میٹنگ میں کانگریس کی طرف سے پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور آچاریہ کرپلانی موجود رہیں گے۔ سکھوں کے نمائندے بلدیو سنگھ موجود ہوں گے۔ آپ کے ساتھ لیاقت علی خاں اور عبدالرب نشتر مسلم لیگ کی نمائندگی کر رہے ہوں گے... آپ کے سامنے ان کو بولنے کی ہمت نہیں پڑے گی۔ میں انڈیا کے تقسیم کا منصوبہ پیش کروں گا، تب تک بھی آپ اگر اپنے یکبارگی جاگ اٹھے ضمیر کی آواز کی وجہ سے کھلے الفاظ میں تقسیم منظور نہ کر سکیں، ہاں نہ کہہ سکیں، تو آپ کسی بھی انداز میں اپنے سر کو تھوڑی سی جنبش دے دیں... اس جنبش کے معنی کیا ہیں، یہ میں طے کر دوں گا!

جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ شطرنج کی اپنی بازی میں وہ انگریزی حکومت کے اقتدار کے مہرے بن گئے ہیں۔ انہیں انہیں کا لفظ سونپا جا رہا تھا... پاکستان!

وقت گواہ ہے... جناح کی رگوں میں بہتا خالص ہندوستانی خون جم گیا تھا اور انھوں نے اچانک محسوس کیا تھا کہ آپسی ضد، چھوٹی چھوٹی ذلت اور رقابت کی انا سے پیدا خلش کیسے ایک جنون بن جاتی ہے اور وہ قوم کے خواب کو توڑ کر ذاتی مقابلے کو چھپاتے ہوئے اپنے طرفداروں کو کیسے

ایک سطر ور اور مذہبی جنون کا خواب سونپ دیتی ہے!

وقت نے اعلان کیا— اس وقت جناح صاحب کی روح اُن کے جسم سے نکل کر اپنی بیوی رتی کی قبر پر چپ چاپ کھڑی تھی۔ روح کچھ بولی تو نہیں، لیکن اس کا وہاں ہونا ہی بولتا تھا... اسی قبرستان میں ان کی روح کی ملاقات گوپال کرشن گوکھلے کی روح سے ہوئی تھی۔ دونوں روحیں ایک دوسرے کو صرف تاکتی رہی تھیں... پھر یہ تو تاریخ کا تقاضہ تھا کہ ۱۹۴۷ء کی تاریخ ۳ رجون کو جناح کی روح کو لوٹنا پڑا اور جب ماؤنٹ بیٹن نے انڈیا کے تقسیم کی تجویز الگ الگ پارٹیوں کے سامنے پیش کی تو جناح صاحب نے نا کیا اور نہ ہاں۔ انہوں نے اپنے چہرے کی ٹھوڑی کو جنبش دے کر صرف آدھا انچ نیچے کیا اور اسی انداز میں بیٹھے رہے...

••

اسی وقت ادیب نے دیکھا— گنگولی سے گھبرایا ہوا راہی معصوم رضا اس کی طرف طوفان کی طرح بھاگتا چلا آرہا ہے... ادیب نے اُسے بانہوں میں لے کر سنبھالا اور پوچھا کہ کیا ہوا؟ راہی کی ہانپتی سانسوں نے تھوڑی سی راحت لیتے ہوئے بتایا—

— سنو... سنو... وہ آٹھ دس سال کا بچہ دُلن کیا نعرہ لگاتے ہوئے گھر میں داخل ہوا ہے...

— لے کے رہیں گے پاکستان!

— کیسے لے بے پاکستان؟ پھُنن میاں نے آنکھیں تریر کر سوال کیا۔

— علی گڑھ والن سے! دُلن نے کہا۔

تو کلثم نے ٹہوکا لگایا— ارے، اوئی جو علی گڑھ سے آئے رہے... کالی شیروانی والے۔ وہ انگلیوں میں سگریٹ دبائے ہاتھ گھما گھما کر میاں لوگ کو بتا رہے تھے کہ قرآن شریف میں کہاں کہاں اللہ میاں نے مسلم لیگ کو ووٹ دینے کا حکم دیا ہے...

اور اُدھر آم کے باغ میں کتھا چل رہی تھی... تین برس پہلے بیوہ ہونے کے بعد مسلمان ہوئی تجو بوا بولی— تلک دھاری پنڈت نے بتایا کہ جب بھگوان کرشن نے ارجن سے کہا، ہے ارجن! ہوں تو میں ہوں... میرے سوا کوئی اور نہیں ہے... اور آج گیتا کا وہی مرلی منوہر بھارت کے ہر ہندو کو پکار رہا ہے کہ اٹھو اور گنگا جمنا کے مقدس کنارے سے ان ملیچھ مسلمانوں کو ہٹا دو...

— یہاں سے ہٹ کر ہم لوگ کہاں جائے کے پڑی؟ پنڈت جی کا اعلان سننے کے بعد ایک ادھیڑ مسلمان بھاتی نے اپنے ہندو لنگوٹیا یار سے پوچھا۔ دونوں بچپن کے گہرے دوست تھے، ساتھ

بیٹھے ہوئے تھے۔ تب اس نے بچپن کے ہندو دوست سے کہا تھا— اب یہاں [illegible]
اور پھر کرشن بھگوان کا حکم ہے کہ تم کو گنگا جمنا کے کنارے سے ہٹا دیا جائے، تو ہٹنا پڑے گا... او جناح صاحب کا پاکستان تو بن ہی رہا ہے... آرام کی زندگی کاٹنے کے خاطر اُدھر ہی چلا جا...

— تم تو کہہ دیا— چلا جا... لیکن پاکستان جائے کا کرایہ بھاڑا بھی جٹ گیا، تو بھی ای ہمار کھیتوا کئی سے جائی پاکستان؟

— ای تو بہت بھاری مسئلہ ہے... پاکستان بن ہی گیا تو بھاتی کا کھیتوا کئی سے جائی پاکستان؟

ہاں، اب دیکھو نا... بھاتی بولا— جنگی تو یہاں گجرل، اب مرے کنارے اکیلت پاکستان جائیں؟

اب چاہے قرآن شریف کی آیت بولے یا ٹھرے گیتا کے کسن بھگوان... ہم تا نا جائب پاکستان...

••

اسی وقت دوسری عالمی جنگ کے بعد تنو میجر حسن بن کر گنگولی لوٹ رہا تھا۔ سنا تو اس نے بھی تھا کہ اگر بٹوارہ ہوا تو فوج کا بٹوارہ بھی ہوگا۔ اصل میں جنگ ختم ہوتے ہوتے اٹلی کے مورچے پر دشمنوں نے اسے جنگی قیدی بنا لیا تھا، اس لیے اس کے چھوٹنے اور لوٹ کر آنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔

نیل کے پرانے گودام کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر اس سے یکے پر نہ بیٹھا گیا۔ وہ یکے سے کود پڑا۔ یکے والے نے لگام کھینچ لی۔ گھوڑا اس بوڑھے راستے پر رُک گیا۔

— تم چلو... میں آتا ہوں! تنو نے کہا۔

گنّے کے کھیتوں سے ہوا سرسرا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔

سامنے ہی پھسو میاں کی کھمپیا تھی۔ بند دروازوں سے زنانے امام باڑے میں جلنے والے پٹرومیکس کی روشنی جھانک رہی تھی۔ دالان میں دو پلنگ تھے اور اُن سے ملی ہوئی کچھ آرام کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس دالان کو دیکھنے کے بعد تنو کے لیے دھیرے دھیرے چلنا ناممکن ہو گیا۔

— پھسو چا آداب! اس نے دور سے ہی نعرہ لگایا۔

— جیتے رہو! کہتے ہوئے انہوں نے اُسے لپٹا لیا۔

اور تب ایک ساتھ سب نے سب کو یاد کیا۔ تنو کے ابا مرحوم کو یاد کیا گیا... آج بھائی صاحب

ہوتے تا کی سے خوش ہوتے! اسلو کا ذکر بھی ہوا۔ دادا جواد میاں اپنی داڑھی پھٹکارتے ہوئے آئے۔ چھوٹی دادی بی تو تھیں ہی۔ اندر گیا تو انہوں نے اُسے لپٹا لیا۔ سلو کی ماں سکینہ نے چٹاچٹ اس کی بلائیں لیں۔ پھر سلمیٰ، کبریٰ، سیدہ، ام لیلیٰ کنیز، رباب اور مہ جبین نے اسے سلام کیا اور آخر میں چھوٹی دڈا نے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا — اچھا، اب تم ہی بتاؤ کہ لڑنیا بالکل ختم ہو گئی کہ کوئی کور کسر باقی ہے ابھیں؟

— جی، لڑائی بالکل ختم ہو گئی! متو نے چھوٹی دڈا کو پورا دلاسہ دیا۔

● ●

صبح اٹھا۔ ناشتہ کیا اور ہاتھ دھو کر باہر چل دیا۔ وہ آگے بڑھا تو داہنے طرف بنسواڑی کے پاس لڑکوں کا ایک غول 'مسلم لیگ زندہ آباد' کا سبق یاد کر رہا تھا... گلا پھاڑ پھاڑ کر۔ متو ان بچوں کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ لڑکوں کے اس جلوس میں کئی ہندو لڑکے بھی تھے اور وہ بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر مسلم لیگ کو جیتنے کی دعا دے رہے تھے۔

— ای کون قسم کا پاکستان بن رہا ہے بھائی؟ متو نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو لڑکے نعرے لگاتے بنسواڑی کے شمال کی طرف بھاگ گئے۔ آوازیں آتی رہیں —

— نعرۂ تکبیر!

— اللہ اکبر!

— قائداعظم!

— زندہ آباد!

— مسلم لیگ!

— زندہ آباد!

اور یکبارگی متو نے دیکھا کہ وہ حکیم صاحب کے بڑے پھاٹک میں ہے۔ اس نے جلدی سے حکیم صاحب کو آداب کیا۔ یہاں اتر مئی کے تمام لوگ موجود تھے۔ ساتھ میں موجود تھے علی گڑھ سے آئے کالی شیروانی والے دو لوگ۔ بات چیت چل ہی رہی تھی۔ کالی شیروانی بول رہی تھی —

— اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دنیا کے نقشے پر ایک اور اسلامی حکومت کا رنگ چڑھ جائے گا... اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ دلّی کے لال قلعے پر ایک بار پھر سبز اسلامی پرچم لہراتا نظر آئے...

متو کو پاکستان کے بننے نہ بننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ایک چارپائی کی پائتی پر ٹک گیا۔

— سن رہیں کہ جناح صاحب شیعہ ہیں! نہ معلوم کس نے کہا۔

— مسلمان ہیں! کالی شیروانی بولی۔

تبھی دوسری شیروانی نے کہا — بیٹے قبلہ! اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہے۔ آج اس رسی کا نام محمد علی جناح ہے۔ آپ اللہ کی طاقت ہیں... اٹھیے اور کہیے کہ آپ پاکستان بنانا چاہتے ہیں۔

... متو کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

کالی شیروانیوں نے اسے الجھن سے دیکھا۔

— دیکھیے... میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں... یہ سرکاری مسلمانوں کا محلّہ ہے، لیگ کے علاوہ اور کسے ووٹ دے سکتا ہے... متو نے شیروانیوں سے کہا — یہ سب تو سرکار پرستی کی وجہ سے لیگ کو ووٹ دیں گے، لیکن آپ اَن پڑھ مسلمان کلثم کا ووٹ نہیں لے سکتے! وہ اپنے بیٹے کا صحیح نام نہیں لے سکتی۔ وہ ممتاز کو متاج کہتی ہے۔ وہ بہت شریف لڑکا تھا۔ آپ اُسے کیا جانیں؟ وہ سوامی سہجانند اور راہل سانکرتیاین کے کسان تحریک میں شامل تھا۔ وہ قاسم آباد کے تھانے پر گولی کھا کر مر گیا۔ میں تو کسان تحریک کی لڑائی کے وقت یہاں پر نہیں تھا۔ میں تو برطانیہ کی فوج میں تھا۔ سنا ہے تحریک کے دوران ممتاز بڑی بہادری سے مرا۔ یعنی جب اُسے یقین ہو گیا کہ لگی ہوئی گولی کھا کر وہ بچے گا نہیں، تو موت سے ڈر کر وہ رویا یا اسپتال لے جانے کے لیے گڑگڑایا نہیں۔ اس نے فائرنگ کے دوران بھاگتے ہوئے ایک آدمی کا دامن پکڑ لیا اور کہا — اے بھیا! گنگولی جیو تو کہہ دیہو امرے اتا سے کہ ہم مر گئے... 'اس پیغام میں چھپے دھرتی کے درد کو آپ نہیں سمجھ سکتے... آپ کے جناح صاحب مالابار ہل کی جو عمارت چھوڑ کر پاکستان جائیں گے تو بہتر عمارت بنوا لیں گے... اگر وہ چاہیں گے تو اپنی بیوی رتی کی قبر اکھاڑ کر پاکستان لے جائیں گے، کیونکہ اُن کا کوئی رشتہ زمین سے نہیں ہے، لیکن کلثم تو اس زمین میں صدیوں سے دفن بزرگوں اور قاسم آباد تھانے پر مرے اپنے بیٹے متاج کی قبر اٹھا کر پاکستان نہیں لے جا پائے گی! اگر ساری قبریں لے گئے تو ہندوستان کا پورا آنگن اکھڑ جائے گا... تب مسلمان کو کتنا چھوٹا ملک تو مل جائے گا، لیکن وہ گھر آنگن سے محروم رہ جائے گا! کیا یہی چاہتے ہیں آپ لوگ! بولیے... کیا یہی چاہتے ہیں آپ لوگ؟

کالی شیروانیوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

متو اور بھڑک اٹھا۔ آپ جان کا ڈر پیدا کر رہے ہیں... ڈر کی یہ فصل ہمیں ہی کاٹنی پڑے گی...

اسی لیے میں بہت ڈرتا ہوں...

— ڈرنے کی کیا ضرورت ہے... آخر آپ محمد بن قاسم کے وارث ہیں... کالی شیروانی نے

جملے بازی کا داؤں چلایا۔

— میں وہ نہیں ہوں! اچھو نے کالی شیروانی کی بات کاٹی — میں مسلمان ہوں لیکن مجھے اس گاؤں سے محبت ہے... کیونکہ میں خود یہ گاؤں ہوں۔ میں نیل کے اس گودام، اس تالاب اور ان کچے راستوں سے پیار کرتا ہوں...

موجود لوگوں نے اچھو کی طرف دیکھ کر جیسے حامی بھری۔

— میدانِ جنگ میں میں نے موت کا رقص دیکھا ہے... جب موت بہت قریب آ جاتی تھی تو مجھے اللہ ضرور یاد آتا تھا، لیکن مکہ معظمہ یا کربلائے معلیٰ کی جگہ مجھے گنگولی یاد آتی تھی... اور میں یہ سوچ کر جھلا جاتا اور رونے لگتا تھا کہ اب شاید میں نیل کے گودام پر بیٹھ کر گپ نہیں کھا سکوں گا اور اب شاید مجھے آٹھویں کی مجلس کا حلوہ نہیں ملے گا۔ اللہ تو ہر جگہ ہے۔ پھر گنگولی اور مکہ اور نیل کے گودام اور کعبہ ہمارے پوکھرے اور آبِ زم زم میں کیا فرق ہے؟

— آپ ہی جیسے لوگ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھ بیچ ڈالیں گے! کالی شیروانی بگڑ گئی — آپ کو شرم نہیں آتی! آپ مکہ شریف سے اس جھلل گاؤں کا مقابلہ کر رہے ہیں!

— جی ہاں، کر رہا ہوں! اچھو نے کہا — اور مجھے شرم بھی نہیں آتی... اور شرم کیوں آئے؟ گنگولی میرا گاؤں ہے۔ مکہ میرا شہر نہیں ہے۔ یہ میرا گھر ہے اور کعبہ اللہ میاں کا۔ خدا کو اگر اپنے گھر سے پیار ہے تو کیا وہ معاذ اللہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ہمیں بھی اپنے گھر سے اتنا ہی پیار ہو سکتا ہے!

— اے بیٹا! تو تو کوفر بولے لگیو! حکیم صاحب نے بگڑ کر کہا — ای کا کر رہا ہے بے حرام زادے! کعبہ پھیرو کعبہ ہے بیٹا!

— میں کب کہتا ہوں کہ وہ کعبہ نہیں ہے، لیکن لاہور تو کعبہ نہیں ہے نا؟! اس نے سوال کیا — دیکھئے چچا، جو کچھ میں نے باہر دیکھا ہے وہ آپ نے نہیں دیکھا ہے۔ اسی لیے جو کچھ میں دیکھ سکتا ہوں، آپ نہیں دیکھ سکتے... نفرت اور خوف کی بنیاد پر بننے والی کوئی چیز مبارک نہیں ہو سکتی...

۱۲

— مبارک ہو! عبدالرب نشتر نے وائسرائے کے کمرے کی کانفرنس میز پر پڑی طشتری میں سے کچھ دانے اٹھا کر لیاقت علی خاں کے منہ میں بطور مٹھائی رکھ دیے — مبارک ہو!

جناح صاحب نے خاموشی سے ڈیڈ سگریٹ ہولڈر نکالا اور کیریوین اے سگریٹ اس میں لگا کر چپ چاپ پینے لگے۔

••

بھنگی کالونی، شام ہو رہی تھی۔ پرارتھنا سبھا سے پہلے گاندھی جی ٹہل کر لوٹے تھے۔ ایک رضا کار چھانوے سے ان کے بھیگے اور تھکے پیروں کی دھول صاف کر رہی تھی۔ تبھی ایک ادھیڑ کھدر دھاری نے آ کر اطلاع دی — باپو! تقسیم ہو گیا ہے...

گاندھی جی نے گہری سانس لی۔ اپنا تھکا پیر کھینچ لیا۔ پھر سوکھے گلے میں ایک گھونٹ سا لے کر وہ آہستہ سے بولے — اچھا ہوا... وہ میرے جسم کو بانٹ لیتے... ایشور انہیں عقل سلیم دے! کہہ کر انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔

جیسے باپو کہہ رہے ہوں — غلط فیصلوں سے تشدد پیدا ہوتا ہے اور تشدد سے عدم تہذیب اور خونریزی...

۱۳

عدالت کے دروازے پر تبھی خون آلود دستکیں پڑنے لگیں۔

وہ دستکوں سے پریشان تھا۔ پریشان نہیں پاگل اور پھر دستکوں پر دستکیں۔ مغربی سرحدوں سے Ak-47 چینی رائفل نے دستک دی۔

عدالت نے پوچھا — تم کون ہو؟

انہوں نے جواب دیا — ہم کشمیر میں ہندو ہیں لیکن ہندوستان میں کشمیری کہلاتے ہیں۔

تبھی شمال مشرق سے تڑتڑاتی ایک گولی آئی۔ الفا دہشت گردوں نے دستک دی۔ چائے باغان سے یہ دستک آئی تھی۔ تب تک ۱۹۸۴ء کی ہوائیں دستک دینے لگیں۔ دکن سے نکسلیوں نے دستک دی۔ ساتھ ہی ہم چناؤ کے بیس مردے دستک دینے لگے۔ بٹالہ بس حادثے کی لاشیں چیخنے لگیں... پھر لوک سبھا نے دستک دی — گزشتہ ایک سال میں جو دس ہزار لوگ فرقہ وارانہ فسادات میں مرے تھے، وہ کھڑے ہو کر شور مچانے لگے... جمہوریت بحالی کے حامی نیپالی شہید دروازے اور دیواریں پیٹنے لگے۔ لنکا کے لٹے والوں نے پیچھے سے دستک دی۔ کراچی کے فسادات میں مارے گئے لوگ ابھی کھڑے ہی تھے کہ ان کی قطار میں تازہ مردے شامل ہو گئے... عدالت ان کی بات سنتی، اس سے پہلے سمرن جیت سنگھ مان تلوار لے کر آ گئے... اس نے تلوار سے ٹھوکا دیا۔ جامع مسجد سے عبداللہ بخاری نے دستک دی — اگر بابری مسجد گرائی جائے گی تو خون کی ندیاں بہا دی جائیں گی! اس شاہی امام کا یہ اعلان ہے۔

تب رکشے والے نے عدالت کا کونہ کھینچتے ہوئے کہا— شاہ تو چلے گئے، شہنشاہی ختم ہوگئی پر یہ اب تک شاہی امام بنے کیسے بیٹھے ہیں؟

دستکیں دیتے ہاتھ ہنس پڑے۔ عدالت نے تاکید کی— خاموش! ہنسی تو خاموش ہوگئی لیکن دستکیں تو خاموش نہیں ہوئیں۔

اور عدالت کے ایک کونے میں پڑے شہاب الدین نے اپنی کھانسی سے دستک دی... جو انڈیا مسلم نہیں 'مسلم انڈیا' رسالہ نکالتے ہیں اور اپنی 'انصاف پارٹی' کی لاش سینے سے لگائے ہوئے تھے۔

عدالت نے شہاب الدین سے پوچھا— تم یہاں کیسے؟

— ان دنوں میری حالت مردوں سے بدتر ہے! مجھے کچھ کہنا ہے! اتنا کہہ کر شہاب الدین پھر کھانسنے لگے۔ عدالت کھانسی کا جواب نہیں دیتی... لیکن اس کھانسی میں بیماری کے جراثیم تھے، اس لیے وہ کھانسی بھی دستک بن گئی تھی۔

تبھی چیخ چیخ کر وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے نیتا دستک دینے لگے... رام جنم بھومی مندر بن کر رہے گا... بلکہ ہم کرشن جنم بھومی اور کاشی وشوناتھ کے مندر کو بھی چھڑا کر دم لیں گے!

ادیب کی عدالت نے حکم دیا— عدالت کی کھڑکیوں اور روشن دانوں کو بھی کھول دیا جائے تاکہ کسی دستک کو اندر آنے میں دقت نہ ہو!

یہ اعلان ہوتے ہی ہندوستان مشین ٹولس H.M.T سری نگر کے جنرل منیجر ایچ۔ایل کھیڑا کی لاش حاضر ہوئی۔ وہ لاش چھ گولیوں سے چھلنی تھی اور خون سے تربتر۔ آتے ہی وہ چیخنے لگا— مجھے دوپہر ڈیڑھ بجے مارا گیا ہے۔ مجھے بٹ مالو علاقے میں لایا گیا، کار سے اُتار کر مجھے چھلنی کر دیا گیا۔ روبیہ سعید کا باپ تو وزیر داخلہ مفتی محمد سعید تھا... کیا اس ملک میں میرا کوئی باپ نہیں ہے؟

عدالت نے کہا— یہ کھیڑا پاگل ہو گیا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جو لوگ ملک سے پیار کرتے ہیں، ان کا کوئی باپ اس ملک میں نہیں رہتا...

— آداب! ایک اور دستک پڑی۔

عدالت نے مڑ کر کہا— آداب! اور آگے پوچھا— آپ کون سی دستک ہیں؟

— جی مجھے پروفیسر مشیر الحق کہتے ہیں۔ میں کشمیر یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا... اس سے پہلے جامعہ ملیہ دہلی میں تھا۔ میں اسلامک اسٹڈیز کا پروفیسر ہوں... مجھے آج شام سری نگر کے پادشیہ باغ علاقے میں مار دیا گیا!

— یہ آپ کے کندھے پر کیا لدا ہے؟ عدالت نے جاننا چاہا۔

— حضور... یہ میرے سکریٹری عبدالغنی کی لاش ہے! یہ بھی میرے ساتھ ہی مارا گیا۔

تب تک پچھلی طرف بہت تیز دستکیں پڑنے لگیں۔ اردلی نے عدالت کو بتایا کہ بڑودہ، گجرات میں ہوئے فسادات کے مردے دستک دے رہے ہیں... ان میں ایک ادھ مرا گھائل بھی ہے جو کبھی بھی مر سکتا ہے!

— تو پہلے اُسے مرنے دو۔ میرے پاس زندہ یا ادھ مروں کے لیے وقت نہیں ہے! مجھے مردوں سے نپٹنا ہے... عدالت نے اردلی کو ڈانٹ دیا۔

اردلی تمتما اٹھا— اگر آپ زندہ یا ادھ مروں کی بات نہیں سنیں گے تو مرنے والوں کی تعداد بڑھتی جائے گی... خون ہونے سے کام نہیں چلے گا... خون کا کھلا ہوا نل بند کیجیے، یہ مسلسل بہہ رہا ہے!

— چپ! عدالت چیخی۔

— میں چپ نہیں رہوں گا۔ عدالت کو سیاست چپ کرا سکتی یا پولس... لیکن آپ ادیب ہو کر چپ کرا رہے ہیں مجھے؟ لعنت ہے آپ پر... اردلی بھڑک اٹھا۔

عدالت نے اپنی غلطی فوراً مان لی— میں معافی چاہتا ہوں محمود! لیکن یہ رونے کی آواز کیسی آ رہی ہے؟ یہ دستک تو مجھے پریشان کرتی ہے...

— یہ بیگم مشیر کے رونے کی آواز ہے...

— لیکن مشیر صاحب تو یہاں کھڑے ہیں، کندھے پر عبدالغنی کی لاش لادے ہوئے... یہ تمہیں نظر نہیں آتے! عدالت نے پوچھا۔

— جی... وہ بات یہ ہے کہ ان کی روح تو یہاں چلی آئی لیکن سری نگر سے میت کو دہلی پہنچنے میں دیر لگی۔ بیگم مشیر جس پلین میں سفر کر رہی تھیں، اسی کے پردے کے پیچھے ان کی لاش رکھی تھی... انہیں کچھ پتہ نہیں تھا۔ پھر ان کے داماد عبدالسلام نے آہستہ آہستہ انہیں بتانا اور سمجھانا شروع کیا۔ آخر لاش جامعہ نگر پہنچ گئی، لیکن بیگم موت کو منظور نہیں کر سکیں۔ بولیں— ڈاکٹر کو بلاؤ... یہ زندہ ہیں!... بس تبھی سے بیگم رو رہی ہیں...

— تو انہیں بتاؤ کہ موت کو قبول کریں! جو مرتا ہے، مر جاتا ہے۔ اُسے جلدی سے قبول کرنے سے ہی دنیا بدلتی ہے۔ عدالت نے حکم دیا۔

تبھی خون کے دو بم عدالت میں پھٹے۔ سب شرابور ہو گئے۔ آخر خون سے تر اپنا منہ پونچھ کر عدالت نے پوچھا۔

— یہ خون کے بم کب سے بننے لگے؟

— جب سے آزادی ملی!

— آزادی کب ملی؟ عدالت نے پوچھا۔

اردلی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

— شرم کیجئے ادیب عالی... عدالت کھول کے بیٹھے ہو، لیکن عدالت کے پاس جو معمولی جانکاریاں ہونی چاہئیں، وہ بھی آپ کے پاس نہیں ہیں... اور اگر ہیں تو... تو... آپ ہمیں بیوقوف بنانا چاہتے ہیں... یا پھر آپ ۱۹۴۷ء کے اسی دور میں رہ رہے ہیں، جس دور میں آزادی کو آپ جیسے دانشوروں نے جھوٹ کہا تھا۔

اس بار عدالت قہقہہ لگا کر ہنسی۔

— لیکن اس دور میں بھی تو جامع مسجد کا شاہی امام آزادی کو جھوٹ کہتا ہے۔ یہ اب تک نہیں بدلا اور نہ وقت کو بدلنے دیتا ہے۔

— یہ نہیں بدلنے دے گا کیونکہ یہ جاہل ہندوستانیوں کا سرغنہ ہے... دوسری طرف جاہلوں کے دوسرے نیتا کھڑے ہیں— اشوک سنگھل، جو ہندو نہیں جنتی ہیں، اور وہ مہنت اویدیہ ناتھ جو گورکھپتی ہے... اردلی عدالت کو بتا رہا تھا— ان کے علاوہ بھی بہت سے ہیں حضور... جاہلوں کی کمی نہیں ہے اس ملک میں!

— ان جاہلوں کی فصل کب بوئی گئی! عدالت نے پوچھا۔

تو ایک مردہ کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا—

— سرکار! یہ فصل سنہ سینتالیس میں بوئی گئی... اس فصل کو خون سے سینچا گیا! بھاگلپور کا ایک مردہ بولا۔ میرٹھ، احمد آباد، بڑودہ، کانپور اور نہ جانے کتنی جگہوں کے مردوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

— تم کس فصل کے دانے ہو؟ عدالت نے دریافت کیا۔

— ہم بھی اسی فصل کے دانے ہیں!

— نہیں! ایک نوجوان مردہ چیخا— یہ ہوں گے... میں نہیں ہوں... میری نسل خالص ہندوستانی ہے... میں سنہ سینتالیس کے بعد پیدا ہوا ہوں اور اب بھاگلپور میں مارا گیا ہوں!

— اور تم؟ عدالت نے دوسرے نوجوان سے پوچھا۔

— تمیز سے بات کیجئے... میں مردہ نہیں شہید ہوں! مجھے پولس نے ہاشم علاقے میں مارا ہے!

— تم وہاں کیا کر رہے تھے؟

— میں خالصتان بنا رہا تھا!

تبھی کراچی کا ایک مہاجر کھڑا ہو گیا— میں بھی مارا گیا ہوں!

— کیوں؟

— کیونکہ میں پاکستان میں پاکستان بنا رہا تھا!

— تو کیا سنہ سینتالیس میں پاکستان نہیں بنا؟

— بنا، لیکن وہ تو جغرافیہ کی بات ہے... ہمارے دماغوں اور دلوں میں پاکستان کا جو نقشہ بنایا گیا تھا، وہ ابھی پورا نہیں ہوا ہے...

— وہ کبھی پورا بھی نہیں ہوگا! ترشول پکڑے ایک مردے نے تیز چیخ نما آواز میں کہا— اب بھارت اکھنڈ ہوگا... اور اس نے نعرہ لگایا— رام، کرشن اور وشوناتھ! تینوں لیں گے ایک ساتھ!

تبھی خون کے کئی بم ایک ساتھ عدالت میں پھٹے اور سارے لوگ ایک بار پھر خون سے نہا گئے۔ اس بار خون میں اتنا تیزاب تھا کہ کئی مردوں کے بدن پر پھپھولے پڑ گئے۔

اپنے پھپھولوں کو چاٹتا ہوا ایک سکھ مردہ چیخ پڑا— مجھے تو شوپیاں میں مارا گیا...

— مطلب؟

— میں خالصتانی نہیں ہوں... میں تو کشمیری ہوں... لیکن مجھے پھر بھی مارا گیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ اپنی گھڑی کا وقت بدلو... اسے پیچھے کرو اور سوئیوں کو پاکستانی وقت پر لاؤ!

— کیا وقت کو پیچھے کرنے سے پاکستان بن جاتا ہے؟ عدالت نے پوچھا۔

— مجھے نہیں معلوم۔ لیکن مجھ سے کہا گیا کہ صرف ہری پگڑی پہنو اور جھٹکے کی دوکان بند کرو... کشمیری پنڈتوں سے کہا گیا— پنڈت یہاں سے بھاگ جاؤ، پنڈتائن کو چھوڑ جاؤ! ان میں سے کئی ایک بھاگتے ہوئے آپ کی عدالت میں آ رہے ہیں۔

— کچھ تو آ چکے ہیں۔ اردلی نے جوڑا۔

— تو مشیر صاحب، آپ کشمیری پنڈت ہیں؟ عدالت نے جاننا چاہا۔

— جی نہیں، میں مسلمان ہوں... پانچ وقت نماز پڑھتا ہوں۔ نماز پڑھنے ہی جا رہا تھا۔ جب مجھے اغوا کیا گیا اور دوسرے دن مارا گیا! مشیر صاحب بولے— حضور آپ نے ٹھیک فرمایا تھا کہ وقت کو پیچھے لے جانے سے پاکستان بن جاتا ہے!

— تو وقت کو گھسیٹ کر کوئی کتنا پیچھے لے جائے گا؟

— بابر تک! ترشول دھاری چیخا— کیونکہ ہماری غلامی کی تاریخ بابر سے شروع ہوتی ہے۔

— نہیں ہماری غلامی کی تاریخ انگریزوں کے آجانے سے شروع ہوتی ہے! بھاگلپور کا ایک بڈھا چلایا — انگریزوں نے ہماری سلطنت بہادر شاہ ظفر سے چھینی تھی... وہ جب گئے تو انہیں ہماری سلطنت ہمیں دے کر جانا چاہیے تھا... بابر تو غازی تھا!

— بابر! درندہ تھا... اس نے آتے ہی ایودھیا میں ہمارا رام جنم بھومی مندر توڑا تھا اور وہاں بابری مسجد بنوائی تھی۔ پاکستان بنا تو اسی دن سے شروع ہو گیا تھا! ترشول دھاری بھڑک اٹھا۔

— یہ غلط ہے! میرٹھ کا ایک ادھیڑ چیخا۔

— یہ صحیح ہے! ترشول دھاری اور بھڑکا۔

عدالت میں عجیب سا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مردوں کی آنکھیں دہشت سے بھر گئیں۔ وہ بدن پر جمے خون کے تھکّے اکھیڑنے لگے... اکھیڑنے کے ساتھ ساتھ تازہ خون بھی رسنے لگا۔

— یہ تازہ خون کہاں سے آیا؟ تمہارا تو خون ہو چکا ہے۔

— یہ بابر کی رگوں سے آیا ہے! ترشول بہت جوش میں تھا۔ اس کے جوش سے اوروں کے چہرے کالے پڑتے جا رہے تھے۔

— سرکار! جب تک بابر کا نام لیا جائے گا، صدیوں کا خون رستا رہے گا! اردلی نے ادب سے کہا۔

ادیب سوچتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ منصف کی کرسی پر تو بیٹھا تھا... لیکن یہ نشست وکرمادتیہ کی تو تھی نہیں کہ کوئی پتلی نکل کر اسے کوئی راستہ بتا سکتی۔ راستے کی تلاش تو اُسے خود کرنی تھی اور اپنے وقت میں کرنی تھی۔ وقت کو وہ پھیلا سکتا تھا۔ وقت کو وہ سمیٹ سکتا تھا۔ آخر اپنے دماغ پر زور ڈال کر اس نے حکم دیا —

— بابر کو عدالت میں حاضر کیا جائے!

اردلی حکم کی تعمیل کے لیے چل پڑا۔

مردوں کے چہرے زرد پڑنے لگے۔

(۱۴)

عدالت میں جب بابر حاضر ہوا تو بہت تھکا ہوا اور ناراض تھا۔ قبر سے نکل کر آنے میں اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ اُسے اچھا نہیں لگا تھا کہ مر جانے کے بعد بھی اُس کے چین میں خلل ڈالا گیا تھا۔ وہ کابل سے چل کر آیا تھا۔

جیسے ہی وہ عدالت میں حاضر ہوا، عدالت نے مردوں سے پوچھا —

— اسے پہچانتے ہو؟

— نہیں... نہیں... ہم نہیں پہچانتے! سارے مردے بول پڑے تھے۔

— یہ بابر ہے! عدالت نے بتایا۔

ایک بھیانک خاموشی وہاں چھا گئی۔

عدالت نے اردلی سے کہا — انہیں ایک کرسی دو!

— بیٹھنے کے لیے مجھے اپنا شاہی تخت چاہیے... آخر میں شہنشاہ ہوں... ہندوستان کا بادشاہ! بابر چیخا۔

— تاج و تخت ختم ہو گئے ہیں۔ اب راجہ اور بادشاہ بھی نہیں ہیں۔ اب نیتا اپنے عوام کے کندھوں یا گردنوں پر بیٹھتے ہیں۔ تم ان کی گردنوں پر بیٹھنا چاہو گے؟ عدالت نے سوال کیا۔

— میں تو آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ اب بلایا ہے تو کہیں بھی بٹھا دیجیے! بابر بولا۔

— ٹھیک ہے، جہاں مرضی ہو بیٹھ جاؤ اور میرے سوالوں کے جواب دو! عدالت نے کہا۔

— جی!

— تم نے ہندوستان پر حملہ کیوں کیا تھا؟

— حملہ! تو ایک بادشاہ اور کیا کرتا؟ جب فرغنہ اور بخارا کی میری سلطنت چھن گئی تو مجھے دوسری سلطنت تو بنانی ہی تھی... میں نے ہندوستان پر کئی حملے کیے لیکن جیت نہیں پایا۔ آخری بار جب میں جیتا تو سچائی یہ ہے کہ ہند پر حملہ کرنے اور اسے جیتنے کے لیے مجھے سلطان ابراہیم لودھی کے چچا، پنجاب کے صوبیدار دولت خاں اور رن تھمبور کے ہندو راجپوت راجا سانگا نے بلایا تھا! بابر بولا۔

— یہ جھوٹ بولتا ہے۔ رانا سانگا کبھی بھی دیش کے خلاف غداری نہیں کر سکتے تھے! ترشول دھاری بولا۔

جب عدالت نے اسے ڈانٹا۔

اردلی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ترشول چھین لیا — یہاں مردے کی طرح ادب سے بیٹھو! سمجھا! نہیں تو ابھی نیچے بھیج دیا جائے گا... وہاں پھر مارے جاؤ گے!

ترشول والے کا چہرہ خوف زدہ ہو گیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا — نہیں، میں پھر وہی موت نہیں مرنا چاہتا!

— کیوں؟ مرنے سے پہلے تم کہا کرتے تھے کہ دس بار نہیں ہزار بار مرنا پڑے تو بھی تم رام

جنم بھومی کے لیے مرو گے... اب کیوں ڈر رہے ہو؟ اردلی نے اُسے ذلیل کیا۔

— اس لیے کہ اب میں انسان ہوں... مجھے اب موت سے بہت ڈر لگتا ہے!

— جب مرے تھے، اُس وقت تم کیا تھے؟

— تب میں ہندو تھا!

— ہندو کیا انسان نہیں ہوتے؟

— ہوتے ہیں، لیکن جب نفرت کا زہر میری نسوں میں دوڑتا ہے تب میں انسان کا چولا اتار کر ہندو بن جاتا ہوں!

— یہ نفرت کا زہر کہاں سے آیا؟

— اسی سنہ سینتالیس والی فصل سے یہ زہر پیدا ہوا ہے حضور! جو ہندو کو اور بڑا ہندو اور مسلمان کو زیادہ بڑا مسلمان بناتا ہے! اردلی بولا۔

— میرا وقت برباد نہ کیجئے... اپنے جھگڑے آپ نپٹائیے! بابر نے عاجزی سے کہا۔

— لیکن سارے جھگڑے کی جڑ تو تم ہو۔ نہ تم رام مندر مسمار کرتے، نہ جھگڑے کھڑے ہوتے! ترشول والا اس بار تہذیب سے بولا۔

— میرا اللہ اور تاریخ گواہ ہے... میں نے کوئی مندر مسمار نہیں کیا اور نہ ہندوستان میں کوئی مسجد اپنے نام سے کبھی بنوائی۔ اسلام تو ہندوستان میں میرے پہنچنے سے پہلے سے موجود تھا... کیا ابراہیم لودھی مسلمان نہیں تھا جو آگرہ کی گدی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اُس مسلمان ابراہیم لودھی کو ۲۰ر اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت میں ہرا کر اس کی سلطنت جیتی تھی۔ اس کا سر کاٹ کر میرے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ میں نے ہمایوں کو تب دلی بھیجا تھا اور میں خود آرام کرنے کے لیے آگرہ چلا گیا تھا۔ آگرہ ہی ابراہیم لودھی کی راجدھانی تھی!

— بابر! سیدھے بات کا جواب دو... اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے عدالت کو گمراہ مت کرو!

— میں ہندوستان کو خود کے لیے فتح کرنے آیا تھا، اسلام کے لیے نہیں۔ خدا کی سلطنت میں مجھے اپنے لیے سلطنت کی ضرورت تھی اور وہی میں نے کیا۔ میں نے تو کبھی تلسی داس کا نام تک نہیں سنا، جس نے ہندوؤں کے رام کو بھگوان بنایا۔ میرے دور میں رام بھگوان تھے ہی نہیں، تو میں ان کا مندر کیوں توڑتا؟ تلسی داس کا نام تو میں نے ان دنوں قبر میں لیٹے لیٹے سنا۔ میں جب دلّی کے تخت پر بیٹھا اور میرے نام کا خطبہ سات دن بعد پڑھا گیا... تب تک تلسی داس کو کوئی جانتا بھی نہیں تھا...

اُس وقت وہ بچہ رہا ہوگا اور کسی گلی کوچے میں ننگا گھومتا ہوگا...

— وہ کون سی تاریخ تھی؟

— ابراہیم لودھی سے میں نے پانی پت کی لڑائی ۲۰ر اپریل ۱۵۲۶ء کو جیتی تھی اور رجب کی ۱۵ بروز جمعہ یعنی ۲۷ر اپریل ۱۵۲۶ء کو میرے نام کا خطبہ پڑھا گیا تھا۔ یہ خطبہ مولانا محمود اور شیخ زین نے پڑھا تھا۔ میں اور میرا لشکر اس وقت جمنا کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ اے عدالتِ ادیب! مجھے ہندوستان کے پانی سے بہت پیار تھا... میں اُس وقت بے وطن تھا اور اپنے لیے ایک وطن کی تلاش میں آیا تھا، کیونکہ اُن دنوں وطن بھی بغیر تلوار کے نہیں ملتا تھا۔

— تم پھر بھٹک رہے ہو۔

— جی نہیں...

— تو پھر سیدھے سیدھے اپنی بابری مسجد کا قصہ بتاؤ!

— میں نے کہا! آگرہ میری راجدھانی تھی۔ اب سوچئے، اُس وقت ہندوؤں کے کرشن کو بھگوان اور اوتار قبول کیا جا چکا تھا۔ اُن کی جائے پیدائش متھرا میں تھی۔ میری راجدھانی آگرہ سے صرف پچاس میل دور... اگر مجھے توڑنا ہی ہوتا تو میں کرشن کی جائے پیدائش نہ توڑتا؟ بھاگا بھاگا ایودھیا تک جا کر رام کی جائے پیدائش کیوں توڑتا؟ کیونکہ رام تو بھگوان ہوئے تلسی داس کے بعد اور میرے سامنے تلسی داس بچہ تھا۔ اُس نے رامائن میرے مرنے کے بعد لکھی۔

— تمہاری موت کب ہوئی؟

— دسمبر ۱۵۳۰ء میں... تاریخ مجھے یاد نہیں! موت کی تاریخ کون یاد رکھنا چاہے گا!

— لیکن دنیا تو کہتی ہے کہ ایودھیا کے رام مندر کو تم نے ۱۵۲۸ء میں گروایا اور اپنے صوبیدار میر باقی کو تم نے حکم دیا کہ اُس جگہ مسجد بنوا دی جائے۔

— یہ سراسر غلط ہے! میرا اُس مسجد سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اصل بات آپ جاننا چاہتے ہیں؟

— بالکل، بالکل! عدالت خوشی سے اچھل پڑی۔

— تو جناب اے فیوہرر کو بلوایا جائے!

— فیوہرر! عدالت کو پسینہ چھوٹ گیا — نازی فیوہرر ہٹلر کو!

— نہیں، اے فیوہرر کو!

— یہ کون ہے؟

— میری سلطنت جب مٹ گئی تب یہ ہندوستان پہنچا تھا۔ یہ سلطنت برطانیہ کے آرکیالوجیکل

سروے آف انڈیا کا ڈائرکٹر جنرل رہا ہے... بلا کر پوچھئے!

عدالت پش و پیش میں پڑ گئی۔ یہ بابر تو خود کی موت کے قریب ساڑھے تین سو سال آگے کی بات کر رہا ہے۔ اپنی پیشانی کھجلاتے ہوئے عدالت نے بابر سے پوچھا—

— لیکن اُسے بلا کر کیا ہوگا۔ اُس کے اور تمہارے دور کے درمیان قریب ساڑھے تین سو سال کا فرق ہے!

— آپ اسے بلائیے تو!

— لیکن وہ تمہاری کیا مدد کر سکے گا؟

— اس نے ۱۸۸۹ء میں وہ کتبہ پڑھا تھا، جو میرے نام پر تھوپی جا رہی مسجد میں لگا ہوا تھا... آج وہ کتبہ پڑھا نہیں جا سکتا، کیونکہ چالوں نے اسے پڑھنے لائق نہیں چھوڑا... لیکن اے فیوہرر کے زمانے تک وہ پڑھا جا سکتا تھا۔ اسے بلا کر تصدیق کر لیجئے۔

عدالت میں بیٹھے مردے سکتے میں آ گئے۔ آخر بابر ثابت کیا کرنا چاہتا تھا۔ باتیں تو وہ قاعدے کی کر رہا تھا۔ بدن پر پڑے پھپھولے میں اب اتنی جان نہیں تھی۔ زخم بھی کچھ کم ٹیس رہے تھے۔ عدالت میں بابر کے آنے سے پہلے جو کہرام مچا ہوا تھا، وہ کافی حد تک تھم گیا تھا۔

عدالت نے اے فیوہرر کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ اردلی بھاگتا ہوا گیا اور انہیں لے آیا۔ فیوہرر کا دماغ ساتویں آسمان پر تھا۔ اُسے یہ توہین آمیز لگ رہا تھا کہ ایک غلام ملک کے آزاد باشندے نے اُسے اس طرح بلایا تھا۔ لیکن بابر کو دیکھتے ہی وہ اپنی اوقات میں آ گیا۔ عدالت کی توہین کرنا اس کے خون میں نہیں تھا۔ وہ ادب سے کھڑا ہو گیا۔

— تم بابر سے کب ملے؟

— میں قریب ۱۹۱۰ء کے آس پاس ملا۔

— کہاں؟

— کابل میں، ان کی قبر میں۔

— تم نے بابری مسجد کا وہ کتبہ پڑھا تھا، جو اب پڑھا نہیں جا سکتا!

— جی ہاں!

— کیا لکھا ہے اُس میں؟

— یہی کہ ہجری ۹۳۰ یعنی قریب ۱۷ ستمبر ۱۵۲۳ء میں ابراہیم لودھی نے اُس مسجد کی بنیاد رکھوائی تھی، اور جو ۱۰ ستمبر ۱۵۲۴ء میں بن کر تیار ہوئی، جسے اب بابری مسجد کہا جاتا ہے۔ یہی بتانے میں بابر

کے پاس گیا تھا۔ اے فیوہرر نے کہا— اس کتبے کو وقت نے نہیں ان لوگوں نے برباد کیا ہے جو اس بابری مسجد اور رام جنم بھومی مندر کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔

— لیکن آج تک کسی نے ابراہیم لودھی پر اس مسجد کی بنیاد رکھنے کی تہمت کیوں نہیں لگائی؟ عدالت نے جاننا چاہا۔

— ابراہیم لودھی پر کسی نے رام جنم بھومی مندر توڑنے کا الزام نہیں لگایا، کیونکہ پہلی بات، وہاں مندر تھا ہی نہیں اور دوسری بات کہ... ابراہیم لودھی کی دادی ہندو تھی... ہندو دادی کا خون اُس کی رگوں میں بہتا تھا، اس لیے بھی اُس پر الزام نہیں لگایا گیا...

— اس لیے کہ وہ ہم وطن تھا اور اُس کی دادی ہندو تھی! بابر چیخا— میں تب غیر ملکی تھا میری رگوں میں ہندو خون نہیں تھا...

— لیکن تم افغانوں کا پیچھا کرتے ہوئے گھاگھرا ندی تک تو گئے تھے۔ وہی گھاگھرا ندی جسے سرجو بھی کہا جاتا ہے... اور ایودھیا تو سرجو کے کنارے ہے۔ میر باقی تمہارا صوبیدار تھا وہاں...

— تبھی تو اس نے اس مسجد کو میرے نام سے منسوب کر دیا ہوگا! آپ تو جانتے ہیں کہ یہ صوبیدار، منصب دار وغیرہ کتنے چاپلوس ہوتے ہیں... آج خود اسی ملک میں کتنے گاندھی نگر، نہرو نگر، قدوائی نگر اور نجانے گاندھی نگر بسے ہوئے ہیں۔ کیا وہ سب ان لوگوں نے تعمیر کروائے ہیں؟ بابر نے کہا۔

— تو پھر تمہاری ڈائری... بابرنامہ کے ساڑھے پانچ مہینوں یعنی ۳ اپریل ۱۵۲۸ء سے ۱۷ ستمبر ۱۵۲۸ء تک کے دنوں کے صفحات کیوں غائب ہیں؟

— اس کے بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں!

— تمہیں بتانا پڑے گا، کیونکہ ۲ اپریل کو تم اودھ میں، ایودھیا کے اوپری جنگلوں میں شکار کھیل رہے تھے، اُس کے بعد کے صفحات غائب ہیں۔ پھر تم بابرنامہ کے مطابق ۱۸ ستمبر ۱۵۲۸ء کو آگرہ میں دربار لگائے بیٹھے ہو! اس درمیان تم کہاں تھے؟ کیونکہ انگریز گزیٹیر مصنف ایچ۔ آر۔ نیول نے یہ صاف صاف لکھا ہے کہ ۱۵۲۸ء کی گرمیوں یعنی اپریل اور اگست کے درمیان تم ایودھیا پہنچے، وہاں تم ایک ہفتے رُکے اور تم نے قدیم رام مندر کو توڑنے کا حکم دیا اور وہاں مسجد تعمیر کروائی، جسے بابری مسجد کا نام دیا گیا!

— یہ سراسر غلط ہے! بابر بولا— میں قبر میں لیٹا ہوا ان صدیوں کو گزرتے دیکھتا رہا ہوں۔ ۱۸۳۹ء تک یا کہیے کہ ۱۸۵۰ء تک تو سب ٹھیک ٹھاک چلا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد سلطنت برطانیہ کی

حکمت عملی بدلنی شروع ہوئی...

— بابر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اے فیوہرر نے درمیان میں ٹوکا — ہماری پالیسیز بدلیں اور جب یہ طے کیا گیا کہ ہندو اور مسلمان، جو ۱۸۵۷ء میں ایک ہوئے تھے، انہیں الگ الگ رکھا جائے... نہیں تو انگریزی حکومت چلنے نہیں پائے گی۔ اسی لیے میں نے بابری مسجد پر لگا ابراہیم لودھی کا جو کتبہ پڑھا تھا اُسے جان بوجھ کر مٹایا گیا... لیکن میں نے اُس کا جو ترجمہ کیا تھا وہ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی فائلوں میں پڑا رہ گیا۔ اُسے ختم کرنے کا خیال کسی کو نہیں آیا۔ اسی کے ساتھ "بابر نامہ" کے وہ صفحات غائب کئے گئے جو اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ یہ بابر اودھ گیا تو ضرور، لیکن کبھی ایودھیا نہیں گیا... اور اُس کے بعد ہماری انگریزی قوم نے اور خاص طور سے ایچ۔ آر۔ نیول نے جو فیض آباد گزیٹیئر تیار کیا تھا، اُس میں شیطانی سے یہ درج کیا کہ بابر ایودھیا میں ایک ہفتے ٹھہرا اور اسی نے قدیم رام مندر کو مسمار کیا! بولتے ہوئے فیوہرر ہانپنے لگا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ اُسے پیاس لگی تھی۔ پانی تو کہیں تھا نہیں اس لیے اُسے خون کا ایک گلاس دیا گیا۔

عدالت نے اگلا سوال کیا — بابر، اگر تمہارے بابر نامہ کے کچھ صفحات پھاڑ دیے گئے ہیں تو بھی تم تو بتا سکتے ہو کہ اگر تم ایودھیا نہیں گئے تو ۳ر اپریل ۱۵۲۸ء سے لے کر ۱۷ر ستمبر ۱۵۲۸ء تک کہاں رہے؟ تم اودھ اور ایودھیا کے جنگلوں میں شکار کھیلتے ہوئے ساڑھے پانچ مہینوں کے لیے کہاں غائب ہو گئے تھے؟ یہ اہم سوال ہے اور یہی سارے جھگڑے کی جڑ ہے۔

جی، یہ صحیح ہے کہ میں اودھ کے جنگلوں میں ۲ر اپریل ۱۵۲۸ء تک شکار کھیل رہا تھا... اور پھر ایودھیا کوئی اتنا مشہور شہر بھی نہیں تھا کہ میں وہاں جاتا۔ وہاں میرا کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔ بابر بولا۔

— لیکن تم بات چھپاتے کیوں ہو؟ صحیح بات اس عدالت کو بتا تو سکتے ہو!

— اصل بات یہ ہے ادیب عالی کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریزوں کی حکمت عملی بدلی تھی اور انہوں نے میرے وطن کو مذہب کے نام پر تقسیم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میرا وطن اور ملک تو ہندوستان ہی تھا... میں تو وہیں آگرہ کی زمین میں زمیں دوز ہو گیا تھا، لیکن متعصب لوگ میری قبر کھود کر مجھے کابل اٹھا لائے... تو خیر... بات یہ ہے ادیب عالی کہ اے۔ ایچ۔ نیول نے جان بوجھ کر ۱۸۵۷ء کے بعد بے ایمانی کی۔ میرے لکھے بابر نامہ میں جس اودھ کا ذکر ہے نیول نے اُس 'اودھ' کو بے ایمانی سے "ایودھیا" کہا ہے، جب کہ اودھ کا مطلب ہے اودھ! جسے آپ آج بھی اسی نام سے پکارتے ہیں۔ فیوہرر نے بھی مجھے جانکاری دی تھی کہ انگریزوں کے اپنے چہیتے افسر کننگھم، جسے ہندوستان کی تاریخ اور پرانی عمارتوں کی دیکھ بھال کرنے کا کام سپرد کیا گیا تھا، اسی

نے بڑی چالاکی سے لکھنؤ گزیٹیئر میں یہ درج کیا تھا کہ بابری مسجد کی تعمیر کے دوران ہندوؤں نے تعمیر ہوتی مسجد پر حملہ کیا تھا اور اُس جنگ میں مسلمانوں نے ایک لاکھ چوہتر ہزار ہندوؤں کو ہلاک کیا تھا... انہیں ہندوؤں کے خون سے مسجد کے لیے گارہ بنایا گیا تھا...

— یہ تو بھیانک ہے!

— لیکن یہ سچ نہیں ہے! بابر بولا۔

— کیسے؟ کوئی ثبوت؟

— پہلی بات تو یہ کہ جو گزیٹیئر کننگھم کا لکھا بتایا جاتا ہے، وہ میرے بابر نامہ کے گم شدہ صفحات کی طرح ہی گم ہو چکا ہے!

— ہیں

— جی، اور میں اس عدالت خاص میں یہ سچائی بھی سامنے رکھنا چاہوں گا کہ خود انگریز افسر نیول نے فیض آباد گزیٹیئر میں لکھا ہے کہ ۱۸۶۹ء میں فیض آباد، ایودھیا کی کل آبادی ۱۹۳۹ تھی اور ۱۸۸۱ء میں اُسی کی آبادی ۱۱،۶۴۳ تھی یعنی بارہ برسوں میں قریب ۲۰۰۰ آبادی کا اضافہ ہوا تھا... ادیب عالی، اب آپ خود ہی سوچئے کہ میرے وقت یعنی ۱۵۲۸ء میں اس علاقے کی آبادی کیا رہی ہوگی؟ تب ۱،۷۴۰۰۰ ہندو کیسے مارے جا سکتے ہیں؟... اس لیے یہ بات صاف ہونی چاہیے کہ انگریزوں نے ہمارے ملک ہندوستان کے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے!

ادیب نے غور سے بابر کو دیکھا۔

— میں تو بتا سکتا ہوں! بابر نے بتایا — لیکن میری بیٹی گل بدن بیگم نے 'ہمایوں نامہ' میں خود لکھا ہے۔ ترکی زبان میں، تزک بابری، موجود ہے... اس سے آپ کو اصلیت کا پتہ چل سکتا ہے، اسے پڑھ لیجئے!

— میں ادیب ہوں... اس دور میں میرے پاس لکھنے پڑھنے کا وقت نہیں بچا ہے... وہ زمانے لد گئے جب تم لڑائیاں بھی لڑتے تھے اور آرام سے بیٹھ کر اپنی ڈائریاں لکھوایا کرتے تھے...

عدالت نے طنز کیا۔

— آپ کے یہ فرمانے سے مجھے یاد آیا... بابر آگے بولا — دیکھئے!... بات یہ ہے کہ...

— یہ... وہ مت کرو بابر! سیدھے سیدھے بتاؤ کہ ۲ر اپریل ۱۵۲۸ء کو اودھ اور اودھ کے جنگلوں میں شکار کھیلنے کے بعد تم ایودھیا گئے تھے یا نہیں اور وہاں ایک ہفتے ٹھہرے تھے یا نہیں؟

— قطعی نہیں! آپ ہی سوچئے حضور... برسوں بعد میری بیگم، ماہم بیگم اور میری بٹیا گل بدن

کابل سے آگرہ آرہی تھیں، پہلی بار... یہ دونوں ۸/اپریل ۱۵۲۸ء کو آگرہ پہنچنے والی تھیں، اس لیے میں اودھ سے انہیں لینے لوٹ پڑا تھا... آپ چاہیں تو گل بدن کے ہمایوں نامہ سے یہ تفصیل پڑھ سکتے ہیں!

— پھر تم نے پڑھنے کی بات کی! تم ایک ادیب کی توہین کر رہے ہو! عدالت نے بابر کو ڈانٹا۔

— میں معافی چاہتا ہوں! بابر بولا— تو گلبدن سے پوچھ لیجیے...

اردلی نے عدالت کے کان میں کچھ کہا تو عدالت نے سر ہلایا اور حکم دیا— گلبدن بیگم کو حاضر کیا جائے! پھر بابر کی طرف مخاطب ہو کر کہا— تمہاری بیٹی گلبدن بیگم سے ہی جاننا بہتر ہوگا۔

کچھ ہی دیر میں اردلی نے گلبدن بیگم کو حاضر کیا۔ اس نے داخل ہوتے ہی اپنے ابا حضور کو آداب کیا اور سسکنے لگی۔

— مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا ہندوستان اس طرح غارت ہو جائے گا اور آپ کو اس طرح ذلیل کیا جائے گا... گلبدن بول ہی رہی تھی کہ عدالت نے تحسین آمیز انداز میں کہا— گلبدن! تم تو کافی خوبصورت ہندی بولتی ہو؟ لیکن فی الحال یہ بتاؤ کہ تمہارے ابا حضور ۳/اپریل ۱۵۲۸ء سے ۱۷/ستمبر تک ۱۵۲۸ء تک کہاں تھے۔

جی، میں بتاتی ہوں! ابا حضور نے ہمیں ہندوستان بلایا تھا۔ میرا بڑا بھائی ہمایوں تو دو سال پہلے ہی ابا حضور کے ساتھ چلا آیا تھا۔ میں اپنی ماں ماہم بیگم کے ساتھ، اپنے دوسرے بھائی بہنوں اور بڑی و چھوٹی امیوں سے پہلے ہندوستان پہنچی تھی۔ ابا حضور فوراً اودھ کے جنگلوں میں شکار چھوڑ کر، ہمیں لینے کے لیے ۷/اپریل ۱۵۲۸ء سے پہلے آگرہ پہنچ چکے تھے۔ ہم علی گڑھ کے راستے آئے تھے۔ ان دنوں علی گڑھ کو کول جلالی پکارا جاتا تھا۔ میں اپنی ماں ماہم بیگم کے ساتھ ۹/اپریل ۱۵۲۸ء کو علی گڑھ پہنچی تھی۔ ابا حضور ہمیں لینے کے لیے آگرہ سے علی گڑھ کے لیے پیدل ہی چل پڑے تھے اور آگرہ سے چار میل دور ہم نانا چاچا کے گھر کے پاس ملے تھے... وہاں سے بھی وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہوئے تھے... پیدل ہی ہمارے قافلے کے ساتھ آگرہ میں داخل ہوئے تھے۔ یہ تاریخ ۱۰/اپریل ۱۵۲۸ء تھی! ابا حضور میری امی کے ساتھ وقت گزارنا چاہتے تھے...

— اس کا تاریخ سے کیا لینا دینا! عدالت نے کہا۔

— تعجب ہے... آپ ادیب ہیں، عدالت لگا کے بیٹھے ہیں اور انسانی جذبات سے کترا رہے ہیں... ایک شخص چاہے وہ شہنشاہ ہی کیوں نہ ہو، کیا وہ انسان نہیں ہوتا؟ کیا اس کے دل میں پیار اور محبت کے چشمے نہیں پھوٹتے؟ آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے... تین مہینے، جی ہاں، تین مہینے... ۱۰/اپریل

سے لے کر ۱۰/جولائی ۱۵۲۸ء تک ابا حضور نے آگرہ میں میری ماں اور میرے ساتھ گزارے۔ اس کے بعد ابا حضور ہمیں لے کر دھولپور کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں سے ہمارے ساتھ سیکری آئے۔ یہاں انہوں نے پانی کے بیچ پتھر کا ایک تخت بنوایا تھا، جس پر بیٹھ کر یہ اپنی تاریخ خود لکھتے یا لکھواتے تھے!

— تو کیا بابر... تمہارے ابا حضور اودھ، ایودھیا سے آگے شیخ بایزید کا پیچھا کرتے ہوئے جونپور، بکسر، چوسا اور سارن (بہار) تک نہیں گئے تھے؟

— وہ کیسے جا سکتے تھے؟ یہ تو ہمیں لینے آگرہ لوٹ چکے تھے۔ ابا حضور کی جو فوجیں شیخ بایزید کا پیچھا کرتی ہوئی جونپور، بکسر اور چوسا تک گئی تھیں، اُن کے سپہ سالار محمد علی جنگ تھے۔ ابا حضور تو ہمیں لینے لوٹ آئے تھے— گھاگھرا اور سرادی کے سنگم سے، یہ ایودھیا گئے ہی نہیں! جون مہینے یہ ہمارے ساتھ آگرہ میں رہے، پھر دھولپور، گوالیار کے لیے روانہ ہوئے... یہ تاریخ ۱۰/جولائی ۱۵۲۸ء تھی اور پھر یہ دھولپور سے سیکری لوٹے اگست ۱۵۲۸ء کے آس پاس۔ تو اب جو بابر نامہ کے پھٹے صفحات ہیں، ان کی جگہ آپ میرے ہمایوں نامہ کے صفحات کو رکھ سکتے ہیں اور جان سکتے ہیں کہ ابا حضور کہاں تھے! میں زور دے کر کہنا چاہتی ہوں کہ ابا حضور کے لیے نہ تو ایودھیا کوئی خاص شہر تھا اور نہ یہ وہاں گئے تھے۔ جن تین مہینوں— اپریل، مئی اور جون ۱۵۲۸ء یہ ہمارے ساتھ تھے، اُس دوران یہ پنجاب میں سرہند تک گئے تھے کیونکہ لاہور کے امام نے ابا حضور کے خلاف بغاوت کی تھی۔ ابا حضور نے سرہند میں بیٹھ کر قنبر علی ارگن کو حکم دیا تھا کہ وہ لاہور کے امام شیخ شراف اور ان کے ساتھیوں کو پکڑ کر آگرہ دربار میں حاضر کرے۔ اس وقت تک تو مسلمان ہی مسلمان سے لڑ رہا تھا... ہر مسلمان چاہے وہ شہنشاہ، سپہ سالار یا صوبیدار ہو— اس ملک کے ہندوؤں کے بغیر اپنی سلطنت قائم نہیں رکھ سکتا تھا اور پھر افغانی مسلمانوں کو شکست دینے کے دور میں ابا حضور کے پاس وقت کہاں تھا کہ ایودھیا جاتے اور کسی مندر کو توڑ کر مسجد بنواتے۔ جب ابا حضور نے ہندوستان پر آخری حملہ کیا تو مذہب یا دھرم کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ تو سلطنت کی لڑائی تھی اور مسلمان خود مسلمان سے لڑا تھا یہاں ہندو مسلمان کا سوال ہی نہیں تھا۔

— سنئے، سنئے! بلکہ بابر کے دور میں ہمیں ایودھیا کے دنت دھاون کنڈ مندر کے لیے معافی نامہ ملا تھا۔ ایک آواز آئی۔

— تم کون ہو؟ عدالت نے پوچھا۔

— میں دنت دھاون کنڈ کا پہلا مہنت پھترداس ہوں۔ مجھے پتہ چلا کہ بابر آپ کی عدالت میں حاضر ہوئے ہیں۔ اس لیے میں سمادھی سے نکل کر اپنے بادشاہ کا درشن کرنے آیا ہوں!

—یہ دنت دھاون کنڈ کیا بلا ہے؟ اور کون سی جگہ ہے؟

—یہ بلا نہیں، یہ جگہ وہیں ایودھیا میں ہے جہاں رام چندر جی داتون کرتے تھے۔ یہیں بھگوان گوتم بدھ نے سولہ چترماس بتائے تھے اور یہیں چینی سیاح ہوین سانگ آیا تھا۔ اپنے سفر نامے میں اُس نے خود اس کنڈ کا ذکر کیا ہے۔ آج بھی ایودھیا میں یہ کنڈ موجود ہے اور میرا آشرم وہاں موجود ہے۔ بادشاہ بابر نے ہمیں معافی نامہ کا تانبے کا تحفہ دیا تھا جسے انگریزوں نے بعد میں سند میں بدل دیا... وہ سند کپڑے پر آج بھی موجود ہے۔ مہنت چھتر داس روانی سے بولتا جا رہا تھا۔

—اس کا مطلب ہے بابر ایودھیا آیا تھا؟

—ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ تھے۔ تب بادشاہ خود نہیں اس کی مہربانیاں آیا کرتی تھیں۔ تب کے بادشاہ آج کے نیتاؤں کی طرح نہیں تھے کہ دس، دس روپے بانٹنے پہنچ جائیں۔ آج بھی ہم دنت دھاون کنڈ کے علاقے کا لگان وصول کرتے ہیں اور مال گزاری نہیں دیتے... بابر کے تانبے کے تحفے اور انگریزوں کی سند کے تحت ہمیں آج بھی یہ معافی نامہ ملا ہوا ہے۔

—تمہارے اوپر بابر نے کیا احسان کیا، اس سے ہمیں لینا دینا نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ بابری مسجد بابر نے بنوائی تھی یا نہیں کیونکہ لگتا ہے کہ تم بابر کے معاصر ہو۔

—جی ہاں، ہوں۔ لیکن مسجد تو خالی جگہ پر ابراہیم لودھی نے بنوائی تھی۔ ہو سکتا ہے اُس میں کچھ ردوبدل میر باقی تاشقندی نے کرائی ہو۔ مہنت چھتر داس بولا— میر باقی کے گاؤں سیہوا میں اُس کی اولاد آج بھی موجود ہیں، آپ اُن سے معلوم کر سکتے ہیں!

—اچھا! تو عدالت کچھ دیر کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔

—مردوں میں افراتفری مچ گئی۔ دنگلیں پھر پڑنے لگیں۔ پھر وہی ہاہاکار مچنے لگا۔ کچھ نئے مردے آ چکے تھے۔ پتہ چلا وہ شمال مشرق کے ہیں اور الفا دہشت گردوں نے انہیں مارا ہے۔ عدالت سمجھ نہیں سکی کہ یہ بوڈولینڈ آخر بلا کیا ہے تو اردلی نے اُسے ساری معلومات فراہم کیں کہ حضور یہ آسام کے ملکی یعنی وہاں کے نوجوانوں کی تحریک ہے۔ اس طرح کی پہلی تحریک آندھرا میں شروع ہوئی تھی۔ پھر انہیں کے طرز پر یہی تحریک لے کر مہاراشٹر میں شوسینا کھڑی ہو گئی...

ادیب نے اردلی کا شکریہ ادا کیا۔ اُسے اپنی جیب میں رکھا اور وہ فیض آباد، ایودھیا کی طرف چل دیا۔ میر باقی کے گاؤں سیہوا کا پتہ کرنے کے لیے۔

مردوں نے اُس کا گھیراؤ کر لیا۔ وہ چیخنے لگے— آپ اس طرح عدالت ملتوی کر کے نہیں جا سکتے... آخر اب ایک ہی تو عدالت رہ گئی ہے... نہیں تو ملک کی زیادہ تر عدالتیں بیکار ہو چکی

ہیں۔ کچے قانون کی وجہ سے بے بس ہیں۔

ادیب نے انہیں جیسے تیسے سمجھایا تب کسی طرح گھیراؤ ختم ہوا۔ اُس نے عدالت برخاست نہیں، صرف ملتوی کی تھی۔

۱۵

ادیب فیض آباد اسٹیشن پر اُترا ہی تھا کہ ایک زنّاٹے دار تھپڑ اس پر پڑا۔ یہ تھپڑ ایک نعرے نے مارا تھا۔ اسٹیشن کی دیوار پر لکھا ہوا نعرہ سامنے کھڑا تھا۔ بولا— فیض آباد، ایودھیا آئے ہو تو پہلے اسے پڑھو!

لکھا تھا— اپنے مذہبی مقامات کا اپمان، نہیں سہے گا ہندوستان!— بجرنگ دل!

—تم کہاں سے آئے ہو؟ اس نے نعرے سے پوچھا۔

—میں دلّی سے آیا ہوں!

—تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

—میں رہنے والا تو دلّی کا ہوں لیکن میری پیدائش گورکھ آشرم، گورکھپور میں ہوئی ہے! نعرے نے جواب دیا۔

—تم فیض آباد، ایودھیا میں کہاں رہتے ہو؟

—میں یہیں اسٹیشن پر رہتا ہوں۔

—شہر نہیں جاتے؟

—کبھی، کبھی جاتا ہوں... جب ہمارے جتھے آتے ہیں...

—اور ویسے...

—یہیں رہتا ہوں۔ شہر کے لوگ مجھے پناہ نہیں دیتے۔

—اسی لیے اسٹیشن پر رہتے ہو؟

—جی ہاں، زیادہ تر...

—میں میر باقی تاشقندی کے گھر جا رہا ہوں! ابھی تو اجازت دو۔ لوٹ کر میں تم سے بھی بات کروں گا۔ نعرہ خود ہی چیخنے لگا— اپنے دھرم استھانوں کا اپمان، نہیں سہے گا ہندوستان! نہیں سہے گا ہندوستان!

ادیب جب اسٹیشن کے باہر آیا تو رکشہ اور آٹو والوں کی بھیڑ نے اُسے گھیر لیا۔ تبھی اس نے

ایک کرشمہ دیکھا۔ وہ نعرہ آسمان میں بادلوں کی طرح گرجنے لگا اور کچھ ہی دیر میں آندھی چلنے لگی اور ریزگاری اور نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ آندھی اتنی تیز تھی کہ ریزگاری اور نوٹ ایودھیا کی طرف اڑتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ گر پڑتے تو غریبوں کے ہاتھ آ جاتے تھے... باقی اڑتے ہوئے سرجو کی سمت میں بڑھتے جاتے تھے۔

میر باقی کے گاؤں سیہوا پہنچنے سے پہلے جب وہ فیض آباد کی سڑکوں سے گزرا تو اُسے سب کچھ حسبِ معمول سا ہی لگا۔ وہی بازار، وہی گہما گہمی اور وہی عام زندگی، بچے رکشوں میں لدے اسکول جا رہے تھے۔ مسلمان عورتیں برقعہ اوڑھے بازاروں میں خرید و فروخت کر رہی تھیں یا چوڑیاں پہن رہی تھیں۔ ہندو منہار اُن کی نازک کلائیوں میں چوڑیاں پہنا رہے تھے اور وہ برقعے کا چلمن اٹھائے کھلے منہ اُن کے سامنے بیٹھی تھیں۔ وہ منہار اُن کے بھائی، چچا یا ماما تھے۔

بازار کھانے پینے کی چیزوں اور ریڈی میڈ پوشاکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہاں نہ ہندو دوکانیں تھیں نہ مسلمان دوکانیں... وہاں صرف دوکانیں تھیں۔ گندگی اور بھیڑ اتنی ہی جتنی کہ پورے ہندوستان میں ہے۔ پوشاکیں وہی جو سب پہنتے ہیں۔

کسی دیوار نے نعرہ نہیں لگایا۔

خون سے نہائی یا گولیوں کی بوچھار سے چھیدی کوئی دیوار کراہتے ہوئے اپنی کہانی سنانے نہیں آئی اور اُسے اس بات سے راحت ملی کہ فیض آباد کی دیواریں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کر رہی تھیں — وہ جنم گھٹی بیچ رہی تھیں، لال تیل اور دودھ کی بوتلیں، بیچ رہی تھیں۔ نوجوان اُن دیواروں سے موٹر سائکلیں پاتی۔ وہی خرید رہے تھے۔ خوبصورت عورتیں ہونٹوں کی سرخی اور بریزیر خرید رہی تھیں اور نامرد لوگ اُن دیواروں میں بیٹھے پوشیدہ امراض کے حکیموں اور ویدوں سے دندناتے جوش اور مردانگی کی دواؤں کی خرید و فروخت کر رہے تھے۔

سب بچوں کے کھلونے ایک سے تھے۔ لکڑی اور پلاسٹک کے کھلونے۔ ربر کی چھوٹی چپلیں — وہی نیلی، ہری یا اودی۔ کسی نے اُن کی چپلیں یا کھلونے یا دودھ کی بوتلیں، اُن کی نپلیں یا انہیں صاف کرنے کے برش الگ الگ نہیں بنائے تھے۔ اُن کی ضد کے بھی ڈھنگ ایک سے تھے۔ وہ ویسے ہی اپنی ماں کے چوڑیوں بھرے ہاتھ کھینچ رہے تھے اور اپنی پسند کی دوکانوں کی طرف لے جانا چاہتے تھے... سب اسی طرح پتے پر چاٹ کھا رہے تھے اور پان کھا کر برقعے والی حسیناؤں کے ہونٹ اسی طرح ہلکے گلابی سے رچے ہوئے تھے جیسے کنول کے پھول کے۔

اُسے یقین نہیں ہو رہا تھا، کیونکہ وہ تو کچھ اور ہی دیکھنے آیا تھا... یہ سب دیکھ کر اس کی آنکھیں

پھٹی رہ گئی تھیں۔ بھاگا بھاگا ہوا وہ جن مورچہ اخبار کے دفتر میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ پوچھنے کہ سب جو اس نے دیکھا ہے — سچ ہے، یا کسی معجزاتی خوف نے اپنا مایا جال پھیلا رکھا ہے؟ کیا یہی فیض آباد ہے یا وہ کسی دوسرے شہر میں آ گیا ہے۔ کیونکہ یہ تو فیض آباد نہیں کوئی طلسم لگتا ہے۔ ایڈیٹر شیتلا سنگھ اُسے حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔ وہاں رکنا عجیب لگ رہا تھا۔ لہٰذا وہ نکل پڑا۔

وہ ایک خوبصورت مقبرے کے پاس سے گزر ہی رہا تھا کہ ایک نہایت ہی سوکھے سے ہاتھ نے اُس کا کندھا تھام لیا۔ وہ گھبرا گیا۔ مڑ کے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کی پردادی کی طرح بوڑھی اور نہایت خوبصورت عورت اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے بال چاندی کے تھے۔ چہرے پر سرجو کے لہروں جیسی جھریاں تھیں۔ اس بوڑھی نے پوچھا —

— نہیں پہچانا؟... میں فیض آباد کی بہو بیگم ہوں۔ میں تو نہیں گئی اپنا فیض آباد چھوڑ کر... وہ چلا گیا۔ اپنی راجدھانی بھی لکھنؤ اٹھا لے گیا۔ میں نے کہا — جا... تو ہی میرا اکیلا بیٹا نہیں ہے۔ میرے ہزاروں لاکھوں بیٹے ہیں... میں تو فیض آباد نہیں چھوڑوں گی!

— دادی آپ رہتی کہاں ہیں؟

— ارے تجھے اتنا بھی نہیں معلوم... میں اسی مقبرے میں رہتی ہوں... یہیں دفن ہوں۔ میں نے دیکھا کہ تو یہاں سے گزر رہا ہے تو سوچا کہ تجھ سے مل لوں۔ صدیوں بعد یہ من کیا کہ تجھے دیکھ لوں... تو امیر خسرو کے خاندان سے ہے نا؟ ادیب ہے نا؟

— ہاں، امی جان! ادیب ہوں۔ امیر خسرو ایٹہ کے تھے، میں مین پوری کا ہوں... تیس میل کا فاصلہ ہے!

— تیس میل کیا ہوتا ہے؟ ادیب تو صدیوں کا فاصلہ طے کرتا ہے... میرے بیٹے، بالمیکی، ویاس، کالیداس، کبیر، میرا بھی تو اسی خاندان کے بزرگ ہیں... جس کا تو وارث ہے...

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بھی بولے، وہ خود ہی بولتی گئیں — میں نے تجھے دیکھتے ہی پہچان لیا... تلسی داس بھی اُسی خاندان کا تھا۔ خسرو تو ایٹہ میں رہتا تھا، لیکن تلسی داس یہیں رہتا تھا ایودھیا میں!... تو بھی یہیں رہ، کیوں بھٹکتا ہے گاؤں گاؤں، صوبہ صوبہ! تو بیٹھ کے لکھ۔ تیرا لکھا صدیوں کے پار جائے گا... سب کے پاس جائے گا... اس عمر میں تیرے ماتھے پر یہ لکیریں... اور سانس میں اتنا غبار... کہاں سے بھاگ کے آیا ہے تو؟ بتا، میرے بیٹے بتا!

— دادی، وقت کچھ ایسا آن پڑا ہے کہ میں کہیں چین سے بیٹھ نہیں پاتا، سوچ نہیں پاتا۔ لکھ نہیں پاتا... آج کل میں خون سے نہاتا ہوں اور بندوقوں کی گولیاں کھا کر زندہ رہتا ہوں!

—ارے بیٹے، ہاں! ایک گولی مجھے بھی لگی تھی... ارے پوچھو، ان کشمیری مجاہدوں کا میں نے کیا بگاڑا تھا؟... لیکن بیٹا، تو اپنا خیال رکھ... کوئی راجا مہاراجا، بادشاہ شہنشاہ، نیتا وزیر اعظم اپنے وقت کا جواب نہیں دے گا۔ سب اچھا یا برا کر کے مر جائیں گے... جواب صرف تجھے دینا پڑے گا یا قوم کو دینا پڑے گا۔ اس لیے تو اپنا خیال رکھ... میرے بیٹے، تو اپنا خیال رکھ... اتنا کہہ کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بیو بیگم روپوش ہو گئیں۔

جیب میں سے اردلی نے دستک دی— آپ اپنا کام پورا کیجیے...

— کیا؟

—بہت خوب! یہ بھی بھول گئے۔ آپ عدالت ملتوی کر کے کس لیے آئے تھے؟ یاد کیجیے اور میر باقی کے گاؤں کا پتہ پوچھیے!

اوہ! اُس نے کہا اور پاس سے گزرتے آدمی سے پوچھا— آپ کو میر باقی کے گاؤں کا پتہ ہے؟

— کون میر باقی؟

اور یہ آواز گونجتی چلی گئی— کون میر باقی؟ کون میر باقی؟

اُس نے جس کسی سے بھی پوچھا، اس نے یہی جواب دیا۔

اُس کا پتہ جب نہیں ملا تو وہ ایک چھاپہ خانے میں گھس گیا۔ وہاں صرف دو ہی چیزیں چھپ رہی تھیں— ایودھیا کی خونی تاریخ اور چندے کی رسید بکس۔ رسید بکس کے گٹھر لد کر ایودھیا کی مندروں میں جا رہے تھے۔

ڈاک خانوں پر بھیڑ لگی تھی۔ رام مندر سمیتیوں، بھجن منڈلیوں اور نہ جانے کن کن پارٹیوں اور تنظیموں کے ایجنٹ اپنی اپنی تنظیم کی ربر مہر لیے منی آرڈروں سے آئے چندے ڈاک خانے سے وصول کر رہے تھے۔

آخر اردلی جیب سے نکلا اور اس نے ایودھیا کی خونی تاریخ، کتاب میں سے میر باقی کا پتہ ڈھونڈ کر وہ صفحہ اس کے آگے بڑھا دیا۔

سلیھوا گاؤں... میر باقی کا گاؤں۔ تفصیل سامنے تھی۔ فیض آباد سے چار میل دور۔

گرمی، کچا راستہ، تیز دھوپ، اڑتی ہوئی گرم دھول کسی طرح وہ گاؤں کے بیچوں بیچ پہنچا۔ گیہوں اب کٹا تھا۔ کھیت خالی پڑے تھے۔ کھلیان بھرے ہوئے تھے۔ کچے پکے گھروں کا گاؤں، دس بارہ بچے کھیل رہے تھے۔ اسے کوئی بڑا اور بزرگ نظر نہیں آیا تھا۔

تب تک ایک بچی نے آکر پوچھا— ابا سے ملنا ہے!

— کہاں ہیں تمہارے ابا؟

—اُدھر چارپائی پر پڑے سو رہے ہیں!

—اردلی نے انہیں جا کر جگایا۔ وہ بھی پاس پہنچ گیا۔

—یہاں کوئی جاننے والا ہے؟

— کیا؟

— کہ اس گاؤں میں میر باقی تاشقندی کے خاندان والے کہاں رہتے ہیں؟

— کون میر باقی تاشقندی؟ ای سلیھوا گاؤں ہے... پوچھنا ہو تو تاشقند گاؤں جا کے پوچھو۔ ایہاں کا پوچھتے ہو! اُس بزرگ گاؤں والے نے کہا اور پھر اٹھ کر اندر چلے گئے۔ پھر وہ نہیں نکلے۔

عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا وہ۔ دھوپ سے جھلستے گاؤں کو اس نے دیکھا... پیچھے ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور ایک مزار... اس مزار کے سرہانے ایک لیمپ لگا تھا۔

اس نے اپنے کریو کو آواز لگائی۔ فوراً کیمرہ اور ساؤنڈ والے آگئے۔ پروڈکشن یونٹ بھی سرگرم ہو گیا۔

اس گاؤں میں اور کوئی مسجد اور مزار تو دکھائی نہیں پڑتا۔ یہی ہوگی میر باقی کی بنوائی ہوئی مسجد اور یہی ہوگا اس کا مزار! اس نے کہا تو اس کے کریو کے لوگ جوتے اتار کر مزار کے اونچے آنگن میں چڑھ گئے۔ ابھی وہ تصویریں لینا شروع ہی کرنے والے تھے کہ پچھلی گلی سے ایک بھیڑ دوڑتی آ پہنچی اور چیخنے چلانے لگی—

—آپ لوگ ہمارے بھارت میں آگ لگانے آئے ہیں! یہ ایک مولوی نما ادھیڑ کی آواز تھی۔

—آپ بغیر پوچھے اوپر چڑھے کیسے؟

—اجازت کس سے لی؟

—آپ ہیں کون؟

—نیچے اتریے!

—آخر آپ کا مقصد کیا ہے؟

—یہ گاؤں آپ کا ہے کہ منہ اٹھایا اور گھس آئے... چیختی چلاتی بھیڑ کسی لمحے بھی بے قابو ہو سکتی تھی۔ کوئی یوں ہی ایک اینٹ بھی اٹھا کر پھینک دیتا تو پتھراؤ شروع ہو جاتا۔ ادیب نرمی سے اس بھیڑ کو خاموش کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن کوئی کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ تب تک گاؤں کے نوجوانوں کا ایک غول بھی تہمد سنبھالتا، کرتے پہنتا بھیڑ میں شامل ہو چکا تھا۔ تناؤ کافی بڑھ گیا تھا۔

تبھی دو فرشتے درمیان میں آ کر کھڑے ہو گئے۔

اُن دونوں فرشتوں میں سے ایک نے پہچانا — ارے بھائی، ای تا اپنے سیتلا سنگھ بھائی ہیں، جن مورچہ والے! ای کو کو گلت کام ناہیں کرییں... شانت! خاموش!

اور اُس چلچلاتی دھوپ میں یہ معجزہ ہوا کہ سارے لوگ طیش اور غصے کو تھوک کر آس پاس جمع ہو گئے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ سب لوگ کس کام سے آئے ہیں؟

شیتلا سنگھ نے انھیں سارا مقصد بتایا تو وہی مولوی نما ادھیڑ سامنے آئے، بتانے لگے — اب بات ای ہے صاحب کہ ہم یہاں چین سے رہتے ہیں۔ پورا گاؤں مسلمانن کا ہے... اس میں شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی... او... میں...

— آپ کیا ہیں؟

— میری پرچون کی دوکان ہے... او... میں ای مسجد کا پیش امام بھی ہوں! یہاں کوئی میر باقی ناہیں رہا... نا اُس کا خاندانی کوئی ہے ایہاں...

تو یہ مزار کس کا ہے؟ بوس نے پوچھ لیا۔

— ای تو ہمارے سامنے والوں کے، اُن کے پیر گنج رہے... او ہم سب گاؤں والے بھی اُن کو پیر گنج مانتے ہیں۔ اُن ہی کا مجار ہے ای! اب آپ ہی سوچیں... کا میر باقی کا مجار او اوکی مسجد اتنی معمولی ہوئے سکتی ہے؟ ای تو آگ لگائے دی ہے غلط تاریخ لکھنے والوں اور دلی کے اخباروں نے... ایہاں آئے کے تصویریں اتاریں او جا کے لکھ دیا... ای میر باقی کی قبر ہے، او ای اوکی بنوائی مسجد!

— سالن کی ٹانگ تو ذری چاہیے!

بس آگ لگاتے گھوم رہے ہیں سب... ای ناہیں سوچتے کہ بھارت کا کا ہوگا! پہلے یہاں ہندو مسلمان کو لڑوانا چاہا، ناہیں لڑوائے پائے تو اب شیعہ سنی کو لڑوانا چاہتے ہیں...

اب تک پانی، شربت، نمکٹ اور مونگ کی دال منھ آ گئی تھی۔ خاطر شروع ہو گئی۔

— ہم جانت ہیں، آپ تو آگ بجھانے میں لگے ہو... آپ جو تو تصویر چاہیے، اتار لیں...

یہ سنتے ہی ونود کیمرہ لے کر مزار کے آنگن میں چڑھ گیا اور بات چیت کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا۔ وہیں پیڑ کے نیچے ایک بڑا سا چراغ رکھنے کا چبوترہ بنا تھا۔ اُسے دکھاتے ہوئے وہ ادھیڑ بتانے لگے —

— اس پر چالیسوں چراغ جلاتے ہیں ہم... جب تعزیہ اٹھاتے ہیں... ای دیپ گھر ہے...

ہم جب ہندو رہے تب ہمارے پرکھن نے بنوایا رہا... اب ہم تعزیہ اٹھاتے بخت اس پہ چراغ جلاتے ہیں۔

— مسجد میں نماز کون پڑھاتا ہے؟

— میں ہی پڑھاتا ہوں! پرچون کی وہی دوکان والے ادھیڑ بولے۔

— گاؤں میں بھی ایک مسجد ہے؟

— ہاں... ای میں دونوں نماز پڑھ لیتے ہیں! شیعہ بھی سنی بھی! پہلے ہم پڑھ لیتے ہیں پھر سنی... کوئی جھگڑا ناہیں ہے لیکن لوگ کروانا چاہتے ہیں، ابھی بات پہ...

— ویسے شیعہ اور سنی میں فرق کیا ہے؟ ادیب نے پوچھا۔

— کوئو ناہیں بابو صاحب! ایک بزرگ نے کہا — جون علی کو شدت سے مانتے ہیں، تون شیعہ، جون سستی سے مانتے ہیں تون سنی!

تبھی چیختی چلاتی، چھاتی پیٹتی ایک ادھیڑ عورت آ گئی — سیاتنی گئے بھاڑ چولہے میں... اے امام صاحب! مور بلقیس کو تو تم نے مروائے دیا... ای کا جے دار ہے وہ امیرات کا بلال...

— یہ کیا واردات ہے — ادیب کے کان کھڑے ہوئے۔ اردلی تب تک اِدھر اُدھر معائنہ کر کے اس کے پاس آ چکا تھا۔

عدالت کی ضرورت کو سمجھ کر وہ فوراً بلال کو بلانے گیا، لیکن خالی ہاتھ لوٹ آیا —

— حضور، بلال کا کہیں پتہ نہیں ہے... نہ وہ اس دنیا میں ہے نہ اُس دنیا میں!

یہ کیسے ہو سکتا ہے! عدالت بولی — سارے مذاہب اور تہذیبوں نے صرف دو دنیا کا اصول عائد کیا ہے... تیسری دنیا کیسے ہو سکتی ہے، جس میں جا کر بلال چھپ جائے؟

— پتہ نہیں حضور... لیکن وہ مجھے ملا نہیں! اتنا ضرور معلوم ہوا کہ وہ مصر کی طرف بھاگ گیا ہے!

— مصر کی طرف! تب تو وہ ضرور پکڑ میں آ جائے گا! آخر مصر والے مجھے کیسے بھول سکتے ہیں...

ہم اُس زمانے کی بات کر رہے ہیں جب انسان اور انسان کا خون ایک تھا، ہماری تہذیب ایک تھی، ہم سب دریائے نیل کی گود میں پلے تھے... ہم نے ہی مصری تہذیب کو جنم دیا تھا۔ مصر کی تہذیب میری ہی تو دین ہے! مصر والوں سے جا کر کہو کہ جس نے تمھیں تمھاری تہذیب دی ہے، اُسے بلال کی ضرورت ہے۔ کیا دریائے نیل کے رہنے والے بھول گئے کہ سین سے لے کر بحیرۂ روم تک کا ۵۰۰ میل کا وہ زرخیز حصہ میں نے ہی سینچا تھا۔ عیسیٰ سے چھ ہزار سال پہلے... اور پھر قارون چیوپس کا پیرامڈ میں نے اور میرے ساتھیوں نے بنایا تھا... جسے ہیروڈوٹس دیکھنے آیا تھا... ارے وہی یونانی

مورخ ہیرے ڈوٹس! شہنشاہ مینس نے کیا کیا، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن قدیم مصر کو ارواح کی آمد اور تناسخ کا مفروضہ میں نے ہی پیش کیا تھا...

—سر!

—چپ رہو ہاں... آج سے ۶۰۰۰ سال پہلے میں نے ہی یہ تصور کیا کہ انسان میں دو روحیں ہوتی ہیں... ایک وہ جو دنیاوی ہے، دوسری وہ جو ماورائی ہے... موت کے بعد بھی روح اپنی پرانی رہائش کو ڈھونڈتی آتی ہے، اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ اہرام ضروری ہیں، جن میں اس روح کے جسم کو محفوظ رکھا جاسکے، تاکہ روح جب چاہے تب اپنے دنیاوی جسم میں آ، جاسکے اور جانتے ہو تم...

—سر!

—جانتے ہو تم! مجھ میں صرف صدیاں ہی نہیں، تہذیبیں بولتی ہیں... ان اہراموں میں روح کی آمد و رفت کے لیے ہی میں نے راستے بنائے تھے تاکہ ارواح کو بھٹکنا نہ پڑے... ہماری طرح، جیسے آج ہم بھٹک رہے ہیں!

—ادیب عالی! بابر نے جیسے پریشان ہو کر ٹوکا...

—سنتے جاؤ بابر! اگر انسان کے انسانی جڑوں کو نہیں پہچانو گے تو تم آج کی دنیا کے دکھ درد کو نہیں سمجھو گے۔

—مجھے آج کی دنیا سے لینا دینا کیا ہے، عدالت عالیہ! بابر نے کہا۔

—لینا دینا ہے، کیونکہ ہم جو دنیا بناتے ہیں اس سے آنے والی نسلیں وابستہ ہوتی ہیں... اگر تمہیں کچھ لینا دینا نہیں ہوتا، تو تم آج یہاں اس عدالت میں موجود نہ ہوتے... کوئی زندگی آزاد نہیں ہے، وہ آگے اور پیچھے جڑی ہوئی ہے!

—جی!

—تو سنو، تم یا کوئی بھی، سبھی تو مصری تہذیب سے وابستہ ہیں۔ اپنی مصری تہذیب میں میں نے ہی تناسخ کا مفروضہ پیدا کیا تھا... میں نے موت کو آخری سچ نہیں مانا تھا... موت کے بعد پھر زندگی... یہی سب سے بڑا سچ تھا...

—اور شاید آپ نے ہی بت پرستی کی روایت توڑ کر ادویت قائم کی تھی۔ ادویت واد یعنی وحدانیت... تیمور بہت ادب سے بولا۔

—تم نے اس میں 'شاید' کیوں لگا دیا؟ شاید نہیں، بلاشبہ... اور سورج کو ہی ہم نے خدا مانا

تھا... اُسے عقیدت سے 'را' پکارا تھا... 'را' ہی ہمیں طاقت دیتا تھا، توانائی دیتا تھا... وہی موسموں کا خالق تھا، تخلیق اور سکھ کا داتا تھا! وحدانیت کو پختہ کرنے کے لیے فاروہ امین ہوتپ نے امون را کو قبول کیا تھا تاکہ تھیبس اور کرناک کی جنوبی تہذیب کو شمالی میمفس کی تہذیب سے ہم آہنگ کیا جاسکے... اسی نے سورج اور سورج کے چکر کا تصور کیا تھا اور تب ہماری تہذیب میں یہ یقین مضبوط ہوا تھا کہ سورج جب غروب ہوتا ہے تو مرنے والوں کی دنیا میں چلا جاتا ہے اور صبح کو طلوع ہو کر زندوں کی دنیا میں لوٹ آتا تھا...

ادیب تہذیب کی اس کہانی کو مسلسل بتاتا جا رہا تھا لیکن اسے توجہ سے کوئی نہیں سن رہا تھا۔ بابر نے اردلی کی طرف دیکھا تو اس نے سرگوشی کی—

—ہمارے صاحب کبھی کبھی بہک جاتے ہیں اور راج نیتاؤں کی طرح اوٹ پٹانگ بھاشن دینے لگتے ہیں... لیکن کیا کریں، آخر انسان کی اس خون آلود تقدیر کے بارے میں فیصلہ تو انہیں ہی دینا ہے۔ اس عدالت کو کون روک سکتا ہے!

تبھی پھر دستکیں پڑنے لگیں... پھر وہی چیخ و پکار اور کہرام مچنے لگا...

ادیب نے پہلے تو کانوں پر ہاتھ رکھے، لیکن جب اس بھیانک شور کو نہیں برداشت کر پایا تو کڑکتی بجلی سی آواز میں چیخا—

—خاموش! دنیا سے تو تم شکست کھا کر یہاں چلے آئے... اگر میں نے تمہیں یہاں سے نکال دیا تو کہاں جاؤ گے؟ بولو، کہاں جاؤ گے؟...

شور کچھ کچھ کم ہونے لگا تو ادیب پھر بھاشن پر اتر آیا—

—دیکھو... ہر تہذیب، ہر مذہب میں برہمن واد پیدا ہوا۔ بھارت میں تو وہ بہت دیر سے آیا، لیکن مصر کی تہذیب میں بھی پروہت واد اور برہمن واد پیدا ہوا۔ یہ جمود کی علامت تھا... میرے مصر میں بھی دیوتاؤں کے نام پر جو پرساد چڑھایا جاتا تھا، وہ وہاں کے مندروں کے پجاریوں کے پیٹ میں جاتا تھا۔ وہ پجاری اُن مندروں میں شان و شوکت سے رہتے تھے۔ وہ محنت، فوجی خدمت اور ٹیکسوں سے آزاد تھے۔ یہ پروہت پجاری اور برہمن ہی مصری تہذیب کے زوال کا باعث بنے۔ یہی کیسرین تہذیب میں ہوا، جو سورج کے نہیں چاند کو پوجنے والے تھے، جو شخص آزادی کو بہت اہمیت دیتے تھے...

—حضور... ادیب عالی! بابر چیخا۔

— سننے دو! اُس سے زیادہ زور سے فوہرر چیخا۔

— تو سنو! سمیرین تہذیب کے برہمنوں نے مرنے والوں اور ارواح کے پیرامڈ نہیں بنائے، بلکہ دیوتاؤں کے نام پر اپنے لیے مندر تعمیر کیے... جب سمیرین تہذیب کے برہمن خود غرض ہو گئے تو اس تہذیب کا بھی خاتمہ ہو گیا اور تب اُس برباد تہذیب پر پیدا ہوئی بیبی لونین تہذیب، بیبی لونین تہذیب نے پچھلی ملی جلی تہذیب کو قبول کیا تھا۔ دجلہ اور فرات کی گھاٹی اس ملی جلی تہذیب سے حصول ہوائی تھی۔ لیکن بیبی لونیا کی تہذیب میں بھی برتری کا غرور پیدا ہوا... اس میں بھی غیر تحریری ورن بنتے گئے... یہی اسیرین، ہتّی، آرمینیم، ہبرو، ایرین اور یونان ملکوں کے ساتھ ہوا...

لیکن یہ تہذیبیں بچ نہیں سکیں، کیونکہ ان میں بھی برتری کے نام پر وہ لوگ ظاہر ہوئے جو مندر، ایوان اور پاکیزگی کے نام پر خود کو پروہت پکارتے تھے۔ یہ پروہت ہی اصل برہمن تھے... جو ذات پات نہیں، مفاد پر مرکوز نسلیت اور برہمن واد کی علامت تھے، یعنی جو جمود کو پناہ دیتے تھے اور وقت کو بدلنے نہیں دیتے تھے...

ابھی ادیب پاگلوں کی طرح گھوم گھوم کر اور کبھی کبھی بال نوچتے ہوئے اپنا بھاشن دے ہی رہا تھا کہ پھر بھیانک دستکیں پڑنے لگیں۔ مردوں کی دنیا میں افراتفری مچنے لگی... چیخ و پکار اور آہ و زاری کی آواز تیز سے تیز تر ہونے لگی تو گھبرا کر ادیب نے اردلی سے فکرمند ہو کر پوچھا—

— یہ بھیانک شور کیسا ہے؟

— سر! جب آپ بھاشن دینے لگتے ہیں تو دنیا کے کسی حصے میں کہیں نہ کہیں خون ہو جاتا ہے... کوئی پرتشدد آدمی جاگ پڑتا ہے اور نسل یا مذہب کے نام پر لوگوں کو بھڑکا دیتا ہے! اور وہ مذہب یا نسل اپنا بدلہ چکانے لگتی ہے...

— لیکن یہ کون لوگ ہیں جو تہذیب کی کہانی کو روک کر بربریت کی داستان سنانا چاہتے ہیں؟

— سر! یہ ۳۹ لوگ جنوبی افریقہ کے بائی پوتونگ علاقے سے ابھی ابھی مر کر آپ کی عدالت میں حاضر ہوئے ہیں۔ یہ سیاہ افریقی ہیں جنہیں گوری چمڑی والے جنوبی افریقی حکومت نے ہی قتل کرایا ہے!

— لیکن وہاں تو نیلسن منڈیلا کی افریقی نیشنل کانگریس ہے اور ڈی کلارک کی گوری حکومت سے سمجھوتہ ہو چکا ہے کہ وہ مل جل کر نیا آئین بنائیں گے اور سیاہ فاموں کو اُن کے بنیادی حقوق دیں گے۔ پھر یہ قتل و غارت گری کیوں؟

— سر! انگریز گوروں نے افریقیوں کی ایک پارٹی 'انتھا فریڈم پارٹی' کو توڑ لیا ہے اور یہ قتل

انہیں سے کروایا ہے...

— ہوں! تو یہ ۳۹ مردے کیا چاہتے ہیں؟

— یہ انصاف چاہتے ہیں۔

— لیکن یہ دوسرے کون لوگ دستکیں دے رہے ہیں؟ جب تک دستکوں کا سلسلہ بند نہ ہوگا، انصاف کیسے ہوگا؟

— کیا کیا جائے حضور! آپ انصاف کرتے چلیں... دستکیں اپنی رفتار سے پڑتی رہیں گی!

— لیکن دستکوں کی رفتار بہت تیز ہے۔

— تو سر! آپ کو اپنے انصاف کی رفتار تیز کرنی ہوگی... جب انصاف تیز رفتار سے چلے گا تو کوئی نہ کوئی حل نکلتا جائے گا!

تبھی جماہی لیتے ہوئے بابر اور فوہرر نے کہا—

— ادیب عالی! اب ہمیں جانے کی اجازت دی جائے... ہماری قبروں پر فاتحہ پڑھنے والے لوگ آنے والے ہیں، اگر ہم انہیں وہاں نہیں ملیں گے تو آپ کے لیے مصیبت کھڑی ہو جائے گی اور دس بیس لاکھ بے گناہ لوگ مار ڈالے جائیں گے!

— ٹھیک ہے! ادیب نے کہا— تم دونوں جاؤ، لیکن سوا اپنی قبر کے تمہیں اور کہیں جانے کی اجازت نہیں ہے تاکہ جب ضرورت ہو تمہیں بلایا جا سکے!

بابر اور فوہرر رخصت ہوئے تو اور تیزی سے دستکیں پڑنے لگیں اور لوگ چیخنے لگے—

— ہم کراچی سے آئے ہیں... ہم سندھی ہیں، ہمیں پاکستانی فوج نے مہاجروں کے کہنے پر مارا ہے۔

— ہم لبنانی ہیں، ہمیں کرسچیوں نے مارا ہے۔

— حضور، ہم بوسنیا سے آئے ہیں، ہمیں سربوں نے مارا ہے!

— ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب مر گئے ہو تو چین سے بیٹھو... زندہ رہنے کے لیے مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں، مر کر آدمی چین کی زندگی بسر کرتا ہے— یہی مصری تہذیب نے ہمیں بتایا تھا اور مصری و آریہ تہذیب نے اسی لیے تاریخ کو مانا تھا... فرق صرف اتنا تھا کہ سندھ تہذیب نے تاریخ کے سچ کو الگ الگ شکلوں میں تقسیم کیا ہوا مانا تھا، لیکن مصری تہذیب نے انسان کا تاریخ انسان کی شکل میں ہی منظور کیا تھا... اسی لیے میں مصری تہذیب کا حامی ہوں... کیونکہ ہم انسانی جون کو حاصل کر کے

مسلسل مہذب ہوتے آئے ہیں...

— سرکار! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اگر ہم مسلسل مہذب ہوتے آئے ہیں تو آپ کی عدالت میں ان دستکوں کی ضرورت کیوں ہے؟

— ہاں! یہ تو صحیح سوال ہے! کہتے ہوئے عدالت کچھ سوچنے لگی، پھر پریشان ہو کر اس نے حکم دیا— زندگی کو بلاؤ! اُسے فوراً پیشتر حاضر کرو!

— زندگی! اردلی نے بھنویں چڑھا کر پوچھا۔

— ہاں زندگی!

— یعنی کہانی!

— جو بھی سمجھو، کہانی اور زندگی میں آج دوری کہاں ہے؟ عدالت نے کہا۔

اردلی زندگی اور اس کی کہانی کو لانے کے لیے جانے لگا۔ لیکن یکبارگی وہ رک کر بولا—

— لیکن سرکار! آپ نے تو بلال کو مصر سے پکڑ لانے کا حکم دیا تھا! اُسے لاؤں یا نہیں؟...

کیونکہ سرکار... یہ اپنی ہندوستانی لڑکی بلقیس بہت رو رہی ہے اور اپنا انصاف مانگ رہی ہے۔

— اوہ... میں بھول ہی گیا... جاؤ اور کہیں سے بھی بلال کو حاضر کرو!

اردلی اچانک غائب ہوا اور فوراً عرب امارات کے ساحلی مسائل کا عہدیدار محمد بلال کو کان سے پکڑ کر لے آیا اور اُسے پیش کر دیا— حضور بلال! اسے پکڑ لایا... یہ حاضر عدالت ہے!

لیکن بلال سمجھ ہی نہیں سکا کہ یہ کیسی عدالت تھی اور اسے کیوں پکڑ کر لایا گیا ہے؟ لیکن جب اُسے اُس کے الزام کے بارے میں بتایا گیا اور پوچھا گیا کہ وہ بے چاری ہندوستانی لڑکی بلقیس کن حالات میں ماری گئی، تو اس نے عدالت کو حقارت سے دیکھا۔

بلال بپھر اٹھا— اوہ، بلقیس! لیکن ایک ہندوستانی عورت کی زندگی اتنی قیمتی نہیں کہ اس کے بارے میں مجھ سے جواب مانگا جائے۔ خود تمہارے ملک کے فسادات میں کتنی بلقیس روز مرتی ہیں... اُن کے ساتھ زنا کیا جاتا ہے... تب تم خاموش رہتے ہو... تب اپنے لوگوں سے تم جواب نہیں مانگتے۔

تبھی مردہ بلقیس کی سسکیوں کی تیز آواز آنے لگی اور مشکل یہ تھی کہ بلقیس کی سسکیوں کے ساتھ ہی کوریا کی ایک ستر سالہ عورت کم ہکسون بھی تھی۔ وہ بھی مسلسل روئے جا رہی تھی۔

عدالت سکتے میں آگئی۔ اس نے پریشانی سے کہا— مردہ لوگوں کو زندہ لوگوں سے الگ کیا جائے،

ورنہ تو سب گڈمڈ ہو جائے گا... میرے کان میں ابھی ایک جاپانی نے قانونی نزاکت کا مسئلہ اٹھایا ہے اور کہا ہے کہ کم ہکسون ابھی زندہ ہے اور اُسے میری عدالت میں حاضر ہونے کا کوئی حق نہیں ہے!

کہتے ہوئے عدالت نے اپنی پیشانی پر دستک دی— یہ ایک آئینی سوال ہے... میں صرف مردوں کی شکایتیں سننے کا مجاز ہوں... لیکن...

— حضور! ان قانونی باریکیوں میں مت جائیے۔ ناانصافی ناانصافی ہے! ناانصافی سے پریشان عورت کی زندگی تو موت سے بھی بدتر ہوتی ہے!

— تم ٹھیک کہہ رہے ہو محمود علی! عدالت چیخی تو پوری کائنات کانپ گئی— نہیں، میں مردوں کے علاوہ ان زندہ لوگوں کی فریاد سننے کا حق بھی رکھتا ہوں جو جیتے جی مردہ مان لیے گئے ہیں!...

پلٹ کر عدالت نے کم ہکسون کی طرف دیکھا— ہاں! تم اپنی کہانی بتاؤ!

کم ہکسون نے کہا— سر! میں کوریائی ہوں۔ تب میں ۱۷ سال کی تھی۔ ویسے میں پیدا تو ۱۹۲۳ء میں جیلن میں ہوئی تھی۔ لیکن ۱۹۴۱ء میں مجھے بیجنگ سے جاپانی فوجیوں نے اٹھایا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران مجھ سے جاپانی سولجروں نے مسلسل ۱۵ بار ہر روز زنا کیا۔ مجھے 'تسجتائی' کور میں بھرتی کیا گیا جو جیکس کور تھی، جسے کمفرٹ کور کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کور میں قریب چالیس ہزار عورتیں، لڑکیاں زبردستی بھرتی کی گئی تھیں اور ہم ہر روز کم سے کم چودہ جاپانی فوجیوں کی دیوانی ہوس کو سہتی اور آسودہ کرتی تھیں...

تبھی بلقیس کی تیز رلائی پھوٹ پڑی—

— کم ہکسون! یہ تو تمہارے ساتھ تب ہوا جب جنگ جاری تھی... لیکن میرے ساتھ تو یہ تب ہوا جب جنگ نہیں تھی... مجھے تو صرف تصویر اور ڈاک کے ذریعہ شادی شدہ ہونے کے نام پر اس گندے پیشے میں ڈالا گیا... عدالت عالیہ!... بلقیس پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی— حضور! نہ تو مجھے ان کی زبان آتی تھی نہ ان کی تہذیب... لیکن وہ عرب تھا، جو مجھے بیاہ کا ناٹک کر کے لے گیا تھا، وہ مجھ سے ۳۸ برس بڑا تھا اور جیسے یہ کم ہکسون چودہ جاپانیوں کی ہوس کا شکار ہوتی تھی، اسی طرح میں ہر روز بیسیوں بار اپنے اُس خاوند کی فطری اور غیر فطری حرکتوں کا شکار ہوتی تھی۔ پھر جو بچہ ہم جیسوں سے پیدا ہوتا تھا اسے 'تیلی بچہ' کہا جاتا تھا اور عرب سماج سے اُسے دور رکھا جاتا تھا...

عدالت کے ماتھے پر سلوٹیں پڑیں، پھر وہ چیخی— او عرب امارات کے افسر بلال! کم ہکسون کی عصمت کا جواب تو جاپانی دیں گے، لیکن تم اس عدالت کو بلقیس کے اس 'تیلی بچے' کی تفصیل دو... جو زبردستی پیدا کیا گیا، پیدا ہو گیا!

اور ساتھ ہی عدالت نے اردلی کو دیکھتے ہوئے کہا— تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو! میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ زندگی کو حاضر کرو... اُن وحشی جاپانیوں اور اس بلال کا بیان میں درج کراوں گا، لیکن تم فوراً جاؤ اور پاکستان کراچی کے ہوائی اڈے سے اُس زندگی کو لاؤ جو زندہ ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی نہیں جی سکی...

حکم کی تعمیل کرنے کے لیے اردلی جیسے ہی تیزی سے چلا کہ عدالت پر حملہ ہوا... طرح طرح کے نعروں کا شور برپا ہوگیا اور تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ کہرام مچ گیا اور عجیب بات یہ ہوئی کہ مردے پھر مرنے لگے۔ وہ زندہ لوگوں کی طرح ہی چیخنے، کراہنے اور چلانے لگے، لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ کون کس کو مار رہا ہے، کیونکہ دنیا کے سارے پاکستانوں کے باشندے اپنی ہی قوم کے باشندوں کے خون کے پیاسے ہوگئے تھے۔

ادیب گھبرا گیا۔ وہ چیخا— یہ کیا بدتمیزی ہے! ہم انسانی تقدیر کے فیصلے کے ساتھ ساتھ زندہ آدمی کی زندگی کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی یہاں موجود ہیں! یہ مردوں کے حقوق کا نہیں، زندہ انسانوں کے حقوق کا بھی سوال ہے۔

— دوہری بات مت کرو! اگر زندہ لوگوں کی زندگانی کا فیصلہ کرنے کے لیے تم نے عدالت لگائی ہے تو پھر تم نے مردوں کی یہ مجلس کیوں جمع کر رکھی ہے؟ ایک حملہ آور نے سوال کیا۔

— کیونکہ یہ مردے اپنی زندگی سے پہلے مارے گئے ہیں۔ ان کی زندگی ابھی باقی ہے اور میں انہیں مردوں سے مل رہا ہوں جو اپنی قدرتی موت سے پہلے مر گئے ہیں۔ زندگی اور غلط موت کے درمیان جھولتی ان کی عمر کا حساب کون دے گا؟ ادیب چیخا— قیامت کے دن تک یہ کہاں انتظار کریں گے؟ ان کے اعمال کا حساب کس نے درج کیا ہے جس سے ان کی اگلی زندگی کی شکل طے ہوگی... یہ بے چین اور ادھوری روحیں بے وقت موت کی شکار روحیں ہیں... ان غلط اموات کا ذمہ دار کون ہے؟

ادیب چیختا ہی رہ گیا۔ حملے جاری تھے اور قہر برپا تھا۔ دھواں، دھماکے، تڑتڑ، ہنگامہ اور بدامنی، چیخیں، شور اور آگ۔ یہ بدامنی دیکھ کر اردلی تیزی سے لوٹا۔ جیسے تیسے اُس نے ادیب کی جان بچائی اور اسے لے کر بھاگا۔

۱۶

بھاگتے بھاگتے وہ پست ہوگئے۔ وہ ایک بڑا ریگستان تھا۔ اس کے ریت پر بھاگنا آسان نہیں تھا۔ ریگستانی طوفان کی وجہ سے اور بھی دشواری تھی۔ اُس کی آنکھوں، کانوں، نتھنوں، بالوں اور

کپڑوں میں ریت بھر گئی تھی... چاروں طرف بیابان ریگستان... اڑتی گرم ریت کے بگولے اور دھول کی لہروں سے بنتے اور بگڑتے ٹیلے...

ہانپتے ہوئے ادیب گر پڑا۔ اردلی بری طرح ہانپتے ہوئے اُس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ تھوڑا دم میں دم آیا۔ سانسیں ٹھیک ہوئیں تو اس نے اردلی سے پوچھا— ہم کہاں ہیں؟

— حضور! ہم ایک ریگستان میں ہیں۔

— دوست، میں اب بری طرح سے تھک گیا ہوں۔ میں اپنے دوستوں اور معاصرین کو آواز دینا چاہتا ہوں کہ میرا ساتھ دو... راکیش، رینو، دُشینت، راہی، پرسائی، رگھوویر، شری کانت کے علاوہ میں اپنے تمام اُن زندہ دوستوں کو آواز لگانا چاہتا ہوں جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کو اپنے لیے نہیں دنیا کے لیے وقف کر دیا ہے اور وہ مسلسل اپنی ذاتی تخلیقی صلاحیت اور اپنے قلم کی سچائی سے اس دنیا کو بہتر بنانا چاہتے ہیں... ان سے کہو، میرا ساتھ دیں... میں بہت اکیلا پڑ گیا ہوں! اُن سے ہاتھ جوڑ کر کہو کہ دنیا کو اُن کی ضرورت ہے... لیکن مجھے پہلے بتاؤ کہ یہ کون سا ریگستان ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ ادیب نے پریشانی سے پوچھا۔

— پتہ نہیں، یہ کون سا ریگستان ہے... لیکن ریت کے سوا یہاں کچھ اور نہیں ہے حضور! اردلی نے اپنی ریت جھاڑتے ہوئے کہا۔

اپنی ریت صاف کر کے اب تک ادیب بھی سکون سے بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا— اردلی! دیکھو، دیکھو... ان سفید بگلوں کو دیکھو... یہ کیسے اڑ رہے ہیں!

— حضور! یہ بگلے نہیں، اسی سفید ریت کے پرندے ہیں۔ یہ گرم بگولوں کے ساتھ اٹھتے ہیں، کچھ دیر ریت کے یہ پرندے اپنے پنکھ پھڑپھڑاتے ہیں۔ پھر اسی ریت میں مل جاتے ہیں! اردلی نے ادیب سے بتایا۔

ادیب ان پرندوں کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے لگا۔

— ہم کدھر جا رہے ہیں حضور؟ اردلی نے پوچھا۔

— یہاں سمت تو ہیں نہیں، جس طرف پاؤں اٹھ گئے اسی طرف چل پڑا ہوں۔ تھوڑی مدد ریت کے ان اڑتے ہوئے پرندوں سے مل رہی ہے... ادیب نے کہا اور چلتا رہا۔

ریت ہی ریت، چاروں طرف۔ کہیں کوئی راستہ نہیں تھا۔ کوئی پڑاؤ یا منزل نہیں تھی۔ صرف ریت ہی ریت۔ پتہ نہیں وہ دونوں کب تک اور کہاں تک چلتے رہے۔ کتنی راتیں گزریں، کتنے دن بیتے، کچھ پتہ نہیں۔ جہاں بھی وہ پہنچتے، یہی لگتا کہ یہیں سے تو چلے تھے۔ سارا ریگستان ایک سا تھا۔

دیکھتے دیکھتے قدموں کے نشان بھی مٹ جاتے تھے۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ چلے بھی تھے یا نہیں۔

—سر! ہم ہر روز اتنا چلتے ہیں لیکن کہیں پہنچ ہی نہیں رہے ہیں! آخر ایک دن اردلی بول ہی پڑا۔

—چلنا اپنی جگہ ہے اور پہنچنا اپنی جگہ... ان دونوں کو ملاتے کیوں ہو؟ ادیب بولا— اس کا ثبوت ہیں یہ ٹھہری ہوئی صدیاں، جو لاکھوں کروڑوں برس پہلے چلی تھیں، لیکن وہیں پہنچیں، جہاں سے وہ چلی تھیں۔ بیچ بیچ میں انہیں مذہب کے پڑاؤ ملے اور ان پڑاؤں نے پھر انہیں اسی بیابان ریگستان میں پہنچا دیا۔

اردلی اس کی بات نہیں سمجھ پایا تو ادیب نے کہا— دیکھو، ہر چیز اپنا کام کرتی ہے۔ اندھیرا آتا ہے، پر وہ خود سے یہ پوچھ کر نہیں آتا کہ وہ کتنا چل کر آیا ہے۔ روشنی آتی ہے، وہ بھی اپنے فاصلوں کا حساب کتاب رکھ کر نہیں چلتی۔ یہ ریت اڑتی ہے، اڑ اڑ کر چلتی ہے، پر اس نے بھی نہیں بتایا کہ اس نے کتنا فاصلہ طے کیا ہے۔

اردلی کو چپ رہنا ہی ٹھیک لگا۔ اُسے لگا کہ صاحب پھر بہک رہے ہیں۔ آخر کہیں دور ایک سایہ سا نظر آیا۔ تعجب کی بات یہ تھی وہ سایہ دیکھتے دیکھتے پھیل جاتا تھا۔ پھر ابھر آتا تھا۔ ادیب نے کئی بار آنکھوں کو دوربین بنا کر اس سایہ کو دیکھا۔ اس سائے نے بھی اُسے دیکھا اور وہ بھاگتا ہوا آیا اور پاس پہنچتے ہی وہ سایہ مرد اس سے لپٹتے ہوئے بولا— ارے ادیب، تم کہاں، ہندوستان سے کب آئے؟

—ارے کامریڈ امام نازش تم! تم پاکستان سے کب آئے؟ بنے بھائی... ارے اپنے سجاد ظہیر کہاں ہیں؟ تم کیسے ہو امام نازش؟

—میں اچھا نہیں ہوں! زندہ بھی ہوں، مردہ بھی۔ میں تو پاکستان گیا تھا۔ جمہوریت کے لیے... غریبوں کی لڑائی لڑنے کے لیے... میں پاکستان گیا تھا، اپنی بیوی، اپنا گھر، امروہہ میں چھوڑ کر...

—ہاں نازش، مجھے یاد ہے، تب تم نے بھی پاکستان زندہ آباد کے نعرے لگائے تھے اور سندھ اسمبلی میں جی۔ ایم۔ سید نے بھی پاکستان کا استقبال کیا تھا۔ بنے بھائی بھی تب یہ بھول گئے تھے کہ پاکستان محنت کشوں، کا ملک نہیں، وہ بڑے سرمایہ داروں کا ملک ہے... جس کی بنیاد مذہبی منافرت سے بھری گئی تھی... اور تم مارکسسٹ اُس مذہبی نفرت کو تب ایک مذہبی اور فرقہ وارانہ ضرورت مان کر ملک کی تقسیم کی حمایت کر رہے تھے۔ تم مذہب کو عوام کی افیم مانتے ہوئے بھی مذہبی اور لسانی نسل پرستی کو ترجیح دے رہے تھے... ادیب نے ایک کے بعد ایک طعنے دیے تو امام نازش بوکھلا گئے اور طیش میں بولے—

—تب تم بھی ہم سے کہاں الگ تھے۔ تب ادیب تم، امریتا پریتم، کرتار سنگھ دگل، موہن راکیش، بھیشم ساہنی، دیویندر ستیارتھی اور یہاں تک کہ تمہارے یش پال، اشک اور اپنے تک خاموش رہے۔ تم لوگوں نے تقسیم کے بعد کے ہولناک منظر کو پیش ضرور کیا لیکن ایماندار تماشائیوں کی طرح۔ وہ صرف منٹو تھا جس نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی لاش سرحد کی غیر فطری لکیر پر پھینکی تھی۔ ہم نے غلطی کی پر تم نے بھی تو اس غلطی میں ہاتھ بٹایا تھا! امام نازش نے طیش میں کہا— جب سجاد ظہیر پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری بنے، تو میں مشرقی پاکستان چھوڑ کر مغربی پاکستان چلا گیا اور وہیں ہمیں مذہبی بنیاد پر بنے ملک پاکستان کی اصلیت کا پتہ چلا... میں نے بنگال جا کر محسوس کیا تھا کہ مذہب کے نام پر قوم کو طے کرنا غلط تھا۔

—لیکن اب تو کبھی ملکوں میں نفرت کا ایک پاکستان بنانے کی کوششیں جاری ہیں... کیا ہوا بوسنیا میں، کیا ہوا ہے سائپرس میں، کیا ہوا ہے تب کے ٹوٹے سوویت یونین اور اب کے بنے رشین فیڈریشن میں۔ کیا ہو رہا ہے آج کے افغانستان میں؟ ہر شخص نفرت کے سہارے اپنے ہی لوگوں کے خلاف ایک دوسرا پاکستان ایجاد کرنا چاہتا ہے۔

تبھی ریت کے ویران جنگل سے ایک آواز آئی— نفرت ہی اب آدمی کو پہچان دیتی ہے... نفرت سے ہی آدمی اور اس کی نسل و فرقے پہچانے جانے لگے ہیں۔ نفرت کی ایکتا کے لیے ماضی کام آتا ہے۔ ماضی کا کرب، عظمت اور وہ یادیں جو سسکتی اور دہکتی ہیں... تاریخ اپنے ماضی کو درست کرنے کی لگاوٹ دے سکتی ہے، لیکن تاریخ کو بھی ماضی کی آگ کے کنڈ میں جھونک دیا جاتا ہے۔ تاریخ کا تجزیہ، اس کی سماجی تشریح انسان کی نفرت کو دلائل سے دباتی ہے، لیکن ماضی دلائل کے نظام کو قبول نہیں کرتا، وہ صرف جزوی سچائیوں کو یاد کی کہانیوں میں بدل دیتا ہے اور اُسے صدیوں زندہ رکھتا ہے۔ نفرت ایک ایسا اسکول ہے جس میں پہلے خود کو ذلیل و رسوا کیا اور ڈسا جاتا ہے... اُسے نفرت کی کھاد سے سینچا جاتا ہے اور تب اس کی یاد کو متحد کر کے انتقام کے نکیلے ہل سے جوت کر ہموار کیا جاتا ہے۔ اسی لیے نفرت پرستوں کے دلائل ابھرے اور ایک سے ہوتے ہیں... ان کے پاس زیادہ باتیں نہیں ہوتیں۔ وہ ہزاروں لاکھوں زبانوں سے ایک ہی آواز میں بولتے ہیں، ایک سے سوال اٹھاتے ہیں، ایک سی دلیلیں دیتے ہیں۔ یہی اُن کی ایکتا کی پہچان بن جاتی ہے۔

—اردلی، یہ بھاشن کون دے رہا ہے؟ ادیب نے پوچھا۔

—سر! یہ یہودی ادیب اموس اوز ہے۔

—ایک ادیب اس ریگستان میں کیا کر رہا ہے؟

—میں نے پتہ کیا ہے، یہ یہیں رہتا ہے، ہیگیو ریگستان کے آزاد شہر میں۔

—یہ اس شہر کہاں ہے؟

—ایک بستی ہے حضور!

—بستی؟

—جی ہاں حضور... اِس ریگستانی بستی میں دنیا کے سارے ادیب آ کر بس گئے ہیں...

—چلو میں تمہیں لے چلتا ہوں۔ آؤ... اموس اوز کے سائے نے کہا اور وہ آگے آگے چلنے لگا۔

پھر پتہ نہیں وہ کب تک چلتے رہے۔ راستے میں امام نازش اپنی درد بھری کہانی سناتے رہے۔— دیکھو ادیب! اب میرے پاس پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ہے... نفرت کے جس سیلاب کی ہم نے تائید کی تھی، اس نے کسی کو کہیں نہیں پہنچایا... شادی کو تین مہینے ہوئے تھے، میں اپنے بھرے پورے گھر اور بیوی کو امروہہ میں چھوڑ کر اس اندھے سیلاب میں بہتا ہوا پاکستان پہنچ گیا تھا... اپنی سرزمیں سے اکھڑ کر... پاکستان میں مسلسل مجھے روپوش رہنا پڑا۔ مجھے لگتا تھا کہ اب شاید میں کبھی امروہہ لوٹ نہیں پاؤں گا... میری بیوی ٹیچر ہوگئی اور امروہہ میں ہی اُس نے اپنی پوری زندگی بچوں کو پڑھانے میں لگا دی۔ اُس نے ہندوستان میں ایک نئی نسل پیدا کر دی لیکن میں نے ایک نسل برباد کر دی اور اس کے ساتھ ساتھ میں خود بھی برباد ہوگیا۔ میں برسوں بعد جنگ میں امروہہ پہنچ ہی گیا۔ دیکھا کہ گھر کے وہ بچے، بھتیجے، بھتیجیاں، جنھیں میں تین تین چار چار سال کا چھوڑ کر جلاوطن ہوگیا تھا وہ خود بال بچے دار ہوگئے ہیں۔ میری بیوی ریٹائر ہونے کے کگار پر کھڑی تھی، جب امروہہ میں میری اُس سے ملاقات ہوئی۔ ایسے ریگستان پر بے حد خوبصورت زندگی ایک ہندوستانی عورت ہی گزار سکتی ہے۔ میں نفرت کے سیلاب کا حصہ بنا، لیکن میری بیوی ایک نئے تعمیر کے سیلاب کا حصہ بنی...

—زندگی کی راہیں زیادہ تر پچھتاوے سے ہی کھلتی ہیں... ادیب نے کہا تو اموس اوز نے مداخلت کی— لیکن مشکل یہ ہے کہ اندھیرے کے سیلاب ایک ساتھ نہیں آتے اور پچھتاوے کا احساس بھی ایک ساتھ پیدا نہیں ہوتا... اُن میں وقت کا وقفہ رہتا ہے، اسی لیے صدیاں اور نسلیں لہولہان ہوتی رہتی ہیں!

—ہاں، جب تک ایک پچھتاوا ابھرتا ہے تب تک کہیں کوئی دوسرا اندھیرا سیلاب بن کے آ جاتا ہے اور جب بہت بعد اس کے پچھتاوے کا دور شروع ہوتا ہے تب تک کوئی تیسرا، چوتھا،

پانچواں اندھیرا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے! ابھی ادیب اپنی بات کہہ ہی رہا تھا کہ اموس اوز نے سامنے اشارہ کیا—

—وہ سامنے! وہ رہا دنیا کے ادیبوں کا شرنارتھی کیمپ!

چھوٹے چھوٹے سفید خیموں کی ایک بستی سامنے موجود تھی۔ اُس بستی پر ریت کے وہی سفید پرندے اڑ رہے تھے۔ ادیب دوڑتا دوڑتا وہاں پہنچا تو سکتے میں آ گیا... اپنے اپنے خیموں میں بھی تو موجود تھے—

کبیر، ٹالسٹائے، ٹیگور، افنان، کزانتی زاکس، راہل سانکرتیاین، ونگر، چیخوف، کامیو، پریم چند، لوسون، میلان کنڈیرا، بریخت، نرالا، سارتر، ہزاری پرساد دویدی، میر، سودا، غالب، فیض، فیقی، نظامی، منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، دشینت کمار، رینو، راکیش، رگھویر سہائے، پرسائی، شری کانت، مکتی بودھ، وہ تو سب کو پہچانتا تھا۔ مہاجرین کے طور پر ادیب اپنے اپنے خیموں میں موجود تھے۔ یہ بستی ریت کی ایک ندی کے کنارے تھی... وقت ریت کی دھارا کی طرح بہہ رہا تھا۔

وقت کو اس طرح بہتے دیکھنا، اس کے لیے عجیب سا تجربہ تھا... کئی کئی صدیاں ساتھ بہتی چلی جا رہی تھیں۔ ریت کے چھینٹے اُس پر پڑے تو اسے بڑی راحت ملی۔

تبھی اردلی نے پیش کش کی— حضور، کہیے تو وقت کو پکڑ لوں؟

—ضرورت کیا ہے۔ اِن ادیبوں نے خود وقت کو قید کیا ہے۔ ہر ادیب کا وقت اس کی کتاب میں قید ہے۔ اُن کا ہر لفظ وقت کی طاقت سے زیادہ مضبوط ثابت ہوا ہے۔ ادیب نے کہا اور وہ اموس اوز کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

بستی میں سکون تھا۔ ریت کے جگنو چاروں طرف بھرے ہوئے تھے... ریتیلے خرگوش دوڑتے ہوئے آتے، رکتے اور پھر کہیں دوڑ جاتے۔ کبھی ریت کی چادر اڑتی ہوئی آتی، پھر پھٹ جاتی اور اُس کے ٹکڑے تتلیوں میں بدل جاتے۔ وہ تتلیاں بستی کے دوسرے کنارے کی طرف چلی جاتیں۔

ادیبوں کی پوری جماعت ایک جگہ بیٹھی تھی۔ وہاں انسان کی کہانی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ہزاری پرساد دویدی اُس وقت کچھ کہہ رہے تھے— جھوٹ تو ایک ماورائی کہانی ہے، وہ ماورائی کہانی، جس کا پہلا احساس انسان نے فطرت کے ساتھ کیا اور عزم کی طاقت سے اُس نے اپنے اُس دنیاوی تجربے کو ماورائی اور ناقابلِ تسخیر بنا دیا... یہ پُرا کتھائیں زبانی چلتی رہیں... یہ انسانی کہانیاں، یہ متھ، یہ پُرا کتھائیں پورانک تاریخ میں بدل گئیں... انھیں سے مذہبی کتھائیں نکلیں، آدرش قائم ہوئیں اور انھیں سے تنگ ذہن مذاہب پیدا ہوئے...

—ہاں، نہیں تو خدا کہاں تھا؟ اپنے اپنے خدا کو تو انہیں تنگ نظر مذاہب نے پیدا کیا... نینوا میں اسیرین سمراٹ اشربانیپال کے میوزیم، لائبریری میں مٹی کے پرتوں پر موجود پراکتھائیں بتاتی ہیں کہ خدا، بغیر پیدا ہوئے، ہمیشہ اور امر نہیں تھا... اُسے عراقی یعنی لومین تہذیب نے پیدا کیا تھا... مارڈک، جو اس تہذیب کا عظیم رہنما اور خدا بنا، وہ جزو فانی تھا... اُس کی تاج پوشی کے لیے دیوتا بلائے گئے تھے، اس کا تخت دیوتاؤں نے خود بنایا تھا اور انہوں نے ہی مارڈک کو پرم دیو— خدا اعلان کیا تھا۔ اُسے کائنات، تباہی اور حفاظت برہمہ، وشنو، مہیش کی طاقت دی تھی۔ اُسے ہتھیار و اسلحے عطا کیے تھے۔

اور مارڈک نے ہی تب کائنات کی تخلیق کی تھی۔ اُس نے اپنے دادا انو کو آسمان کا شہنشاہ بنایا تھا، اپنے والد ایا کو زمین کا۔ اور تب مارڈک نے ایک مہامندر بنایا تاکہ آسمان کے دیوتا اور خدا جو اس کی رعایا تھے، زمین پر آئیں تو آرام سے ٹھہر سکیں... اور اسی مہامندر کو بیبی لون پکارا گیا۔ اُسی مارڈک نے اپنے سلف تیامت کے جسم کو پھاڑ کر دیگر مادّی اقتدار کو پیدا کیا... شکستہ جسم کے درد سے جب تیامت کی آنکھیں آنسوؤں کے سیلاب سے بھر گئیں تو وہیں سے دجلہ اور فرات ندیاں نکلیں اور کائنات کی کہانی کا آغاز ہوا۔ تیامت کی ہڈیوں اور خون سے ہی تب بے رحم انسان پیدا ہوا۔

—ہاں، وہ صحیح معنوں میں کاکیشس کی آریہ تہذیب تھی۔ میں اُسی اصل آریہ تہذیب کا وارث ہوں... ایک چیختی آواز نے شانت ریگستان کی خاموشی کو توڑ دیا۔

—یہ بدتمیز کون ہے؟ ادیب نے پوچھا تو اردلی نے ادب سے بتایا—

—حضور، یہ شخص ہٹلر ہے! جرمنی کا نازی ہٹلر۔

—وہ درندہ، جس نے پوری دنیا کو تباہ کرنے کی ٹھان لی تھی! اُسے سامنے دیکھ کر میرا ماتھا پھٹتا ہے، خون کھولتا ہے! اسے حراست میں رکھو... میں تاریخ طے کروں گا، تب اسے میری عدالت میں پیش کیا جائے! میں بہت تھک گیا ہوں... اب کچھ آرام کرنا چاہتا ہوں!

تو حضور آرام فرمایئے نا... اردلی نے کہا کہ تبھی بوئی پاٹنگ میں چلی گولیوں اور اکتالیس لاشوں نے پھر دستک دی۔

اردلی نے انہیں روکا اور بولا— صاحب آرام کر رہے ہیں اور پھر انسانی تہذیب کا قانون بھی کچھ ہوتا ہے... آپ ہر وقت دستک نہیں دے سکتے...

تب تک چیخ پکار، آہوں کراہوں اور دستکوں سے ادیب کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ وہ چلایا—

—اردلی! آنے دو... بربریت، تکلیف، اذیت، غیر انسانی حادثات کے شکار لوگوں کو آنے دو... یہ انسانی عدالت ہے، قانون کی منشا اور اپاہج عدالت نہیں... ہماری عدالت ہر انسانی ظلم کے خلاف کھلی ہوئی ہے... اس لیے جو بھی دستک دے، اُسے آنے دو۔

اور اتنا سنتے ہی اکتالیس لاشیں چیخنے لگیں— ہمیں جولو دہشت گردوں نے مارا ہے...

—تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟

—جنوبی افریقہ سے! وہاں کے وزیر اعظم ڈی کلارک کی سازش سے ہمیں بوئی پاٹنگ کی بستی میں مارا گیا ہے۔ ہمیں بتایئے کہ ہمارا قصور کیا ہے؟

—قصور، صرف اتنا کہ تم ایک استحصال شدہ ذات کے غریب انسان ہو...

—لیکن جولو بھی تو ہماری طرح استحصال شدہ اور غریب ہیں... ہم ایک ہی نسل کے ہیں، لیکن یہ گورے ہمیں ہماری نسل والوں سے ہی مروا رہے ہیں۔

—غریبی اور بھوک کی کوئی نسل نہیں ہوتی!

—لیکن ہم اُن گوروں سے انتقام لیں گے... بدلہ...

—بند کرو یہ انتقام کی بات۔ آخر کتنی صدیاں کتنی صدیوں سے انتقام لیں گی... پاگل ہو گئے؟ تم لوگ...

—سر، آپ تھکے ہوئے ہیں، آرام کریں، تب تک ہم اپنے زخموں کو دھو ڈالتے ہیں۔ کہتے ہوئے بوئی پاٹنگ کی ساری لاشیں ایک طرف چلی گئیں۔

ادیب نے راحت کی سانس لی... ایک تکیہ کھینچ کر سر کے نیچے لگایا کہ تکیے کے نیچے دبے ہوئے تمام کاغذات کبوتروں کے پنکھوں کی طرح اڑنے لگے۔

ادیب چونکا— ارے زندگی، تم تکیے کے نیچے دبی ہو!

زندگی نے کوئی جواب نہیں دیا... خاموشی... سناٹا...

—زندگی تم کہاں ہو؟ ادیب چیخا، پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا۔

—حضور، آپ کسی الجھن میں گرفتار دکھائی دیتے ہیں... میں کچھ مدد کروں آپ کی؟ بڑے ادب سے اردلی نے کہا۔

—ہاں دوست! کہیں سے جاکر زندگی کو بلا لاؤ... میں کچھ دیر جینا چاہتا ہوں! کسی طرح تم میری ادھوری لکھی زندگی کو واپس لے آؤ... پلیز لے کر آؤ... ادیب نے کہا۔

—میں ابھی لے کر آتا ہوں حضور! کہہ کر اردلی تیزی سے باہر چلا گیا۔

۱۷

اردلی جب لوٹ کر آیا تو عدالت اپنے کانوں میں روئی ٹھونسے اور آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔
کچھ دیر اردلی پریشان سا کھڑا رہا۔ اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا، لیکن عدالت کو اسے ٹوکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

آخر، بڑی خاموشی سے اُس نے یادنام کی ایک پرچھائیں کو عدالت کے سامنے والی کرسی پر بٹھا دیا۔

کچھ دیر بعد ادیب نے گہری سانس لے کر آنکھیں کھولیں تو سامنے بیٹھی یادوں کی پرچھائیں کو نہ پہچانتے ہوئے پوچھا۔

— آپ؟

— جی میں! آپ نے شاید مجھے طلب کیا ہے... آپ کا اردلی مجھے لایا ہے...

— کہاں، پاکستان سے؟

— جی نہیں، آپ نے پھر مجھے غلط سمجھا... یہی غلطی آپ نے لاہور ایئرپورٹ پر بھی کی تھی... تب بھی آپ نے مجھے پاکستانی سمجھا تھا اور میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں پاکستانی نہیں ہندوستانی ہوں!

— انسان اور انسان کی قدرتی شناخت کے درمیان یہ ہندوستان اور پاکستان، سیریا اور لبنان کہاں سے آ جاتے ہیں؟

— مجھے کیا معلوم... یہ تو سقراط سے لے کر آج تک چلا آ رہا... پرچھائیں نے کہا۔

— خیر، سقراط سے میں بات کروں گا... لیکن آپ یہاں کیوں حاضر ہوئی ہیں!

— مردوں کے درمیان رہتے رہتے کیا آپ زندگی کو پہچاننا بھی بھول گئے؟ پرچھائیں نے کہا— آپ نے مجھے اپنے اردلی سے طلب کیا ہے... یاد کیجئے، تب آپ لاہور سے کراچی جا رہے تھے۔ آپ کو چین جانا تھا اور وہ سیدھی اڑان کراچی سے ملتی تھی... مجھے بھی کراچی جانا تھا اور اس اڑان کا انتظار کرتے کرتے ہم آپ باتیں کرنے لگے تھے...

— او سلمیٰ!... ادیب یکبارگی چیخ سا پڑا۔ اردلی بھی سکتے میں آ گیا۔ ادیب اُسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ہاں، مجھے اب سب یاد آ گیا... میں نے ہی تم سے تب پوچھا تھا— کراچی میں آپ کے رشتہ دار ہوں گے...

— جی نہیں، رشتہ دار تو زیادہ تر پٹنہ میں ہیں... اور شاید آپ کو پتہ ہو کہ پٹنہ میرے ملک

ہندوستان کا ایک شہر ہے... کراچی میں میرے زیادہ تر رشتہ دار نہیں ہیں اور پھر مجھے آگے جانا ہے کویت۔ میں دو ایک دنوں کے لیے کراچی کے کسی ہوٹل میں ٹھہروں گی...

— کس ہوٹل میں؟

— شاید ہالی ڈے ان میں۔

— تب تو شاید کل ناشتے پر ملاقات ہو سکے۔ میرا قیام بھی اُسی ہوٹل میں ہو رہا ہے۔ شاید ایئر لائن والے وہیں ٹھہرا رہے ہیں۔

— انشاء اللہ!

— تب لاہور ایئرپورٹ پر کراچی والی فلائٹ کا اعلان ہونے والا تھا۔

— میں ایک مزہ دکھاؤں؟ سلمیٰ نے کہا تھا۔

— کیا؟

— یہی کہ میں ساڑی پہنے ہوئے ہوں اور دیکھئے کہ لاہور ایئرپورٹ کے یہ لوگ ہندوستانی عورتوں سے کس طرح پیش آتے ہیں! یہ لوگ عموماً عورتوں کو بہت پریشان کرتے ہیں، ہندوستانی عورتوں کو تو خاص طور سے...

کہتے ہوئے سلمیٰ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی... پاکستان ایئر لائنس والے نے پہلے تو اُسے گھور کر دیکھا اور ٹکٹ دیکھنے سے پہلے سوال کیا—

— کتنی ساڑیاں، بلاؤز اور بریزیں آپ لائی ہیں؟

— کسٹم والوں کی ذمہ داری آپ کیوں پوری کر رہے ہیں؟ انہیں جو ضرورت ہوگی، پوچھ لیں گے... سلمیٰ نے کہا تھا۔

— کتنے پینٹ کوٹ اور جیکٹ آپ کے سامان میں ہیں اور کتنے دن رکیں گی آپ پاکستان میں؟

— یہ سوال بھی کسٹم والے پوچھیں گے یا میرا پاسپورٹ جانچ کر کے معلومات حاصل کر لیں گے... آپ ٹکٹ دیکھئے اور مجھے سیٹ دیجئے! سلمیٰ ذرا تلخی سے بولی تھی۔ اس درمیان وہ کنکھیوں سے ادیب کو بھی دیکھتی رہی تھی۔ کاؤنٹر والے نے اس کی اس حرکت کو دیکھ لیا تھا، پوچھنے لگا— وہ صاحب آپ کے ساتھ ہیں؟

— اس سے آپ کو کیا لینا دینا؟ سلمیٰ بولی تھی۔

— جی! اس نے سلمیٰ کا ٹکٹ دراز میں ڈالا اور اٹھ کر پیچھے کی طرف چلا گیا۔ سلمیٰ کو بھی تعجب ہوا کہ آخر یہ آدمی چاہتا کیا ہے اور سوچنے لگی کہ خوانخواہ اُس نے مذاق ہی مذاق میں اپنے لیے شاید

مشکل پیدا کر لی۔

تبھی وہ کاؤنٹر والا ایک پولیس انسپکٹر کو لے کر آیا جو شاید سلمٰی سے سوال جواب کرنے کے لیے خاص طور سے لایا گیا تھا۔ سلمٰی سہم سی گئی کہ تبھی اس پولیس انسپکٹر نے اُسے تقریباً پہچانتے ہوئے کہا—

—معاف کیجئے گا... آپ... آپ...

—جی شاید آپ مجھے ٹھیک ہی پہچان رہے ہیں! سلمٰی کی جان میں جان آئی۔ میں سی ایس پی کے جناب آفتاب احمد کی نواسی ہوں اور ہندوستان میں رہتی ہوں، وہ میرے نانا ہیں! سلمٰی نے کہا۔

تب پولیس والا کچھ خفگی سے کاؤنٹر کلرک سے بولا— پہلے مسافر کو ٹھیک سے دیکھ لیا کرو... سمجھے... اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔

حالانکہ کاؤنٹر کلرک مطمئن نہیں ہوا تھا، لیکن اس نے شاید یہی سوچا کہ جب پولیس ہی اپنا کام نہیں کرنا چاہتی تو میں اس کا کام کیوں کروں؟ اور اس نے بورڈنگ کارڈ سلمٰی کے آگے بڑھا دیا۔

اُس کے بعد سلمٰی اُسے جہاز میں ملی اور اس کے کوہ جانے اور اُس کے بیجنگ اڑان سے پہلے کی اُن کی ملاقات کراچی کے ہالی ڈے ان کے ریستراں میں صبح ناشتے پر ہوئی۔

ناشتے کے وقت کچھ انہونی ہوئی۔ وہ جب ریستراں میں پہنچا تو سلمٰی وہاں کچھ پہلے سے موجود تھی۔ اس نے سلمٰی کو دیکھا تو یکبارگی دیکھتا ہی رہ گیا۔ شاید کسی ایسی ہی، ہو بہو ایسی ہی عورت کو دیکھنے کی اُس کی تمنا نہ جانے کتنے برسوں سے ادھوری پڑی تھی اور آج جا کر پوری ہوئی تھی۔ دل میں چھپی ہوئی کوئی بات جب یکبارگی پوری ہوتی ہے تو آدمی کا من جھجکنے لگتا ہے... خواب اس طرح سے سامنے آجائے تو یہی ہوتا ہے اور پھر رات جو خواب اس نے دیکھا تھا وہ بھی اُس کی ذہن میں الجھا ہوا تھا... اُس خواب میں اُس نے سلمٰی کو پنجابی لباس میں دیکھا تھا اور سلمٰی ہو بہو اُسی لباس میں سامنے تھی۔ وہ جیسے کچھ بول ہی نہیں پایا تھا۔ لیکن سلمٰی نے سارے حالات کو بہت آسان بنا دیا تھا—

—آیئے، تشریف لایئے۔ مجھے امید تھی کہ آپ کے چین جانے سے پہلے ہماری ایک اور ملاقات ضرور ہوگی!

وہ شرما گیا تھا۔ یہی سب کچھ تو وہ بھی چاہ رہا تھا... تب تک بیرا آگیا اور اس نے ناشتے کا آرڈر دیا— میرے لیے تو کارن فلیکس، بریڈ سلائس پر فرائڈ ایگس... اور چِلی ساس، بھئی معاف کرنا، مجھے چِلی ساس بہت پسند ہے... اس نے سلمٰی کی طرف دیکھ کر پوچھا— اور آپ؟ تو سلمٰی نے بتایا کہ وہ اپنا آرڈر پہلے ہی دے چکی ہے۔

دونوں کا ناشتہ ساتھ ہی آیا اور پہلی انہونی سامنے آئی۔

دونوں کا ناشتہ ایک ہی تھا۔ وہی کارن فلیکس، وہی فرائڈ ایگس سلائسوں پر، نہیں تو ٹوسٹ کھِس آتا ہے اور وہ چِلی ساس، جو ناشتے پر ہوتا ہی نہیں۔

—لگتا ہے، یہاں ایک ہی ناشتہ ملتا ہے۔ آپ کا ناشتہ بھی وہی آیا ہے جو میرا... اس نے کہا تھا۔

—جی نہیں، یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے بھی بالکل وہی آرڈر دیا تھا جو آپ نے دیا! سلمٰی بولی۔

—چِلی ساس بھی!... یہ تو میں نے خاص طور سے منگوایا تھا۔

—جی ہاں، میں نے بھی۔ مجھے بھی نہ جانے کیوں فرائڈ ایگز کے ساتھ چِلی ساس کا ہلکا سا ٹچ بہت پسند ہے! سلمٰی نے کہا— شاید آپ کو بھی... حیرت کی بات ہے۔

اور اُن کے درمیان تب ایک عجیب سا سناٹا چھا گیا تھا۔ کہیں کچھ ایک ہونے کا سناٹا۔ یا اس اتفاق کا سناٹا۔ کافی دیر خاموشی رہی۔ پھر سلمٰی نے ہی یہ خاموشی توڑی—

—عجیب ہے کہ آج رات میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا۔ ویسے میں اکثر خواب نہیں دیکھتی... شاید یاد نہیں رہ جاتے ہوں گے، لیکن یہ خواب یاد بھی رہ گیا۔

—کیا خواب دیکھا آپ نے؟ پوچھتے ہوئے وہ کچھ سہما سا تھا کہ کہیں اس ناشتے کی پسند کی طرح... کہیں خواب بھی... خواب بھی ایک سا... کہیں... کیونکہ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ لاہور سے کراچی آنے والا اُس کا جہاز کسی حادثے کی وجہ سے ایک ریگستان میں اتر پڑا تھا اور ریت کی لہروں سے ٹکراتا ہوا ایک جگہ آکر ایسے رُک گیا تھا جیسے جہاز اترا ہو اور سارے مسافر محفوظ تھے۔

—جی دیکھا یہ کہ... سلمٰی نے بتایا— کہ لاہور سے کراچی آنے والا ہمارا جہاز کسی حادثے کی وجہ سے ایک ریگستان میں اتر پڑا ہے...

اس کی سانس رکنے سی لگی تھی کہ سلمٰی یہ کون سا خواب سنا رہی ہے، پر وہ آگے بتا رہی تھی—

جی اور ہوا یہ کہ جہاز ریت کی لہروں سے ٹکراتا ہوا، ایک جگہ جا کر ایسے رک گیا جیسے اس نے لینڈ کیا ہو... اور تعجب کی بات یہ کہ سارے مسافر محفوظ تھے! عجیب خواب تھا... سلمٰی اتنا بتا کر کافی پینے لگی۔

اس کی سانس تو اب لگ بھگ رک ہی گئی تھی۔ اس نے بھی کافی کا ایک گھونٹ لیا پھر بڑی مشکل سے بولا تھا—

— سلمیٰ جی!... اب میں کیسے بتاؤں کہ یہی، بالکل یہی... ہو بہو یہی خواب میں نے بھی...
آگے وہ کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔

دونوں اپنی اپنی کافی پیتے بیٹھے رہے تھے... اور سوچتے رہے تھے کہ کیا یہ کبھی واقعی ممکن ہو سکتا ہے کہ دو مختلف لوگ بالکل ایک سا خواب ایک ہی رات میں دیکھیں۔ یہ تو انہونی بات تھی۔ ایک ایسی بات جو کبھی نہیں ہوتی، جو شاید کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔

کچھ دیر سلمیٰ نے اُسے دیکھا تھا جیسے کہ کہیں ایک سا خواب دیکھنے کی بات وہ کسی خاص مصلحت سے تو نہیں کہہ رہا ہے لیکن وہ سوچنے لگی تھی کہ جو دو لوگ گھنٹے دو گھنٹے بعد الگ راستوں پر جانے والے ہوں، جو دو لوگ پہلی بار یونہی اچانک مل گئے ہوں اور جو دو لوگ اگلی زندگی میں شاید کبھی نہ ملنے والے ہوں وہ ایک دوسرے سے جھوٹ بول کر کیا پائیں گے یا کیا کھوئیں گے... ان کے درمیان سچ بولنے کے علاوہ تھا بھی کیا؟ جھوٹ کی وہاں کوئی جگہ تھی نہ ضرورت...

کافی دیر تک وہ دونوں خاموش ہی بیٹھے رہے— وہ ایک سے خواب لے کر کچھ ایسے الجھ گئے تھے کہ دوسری باتوں کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا تھا۔

پھر بھی محض کچھ بات کرنے کی خاطر اُس نے سلمیٰ سے پوچھا تھا—

— کیا آپ شروع سے ہندوستانی ہیں؟

— مطلب؟

یہی کہ آپ ہندوستان میں پیدا ہوئی تھیں؟

— ہاں، یہی سچ ہے۔ لیکن سچ یہ بھی ہے کہ میں نے کوکھ میں جنم لیا پاکستان میں، لیکن میں پیدا ہوئی ہندوستان میں... سنہ سینتالیس میں۔ اصل میں ہم بہار کے رہنے والے ہیں... وہاں کی ایک چھوٹی سی ریاست کے۔ میری نانی وہیں ہیں اور زندہ ہیں لیکن میرے نانا کافی پہلے یہاں سندھ چلے آئے تھے۔ تب ہندوستان ایک تھا۔ پاکستان بنتے ہی میرے والد اور والدہ بھی انہیں کے ساتھ یہاں آ گئے تھے۔ ویسے میرے نانا ایک طرح سے کہیں تو، مہاجر بن گئے... اور اب انہیں بہار یاد آتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہمارا ملک پاکستان ہو گیا، لیکن وطن تو ہندوستان ہی ہے... ہماری یادیں تک ہندوستانی ہیں... نانا یہیں ہیں کوئٹہ میں۔ میں انہیں سے ملنے جا رہی ہوں۔ وہ بہار کو یاد کرتے ہیں، ہم سب انہیں یاد کرتے ہیں...

— لیکن یہ تو ایک پہیلی ہے کہ آپ نے اپنی ماں کی کوکھ میں جنم لیا پاکستان میں اور آپ پیدا ہوئیں ہندوستان میں!

— پہیلی کیسی! جب پارٹیشن ہوا، تب میں اپنی امی کی کوکھ میں تھی۔ اُس وقت بہار میں بھیانک فساد ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، لیکن ابا اور امی نہیں رُکے... نانا نے انہیں بہت روکا، لیکن وہ یہی بولے کہ نانی بہار میں اکیلی ہیں اور پھر یہ بھی کہ کچھ بھی ہو، ہم اپنا گھر اور وطن نہیں چھوڑ سکتے!

ادیب نے اُسے حیرانی سے دیکھا، پھر رفتہ رفتہ رُک رُک کر کہا— یہ تو عجیب بات ہے کہ جب لاکھوں مسلمان ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آ رہے تھے تب آپ کے ابا اور امی نے مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہندوستان جانے کا فیصلہ کیا... وہ مسلمان...

— نہیں... نہیں... تیسری میں! امی کی کوکھ میں میں بھی تو تھی ادیب! تم مسلمان کی اس روحانی تکلیف کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر تم ہندو ہندوستان کے قدیمی باشندے ہو تو ہم بھی یہاں کی قدیمی اولادیں ہیں... ہم مسلمان ہو گئے تو کیا ہوا؟ مذہب بدلنے سے مٹی تو نہیں بدل جاتی!

ادیب نے سلمیٰ کو گہری نظروں سے دیکھا۔

— کیوں؟ آپ اس طرح مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ میں نے اپنے خاندان میں بہت سی موتیں دیکھی ہیں۔ جب موت آتی ہے تب کسی کو کعبہ یا کربلا یاد نہیں آتا، اپنا گھر یاد آتا ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں، یقین نہ ہو تو پوچھتے جا کر کسی بھی ملک کے مسلمان سے۔ یہاں تک کہ ریاض اور تہران میں رہنے والے مسلمان سے... خدا کا گھر سب کے لیے ہے لیکن اپنی موت کے وقت صرف اپنے گھر۔ گاؤں کا گھر اپنا ہوتا ہے۔ یہی آخری سچ ہے۔ اسپین، ترکی، مصر، انڈونیشیا یا کہیں کا بھی مسلمان اپنے وطن کی دھرتی پر مرنا چاہتا ہے، مکہ یا مدینہ میں نہیں...

— لیکن...

— لیکن کیا؟ تم آریوں نے خود اپنے مذہب کو نکیل بند کر کے توڑا ہے۔

— یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو سلمیٰ؟

— تمہارے برہمن گرنتھوں کی بنیاد پر! تم نے اپنے ورن کے نظام کو دھرم بنا لیا تھا— ہر بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے لیکن تمہارے برہموں اور اُن کے گرنتھوں نے ماں کی کوکھ کو ذلیل کرتے ہوئے انسان کو برہما کے الگ الگ اجزا سے پیدا ہونے کا اصول پیدا کیا... آج کے الفاظ میں کہوں تو تمہارے برہموں نے اپنا پاکستان بنا لیا...

ادیب سکتے میں آ گیا۔ اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اور تب سلمیٰ بولی تو ادیب نے اُسے غور سے دیکھا—

—اور تب، تمہارے اپنشدوں نے انسانی قدروں اور خوشحالی کو بچانے کی کوشش کی...

ادیب نے اضطراب سے پھر اُسے دیکھا۔

—تمہارے اُپنشد اور کچھ نہیں... وہ برہمنی ظلم، ورن نظام کی بداخلاقیوں اور خدائی اعتقاد کو قائم کرنے والے پشیمانی کے گرنتھ ہیں... انہوں نے تم خاندانی آریوں کو ضرور سنبھالا، لیکن وہ دنیا کے بدلے ہوئے ذہنی نقشے کو نہیں سنبھال سکے... دنیا کی سچائیاں بدل گئی تھیں، لیکن تم آریہ ان بدلی ہوئی سچائیوں کو جذب نہیں کر پائے، یہی تمہاری تنزلی کی وجہ ہے۔ مذہب کی بنا پر ثقافتیں بنتی ہیں... لیکن کافی عرصہ بعد وہ دھرم سے نجات پاکر انسانی ثقافتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں... لیکن تم اور تمہارے لوگ بار بار ثقافت کو دھرم کی طرف کھینچتے رہے...

—اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ بعد میں اقبال اور سرسید احمد خاں نے جو رنگ اختیار کیا، وہ ٹھیک تھا؟

—کون کہتا ہے کہ وہ ٹھیک تھا... لیکن یہ تبدیلی تب آئی تھی جب لوک مانیہ تلک نے تحریک آزادی کو گن پتی تقریب سے جوڑ کر اسے آزادی کی ہندو تحریک بنا دی تھی...

—لیکن گاندھی جی نے آکر اس غلطی کو سدھارا بھی تو تھا۔

—تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ دل تقسیم ہو چکے تھے۔

وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

تب سلمیٰ نے پھر خاموشی کو توڑا تھا—

—اس کے بعد کی تاریخ کو دیکھو ادیب!... ہوا کیا؟ یہ ٹھیک ہے کہ گاندھی جی نے سب سنبھالا، لیکن تب تک انگریز اس سچائی کا فائدہ اٹھا چکا تھا... اور دیکھو نا، بعد میں کیا ہوا؟ لوک مانیہ تلک نے بالآخر سارے ہندو وادیوں کو جنم دیا... ساورکر جیسے انقلابی ہندو ہو گئے۔ اُن کی نسل نے ناتھو رام گوڈسے پیدا کیا... آخر اسی نے گاندھی جی کا قتل کیا... تو گاندھی، نہرو، پٹیل، مولانا آزاد کے رہتے ہوئے بھی مسلمانوں کے لیے امید بچی ہی کہاں تھی... دلوں میں شک بیٹھ گیا تھا کہ اقتدار ملتے ہی دھیرے دھیرے نہرو کا سیکولرزم سرد پڑ جائے گا اور سرد ہندو تو ہوش میں آتا جائے گا۔

—تو کیا اسی لیے مشکوک مسلم دماغ نے بابر، تیمور اور چنگیز خاں جیسوں سے اپنا رشتہ جوڑا تھا؟

—تو مشکوک مسلم ذہن اور کیا کرتا؟ انگریزوں کے ہاتھوں میں تو وہ دھاری تلوار آ ہی گئی تھی... وہ بھلا کیوں چوکتے... اور یہ مت بھولئے ادیب کہ عہد وسطیٰ کے سارے حملہ آور سامراجی تھے، وہ مذہب کے مبلغ اور بانی نہیں تھے... منگول چنگیز خاں تو مسلمان بھی نہیں تھا، تب اسلام ہی نہیں

تھا۔ وہ تو بودھوں سے بھی پہلے کے شامانی مذہب کا بت پرست تھا!

—آپ کو تاریخ کی کافی معلومات ہے! اس نے ناشتہ ختم کرتے ہوئے کہا۔

—آخر میں تاریخ کی اسٹوڈنٹ رہی ہوں... اسی الہ آباد یونیورسٹی میں، جہاں سے آپ ادیب بن کر نکلے ہیں... اور ایک خاص بات کہوں؟

—کہیے!

—جناح صاحب نے تاریخ نہیں بنائی تھی، تاریخ نے جناح صاحب کو بنایا تھا! اپنی تاریخ سے سبق لیجئے۔ اس کی دیگ کو مذہب کے چولھے پر مت چڑھائیے... نہیں تو پھر وہی حال ہوگا جو تقسیم کے ساتھ ہندوستان کا ہوا اور آج پاکستان کا ہو رہا ہے۔

اُسے حیرانی ہوئی کہ سلمیٰ اتنا کھل کر کیسے بول پا رہی تھی اور وہ بھی کراچی (پاکستان) میں بیٹھ کر۔ غنیمت یہی تھا کہ اُس وقت اُن کے ناشتے کی میز کے آس پاس اُس کے علاوہ اور کوئی سننے والا نہیں تھا۔

تبھی...

تبھی قہر سا برپا ہوا... دستکوں کی آواز سے اس کا وجود تھرتھرانے لگا... سلمیٰ بھی سامنے نہیں تھی۔

ادیب اچانک چیخا— اردلی! میں کہاں ہوں؟

—حضور، آپ اپنی عدالت میں ہیں!

—عدالت میں! کیا کہہ رہے ہو تم... میں تو کراچی کے ہالی ڈے ان ہوٹل کے ریستراں میں بیٹھا ہوا تھا اور سلمیٰ سے باتیں کر رہا تھا...

—حضور... آپ کی یادوں کی پرچھائیں کا نام کیا ہے، یہ تو مجھے نہیں معلوم، لیکن آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اُس پرچھائیں کو میں نے ہی آپ کے سامنے پیش کیا تھا... اردلی بے حد ادب سے بولا۔

تب تک دستکیں اور چیخنا چلانا پھر تیز ہو گیا تھا۔ عدالت نے حکم دیا— فریادی کو پیش کیا جائے!

اپنی چھاتی پیٹتی شاہین سامنے حاضر ہوئی!

—تم کون ہو؟

—شاہین!

—کہاں سے آئی ہو؟

—بمبئی، ہندوستان کے قبرستان سے...

— کیا ہوا ہے تمھیں؟

— بابری مسجد کی شہادت کے بعد پورا ہندوستان جل اُٹھا۔ بمبئی میں تو حیوانیت کا زلزلہ آ گیا... میں قبر میں پڑی سو رہی تھی، مجھے بھی نہیں بخشا گیا۔ مجھے میری قبر سے بے دخل کر دیا گیا۔ قیامت کے دن میرا فیصلہ ہونا ہے، لیکن اب میرے پاس اُس دن کا انتظار کرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، اس لیے آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں!

— لیکن یہ عدالت ہے قبرستان نہیں!

— ہندوستان میں ساری عدالتیں قبرستان میں تبدیل ہو چکی ہیں، اُن میں اب سر چھپانے کی جگہ بھی باقی نہیں ہے، اس لیے میں پناہ لینے یہاں آئی ہوں!

— لیکن تم تو اتنی کم سن ہو... کیا حق تھا موت کو کہ وہ تمھیں کھینچ کر قبر تک لے گئی...؟ عدالت نے ابرو ٹیڑھی کر کے جاننا چاہا۔

— موت نے میرے ساتھ زیادتی نہیں کی، میں نے خود موت کو بہتر سمجھا تھا! شاہین نے کہا۔

— لیکن کیوں؟

— اس لیے کہ پاکستان بن چکا تھا... لیکن میں پاکستان نہیں جانا چاہتی تھی!

— تو تمھیں ہندو درندوں نے فسادات کے دوران مار ڈالا؟

— نہیں... میری موت کی کہانی بالکل الگ ہے اعلیٰ حضور! جب ملک تقسیم ہوا...

ابھی عدالت نے یہ جملہ سنا ہی تھا کہ برسوں برس لوٹ کر آنے لگے اور لہولہان سنہ سینتالیس سامنے آ کر کھڑا ہو گیا...

اور اسی کے ساتھ اوپر آسمان سے گدھوں کے جھنڈ اترنے لگے جس سے اندھیرا چھا گیا۔ پنجاب سے لے کر آسام تک کی ندیوں کا پانی خون سے لال ہو گیا... اور کروڑوں لاشیں جشن مناتے ہوئے درندگی کا رقص کرنے لگیں... ادھر مرے اور زخمی لوگ وحشت، دہشت اور حیوانیت کے شکار ہو کر چیخنے لگے۔ لاشوں اور زخمیوں کے چھاتیوں پر چڑھ کر اُدھر جناح آزاد پاکستان کا اور اِدھر نہرو آزاد ہندوستان کا پرچم لہرانے لگے...

تبھی کچھ آوازیں آنے لگیں، کون کیا کہہ رہا تھا، اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا، لیکن اُن آوازوں میں بے بسی اور خوف بول رہا تھا... یہ آوازیں بجلیوں کی طرح کڑک رہی تھیں اور ادیب کے ذہن پر کوڑوں کی طرح برس رہی تھیں—

— ہندوستان کی قومی تقدیر ایک ہے... تم مجھے خون دو، میں تمھیں آزادی دوں گا اور آزادی

کا لال قلعہ محبت کی بنیاد پر کھڑا ہو گا... نفرت کی بنیاد پر نہیں!

— پاکستان ایک نفرت کا نام ہے!

— نفرت کے اصولوں پر پاکستان بنا ہے۔

— جناح نے تاریخ نہیں بنائی... سامراجی طاقتوں کی تاریخ نے جناح کو بنایا ہے۔

— مجھے یہ منظور نہیں!

— میں اب بھی کہتا ہوں... مذہب سے قوم نہیں بنتی۔ ایک خون اور ایک تاریخ سے قوم بنتی ہے!

— اگر مذہب سے قوم کی شناخت پیدا کرو گے تو یہ ساری دنیا ٹکڑوں میں بٹ جائے گی...

— ارے قائد اعظم محمد علی جناح! سنا تم نے، خود پشتونوں، پنجابیوں، بلوچیوں، سندھیوں، بنگالیوں اور مہاجروں کو نہیں سنبھال سکو گے... یہ آپس میں لڑ مریں گے... مذہب کام نہیں آئے گا۔ تب تہذیب، تاریخ اور ان نسوں میں بہتا خون ہی کام آئے گا، جو قوم کی اصلیت کو طے کرے گا!

آوازیں مسلسل اونچی اور تیز ہوتی جا رہی تھیں... ادیب کچھ سمجھ ہی نہیں پایا، تو اُس نے اردلی کو آواز دی— ان آوازوں کا پتہ کرو... یہ میرے کام میں خلل ڈال رہی ہیں!

اردلی بھاگا ہوا گیا اور فوراً ہی معلوم کر کے واپس آیا— حضور! یہ آوازیں تین چار پاگلوں کی ہیں!

— کون ہیں یہ پاگل؟

— حضور... کیسے بتاؤں...

— مجھے ایسے پاگلوں سے دنیا کو بچانا ہے!

— حضور! یہ دنیا کو پاگل پن سے بچاتے ہوئے خود پاگل ہو گئے ہیں۔

— عجیب لوگ ہیں۔

— جی ہاں حضور... اب ایسے پاگل لوگ اس دنیا میں نہیں ملتے... اگر ملتے ہوتے تو سوویت یونین نہیں ٹوٹتا۔ یوگوسلاویہ میں بوسنیا کے مسلمانوں کا قتل عام نہ ہوتا، صومالیہ میں لوگ اور بچے برسہا برس قحط سے نہ مرتے اور چار سو فلسطینی اسرائیل کی سرحد پر بھوک، سردی اور موت کا انتظار نہ کر رہے ہوتے... انھیں اسرائیلی اس طرح موت کے منہ میں نہ دھکیل دیتے! اردلی کچھ عجیب سے طیش میں بولا۔

ادیب ہنسا— تو تم اس عدالت کی اردلی گیری کرتے ہوئے بہت سمجھدار ہو گئے ہو... لیکن یہ پاگل لوگ آخر ہیں کون؟

— حضورِ اعلیٰ — یہ چار پاگل ہیں... ان کے نام جو میں معلوم کر کے لایا ہوں وہ ہیں... کہتے ہوئے اردلی نے اپنی یادوں کے مٹی پر دستک دی — جی ہاں... ان میں سب سے بڑا پاگل ہے۔ مہاتما گاندھی، دوسرا پاگل ہے، نیتاجی سبھاش چندر بوس، تیسرا ہے خان عبدالغفار خاں اور چوتھا ہے ایک ادیب!

— انہیں خاموش کرو!

— حضور! یہ بڑے خاموش لوگ ہیں، لیکن جب بھی تاریخ کے صفحات کو پلٹا جاتا ہے تو ان پاگلوں کی روحیں چیخنے لگتی ہیں! اور یہ اپنی قبروں اور سمادھیوں سے نکل کر اسی طرح کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

— تو فی الحال انہیں روکو!

— روک دیا حضور! انہیں میں نے ان کے مزاروں اور سمادھیوں کے پاگل خانے میں قید کر دیا ہے۔ اب یہ سب آپ کو پریشان کرنے نہیں آئیں گے۔

تب تک شاید ادب کر دہ پرچھائیوں والی یاد اس کے سامنے پھر آ بیٹھی تھی۔ اس کے بدن میں جھیل کی طرح پڑتے غموں اور سلوٹوں کو محسوس کرتے ہوئے تب ادیب بے ساختہ بول پڑا تھا —

— سلمیٰ! تم بہت خوبصورت ہو!

سلمیٰ اس جملے پر چونکی نہیں۔ وہ صرف اتنا بولی —

— تقسیم نہ ہوتا تو پوری کائنات بہت خوبصورت ہوتی! سلمیٰ نے کہا اور گھڑی دیکھی۔

— اب اٹھنا چاہیے... آپ کی فلائٹ کتنے بجے ہے؟

— گیارہ بجے! ٹھیک ہے، دیکھیے پھر کبھی ملاقات ہوتی ہے یا نہیں۔

— میں تو سمجھی تھی، آپ کوئی خوبصورت سا جملہ بول کر الوداع کہیں گے...

— یعنی؟ کیسا جملہ... میں سمجھا نہیں...

— کچھ ایسا کہ جیسے یہ شعر ہے — قہر ہو یا کہ بلا ہو... کاش تم میرے لیے ہوتے! کہہ کر سلمیٰ ہنس پڑی — اچھا خدا حافظ...

— خدا حافظ! بھارت پہنچو تو... کہتے ہوئے اس نے ٹیبل نیپکن پر اپنا پتہ لکھ کر اسے تھماتے ہوئے کہا — حالانکہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، لیکن پھر بھی...

اور شکریہ کہہ کے وہ چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی صدیوں کے سناٹے نے اُسے گھیر لیا۔ اُسے یکبارگی احساس ہوا، وہ اب واقعی دوسرے ملک میں ہے۔ نہیں تو کل لاہور سے لے کر آج کراچی

کی صبح تک وہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ کہیں اور ہے۔ سلمیٰ تو کوئٹہ کے لیے چلی گئی لیکن وہ اپنی بہت گہری خوشبو اس کے پاس چھوڑ گئی تھی۔

ایک اور کافی کا آرڈر دے کر وہ اسی خوشبو کے ساتھ کچھ دیر اور بیٹھنا چاہتا تھا۔ کافی آ گئی اور وہ حیرت بھرے انداز میں سوچ رہا تھا کہ کیسے ہوں گے۔ سلمیٰ کے نانا، جو پاکستانی بھی ہیں اور اپنی یادوں کو لے کر مہاجر بھی اور کیسے ہوں گے سلمیٰ کے ابا، امی... جب ہندو سکھ خون کے سمندر پار کرتے ہوئے بھارت کی طرف بھاگ رہے تھے اور بھارت کے مسلمان پاکستان کی طرف، تب ایک مسلمان جوڑا پاکستان چھوڑ کر اپنی اگلی صدیوں کی خیریت کے لیے کسی ملک کی طرف نہیں، اپنی مٹی کی طرف بھاگ رہا تھا۔

۱۸

تب ادیب وطن سے لوٹ آیا تھا۔ سلمیٰ بھی اپنے نانا سے مل کر کوئٹہ سے لوٹ آئی تھی۔ اُسے امید نہیں تھی کہ اتنے مہینوں بعد بھی سلمیٰ اس ٹیبل نیپکن پر لکھے پتے اور فون نمبر کو سنبھال کر رکھے گی... لیکن اس نے رکھا تھا، نہ رکھا ہوتا تو فون کیسے کرتی اور یہ بھی کتنی خوشنما سی بات تھی کہ ادیب کو مکان بدلنا تھا، تبھی فون آیا تھا۔ نہیں تو پتہ لاپتہ ہو جاتا اور فون نمبر بے کار۔

کراچی ہالی ڈے ان میں وہ ناشتہ، وہ ایک سپنا جو دونوں کے خوابوں میں ایک سا آیا تھا... اور اب وہ اس مکان اور فون نمبر کا تقریباً آخری دن۔

— کہاں سے بول رہی ہیں آپ؟

— پٹنہ سے... کیوں... میرے فون کی تو امید بھی نہیں ہوگی آپ کو...

— ایک ہلکی سی امید تو ہر دن تھی، لیکن وہ امید ہی کیا جو پوری ہو جائے!

— مطلب؟

— یہی کہ امید جڑوں کی طرح پھیلتی ہے... فون نہ آتا تو فون آنے کی امید رہتی، فون آ گیا ہے تو دوسری امیدیں سانس لے رہی ہیں۔

— میں دلّی آ رہی ہوں... اب بتا ہی دوں۔ میں دلّی سے ہی فون کر رہی ہوں۔ کہیں ملیں گے آپ؟

— جہاں آپ کو اچھا لگتا ہو۔

— انڈیا گیٹ، مان سنگھ روڈ جہاں کراس کرتی ہے، وہیں نہر کے پاس ایک مسجد کا پچھواڑہ ہے...

— پچھواڑے کیوں؟

— اللہ کا گھر مسجد کے پچھواڑے ہی ہوتا ہے... شام...

— اس کے آگے وقت نہ بتائیں تو بہتر ہوگا...

— کیوں؟

— اس لیے کہ جگہ آپ نے بتا دی ہے، میں تا زندگی اسی جگہ آپ کا انتظار کروں گا...

— دیکھتے ہیں، کون کس کا انتظار کرتا ہے...

اور جب ادیب قریب چھ بجے مسجد کے پچھواڑے پہنچا تو دیکھا سلمیٰ گھاس کے ہرے قالین پر بیٹھی تھی۔ گھاس کے تنکے توڑتے ہوئے... اس نے گاڑی پارک کی تو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوگئی۔ اس کی پلکیں لہر کی طرح تھمی ہوئی تھیں... ادیب پاس پہنچا تو نہ دو ہاتھوں میں ہاتھ پکڑ پائے نہ کسی کے ہاتھوں نے کوشش کی۔ پلکوں کی لہریں اپنی جگہ اٹھنے گرنے لگیں۔

— مجھے پتہ تھا... یا کہوں کہ مجھے لگا تھا... سلمیٰ بولی۔

— کیا؟

— کہ آپ کرتا پاجامہ پہن کر آئیں گے... اور وہی سچ ہوا۔

— کچھ ایسا ہی ہالی ڈے ان کراچی میں میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ یاد ہے وہ پلین کریش والا خواب... اس میں میں نے آپ کو جس شلوار کرتے میں دیکھا تھا، ہو بہو وہی شلوار پہنے آپ مجھے ناشتے پر ملی تھیں۔ آخر ایسا کیسے ہوتا ہے... ایسا کیسے ہو سکتا ہے... ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ جو سوچو وہی سامنے آجاتا ہے! ادیب نے کہا تھا۔

— کیا پتہ! اللہ کو بہتر معلوم ہوگا... آپ ہمیں ایک چاکلیٹ آئس کریم نہیں کھلائیں گے؟

اور ادیب آئس کریم لینے لگا تو سلمیٰ وہیں کھڑی رہی۔ وہ ساتھ نہیں آئی۔ آئس کریم لے کر دونوں پھر گھاس پر بیٹھ گئے تھے۔ اندھیرا اتر آیا تھا۔ آئس کریم والے ٹھیلوں کے پاس رونق بڑھ گئی تھی۔

اور تب اس نے سلمیٰ سے ایک بہت سنجیدہ سوال کیا تھا— سلمیٰ، یہ عجیب نہیں ہے کہ ملک تقسیم ہوا، پاکستان بنا، تو تمہارے گھر والے پاکستان چھوڑ کر ہندوستان بھاگے؟... معاف کریں، آپ کے گھر والے...

— نہیں، یہ تمہارے اور تم ہی ٹھیک ہے... سلمیٰ نے ٹوکا۔

— یعنی عجیب خاندان ہے تمہارا! نانا پاکستان میں... یادوں کو لے کر ہندوستان میں اور جب پاکستان بنا تو مسلمان اُدھر بھاگے، لیکن تمہارے والد پاکستان چھوڑ کر ہندوستان بھاگے! یہ عجیب نہیں ہے کیا؟ اس نے پوچھا۔

— اس میں عجیب کیا ہے؟... یہ تو میرے ابو نے بتایا ہے کہ اسلام کی نظر سے پاکستان کا بننا ہی گناہ ہے، کیونکہ اسلام نفرت نہیں سکھاتا، لیکن پاکستان کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی ہے... اسلام جیسا مذہب کسی ملک کی سرحدوں میں قید کیسے کیا جا سکتا ہے۔ کوئی مذہب قید نہیں کیا جا سکتا... اسلام تو خاص طور سے نہیں... سلمیٰ ابھی یہ بول ہی رہی تھی کہ سر کے اوپر کھڑے ایک صاحب نے تیزی سے ٹوکا—

— اے لڑکی، کیا بک رہی ہے تو؟ پاکستان اس لیے بنا کہ آزادی سے پہلے ہندو اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے شک اور نفرت تھی، مسلمانوں کے حقوق کی ضمانت نہیں تھی... اس لیے پاکستان بنا! وہ صاحب چیخ اٹھے تھے۔

— آپ کون ہیں؟ ادیب نے پوچھا۔

— میں انڈین یونین مسلم لیگ کا صدر غلام محمد بنات والا ہوں۔

— اوہ بنات والا! تب تم پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔

— تم کون؟

میں! میں چندر کانت بھاردواج... آر ایس ایس علی گڑھ کا چیف!... تم متعصب مسلمانوں کی وطن سے غداری کی روایت پرانی ہے... تم کبھی قوم پرست ہو ہی نہیں سکتے!

— ہو ہی نہیں سکتے... اسلام قوموں کی، ملکوں کی سرحدیں منظور نہیں کرتا... ہم قومیت کو نہیں مانتے، ہم تو دارالاسلام میں یقین کرتے ہیں، دارالحرب میں نہیں!... ایک اور آواز آئی—

— تم کون؟

— میں مودودی ہوں! مولانا ایس اے مودودی...

— اے مودودی! تمہاری ذہنیت میں سمجھتا ہوں۔ تم تو اسلام کو دارالاسلام بنانا چاہتے تھے... لیکن سمجھ لو کہ دنیا کے نقشے پر صرف اکھنڈ ہندوستان رہے گا۔ تم جیسے غدار وطن کی وجہ سے ہندوستان میں بھی پاکستانی سنک چلے، یہ ہم نہیں ہونے دیں گے انہیں ہونے دیں گے! اچھے! ایک اور آواز چیخی تھی۔

سلمیٰ سہمی ہوئی تھی تو ادیب نے پوچھا—

— آپ کون؟

—میں ونایک دامودر ساورکر—

—لیکن آپ تو راشٹروادی تھے، ہندوودای نہیں!

—وہ پاکستان کا اقبال بھی تو قوم پرست تھا جس نے لکھا تھا— 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا...' لیکن دیکھتے دیکھتے وہ انسان شیطان میں بدل گیا... اور جب اُس نے اپنے ترانے کو بدلا— 'چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا، مسلم ہیں ہم وطن ہیں، سارا جہاں ہمارا، تب میں کیوں نہیں بدل سکتا؟ اس پاک ہندو ملک میں اب شاستر کا ہی قانون چلے گا! ابھی ساورکر بول ہی رہے تھے کہ مرشد آباد کا نواب دیوان چیخنے لگا—

—ہندوستان ایک مسلم ملک ہے... یہاں شریعت کے قانون ہی چلیں گے۔ شاستروں کے نہیں۔

—چپ رہو! اے مرشد آباد کے نواب دیوان، تمہارے اسلاف بھی ہندو تھے۔ علامہ اقبال، جناح، شیخ محمد عبداللہ تک کے اسلاف ہندو تھے۔ کون اپنے ہندو خون سے انکار کرے گا۔ لیکن تم لوگوں نے خون کے تعلقات کو قبول نہیں کیا... تم نے نسل کو بھی منظور نہیں کیا۔ مذہب بدلنے سے خون اور نسل نہیں بدلتے... لیکن تم بدل گئے... انگریزوں سے مار کھانے کے بعد بھی تمہارا یہ غرور نہیں گیا کہ تم حکمراں اور فاتح طبقہ کے لوگ ہو... لیکن تم تو خالص ہندوستانی تھے۔ صرف تمہارا مذہب وہ تھا جو عہد وسطیٰ کے حکمراں کا تھا۔ تمہارا طرز عبادت بدلا تھا، تاریخ اور ثقافت نہیں... سمجھے! ساورکر تقریباً بھاشن دینے لگے تھے اور ہنگامہ سا برپا ہونے لگا تو انڈیا گیٹ پر گشت لگاتے پولس والے فوراً دوڑ پڑے۔

پولس کو دیکھتے ہی بھانت والا، مولانا مودودی، اور نواب دیوان صاحب مان سنگھ روڈ والی مسجد میں چھپ گئے اور ساورکر بھاگ کر بمبئی کے دادر والے اپنے مجسمے میں داخل ہو گئے...

ادیب اور سلمیٰ سکتے میں تھے۔ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ یہ ہوا کیا تھا اور اُن کے درمیان یہ سارے لوگ کہاں سے اور کیوں آ گئے تھے؟

—سنو ادیب! سلمیٰ نے تب پوچھا تھا— کیا کوئی جگہ ایسی نہیں، جہاں ہم ان مردوں اور چہروں سے دور کہیں بیٹھ سکیں؟

—چلو، کار میں بیٹھتے ہیں! ادیب نے کہا۔

لیکن کوئی کار میں کب تک بیٹھا رہتا۔ آخر ادیب نے کار اسٹارٹ کی اور یوں ہی سڑکوں کو ناپنے لگا۔ آخر یہ طے ہوا کہ وہ سلمیٰ کو xxxx ہاؤس کے پاس کہیں اتار دے، تا کہ وہ کرزن روڈ اپارٹمنٹ میں اپنے گھر چلی جائے۔ رات کے قریب ساڑھے نو بج رہے تھے اور سلمیٰ کو گھر بھی لوٹنا تھا۔

ابھی ادیب نے کار کرزن روڈ کی طرف موڑا ہی تھا کہ سلمیٰ نے گھبراتے ہوئے اُس کی جانگھ پر ہلکے سے ہاتھ رکھ کر کہا تھا— پلیز... گاڑی یہیں بائیں طرف روک لیجیے یا کسی اور سڑک پر نکل چلیے...

— کیوں کیا ہوا؟

—اگلی گاڑی میں میرا بھائی شاہد جا رہا ہے... اس کے ساتھ میرا بیٹا بھی بیٹھا ہوا ہے... وہ اُسے گھمانے، آئس کریم کھلانے لایا ہوگا... پلیز گاڑی روکیے! سلمیٰ نے خوشامد کی تھی جو واقعی سچ تھی اور اس نے گاڑی بائیں طرف موڑ کر روک دی تھی۔

—میں یہاں سے پیدل چلی جاؤں گی! سلمیٰ بولی تھی۔

سلمیٰ نیچے اتری تو ادیب بھی گاڑی بند کر کے اُس کے پاس آیا اور بولا تھا—

—مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم زندگی کی اتنی بڑی ذمہ داریاں اٹھا کر چل رہی ہو!

—لیکن مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھ سے بڑی ذمہ داریاں اٹھاتے ہوئے چل رہے ہیں...

—ادیب بھونچکا رہ گیا تھا...

— کیا معلوم ہے تمہیں؟

—یہی کہ آپ شادی شدہ ہیں... آپ ایک بہت ہی نیک بیوی کے پتی ہیں۔ ایک بہت خوبصورت اور ذہین بیٹی کے باپ ہیں... اور یہ کہ آپ کی لڑکی ہی نہیں، آپ کی دوست ہے... سلمیٰ کہہ رہی تھی تب سر پر کھڑے نیم کی زرد پتیاں جھڑ رہی تھیں۔ اس اندھیرے میں وہ جھپکتے پلکوں کی طرح جھلکتی اور کھو جاتی تھیں۔ تب اُسے لگا تھا کہ جب بھی کسی کے دل میں کوئی طوفان آتا ہے، تب قدرت بھی متاثر ہو جاتی ہے...

— کیوں، آپ کچھ الجھنے لگے؟ سلمیٰ نے پوچھا تھا۔

— نہیں، نہیں تو... یہ نیم کی پتیاں جھڑ رہی ہیں نا...

—ہاں، پت جھڑ کا موسم ہے نا!

— نہیں، یہ اندھیرے کا موسم ہے... لگتا ہے اندھیرا اپنی پتی جھڑ رہا ہے...

—تو ایک کام کیوں نہ کریں!

— کیا؟

— کہ ہم نہ کچھ پوچھیں، نہ جانیں... اپنی روایتی زندگی کے جواب ایک دوسرے سے نہ مانگیں... دماغ کو بر طرف کر دیں اور اُسے جی لیں جو دل چاہتا ہے۔ اُن موتیوں کو بٹور لیں غوطہ خور کی طرح جو سمندر کی سطح میں جب اترتا ہے تو کسی بات کا جواب نہیں دیتا... نہیں؟ سلمیٰ نے یہ کہا تو

کچھ زیادہ ہی پتیاں جھڑنے لگی تھیں۔

تبھی کئی آوازیں آنے لگیں۔ جنوبی قطب کے پاس سے برنارڈ بیرے بلانے لگا — ادیب آؤ نا... ممنوعہ پیار ہی اصلی پیار ہوتا ہے... جس پیار میں ممنوعیت نہیں وہ طوائفیت ہے، لیکن وہ رجحان سماج نے قبول کر رکھا ہے... تم سماج کو ترک کرو... میں نے ابھی ابھی سنا... تمہاری معشوقہ نے چاہا ہے کہ اُسے جی لو، جو دل چاہتا ہے۔ سنو، دماغ سے جیو گے تو جی نہیں سکو گے اور یہ دنیا بھی تمہیں جینے نہیں دے گی... اپنی ممنوعیت سے اوپر اٹھ کر زندگی کو قبول کرو... محویت میں ہی لطف ہے... محویت ہی آخری ہے۔ وہ چاہے کسی جاوداں راہ سے حاصل ہوتی ہو یا کسی فانی شے سے!

— تو کیا پال اور ورجنی جیسی جاوداں عشقیہ کہانی کے کردار فانی تھے؟ ادیب نے پوچھا۔

— تو اور کیا! بیرے بولا — اگر مسز پوایور نہ ہوتیں تو میں اس کے شوہر کی بات کبھی منظور نہیں کرتا... وہی تو کہانی ہے... میں تو ماریشس میں مسز پوایور کے لیے رُکا تھا اور تب وہی لڑکی میرے ناول کی ہیروئن ورجنی بنی تھی اور میں خود بنا تھا پال! اور اس کے شوہر کو میں نے بنایا تھا کھوسٹ بوڑھا... اے ادیب! تم کس تذبذب کے شکار رہو... اپنی محبوبہ کو لے کر ماریشس چلے آؤ... محویت کو قبول کرو، اسے جیو کیونکہ انسان کے سب سے نازک، پابند لمحے محویت میں ہی مضمر ہوتے ہیں اور فطرت انہیں مقدس بناتی ہے!

سلمیٰ سب سن رہی تھی۔ ادیب سوچ رہا تھا۔ پھر وہ دھیرے سے بولا — سلمیٰ قدرت کی پاکیزگی تو ماریشس میں بکھری پڑی ہے۔ لوگ صرف اُس کی خوبصورتی دیکھتے ہیں... گرانڈ بے جتنی مقدس جگہ تو دنیا میں نہیں ہے... حسن تو خود ہمارے پاس موجود ہے، لیکن حسن کی پاکیزگی کوئی نہیں دیکھتا... وہ تو وہاں بکھری پڑی ہے... ترو بیش میں بھی... سبھی جگہ...

— سوچنا آسان ہے ادیب... سوچے ہوئے کو جینا بہت مشکل... ہمارے اور تمہارے حالات کیا ہمیں اس بات کا موقع دیں گے کہ ہم اُسے جی سکیں جیسے ہمارا دل جینا چاہتا ہے؟ سلمیٰ نے کہا تھا...

نیم کے جھڑتے پتوں اور اُترتے اندھیرے کے درمیان چلتی یہ بات نہ جانے کیسے تب ترو بیش کے چاندی کے کنارے پر پہنچ گئی تھی۔ رات چاندنی تھی... سمندر کی لہریں سفید پھولوں کے چادر کی طرح کانپ رہی تھیں۔ بھیگا ہوا کنارہ مدھم آواز میں کچھ گا رہا تھا... کورل کی ریت چاندی کی طرح کچھ بکھری ہوئی تھی۔ کائی کے رنگ کے سیوتی کے گچھے پودے ہتھیلیاں کھولے کھڑے تھے... پتیاں ہلتی تھیں، تو اُن کی ہتھیلیاں چاندی کی طشتریوں میں بدل جاتی تھیں... سیوتی کی ہتھیلیاں۔

— لگتا ہے پورے چاند کی رات ہے! ادیب نے پھیلی چاندنی کو دیکھ کر کہا تھا۔

— نہیں، آج چاند تھوڑا سا ادھورا ہے... کل پورے چاند کی رات ہوگی! سلمیٰ نے چاند کو دیکھ کر کہا تو چاند اُتر کر آیا اور اُس کے ریشمی بال تھپ تھپا کر چلا گیا۔

ریت پر دونوں بیٹھے تھے، تب سلمیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا — کیا یہ ٹھیک نہیں ہوگا کہ ہم دونوں اسی طرح پاس رہتے ہوئے دور رہیں... بس، ایک دوسرے کے لیے سوچیں اور جئیں...

— کیوں، کچھ ایسا ہے جو روکتا ہے؟

— نہیں، ایسا تو کچھ نہیں...

— یادیں! یادیں تو بہت سی ہو سکتی ہیں... لیکن کوئی بھی یاد مجھے باندھتی نہیں!

— کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے لیے خوبصورت یادوں کا اخراج کر رہے ہوں...

— شاید یہ ٹھیک ہو ادیب، لیکن یادیں تو وہی ہیں جو ایک خلش کی طرح زندگی کا ساتھ دینے کے لیے لگی رہ جاتی ہیں... اور شاید انہیں ادھوری یادوں کو ہم بار بار پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں... سلمیٰ نے کہا اور اُس کی پلکیں بھیگے کنارے کی طرح کچھ اور بھی کہنے لگیں۔

— سلمیٰ... یادیں مقدس ہوتی ہیں، شاید اسی لیے لگی رہ جاتی ہیں... کوئی یاد نہ چھوٹی ہوتی ہے نہ بڑی، لیکن ہر یاد کی آنچیں الگ ہوتی ہیں... کیوں نہ ہم اُن گہری اور اگر ہو سکے تو پوری یادوں میں تبدیل ہونے کے لیے سفر پر نکل پڑیں! ادیب نے کہا اور پہلی بار اُس نے شبنم سے بھیگی سلمیٰ کی گردن پر اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے۔ سلمیٰ لہر کی طرح کانپ اٹھی تھی... اُس کے ہونٹ تتلی کے پنکھوں کی طرح کھلے اور کانپے تھے اور پلکیں ترو بیش کی سیپیوں کی طرح موند گئی تھیں۔

کچھ بوندیں موتیوں کی طرح ادیب کی ہتھیلیوں پر گری تھیں۔ وہ انہیں دیکھتا رہا... وہ موتی اُس کی ہتھیلیوں پر سوکھ گئے تھے۔ اُن کے داغ پھر نہیں چھوٹے۔ آنسوؤں کے نہ مٹنے والے داغ اُس نے پہلی بار دیکھے تھے!

رات کا پتہ ہی نہیں چلا، کب آئی اور کب بیت گئی تھی... لہروں کے ساتھ آتی ہوا کی نمی نے بتایا تھا کہ رات بیت گئی... چاندنی جسم کے سرمئی اندھیرے میں گھلنے لگی تھی۔ وہ دونوں ریت سے اٹھ کر کاٹیج میں چلے آئے تھے۔

بستر اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بھی ترو بیش کے ریت کی طرح صاف تھا۔

— میرے لمس سے، چھونے سے، کچھ ایسا تو نہیں جو تم میں زندہ ہوتا ہو اور میری قوس بندی کرتا ہو؟

— نہیں، ایسا بھی کچھ نہیں... سلمیٰ نے بہت گہری نظروں سے ادیب کو دیکھ کر کہا تھا — اور پھر...

— کیا؟

— یہی کہ... وہ کچھ جھجکی۔

— کہ؟

— کہ سچائی یہی ہے کہ قدرت نے کچھ قانون بنائے ہیں... آدمی عورت کے آپسی رشتوں کا یہی قانون ہے کہ عورت کچھ دے کر پاتی ہے اور آدمی کچھ پا کر دیتا ہے! سلمیٰ بولی تھی۔

— اس قانون سے تو برابری ختم ہوتی ہے۔

— نہیں... برابری جنس نہیں، جسے ترازو پر رکھ کر تول لیا جائے۔ برابری تو تمناؤں کی ہوتی ہے... خواہوں کی ہوتی ہے... ادیب نے اُسے گہری نظر سے دیکھا — آج رات کون سا خواب دیکھا؟

— آج رات، رات ہوئی ہی کہاں... آج تو کھلی آنکھوں والا خواب دیکھا... اور اتفاق کی بات ہے کہ یہ خواب بھی میں نے اور آپ نے ایک سا دیکھا، ہائی ڈے ان والے خواب کی طرح۔ شاید یہی ہماری زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے...

— کہ جو دنیا میں کہیں سچ نہیں ہوتا، کبھی سچ نہیں ہوا، وہ ہمارے ساتھ سچ کی طرح موجود ہے! ادیب بولا۔

— یہی سچ ہے! سلمیٰ نے کہا۔

اور سلمیٰ کے وہ الفاظ 'یہی سچ ہے!' ماریشس کے اُس کاٹیج سے نکل کر کائنات میں گونجتے چلے گئے...

یہی سچ ہے... یہی سچ ہے...

تب دونوں ہی خود کو روک نہیں پائے تھے اور طوفانی سانسوں کے ایک گھر میں سما گئے تھے۔

پتھر، اینٹوں اور جسم کے گھر تو اس دنیا میں بہت بنے تھے، سبھی نے بنائے تھے، لیکن یہ گھر سانسوں کا تھا... سانسیں... جو دور کورل ریف سے ٹکراتی ہند مہا ساگر کے لہروں کی طرح جھاگ والی تھیں... اور دونوں کی کستی بانہوں اور الجھتے اعضا سے چنگاریوں کے پھول جھڑنے لگے تھے...

— لگتا ہے، ہم کہیں ڈھاک کے جنگل میں لیٹے ہیں! اُکھڑی کانپتی سانسوں سے سلمیٰ بولی تھی...

— ہاں! ادیب کی سانسیں بھی بھاری تھیں — صدیوں، ہزاروں سال پہلے ماریشس میں ایک جوالا مکھی پھوٹا تھا، سمندر کی گہرائی سے... اُسی نے اس ملک کو جنم دیا تھا... آج ہماری جوالا مکھی نے ہمیں جنم دیا ہے... کتنا خوبصورت ہے آگ کے جھرنے میں نہایا ہوا یہ پلاش کا جنگل!

اور تب پھر ایک اور گہری پہچان کے لیے دونوں ایک دوسرے میں کچھ ڈھونڈنے لگے تھے۔

— آپ اور کیا کھوجنا چاہتے ہیں؟

— وہی جو تم بھی شاید کھوجنا چاہتی ہو... میں جسم کے کسی بھی حصے کو چھونا نہیں چاہتا اور شاید ہر اعضا کا گنجان لمس تلاش کر رہا ہوں!

— ادیب احساس کرو جب قدیم ہوا نے قدیم دھرتی کو پہلی بار چھوا ہوگا...

ادیب اُسے دیکھتا رہ گیا...

— سلمیٰ!

— ہاں!

— تم نے کب نہایا... تم نے میک اپ کب کیا؟

— میک اپ! آدھا دن چڑھ آیا ہے، ہم نے آئی ہوئی صبح کہاں دیکھی ہے... جو میک اپ...

— لیکن... تمہاری پلکیں جاگی کیوں ہوئی ہیں، ماتھے پر چاندنی کا یہ ٹیکہ تم نے کب لگایا؟

— اور؟ اور؟

— تمہارے ہر جوڑ... بغلوں اور جانگھوں اور ہر مسام سے مشک کی یہ خوشبوئیں پھوٹ رہی ہے!

— آہ... لیکن آپ کے جسم سے آتی بھیگی دھرتی کی یہ مہک مجھے بے ہوش کیوں کر رہی ہے؟...

— پتہ نہیں یہ سب کیا ہے... سلمیٰ، شاید ہم ہی کائنات ہیں... فانی ہوتے ہوئے بھی مسلسل جی سکنے کے تسلسل کی ایک کڑی... ادیب اُس میں تحلیل ہوتے ہوئے بولا تھا۔

— اب کچھ بولو مت ادیب... کچھ سوچو مت... کچھ بھی بولو مت... نہیں تو سانسوں کا یہ محل گر جائے گا... سوچو مت... جی تو چاہتا ہے، وہ اُسے دے دو... وہی ہونے دو جو ہوتا ہے! جو ہوتا ہے... جو ہمیشہ ہوگا... کہتے ہوئے سلمیٰ اس کے جسم میں سانس کی طرح سما گئی تھی... اور ان کے جسموں پر ہزاروں نیلے پھول کھل اٹھے تھے۔

یکبارگی تبھی دروازے پر دستک ہوئی... تھکن کی مدہوشی میں دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا اور آواز دی — کم ان!

چیمبر بوائے اندر آیا تو دونوں نے خود کو سنبھالا۔

— سر! آپ لوگوں نے نہ چائے منگوائی، نہ لنچ پر آئے... کہئے تو کمرہ صاف کر دوں... چیمبر بوائے بولا۔

— تھینک یو... لیکن یہاں گندہ کچھ ہے ہی نہیں... سلمیٰ بولی تھی — فرنیچر صاف کرنے کی

ضرورت ہو تو کال کر دیجیے!

— نو پرابلم میڈم! کہتا ہوا چیمبر بوائے واپس چلا گیا۔

اور تب سلمیٰ نے ادیب کو سادگی سے دیکھتے ہوئے کہا تھا — سنیے! اب ہم اس بستر پر نہیں لیٹیں گے۔

— کیوں؟

— اس بستر پر محبت سوئی ہے، اس پر لیٹنے سے ہماری محبت کہیں میلی نہ ہو جائے...

— چلو اب برش کر لو... نہا لو... اور چل کر کچھ کھا لو... ویسے بھی یہاں ماریشس میں رات آٹھ بجے کے بعد کھانا نہیں ملتا...

— نہا تو لیں گے، لیکن یہ نیلے پھول تو تب بھی نہیں کمہلائیں گے۔ ان کا کیا کریں گے؟ سلمیٰ نے پوچھا تھا۔

— ہم سے پوچھنے والا ہے کون؟ ادیب بولا تھا اور اس نے سلمیٰ کو ایک بار پھر بانہوں میں بھر لیا تھا۔

١٩

جب ادیب اور سلمیٰ کالج سے نکلے تب بھی نیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ سلمیٰ ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ بدن کے باقی پھول تو ساڑی اور بلاؤز کے اندر گلدستوں کی طرح سما گئے تھے، لیکن بانہوں پر ان نیلے پھولوں کی جو بیل اتر آئی تھی، وہ قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ سلمیٰ بار بار اس بیل کو پلو سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ خوشبو اندر ہی رہے باہر نہ چھلکنے پائے۔

اس وقت سامنے مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ بادلوں کا پلو اُسے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ بار بار اپنی کرنوں کی تارچ پھینکتے ہوئے ترو بش کو پلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

ہند مہا ساگر کی پرسکون لہریں کناروں پر تھپکیاں دے رہی تھیں۔ کچھ خانہ بدوش ناویں اب بھی کورل کی طرف جا رہی تھیں۔ اُن کے پال ڈوبتے سورج کی روشنی میں تاج کی طرح چمکتے اور کھو جاتے تھے۔

— کیسی لگتی ہیں اس خاموش سمندر کی لہریں... جیسے کوئی رنگریز نیلا دوپٹہ سکھا رہا ہو... سلمیٰ بولی تھی... اور رات میں یہی لہریں بانہوں میں بدل جاتی ہیں...

ادیب نے اس کی پیٹھ کو لپیٹتے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور اُسے لیے وہ گنے کے

چھتاروں والی چھتری کے نیچے لے آیا تھا۔ وہاں میز پڑی تھی۔ کھانا کھانے کے لیے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں جانا انہوں نے پسند نہیں کیا تھا۔ سورج اب ڈوب گیا تھا۔ سیوتی کی جھاڑیوں کی چتاں پلٹ گئی تھیں اور نیچے سیپیوں کے آٹے کا سفید قالین بچھا تھا۔

— کتنی اچھی ہے یہ ریت... پیر میلے نہیں ہوتے! سلمیٰ بولی ہی تھی کہ ویٹر آ گیا۔

— انڈیا! بھارت...

— ہاں، انڈیا... بھارت!

— سر! سنا ہے اُدھر بھارت میں بہت بڑا سورج نکلتا! ویٹر نے دونوں ہاتھ پھیلا کر بتایا۔

— نہیں، اتنا ہی بڑا نکلتا ہے، جتنا بڑا یہاں ہوتا ہے! سلمیٰ نے ہی جواب دیا تھا۔

— کیسے ہو سکتا ہے میڈم! ویٹر نے اُس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا، لیکن اس نے آگے بحث نہیں کی۔

— آپ آرڈر دس منٹ بعد لے سکیں تو مہربانی ہوگی — سلمیٰ نے ویٹر سے کہا۔ وہ چلا گیا۔

دیکھا! بڑی ثقافت کا سورج بھی بڑا ہوتا ہے! ادیب نے کہا تو سلمیٰ نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ رفتہ رفتہ اُس کی انگلیاں لہروں کی طرح تھرتھراتی رہیں...

— ایک عجیب سی بات من میں آتی ہے — سلمیٰ نے دھیرے سے کہا۔

— کیا؟

— لگتا ہے ہم دو صدی پہلے چلے ہوں... گرمٹیا مزدوروں کی طرح اور یہاں آ کر اترے ہوں... اُسی طرح ناؤ میں، ٹھیکیدار نے ٹھنسوا دیا ہو۔ اُس لاش کو بھی، جو راستے میں اپنا چولا بدل چکی تھی۔ انگریز مالک نے سپلک ٹینک سے نہلا کر ہمیں نکال لیا ہو اور گلے میں نمبر کا پٹہ پہنا دیا گیا ہو اور تب ہم گنے کے کھیتوں میں کام کرنے چل پڑے ہوں... پتہ نہیں سلمیٰ کہاں کھو گئی تھی اور صدیوں کو پکارتے دوڑی چلی جا رہی تھی۔

کہ تبھی ایک صاحب آئے تھے... جی، میں ایک منٹ دخل دے سکتا ہوں؟

— ضرور... ضرور... فرمائیے؟

— جی، میں آپ سے نہیں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں!

— سلمیٰ سے... کیجیے...

— ہم اُس چھتری کے نیچے بیٹھ جائیں... انہوں نے کہا۔

— کیوں؟ ایسی کیا ضرورت ہے؟ سلمیٰ نے اعتراض کیا۔

— کوئی ضروری نہیں کہ آپ میری موجودگی کو محسوس کریں! ادیب نے کہا تو سلمیٰ کے چہرے پر اُسے پریشانی دکھائی دی۔ اسی پریشانی میں سلمیٰ نے پوچھا— آپ کہاں چلے جائیں گے؟

— کہیں نہیں، میں یہیں کہیں چلا جاؤں گا... جو لوگ باتیں چھپا کر کرتے ہیں، انہیں نہیں معلوم کہ باتیں چھپتی نہیں! تم میری موجودگی کب چاہوگی۔ میں موجود ہو جاؤں گا اور اتنا کہتے ہوئے ادیب غائب ہو گیا۔

— خیر، کوئی بات نہیں، جی بتایئے؟ سلمیٰ نے اُن صاحب سے کہا۔

— پہلے تو میں اپنے بارے میں بتا دوں... میرا نام نعیم ہے، میں پاکستان سول سروس میں ہوں۔ آپ سی ایس پی سے ریٹائرڈ آفتاب احمد کی شاید نواسی ہیں! نعیم نے پوچھا۔

— جی، اور ہندوستانی سول سروس آئی اے ایس سلمان حسین کی بیوہ! سلمیٰ نے تھوڑا اٹک کر کہا۔

— جی ہاں، جی ہاں، مجھے معلوم ہے... میں سلمان کا کزن ہوں۔ مجھے معلوم ہے، شملہ میں اُن کی موت ہو گئی تھی...

— اور مجھے اُن کے گھر والوں نے سلمان کی کمائی کی دو تہائی جائیداد کی وراثت سے بے دخل کر دیا تھا ایک جھوٹی 'ول' بنا کر! سلمیٰ نے غصے میں کہا۔

— ہاں، کچھ کچھ تو مجھے معلوم ہے... ہندوستان کی ساری اور پوری خبریں تو ملتی نہیں... نعیم بولے۔

— تب تو شاید آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آپ کے خاندان والوں نے مجھے عدالت میں گھسیٹا تھا... اور سلمان کی موت کا الزام مجھ پر لگایا تھا اور دلیل یہ دی تھی کہ شادی سے پہلے میرا تعلق کسی اور آدمی سے تھا... سلمیٰ ترشی سے کہہ رہی تھی۔

— ہاں، اور شاید عدالت نے آپ کو کٹ گھرے میں کھڑا دیکھ کر کہا بھی تھا کہ اتنی خوبصورت عورت کا حقدار ایک آدمی ہو اور وہ مسلسل حقدار بنا رہے، یہ ناممکن ہے! نعیم نے کہا۔

— ہاں یہ چٹ پٹی خبریں اخباروں نے چھاپی تھیں! اور سرحد کے اس پار و اُس پار کے رشتے داروں نے صرف یہی خبریں سنی، پڑھی اور جانی تھیں اور پھر آپ نوکرشاہوں کا کنبہ تو ایک ہے، پھر وہ چاہے ہندوستانی آئی اے ایس ہوں یا پاکستانی سی ایس پی! سلمیٰ نے زہر بجھے لہجے میں کہا تو نعیم کچھ گھبرا گیا— نہیں، ایسا تو نہیں ہے...

— ایسا ہی ہے نعیم صاحب! آپ کے خاندان سے چھٹک کر اپنی مرضی کا مالک کوئی بھی مرد

آزاد ہو سکتا ہے لیکن عورت کو آپ اپنے خاندان کی جائیداد سمجھتے ہیں! اگر کسی حادثے کے بعد کوئی عورت کسی اور خاندان کے مرد کو قبول کر لے تو آپ لوگ برداشت نہیں کرتے...

— آپ کچھ غلط سوچ رہی ہیں...

— اس میں غلط کچھ بھی نہیں ہے... پہلے تو آپ عورت کو اپنے خاندان میں گھیر کر رکھنا چاہتے ہیں، پھر خاندان کا واسطہ دیتے ہیں اور جب کچھ بھی کامیاب نہیں ہوتا تو مذہب کا واسطہ دیتے ہیں...

— ہاں، شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں! آپ اب بھی مسلمان تو ہیں ہی... لیکن ایک ہندو مرد کے ساتھ جو راستہ آپ تلاش کر رہی ہیں، وہ کفر ہے! نعیم نے سختی سے کہا۔

— تو آپ یہاں بھی وہی گھٹیا بات لے آئے! کیا دلی رشتہ قائم کرنے سے پہلے کبھی کسی نے پوچھا ہے کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ کیا آپ فطری محبت اور مذہبی محبت میں فرق نہیں کر سکتے، نعیم صاحب؟ کسی بھی مذہب سے پہلے قدرت ہے! سلمیٰ بولی تو نعیم لاجواب سا ہو گیا۔

— میں کہنا صرف اتنا چاہتا ہوں کہ...

— کہ میں ایک ہندو کے ساتھ اپنی دلی، جسمانی اور روحانی خوشی کے راستے کی تلاش نہ کروں!

— آپ کے سامنے ایک بیٹا بھی ہے... سوچئے، اُس کا کیا ہوگا؟

— وہ میرا بیٹا ہی سہی، لیکن مرد کو جینے کے لیے کہیں مشکل نہیں ہوتی۔

— میں ایک دوست اور رشتہ دار کی طرح آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ بہتر ہوگا آپ اپنے بیٹے کے ساتھ، اپنے نانا کے پاس پاکستان لوٹ آئیں! نعیم نے کہا۔

— آپ تو بالکل یزید کی طرح پیش آ رہے ہیں!

— یزید کی طرح... میں سمجھا نہیں!

— آپ سمجھ رہے ہیں، یہ آپ کیوں قبول کرنا چاہیں گے؟ یزید نے بھی حضرت حسین کو مدینے سے عراق آنے کی دعوت دی تھی اور کربلا کے میدان میں انہیں بھوکا پیاسا رکھ کر آخر اُن کا قتل کر دیا تھا! آپ کا بلاوا یزید کا بلاوا ہے اور آپ کا پاکستان میرا کربلا ہی بن سکتا ہے۔ جہاں آپ مجھے ہر طرح سے بھوکا رکھ کر اپنی ہوس کا شکار بنا سکتے ہیں اور زندہ رہتے ہوئے بھی ایک غیر قدرتی موت مجھے دے سکتے ہیں... حضرت حسین تو صرف کربلا میں شہید ہوئے تھے، لیکن مسلمان عورت کے لیے تو آپ لوگوں نے پوری زندگی ہی ایک کربلا بنا رکھی ہے۔ سلمیٰ کے اندرون ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا، وہ چیخ پڑی— کیا ہے وہ خاص چیز جو ایک مسلمان مرد عورت کو دے سکتا ہے جو غیر مسلم نہیں دے سکتا؟

—اسلام نے عورت کے لیے جو درجہ تجویز کیا ہے وہ کسی اور مذہب کے پاس نہیں ہے۔ جسمانی سطح پر تو ہر مرد صرف وہی دے سکتا ہے جو کوئی بھی مرد عورت کو دے سکتا ہے، لیکن روحانی اور دنیاوی سطح پر ایک مسلمان مرد عورت کو وہ سب کچھ دے سکتا ہے جو دنیا کا کوئی مذہب نہیں دیتا! نعیم بولا—اسلام ماننے والوں کے پاس قرآن پاک ہے، حدیث ہے!

—لیکن وہ تو عربوں کے پاس ہے... اُن کی اصل کاپیاں جو انھوں نے اب تک کسی کو نہیں دیں۔ پھر تو فقہ نے ہی اسلامی قانون کی الگ الگ پہچان دی اور یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ تبھی اسلامی شریعت کے قوانین کی پہچان میں فرق آیا... سنیوں کے چار اسکول بنے... شیعوں نے تب سنیوں سے الگ اپنے اسکول فقہ اثنا عشری کو قبول کیا۔ یہ صحیح ہے ان سبھی اسکولوں کے لوگ مسلمان ہیں، ان کا خدا ایک ہے، ان کا نبی ایک ہے، ان کی کتاب ایک ہے مگر ان کی زندگی جینے کے اصول الگ الگ ہیں...

—جی! اور؟ نعیم نے جیسے چیلنج کیا۔

—اور یہی کہ آپ سی ایس پی میں ضرور ہیں لیکن آپ پاکستان نام کے ملک کو نہیں، آپ اسلام کے نام پر اپنی کمزوریوں کو چلانا چاہتے ہیں۔ ملک تو آپ کو انگریزوں نے جاگیر میں دیا ہے اور آپ عوام کے لیے نہیں غلط مذہبی منصوبوں کے لیے دس بیس نسلوں کو اسلام کے نام پر غارت کردینا چاہتے ہیں... حالانکہ اسلام نے نفرت کا پیغام کبھی نہیں دیا، لیکن آپ نفرت کو مذہبی منصوبوں کی پوشاک پہنا کر دوسرے مذہبوں کے ساتھ وہی کرنا چاہتے ہیں جو اسرائیل کی یہودیت نے اسلام کے ساتھ کیا تھا۔

—یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟ پاکستان کی بنیاد ایک اصول پر رکھی گئی ہے...

— کس بنیادی اصول پر؟ مذہب تو قوم کی پہچان نہیں ہے! مذاہب کے آنے اور نازل ہونے سے بہت پہلے بھی تو لوگ کسی اور مذہب، کسی اور عقیدے، کسی اصول کے تحت ہی اپنے سماج کو چلا رہے تھے۔ آج اگر پورا امریکہ اسلام کو قبول کرلے، تو کیا وہ قوم کی شکل میں امریکی نہیں رہ جائیں گے؟ کیا وہ عربی یا ایرانی ہو جائیں گے؟

—آپ تو بحث کررہی ہیں اور اس بحث میں آپ خواہ مخواہ اسلام کو گھسیٹ رہی ہیں!

—وہ اس لیے کہ پاکستانی ہونے کے ناطے آپ خود کو اسلام کا علمبردار سمجھتے ہیں، اسی لیے بار بار آپ مجھے اسلام کا واسطہ دے رہے ہیں۔ اسلام کے نام پر ایک ملک پاکستان بنا تھا... یہ دنیا میں کبھی نہیں آیا تھا، ہمیشہ ملکوں کے نام پر مذاہب نے اپنی پہچان حاصل کی ہے۔ پاک نبی حضرت محمدؐ

کے آنے اور پاک قرآن کے نازل ہونے کے باوجود عرب، عرب ہی رہا، عراق ہی رہا، ایران ایران ہی رہا، لیکن پاکستان، بھارت یا ہندوستان نہیں رہا...

—آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟

—یہی کہ خود آپ کے صدر ضیاء الحق نے کہا تھا کہ پاکستان اسی طرح ایک مذہبی منصوبے کی مثال ہے جیسے کہ اسرائیل یہودیت کی دین ہے، اگر اسرائیل سے یہودیت ختم ہوجاتی ہے تو اسرائیل نہیں بچے گا۔ اسی طرح اگر پاکستان سے اسلام کی بنیاد ختم ہوجاتی ہے تو پاکستان ختم ہوجائے گا!... مذہب ختم ہوجاتے ہیں، نعیم صاحب، لیکن قومیں تو ختم نہیں ہوتی!... کیا عیسائیت قومیں ختم کرسکیں؟... قوم کا تصور ہی الگ ہے... کیا بودھ مذہب آنے کے بعد، چین، جاپان، کمبوڈیا، برما، شری لنکا، انڈونیشیا کی قوموں کو کوئی بدل سکا... اُن میں بہت سے عیسائی اور مسلمان بن گئے، لیکن کیا مذہب قوم کو توڑ پایا؟

—آپ بے ہودہ بحث کررہی ہیں! نعیم نے کہا۔

—آپ اس وقت ماریشس میں اکیلے ہیں۔ آپ میرے فوت فرمائے خاوند سلمان حسین کے کزن ہیں... اگر میں اسلام کے نام پر ادب کو چھوڑ کر ابھی اسی رات آپ کے ساتھ سو جاؤں تو شریعت، حدیث اور مقدس قرآن شریف سب میرا ساتھ دیتے گئیں گے کیونکہ آپ ان پاک اصولوں کو انسانی پہچان سے الگ کرکے اسلامی پہچان دے کر اپنے لیے محدود کرلینا چاہتے ہیں! اس لیے نعیم صاحب، آپ مجھے مذہب کا واسطہ مت دیجیے۔ ہر مذہب میں آپ جیسے گھٹیا اور کمینے لوگ موجود ہیں جو اپنی جسمانی خواہشوں کے لیے مذہب کا استعمال ایک طمنچے کی طرح کرتے ہیں۔ یہ طمنچہ آپ کی پینٹ کے نیفے میں قید ہے اور کلبلاتا رہتا ہے اور اس کی ضرورت کے مطابق آپ جیسے لوگ مذہب کا واسطہ دیتے رہتے ہیں! سلمٰی چیخ رہی تھی۔

—آپ نہایت بے ہودہ عورت ہیں! نعیم غصے سے میز پر مکا مار کر چیخا تھا۔

—آپ نہایت بے ہودہ آدمی ہیں جو پاکستان کے نام پر ایک بڑے مذہب کو نہایت چھوٹے دائرے میں قید کرنا چاہتے ہیں... میرا اسلام اتنا گھٹیا مذہب نہیں ہے۔ آپ نے پاکستان کے نام پر ایک بنتی قوم کو بانٹا اور اب آپ مجھے، ایک فرد کو پھر مذہب کے نام پر کسی دوسرے سے الگ کرکے میرے وجود کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں! سلمٰی چیخی تو کہرام سا مچ گیا۔ نعیم گھبرا گیا اور وہ جیسے تیسے اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا اٹھ گیا۔ اٹھ کیا گیا، بھاگ کھڑا ہوا۔

اس وقت چاند نکل آیا تھا۔ کنارے سے لگے سمندر کی سطح جھلملاتی منی میں بدل گئی تھی۔

ریت کی طرح چمک رہی تھی اور سمندر سے آتی ہوا چاندنی کو دوپٹے کی طرح لپیٹے ادھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ سیوتی کے پودوں کی پتیاں پلٹ چکی تھیں اور آہستہ آہستہ تالی بجا رہی تھیں — سی پائن کی جھومریں کچھ گنگنا رہی تھیں اور دور دور گنّے کے کھیتوں کے پتے گوٹے کی کناریوں کی طرح آپس میں الجھ رہے تھے...

آج پورے چاند کی رات تھی... سلمٰی کا تمتماتا چہرہ اُس چاندنی میں ٹین کی چادر کی طرح چمک رہا تھا۔ نعیم صاحب نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے... ٹریولش میں سناٹا تھا۔ پتہ نہیں باقی لوگ کہاں چھپ گئے تھے۔ جھلملاتی مٹی والی پانی پر کچھ کشتیاں تھاپ دیتے ہوئے تھرتھرا رہی تھیں... دور کالی جیٹی کی جالی پر چاندی کی برفیاں ٹنکی تھیں۔ لاوے کی ننھی ننھی چٹانیں آرام کرتے ہرنوں کی طرح بیٹھی تھیں اور پانی کے اندر چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کے جھنڈ موتیوں کی چادروں کی طرح آتے اور پلٹ کر چلے جاتے تھے۔

آخر ادیب کو بے کراں سے نکل کر سلمٰی کا خیال آیا کہ وہ بالکل اکیلی ہے۔ ادیب پاس پہنچا اور جیسے ہی اُس نے سلمٰی کو چھوا، وہ ریت کے مینار کی طرح بکھر کر اُس کے وجود میں سما گئی...

ادیب نے ریت کے ایک ایک ذرّے کو سمیٹا، اُسے پھر جوڑا... ہر ذرّے کو اُس کی جگہ رکھا تو سلمٰی پھر جوں کی توں بن کر کھڑی ہو گئی۔ فرق اتنا ہی تھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ ریگستانی آندھیاں تھیں اور سانسوں میں تیزاب کی مہک۔

ادیب نے اُسے جھنجھوڑا — سلمٰی؟ آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟

— کچھ نہیں ادیب! نعیم جیسے لوگ آخر یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ مسلمان اور اسلام کے نام پر ان پاکستانیوں کو بولنے کا کوئی حق نہیں ہے... آج ہندوستان میں پاکستان سے زیادہ مسلمان ہیں اور پاکستان سے زیادہ اسلام کو سمجھنے والے لوگ ہیں اور اسلام کو دل سے ماننے والے مسلمان ہندوستان میں اُن سے کہیں زیادہ ہیں، تب ان پاکستانیوں کو بولنے کا حق کہاں ہے؟ سلمٰی بری طرح چیخ رہی تھی۔

— چھوڑو یہ باتیں... آؤ کھانا کھا لیں! ادیب نے کہا۔

— ہاں، مجھے بہت بھوک لگی ہے!

ادیب نے پلٹ کر دیکھا۔ ہوٹل کے مین ہال کی روشنیاں گل تھیں۔ وہ ادھر گیا تو پتہ چلا ہوٹل بند ہو چکا ہے... ہولی کی چھٹی ہے اور اب کھانا نہیں مل سکتا!

— لیکن ویٹر تو آرڈر لینے آیا تھا۔

— جی ہاں، اُس نے بہت دیر آپ کا انتظار کیا... آخر چھٹی کا دن تھا۔ انتظار کرتے کرتے وہ تھک گیا پھر کچن بند ہو گیا تو وہ چلا گیا۔

— تو اب کچھ نہیں مل سکتا؟

— ساری سر!

— لیکن آپ جنوبی افریقہ کے ٹورسٹوں کو تو ساری رات کھلاتے ہیں!

— جی، تب جب چھٹی کا دن نہیں ہوتا... ویسے بھی جنوبی افریقی ٹورسٹ شام آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک اپنا ڈنر ختم کر لیتے ہیں اور ہم ہر دن ساڑھے نو بجے اپنا کچن بند کر دیتے ہیں، اب تو ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔

وہ جب کاٹیج میں لوٹا تو بستر پر پڑی سلمٰی بری طرح سسک رہی تھی... نعیم کی باتوں اور بھوک نے اُسے بے حال اور بدحال کر دیا تھا۔

— سلمٰی!

— کچھ نہیں، مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی اور آپ ریکشن پر بحث میں الجھے ہوئے تھے... آپ کو میری بھوک کی فکر ہی نہیں تھی، اس لیے میں یہاں چلی آئی۔ مجھے پتہ ہے ہوٹل میں بھی کچن بند ہو چکا ہے ہولی کی وجہ سے، لیکن ہر ایک تو ہندو نہیں ہے... غیر ہندوؤں کو بھی تو بھوک لگتی ہے! کہتے ہوئے سلمٰی بھوک سے رونے لگی۔

— دیکھو، میں کچھ کوشش کرتا ہوں! کہتے ہوئے ادیب نے باہر نکل کر گاڑی لی اور پورٹ لوئی کی طرف نکل پڑا۔ وہی گنّے کے کھیتوں کی قطاریں... اندھیرا اور گاؤں ٹریولے سے ہوتی ہوئی پتلی سڑک۔ ٹریولے سے گزرا تو بائیں طرف ایک مکان میں روشنی دکھائی دی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ برنارڈ پیرے کا کوئی خاندان ہے... رُک کر پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ ایک ادیب کا گھر ہے۔ اس ادیب کا نام ابھمنیو انت ہے اور یہ ہندوستانی نژاد ہے... جب سارا ماریشس روشنیاں بجھا کر سو جاتا ہے تو یہ رشی صفت ادیب اپنے قلم کو شمع کی طرح جلاتا ہے تاکہ دنیا میں روشنی کی کمی نہ پڑے...

اور اُس ادیب کے قلم کی وہ روشنی اُس کا پورٹ لوئی تک ساتھ دیتی رہی۔ جب وہ اُس بندرگاہ والے شہر میں پہنچا تو گودی سے لہسن اور پیاز اترنے کی بو آ رہی تھی۔ پتہ چلا کہ یہ بھارت سے آتا ہے۔ کریم اور پنیر آسٹریلیا سے آتی ہے۔ گوشت نیوزی لینڈ سے، سیریلس یوروپ سے، پٹرول گلف سے اور ٹورسٹ پوری دنیا سے۔ سامان کی کوئی کمی نہیں تھی، لیکن بازار تو بند تھا۔ آخر ادیب کو ایک جگہ ٹریولے کی طرح ہی روشنی ٹمٹماتی دکھائی دی۔ وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ یہ وزیر اعظم سر شیو ساگر رام غلام

کا گھر ہے۔ جس کے نیچے خوانچے جیسی ایک دوکان اب تک کھلی ہوئی تھی۔ اس پر کچھ سموسے، پکوڑے اور کیلے موجود تھے۔ خریدتے ہوئے معلوم ہوا کہ دوکاندار میڈاگاسکر کا ایک معمولی سا آدمی ہے جو ہندوستانی ناشتہ بنا کر بیچتا اور اپنا پیٹ بھرتا ہے اور ماریشس کے وزیر اعظم نے اپنے گھر کے نیچے اُسے خوانچہ لگانے کی اجازت دی ہے... ادیب کو لگا تھا کہ آخر یہ کیسا ملک ہے جو ہر طرف اور زندگی کے ہر پہلو سے پاک اور صاف ستھرا ہے۔ جو کچھ ملا، اُسے لے کر ادیب تریونش کی طرف بھاگا۔ آدھی رات بیت گئی تھی۔ تریونے سے گزرا تو اُس رشی صفت ادیب ابھیمنیو انت کے کمرے کی روشنی اب بھی جل رہی تھی...

کاٹیج میں پہنچا تو سلمیٰ انتظار کر رہی تھی۔ ادیب نے سموسے، پکوڑے پلیٹ میں رکھے، کیلے بھی رکھ دیے۔

— لو کھاؤ...

— میرا پیٹ تو اسی وقت بھر گیا جب آپ اسے لانے کے لیے نکل پڑے تھے۔ پیٹ کی بھوک بہت سمجھدار ہوتی ہے! سلمیٰ نے کہا اور اُسے پیار کر لیا — پیاس لگی ہے...

ادیب نے پانی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سلمیٰ نے روک لیا اور اُسے اپنی بانہوں میں بھر لیا — پیاس کا پانی اور ہوتا ہے ادیب...

اور تب کمرے کی ساری مصنوعی خوشبو کہیں اور اڑ گئی تھی۔ جسم اپنی فطری خوشبو کے ساتھ، ندیوں کی طرح لڈ کر ایک ہو کر بہنے لگے تھے... جسم نباتات کے جنگل بن گئے تھے... دیودار، چنار، بوراس، صندل، دارچینی اور دھرتی کی سوندھی مہکتی جنگلوں سے ہوتے ہوئے صدیوں کی بانہوں میں پھیلے ہوئے تھے...

— آہ... اب مجھے چھوڑنا مت۔ ہم اسی طرح جیتے جیتے پتھروں میں تبدیل ہو جائیں گے...

آہ... ادیب... میرے ادیب...

— ندیوں کی بانہوں کے پانی کناروں کی طرف بہہ چلے تھے۔ بیچ دھارا کا پانی اب بے قرار سطح پر بہہ رہا تھا۔

— ایک بات کہوں... آپ کے پسینے کی طرح یہ بھی کھارا ہے... یا خدا، یا میرے پروردگار... مجھے مشکل سے ملی اس روحانی خوشی سے محروم مت کرنا! میری جسمانی خوشیوں پر چاہے جو پابندیاں لگا دے میرے خدا... یہ مجھے میرا حاصل ملا ہے پروردگار... خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی۔ شاید یہ خیرات نہیں، میرا حاصل ہے... اس میں مجھے جی لینے دو!

— آمین!

— یہ آمین آپ نے بولا تھا؟ سلمیٰ نے چونک کر پوچھا۔

— نہیں تو!

— کوئی تیسرا شاید مسلسل ہمارے ساتھ ہے...

— جو ہمیں ایک سا ناشتہ دیتا ہے، ایک سے خواب دیتا ہے، ادیب بولا۔

— ادیب!

— ہوں!

— ادیب... آپ نے اتنے دنوں میں مجھے وہ سب دے دیا جو میرے شوہر سلمان نے مجھے آٹھ برسوں میں نہیں دیا...

— کیا کہہ رہی ہو تم؟

— وہی، جو سچ ہے! جو سچ ہے... آپ نے مجھے جنت سے نکال کر عبادت کی دنیا میں پہنچایا ہے ادیب! کاش...

کاش؟

— کاش، آپ شروع سے میرے شریکِ حیات ہوتے۔ ہم شادی شدہ ہوتے... کہتے ہوئے سلمیٰ بری طرح رو پڑی تھی۔ ادیب نے اُس کی آنکھوں پر ہونٹ لگا کر ایک بھی بوند گرنے نہیں دیا تھا۔

— تمہارے آنسو تو میرے پسینے کی طرح کھارے نہیں ہیں۔ یہ دجلہ، فرات، نیل اور گنگا کے پانی کی طرح میٹھے ہیں! ادیب نے اُسے بانہوں کی ریشمی بندھن میں لپیٹتے ہوئے کہا تھا۔

— آپ اُس سال کہاں تھے؟

— کس سال؟

— جس سال سلمان سے میری شادی ہوئی تھی۔

— تب میں تمہاری کوٹھی کے کونے پر ایک پیڑ کی طرح کھڑا ہی رہا تھا... جس کی شاخوں میں بارات کے استقبال کی چاندنی اور بلب کی لڑیاں باندھی گئی تھیں! ادیب نے پیڑ کی طرح اداسی سے ہنستے ہوئے کہا تھا — مگر تب میں لاچار تھا... اور تب میں نے تمہیں تمہاری خوشیوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔

— ہاں ایسا نہیں ہے کہ سلمان نے مجھے خوشیاں نہیں دیں... لیکن کچھ ایسی باتیں بھی دیں

جن کے بارے میں سوچتی ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس آٹھ سال کی زندگی کے بارے میں کہاں تک سوچوں؟ ادیب، سچ کہوں... سلمان کا چہرہ میں اُن کی موت کے بعد بھی ڈھونڈتی رہی، لیکن کوئی ایک چہرہ بھی میرے سامنے نہیں آیا! ہر عورت کی شاید یہی کمزوری ہے کہ وہ ایک چہرے والے آدمی کو ڈھونڈتی ہے۔

— سلمیٰ! میرے بھی اگر زیادہ چہرے نہیں، تو بھی دو چہرے تو ہیں... ایک وہ، جو میری بیوی کے ساتھ جڑا ہے اور دوسرا وہ، جو تمہارے ساتھ جڑ گیا ہے! ادیب نے کہا۔

— اس کی اصلیت میں جانتی ہوں ادیب!

— کیا؟

— یہی کہ آپ مجھے چھوڑ سکتے ہیں، نہ اپنی بیوی کو!

— یہ تم کیسے جانتی ہو؟

— ایسے کہ میں آپ کو جانتی ہوں۔ آپ اپنی حسرتوں کی سزا کسی دوسرے کو نہیں دے سکتے۔ یہ میں بخوبی جانتی ہوں کہ آپ اپنی حسرتوں کے لیے جئیں گے، انہیں جلائیں گے، آپ اپنی حسرتوں کو ریگستان کے پار لے جائیں گے، اُن سے اوبیں گے، دکھ اٹھائیں گے، لیکن اُن کا دکھ کسی اور کو نہیں اٹھانے دیں گے! سلمیٰ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

— تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

— یہی کہ آپ اپنی بیوی شانتا کو میرے لیے چھوڑ سکتے ہیں، لیکن آپ انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے... کیونکہ آپ اپنی حسرتوں کی سزا خود کو دے سکتے ہیں، شانتا کو نہیں! اس لیے مجھے بھروسہ ہے کہ آپ مجھے بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر آپ شانتا کو چھوڑ سکتے تو مجھے بھی چھوڑ سکتے ہیں! سلمیٰ نے ادیب کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیے تھے...

— سلمیٰ، تم کیا ہو؟ عورت ہو یا فرشتہ!

— ادیب! سوچتی ہوں تو تھوڑی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ مجھے میرے مذہب کے نعیم کی طرح کے لوگ مذہب کے نام پر آپ کے ساتھ جینے نہیں دیں گے... آپ ایسا کریں...

— کیا؟

— کہ صرف جینے کے لیے میں ہندو بن جاؤں اور آپ مسلمان ہو جاؤ! کیونکہ مسلمانوں کی ذہنیت یہ تو قبول کر سکتی ہے کہ کوئی مسلمان مرد ہندو عورت کو بیاہ لے، لیکن کوئی ہندو مرد مسلمان عورت کو بستر تک لے جا سکے، یہ انہیں منظور نہیں... تو کیوں نہ ہم صرف اپنی زندگی جی سکنے کے لیے

اپنے مذہبوں کو بدل لیں تا کہ انہیں چین آ جائے، نہیں تو نعیم جیسے لوگ ہمیں جینے نہیں دیں گے!

۴۰

سلمیٰ اور ادیب نے مذہب تو نہیں بدلے لیکن انہیں اس بات میں مزہ ضرور آنے لگا۔ یہ اُن کے لیے جیسے ایک کھیل ہو گیا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے جگہ بدلی۔ وہ پورب کی طرف بھاگے۔ بھاگتے ہوئے بلیک ریور کے گھنے جنگلوں کو پار کرتے ہوئے جب وہ رکے تو، سامنے انہیں پھولوں سے لدا ایک راستہ ملا۔ تھوڑی آگے بڑھے تو ایک بوڑھے اتھاس پرش نے انہیں ٹوکا۔ کیوں بابا؟ بھاگ کہاں رہے ہو؟

ہم اپنی خوشیوں کے لیے حال سے بھاگ رہے ہیں! ادیب نے ہانپتے ہوئے کہا۔ سلمیٰ پسینے سے تر اس کے کندھے کا سہارا لیے اور بھی زیادہ ہانپ رہی تھی۔ اُس نے سانس لیتے ہوئے جیسے تیسے کہا— اصل میں ہم صدیوں سے اسی طرح بھاگ رہے ہیں... اے بابا آدم... ہمیں راحت سے جینے کا وقت کب ملے گا؟

اتھاس پرش ہنسا۔ اس کی ہنسی بلیک فاریسٹ کے قدیمی درختوں سے الجھتی، جھرنوں سے جھرتی، شمار یل کی ست رنگی دھرتی سے گزرتی، کیوپپ میں پل بھر کی راحت لے کر جوالا مکھی کے پرسکون دہانے میں گونجتی اور مسلسل پھیرے دار موڑ یا پہاڑ کے کالید اس سے ٹکراتی، وہیں لوٹ آئی اور رفتہ رفتہ شانت ہو گئی۔

ادیب اور سلمیٰ حیران سے اتھاس پرش کو دیکھ رہے تھے۔

— کہاں تک بھاگو گے تم دونوں؟ انسان ہمیشہ بھاگتا ہی رہا... لیکن مرد کبھی بھاگتا نہیں... میں نے یہاں بھی اُن بھارتی مزدوروں کو بلیک فاریسٹ میں بھاگتے دیکھا ہے، جو انگریز نو آبادیوں کے ظلم نہیں سہہ سکے۔ کچھ نے خودکشی کر لی، کچھ ہند مہا ساگر میں کود کر اپنے ملک کی طرف بھاگے اور سمندر کی گہرائی میں سما گئے۔ کچھ کو نو آبادیوں کے شکاری کتوں نے چیر ڈالا، کچھ یہاں کے آبنوس کے جنگلوں کو کاٹتے کاٹتے خود پیڑوں کی طرح کاٹ ڈالے گئے... تمہیں بتاؤ تبت کہاں بھاگ کر جائے گا؟ نائجیریا یا بولیویا کہاں بھاگے گا؟ میکسیکو بھاگ کر بھارت کا حصہ نہیں بن سکے گا۔ سلواڈور بھاگ کر ارجنٹین کے پیٹ میں نہیں سما سکے گا... تم کہاں تک بھاگو گے... بھاگنے سے دنیا نہیں بدلتی... دنیا کا سامنا کرو—

— ہم یہی کریں گے بابا آدم! سلمیٰ نے کہا اور وہ اتھاس پرش سے پھر ملنے کی التجا کرتے

ہوئے پھولوں والے راستے سے شرا ک ہوٹل میں داخل ہو گئے تھے۔ یہاں کی دنیا تو پانی کا پراسرار کل تھی۔ دنیا کے سارے موتیوں نے مل کر ماریشس کے ساحلوں کی تعمیر کی ہے اور کائنات میں آج تک انسان کے جتنے اجلے آنسو بہے ہیں وہ سب ماریشس کے سمندروں میں یکجا ہیں۔ اسی لیے وہ اتنے شفاف اور پاکیزہ ہیں۔ یہاں ہر درخت گاتا ہے، ہر پتی ہاتھ ہلا کر پاس آنے کی دعوت دیتی ہے۔ ہر چڑیا ایک درخت کا پیغام لے کر میلوں دور کھڑے درخت تک پہنچاتی ہے اور میگھوں کو مزیا پہاڑ کا کالیداس ہر لمحہ بلاتا رہتا ہے اور وہ قاصد یہاں وہاں چھائے رہتے ہیں... اور ہوا مسلسل ان میگھ دوتوں کو اپنی بانہوں میں بھر کر لاتی ہے اور پھر اڑا لے جاتی ہے۔

ابھی وہ کمرے میں نارمل ہو کر چائے پی ہی رہے تھے کہ اتہاس پرش اچانک داخل ہوا۔ وہ دونوں انھیں دیکھتے رہ گئے۔

— آپ چائے پئیں گے؟ یکبارگی ادیب نے پوچھا۔

— ہوٹلوں کی چائے میں رس کہاں ہے؟ مجھے میری دھرتی کے چائے کے باغ اپنا رس پلاتے رہتے ہیں... آپ دونوں چائے پیجیے لیکن میں نے آپ کی تنہائی میں دخل دینے کی جرأت اس لیے کی کہ میں نے آپ دونوں کو تذبذب میں پایا... ایسی صورت حال میں جو آپ کو فطری زندگی جینے سے روکتی ہے... وہ جو حیوانیت کی جسمانی زندگی نہیں ہے، بلکہ انسان کی تخلیقی احساسات سے بھرپور زندگی ہے۔

— ہاں، کچھ کچھ ایسا ہی ہے... ہم تھوڑے پریشان بھی ہیں اور اس دہشت سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

— دہشت سے نجات پانے کی اصل راہ ہے۔ ایک دوسرے میں اٹوٹ یقین... اور امکان کے تئیں آستھا... امکان کی قبولیت... جو طاقتیں ان سے انکار کرتی ہیں وہ امکان مخالف ہیں کیونکہ ہر شخص کے اندر امکان کی ایک نامعلوم روشنی جل رہی ہے... ایک ثابت سالم روشنی اور امکان ہی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ ہے جس کی ایجاد خود انسان نے زندگی کو تسلسل دینے کے لیے کی ہے!

— لیکن اس امکان کے ایجاد اور اس کی روشنی کو کوئی منظور نہیں کرتا! سلمیٰ نے کہا۔

— تم دونوں اس ایجاد کے اگلے تجربے کے سائنس داں ہو... تم خود وہ سالم روشنی ہو۔ تم دونوں اس جلتی روشنی کے سبب 'دن' ہو... تمہارے پاس جو اجالا ہے، وہ اسی کا ہے... یہ اجالا کبھی ختم نہیں ہوتا۔ دن کبھی رات نہیں بنتا۔ جب کیوپپ اور اس علاقے میں گھنگھور بادل چھا جاتے ہیں، اندھیرا چھانے لگتا ہے تب بھی یہ احساس بنا رہتا ہے کہ ابھی رات نہیں ہے، دن ہے! اسی

طرح تمہارے تعلقات گناہ کا احساس نہیں، ثواب کی علامت ہیں!

کہہ کر اتہاس پرش روپوش ہو گیا۔

بہت دیر رات تک ادیب اور سلمیٰ شرا ک ہوٹل کے مختلف حصوں میں گھومتے رہے... جہاں آنسوؤں کی طرح شفاف پانی آب زمزم کی طرح مسلسل بہہ رہا تھا۔ بہت دیر تک دونوں اس پاکیزہ پانی میں تیرتی مچھلیوں کو دیکھتے رہے۔ کبھی پانی کے نیچے لہلہاتی کورل کی نباتات کو دیکھتے اور کبھی مچھلیوں کی سانسوں سے اٹھتے بلبلوں کو... پھر وہ دونوں ایک کشتی لے کر سامنے کے ٹاپو والے راہ راحت میں چلے گئے اور جب مارٹنی کی مدہوشی میں لوٹے، تو سلمیٰ نے کہا—

— آپ اب مسلمان بن جائیے!

— بن گیا!

— اور میں ہندو بن جاتی ہوں!

— بن جاؤ!

اور ادیب مسلمان بن گیا، سلمیٰ ہندو!

— میں تمہارا ہاتھ پکڑوں؟ ادیب نے کہا۔

— پکڑیے!

— ہاں، تو اب کیسا لگا؟ ایک مسلمان کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے؟ ادیب نے پوچھا۔

— اس میں تو کوئی مذہب آڑے نہیں آیا۔ یہ تو اسی طرح مجھے کپکپاتا ہے، جب آپ ہندو تھے اور نہ میرا ہندو ہونا آڑے آتا ہے۔ میں بھی اسی طرح لاجونتی کی طرح آپ کے لمس سے اپنی پنکھڑیاں بند کر لیتی ہوں... سلمیٰ نے جواب دیا۔

— اور اب؟

— میرے ہونٹ اسی طرح بھیگتے ہیں اور تشنہ ہو جاتے ہیں جیسے پہلے تھے۔ یہ پیاس تو مذہب بدلنے سے بدلتی نہیں، بجھتی نہیں۔ سلمیٰ نے بھاری سانسوں کے ساتھ کہا۔

— شاید یہ غلط طریقہ ہے... آؤ، ہم دونوں مسلمان ہو جاتے ہیں، یا دونوں ہندو ہی ہو جاتے ہیں ادیب نے اُسے بانہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔

— اب! اب بھی آپ کی بانہوں میں وہی کشش اور طاقت ہے...

— اور اب...

— اب بھی آپ کی ہتھیلیاں اور انگلیاں وہی تلاش کر رہی ہیں جو ہمیشہ تلاش کرتی تھیں۔ اور

انہیں نخلستانی جھیلوں میں پناہ لے رہی ہیں جو طویل ریگستانی سفر کے بعد کبھی کبھی زندگی میں ملتی ہیں... آؤ ادیب... آؤ... اب یہ بھول کر کہ تم کون ہو سما جاؤ مجھ میں اور مجھے آزاد کرو... سلمیٰ نے اکساہٹ ہوتے ہوئے کہا اور وہ اپنی سانسوں سمیت ادیب میں سما گئی اور ادیب سلمیٰ میں۔ وہ دونوں سانسوں کے محل میں قید ہو گئے۔

جب ہوش آیا تو سلمیٰ ریگستان کی طرح اس کے سامنے تھی اور ادیب ابھی بھی اس کی ریشمی ریت پر بیٹھے کھجور کی طرح موجود تھا اور دونوں ہی ریت میں دھنس کر اپنی جڑوں کو رس دینے والی پاتال کی ندی میں ڈوبے رہنا چاہتے تھے۔

— آہ، ان چوٹیوں پر لکھے ہوئے نام تو مٹ جائیں گے!

— نہیں، نام تو ہمیشہ لکھے رہیں گے۔ اپنا نام لکھو ادیب!

میز کی اسٹیشنری کے ساتھ رکھے ہوئے قلم کو اٹھا کر تب ادیب نے اس کے اُبھرے اور گداز اٹھانوں پر نام لکھا تھا۔ ایک بار... پچاسوں بار...

— لکھتے جاؤ ادیب، لکھتے جاؤ...

— تکلیف تو نہیں ہوتی؟ آخر اِک کا یہ قلم بہت نوکیلا ہے... درد ہوتا ہوگا...

— ریت ہر درد کو برداشت کر لیتی ہے ادیب! اس بدن کے ہر حصے پر لکھو اپنا نام...

اور ادیب اُس ریشمی ریگستان کے ہر ایک اٹھان پر اپنا نام لکھتے لکھتے جب تھک گیا تو سلمیٰ نے اُسے اپنی بانہوں میں پھر گھیر لیا۔

— اب میں خود کو پورا محسوس کر رہا ہوں سلمیٰ!

— تو پھر میری بانہوں میں سما جاؤ ادیب...

— سلمیٰ! یہ میٹھی اور شیریں تھکان کتنا سکون دیتی ہے... اتنا سکون تو کسی مذہب میں نہیں ہے...

— آؤ ادیب... پھر اپنے سکون کے لیے ایک بار اور مذہب بدل کر دیکھیں! سلمیٰ نے اُس کی تھکی سانسوں کو پیتے ہوئے کہا۔

— سلمیٰ! کسی مذہب کے پاس اس قدر سکون، اتنا پتہ سکون نہیں ہے جو ہمیں آخرت کے دن تک سنبھال سکے... ہمیں تو وہیں تک جینا ہے! ادیب نے کہا۔

لیکن آپ تو فی الحال مسلمان ہیں۔ آپ مرنے کے بعد زندگی کو کیسے قبول کر سکتے ہیں، اس لیے آپ وہیں تک جینے کی بات کرتے ہیں!

— لیکن تم تو اب ہندو ہو، کیا تم تناسخ میں یقین کر سکتی ہو؟

— یقین کروں یا نہ کروں... لیکن تناسخ پر یقین کرنا اچھا لگتا ہے۔

— اوہ... اوہ سلمیٰ... تب تم کچھ اور ہو، مذہب سے اوپر... فانی انسان کی جاودانی میں یقین کرنے والی ایک فرد! ایک شرط!

— اس میں نیا کیا ہے ادیب... یہی تو ایرانی صوفیوں نے کہا ہے اور ہندوستانی ویدانت کے گیانیوں نے بھی...

تبھی کہیں پیچھے سے ایک تیکھی آواز ابھری—

— اے لڑکی! تو بہت سرکش ہوتی جا رہی ہے... لعنت ہے تجھ پر... تو جو زندگی جینا چاہتی ہے، دارا شکوہ والا جو فلسفہ اپنے لیے مہیا کر رہی ہے، وہ کفر ہے۔ آخر تو تجھے اس ہوٹل کے کمرے سے نکل کر آنا ہی ہوگا... تو اسی دنیا کی سڑکوں پر چلے گی اور تو سنگسار ہوگی۔ آخرت کے دن تو بھی مرد کا آدھا حصہ ہی ٹوٹ کر گرے گا لیکن تیری جیسی عورت کا تو پورا جسم خون اور پیپ سے لت پت زخموں کی شکل میں ٹوٹ ٹوٹ کر گرے گا...

وہ کرخت آواز بجلی کی طرح تڑک اور کڑک رہی تھی... اور اب وہ کوندتی ہوئی وہیں کمرے میں کھڑی ہوگئی تھی۔

— ادیب... یہ کون ہے؟ سہمی سلمیٰ نے اُس کے کندھے کے پیچھے چھپتے ہوئے پوچھا۔

— میں، میں جلاد ہوں! عالم گیر اورنگ زیب کا جلاد! میں کوتوال بھی ہوں اور جلاد بھی۔ وہی جلاد جس نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر صوفی سرمد کا سر دھڑ سے الگ کیا تھا... میں وہی ہوں جس نے شواجی کے بیٹے سمبھاجی کی زبان کاٹی تھی اور بھرے دربار میں اس کی دونوں آنکھیں نکالی تھیں... میں نے ہی کوٹ وجھورا کے کتابوں کے گودام کو تہس نہس کیا تھا، انہیں جلایا تھا... کتابوں کا ایک ایک ورق جلا کر راکھ کر دیا تھا!

— خاموش! یہ اُن سیاہ طاقتوں کا نمائندہ ہے جو امکان اور اُس کی تابناک تاریخ کو روکنا چاہتی ہیں... ایسے جلادوں نے ہی دنیا کو بدلنے سے روکا ہے۔ کوئی جلاد اپنے وقت کا نامہ نگار نہیں بن سکتا۔ پتہ ہے کوئی کتاب مرتی نہیں... وہ بھی صرف چولا بدلتی ہے۔ جن کتابوں کو تو نے پھاڑا اور جلایا تھا، اُن کے خیالات سفید کبوتروں کی شکل میں اڑ گئے تھے، تو انہیں نہیں دیکھ پایا تھا... یہ آواز اور کڑک دار تھی۔

اور سامنے اتہاس پرش پھر کھڑا تھا— کیوں تو ہندوستان کے شہنشاہ عالمگیر کو بدنام کر رہا ہے... حالانکہ اورنگ زیب نے بہت قہر ڈھائے، لیکن وہ پھر بھی شہنشاہ تھا۔ اُس نے دس غلط کام

کیے تو ایک آدھ اچھا کام بھی کیا ہوگا۔ اورنگ زیب اگر اکبر کے راستے پر چلا ہوتا تو آج ہندوستان کا
ہی نہیں، دنیا کا نقشہ دوسرا ہوتا اور اسلام عالمی مذہب کی ایک عالمگیر قوت کا قائد ہوتا، لیکن اورنگ
زیب یہ نہیں کر پایا... لیکن کچھ بھی سہی، عالم گیر کو تیرے جیسے گھٹیا حامیوں کی ضرورت نہیں ہے... تجھ
جیسے جلادوں کی وجہ سے ہی عالمگیر اور بدنام ہوا... دیکھ! دیکھ سکتا ہے تو دیکھ! اورنگ آباد میں اپنی قبر
میں اورنگ زیب کی آسمانی نیند تو نے توڑ دی ہے اور وہ قبر میں کروٹیں بدل رہا ہے۔ ارے سمبھا جی
کی بات تو تو نے یاد کی لیکن یہ تو کیوں بھول گیا کہ عالمگیر نے اسی سمبھا جی کے بیٹے ساہو جی کو پناہ
بھی دی تھی، جب وہ صرف سات سال کا تھا۔ اُسے ہفت ہزاری کا عہدہ دیا تھا اور راجہ کا خطاب!
اُسے پڑھانے کے لیے عالمگیر نے پنڈتوں کی تقرری کی تھی اور اس کی مناسب تربیت کے لیے ایک
دیوان اور ایک بخشی کو تعینات کیا تھا۔ اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں مدن سنگھ اور اودھو سنگھ کو ولی
عہد کا درجہ دیا تھا۔ اورنگ زیب نے سارے جنوبی ایشیا کی تاریخ بدلنے کی کوشش کی... اس کے لیے
وہ مذہب کا استعمال نہ کرتا تو بہتر ہوتا...

— نہیں، مذہب ہی تو ہم مسلمانوں کی جیت ہے۔ جلاد نے چیخ کر کہا— اورنگ زیب نے
ہمیں مسلمان ہو کر جینا سکھایا ہے... اس نے کہا 'السلام علیکم' کو 'نمسکار' یا 'رام رام' کی جگہ قبول کرو۔
اس نے شہنشاہوں کی 'درشن' روایت کو ختم کیا تاکہ وہ کافروں کو الگ کر سکے، کیونکہ 'درشن' روایت
اور کچھ نہیں بت پرستی تھی... وہ چاہے شہنشاہ کی ہی کیوں نہ ہو! ہم نے ہندو درشن رسم و رواج کو
بند کیا...

— اور؟

— اور، ہم نے اسلام کے تحت عالمگیر کے پردادا شہنشاہ اکبر اور اس کے بڑے بھائی
دارا شکوہ کی مخالفت کی، کیونکہ وہ قریب قریب کافر ہو گئے تھے!

— اس لیے کہ اکبر اور دارا شکوہ ہندوستان میں مروج مذہب اور روحانیت میں اسلام کی
روحانی سوچ اور رواجوں کو ڈھال دینا چاہتے تھے۔ یہ تہذیب و تمدن اشتراک کا ایک تاریخی موقع
تھا، لیکن اورنگ زیب نے اس موقع کو اپنے شہنشاہی انا اور بھائی بھتیجوں کے قتل کے الجھاؤ کے تحت
پامال کیا اور ایک اسلامی خطہ کا تصور دیا، جو انسانی محبت پر نہیں بلکہ نفرت پر ٹکا تھا۔ اس نے تبت
سے لے کر گولکنڈہ، بیجاپور، بنگال سے لے کر کابل، قندھار تک کے علاقے کو، اس کی مذہبی، ثقافتی
ضرورتوں اور خوبیوں کو نکار کر ایک اسلامی ریاست کا خواب دیکھا تھا۔ اسی لیے اورنگ زیب مغل
سلطنت کا آخری بادشاہ ہوا، جو بدلتی دنیا میں ایک ضدی مسلمان بادشاہ بن کر، مراٹھوں سے ہار کر،

آخر انگریزوں کو باگ ڈور سونپنے کا راستہ کھول کر چل بسا!

— یہ غلط ہے... انگریزوں کو باگ ڈور اس کی نکمی اولاد نے سونپا۔

— وہ ہندوستان کا پیسہ مکہ کے شریف کو ہر سال بھیجتا تھا۔ مکہ کے شریف کے لوگ ہندوستان
آتے اور یہاں سے پیسہ لے جاتے تھے۔ یہ وہی پیسہ تھا جو جزیہ کی شکل میں کافروں سے وصول کیا
جاتا تھا۔ وہ ہندوستان کو اپنا ملک مانتا ہی نہیں تھا، اسی لیے اس نے انگریزوں کو سورت اور بمبئی کے
درگاہوں پر تجارت کی کھلی چھوٹ دی تھی۔ اسی لیے انگریز مورخ لین پول نے اُسے بہت سمجھدار اور
انصاف پسند بادشاہ کہا تھا... اور یہ بھی کہا تھا کہ اُس کے نظام میں کافروں پر جو کچھ ظلم ہوتے بھی
تھے، وہ صرف اس لیے کہ وہ کٹر مسلمان تھا...

— اگر وہ ہندوستان کو اپنا ملک نہیں مانتے تھے تو وہ آج تک اورنگ آباد میں مدفون نہ پڑے
رہتے! جلاد نے کہا— کچھ بھی ہو ساری تاریخیں بتاتی ہیں کہ اورنگ زیب سے بڑا مسلمان بادشاہ
دنیا میں نہیں ہوا... کتابوں میں لکھا ہے کہ اس نے دین کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ کتابوں
میں یہ بھی لکھا ہے کہ عالمگیر نے تیموری خاندان کی عظمت میں چار چاند لگائے۔

— اسی تیمور کی عظمت میں جس نے اسلام کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا— آسمان کا خدا تو
نہیں دکھائی دیتا لیکن زمین کا خدا دکھائی بھی دیتا ہے اور سنائی بھی دیتا ہے... وہ ہے بادشاہ! اُسی
طرح جیسے آسمان میں ایک خدا ہے، اُسی طرح زمین پر بھی ایک ہی بادشاہ کا ہونا ضروری ہے۔ وہ
اسلام کو طاق پر رکھ کر خود کو خدا کا درجہ دیتا تھا۔ تم دارا شکوہ کی طرح ذہین نہیں، تم تیمور، ابدالی،
اورنگ زیب کی طرح جاہل اور ان پڑھ ہو اور ان پڑھوں جاہلوں کی روایت میں جلاد ہی پیدا ہو سکتے
ہیں!... خیر، اس بحث کو چھوڑو، اتنا بتاؤ کہ تم سلمٰی اور ادیب کو کچھ لمحے اور جینے کے لیے کچھ وقت
دو گے یا نہیں؟ اچانک پرش نے سوال کیا۔

— ہماری حدیث، ہماری شریعت...

— کتابوں کی بات مت کرو جلاد! اسلام کی کتابیں تم سے بہت بڑی ہیں، لیکن تم نے کتابوں
کو کتاب رہنے کہاں دیا ہے۔ تم کتاب کے نام پر خود کو نافذ کرتے ہو، نام کتاب کا لیتے ہو۔ تم کون
سی کتاب نافذ کرو گے؟ سب نے اپنا اپنا فقہ پیش کیا ہے، حنفی، مالکی، حنبلی اور شافعی مسلکوں نے...
اور ان چاروں مسلکوں کو بھی اہل حدیث مسلک قبول نہیں کرتا۔ یہ تو سنیوں کے آپسی جھگڑے ہیں۔
شیعہ تو ان سے الگ اپنی تشریح کو قبول کرتے ہیں تب تم ان افراد کو کس ڈنڈے سے ہانکو گے؟ خدا
کے لیے تم کتابوں کو اپنے ذاتی اصولوں اور تشریحات کا غلام مت بناؤ اور ان دونوں کو خدا کے رحم پر

جینے دو۔ خدا نے سب کو سکون سے جینے کا حق دیا ہے... انھیں زندگی جی لینے دو جلاد، انھیں کتابوں کی حدوں میں مت باندھو!

—یوں میرا بھروسہ بات چیت میں نہیں...

—اس لیے کہ تم جلاد ہو، جو کبھی خلفا، کبھی شہنشاہوں کا واسطہ دے کر دنیا کو ستاتے رہتے ہو اور یہ بھول جاتے ہو کہ حضرت محمدؐ نے جب عرب خانہ بدوش قبیلوں کے لیے قانون قائم کیے تھے، تب ساری دنیا ریگستان یا جنگل میں نہیں رہ رہی تھی۔ عراق، شام، مصر، ایران میں تب تک ترقی یافتہ ثقافتیں موجود تھیں اور ان کے تہذیب یافتہ لوگوں کو عرب قبیلوں کے لیے بنائے گئے قانون سے نہیں باندھا جا سکتا تھا۔ انھوں نے نبی کے ایک خدا کو قبول کیا تھا لیکن عربوں کے طور طریقوں کو اپنے لیے موزوں نہیں پایا تھا!

—مجھے بحث میں مت الجھاؤ... سوال تو اس عورت کا ہے! یہ عورت کھلی بے حیائی میں پڑ گئی ہے۔ اس نے اللہ کی طے کی ہوئی حدود کو لانگھا ہے... اس لیے...

ان دونوں کی بحث کے دوران سلمیٰ لگ بھگ بے ہوش سی ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ یہ سب کیا ہو گیا تھا؟ کیا مسلمان ہونا اور مسلمان رہ کر جینا اتنا مشکل بنا دیا گیا ہے۔ کیا مسلمان ہوتے ہوئے جینے کی شرطیں صرف کتابوں کی شرطیں ہیں؟ ان میں زندگی کے قدرتی اور بڑے اصولوں کے لیے کوئی جگہ نہیں؟

—جگہ ہے! اسلام میں ہر فطری ضرورت کے لیے جگہ ہے، لیکن جب مذہب کو سیاسی مفاد کے لیے نفرت میں بدلا جاتا ہے تو ایک نہیں بہت سے پاکستان پیدا ہوتے ہیں! میری بچی، تمہاری زندگی کو اس غلط تقسیم نے توڑ دیا ہے، کیونکہ ان لوگوں نے ایک مذہب کے تحت ایک قوم، ایک ملک اور ایک تہذیب کو تقسیم کیا ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے آ کر عبدالغفار خاں بولنے لگے، تو ناصرہ شرما بھی حاضر ہو گئیں—

—تہذیب کو کیسے تقسیم کیا جا سکتا ہے؟... یہاں افغانستان میں تو اپنا سکہ چلتا ہے— 'کلدار' اور میرے ہوائی ٹکٹ پر بنی ہے گوتم بدھ کی تصویر، جو شہر بامیان میں موجود ہے۔ افغانستان کی اس سرزمین پر برسوں ہندو اور بودھ مذہب کا اثر رہا ہے، یہ تہذیبی اور تاریخی رشتہ ہے جو سرحدوں کی تقسیم کے باوجود آج بھی زندہ ہے۔ دشمنوں سے کابل کی حفاظت کے لیے بودھ راجا کنشک نے ہی وہ دیواریں بنوائی تھیں جو اسے شاید آج بھی محفوظ رکھے ہوئے ہیں اور بودھ مذہب سے پہلے اسی سرزمین پر چاروں وید تخلیق کیے گئے... ان ویدوں میں افغانستان کے سارے پہاڑوں، وادیوں،

شہروں اور بادشاہوں کے نام موجود ہیں اور اسی سرزمین پر آگ کی پرستش کرنے والے زرتشتوں کی اسفور تخلیق ہوئی اور وحدانیت کی تعلیم کا آغاز ہوا... اس وقت تک آریہ اخلاقیات اور سچ کی کھوج کر چکے تھے، تب روم اور یونان کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، تب آریوں نے افغانستان میں آگ کی عبادت شروع کی تھی اور آگ کی روشنی کا وہ خدا 'اہرمن' تھا۔

—بیٹی! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تہذیب کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ خان عبدالغفار خاں نے ناصرہ کے کندھے کو تھپتھپاتے اور اسے راحت دیتے ہوئے کہا تھا— آؤ، ہم لوگ چلیں اور ان دونوں کو مقدس آگ میں جلنے دیں، تاکہ یہ اس میں تپ کر آنے والی دنیا کو کوئی نیا زاویہ دے سکیں۔

—اس کے لیے ہم سلمیٰ اور ادیب کو ان کی زندگی جینے کی مہلت دیں۔ انھیں کتابوں کے دقیانوسی فیصلوں میں نہ باندھیں۔ تاریخی فرد نے خان عبدالغفار خاں سے التجا کی اور وہ بات فوراً منظور ہوئی۔

—ہم اپنے مذہبی اور کتابی مسئلے باہر چل کر طے کریں گے... آؤ، سب میرے ساتھ آؤ اور تب عبدالغفار خاں، اورنگ زیب کا جلاد، ماریشس کا اتہاس پرش اور ہندوستان کی ناصرہ شرما... سب ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل گئے... اور تب ٹھراک ہوٹل کی وہ رات جنگل کی رات میں بدل گئی۔

—یہ جنگل تو اتنا گھنا ہے کہ ہوا بھی اس میں راستہ بھول سکتی ہے! سلمیٰ نے کہا تھا۔

—اس لیے آدمی نے اسے سانس بنا کر سینے میں قید کر رکھا ہے تاکہ آدمی اپنا راستہ نہ بھول جائے! ادیب بولا۔

سلمیٰ بری طرح سہمی ہوئی تھی... بڑی مشکل سے پھر بولی— میرے اندر کچھ مر گیا ہے ادیب! آدمیوں کا یہ جنگل مجھے ڈراتا ہے۔ لگتا ہے چاروں طرف قبرستان ہی قبرستان پھیلے ہیں... اور انھیں کے بیچ کھڑی میں پل پل مرتی جا رہی ہوں۔

—سلمیٰ! یہ جسم اور اس کے اندر موجود روح ایک مندر بھی ہے اور ایک شمشان بھی۔ ان دونوں میں دیے جلتے ہیں... اپنے دیے جلائے رکھو...

—کیسے جلائے رکھوں ادیب! اب یہ جلتے بھی ہیں تو بھی قبرستان کی مہک دیتے ہیں۔ ان میں جی نہیں۔ میرے جسم، میرے ذہن کا کوئی کٹا ہوا حصہ جلنے لگتا ہے۔

—اپنی خواہشوں کی مہک کو زندہ رکھو سلمیٰ۔ تمہاری خواہشوں کے دیوں سے ہی میرے دیے روشن ہو پائیں گے۔ نہیں تو یہ جسم تو بجھے ہوئے دیوں کا گھر ہے۔ سلمیٰ اور بے کیا؟ جن کے دیے جل

اٹھتے ہیں، وہ تیرتے ہوئے پار ہو جاتے ہیں۔ بجھے ہوئے دیے تو ندی کے پانی میں ڈوب جاتے ہیں... ادیب نے اُس کی اوس سے بھیگی گردن چوم لی تھی۔

— کچھ بھی کہو ادیب... مجھے لگتا ہے کہ میں ایک اندھیرے جنگل میں کھو گئی ہوں! سلمیٰ نے سہمی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

— حوصلہ رکھو سلمیٰ۔ آخر عمر کے اس دور میں ہم دکھوں کے راستے بنانے کے لیے تو نہیں ملے ہیں۔ ہمیں اس جنگل میں چھوٹے چھوٹے سکھوں کی پگڈنڈیاں بھی چلنے کے لیے ملتی رہیں تو سفر پورا ہو جائے گا۔

— مجھے تو اب شک ہوتا ہے ادیب کہ یہ پاؤں اب میرا ساتھ دے پائیں گے؟ ایسا لگتا ہے، یہ کسی گہری چوٹ سے ٹوٹ گئے ہیں...

— لیکن جنگل میں آدھی دور آ کر، یہاں اس جگہ تو زندگی کھڑی نہیں رہ سکتی... یہاں سے کسی طرف تو چلنا ہی ہوگا۔ بنے بنائے راستے واپس بھی لے جاتے ہیں، لیکن جو پاؤں خود پگڈنڈیاں بناتے ہیں، اُن پاؤں کے مسافر واپس نہیں آتے، وہ چلتے جاتے ہیں! ادیب نے گہری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

— ہاں، شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں... آپ کے پاس تو پھر بھی گھر تک واپس جانے کا راستہ ہے، میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہے۔ سوا میرے بیٹے سہراب کے، جو ہاسٹل میں ہوتے ہوئے بھی اب تک میری انگلی پکڑ کر ہی چلتا ہے... کہتے ہوئے سلمیٰ بری طرح رو پڑی تھی — ادیب! اس جنگل سے میں تو کہیں واپس بھی نہیں جا سکتی!

ادیب نے اُس کی آنکھوں سے جھڑتے ہرسنگار کے ایک ایک پھول کو بٹور لیا تھا۔

— سلمیٰ اب اپنے پاؤں سے بنائی پگڈنڈیاں ہی ہمیں اس جنگل کے پار لے جا سکتی ہیں... یا اس طرف، جس طرف ہمیں جانا ہے۔ اس اندھیرے جنگل میں بس، ہم ایک دوسرے کو آواز دیتے رہیں گے، تا کہ کوئی بھی کہیں زیادہ پیچھے نہ چھوٹ جائے اور اپنے کو اکیلا پا کر نا امید نہ ہو جائے۔ اس جنگل میں کھو نہ جائے۔

— جب جنگل پار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں ہے تو پھر ساتھ ہی نکل چلیں ادیب! سلمیٰ نے کہا اور اُسے ایک ٹک دیکھا تھا۔

— آمین!

— آمین!

اور ساری سمتیں گونج گئی تھیں — آمین...

— ادیب! اب یہ جنگل میرا ہے... اور اب تم بھی میرے ہو! اور تب سلمیٰ نے اُسے سمیٹ لیا تھا اور وہ دونوں بھیگتے جنگل میں کھو گئے تھے۔ اس کے بعد وہی، بھیگتی جنگلی ہوائیں، جنگل کو سمیٹتی باہیں... اور گری گری کے متلاطم ہند مہا ساگر میں ڈوبتا اور نہاتا پورا جنگل...

شعلہ تھا تو وہ دونوں بستر پر نہیں، تاریکی کی وسعت میں کہیں اسی کنارے کی ایک چٹان پر برہنہ پڑے تھے... اور بے چین ہند مہا ساگر کی لہریں پکار رہی تھیں — مما! مما!

سلمیٰ چونکی تھی — یہ تو سہراب کی آواز ہے...

چھٹیوں میں آیا ہوا سہراب اپنی ماں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اپنے کپڑوں کو لپیٹ کر گھبرائی ہوئی اور بے حد پریشان سلمیٰ تب تک پاگلوں کی طرح بھاگی تھی۔ گھبراہٹ میں اس نے بلاؤز الٹا پہن لیا تھا...

ادیب نے تب اُس اندھیرے میں اتنا ہی دیکھا تھا کہ اپنی ماں سے لپٹ کر سہراب رو رہا تھا اور سہراب سے لپٹ کر اس کی ماں رو رہی تھی۔

یہ رونا پھر کئی ہفتوں تک جاری رہا۔ یہ تبھی تھا جب سہراب ہاسٹل لوٹ گیا۔

تب سلمیٰ پھر ادیب سے ملی۔ دونوں اسی چاندنی والی ریت پر کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ آخر سامنے نیلے پانی پر ڈوبتے سورج کو دیکھتے ہوئے ادیب نے پوچھا — اب ہم باتیں کہاں سے شروع کریں؟

— وہیں، اُسی پہلے دن سے جب ہم لاہور ایئرپورٹ پر ملے تھے...

— اور پھر...

— ہر بار ہماری باتیں وہیں سے شروع ہوں گی اور گری گری کی اُسی چٹان پر ختم ہوں گی، جہاں مجھے پکارتا ہوا سہراب آیا تھا۔ سلمیٰ کی آنکھوں میں جگنو سے چمک رہے تھے — میرا سکھ اور میری تکمیل یہی ہے... یہ اگر آپ کو نہیں بتا پاؤں گی تو کسے بتاؤں گی... شاید اتنا حق تو مجھے ہے... کہ میں خود کے لیے خدا کے لیے اور سہراب کے لیے ایمانداری سے جیتی رہوں۔ گناہ وہاں ہے جہاں فریب یا بے ایمانی ہے۔ میں آپ کے ساتھ، سہراب کے لیے اور خدا کے سامنے ایک کھلی زندگی جینا چاہتی ہوں... میرا اللہ جانتا ہے... سب کچھ جانتا ہے کہ میں کیا چاہتی ہوں! کہتے ہوئے وہ اٹھی تھی اور کمرے کی طرف چل دی تھی۔ ادیب بھی اُس کے ساتھ ساتھ کمرے میں چلا آیا۔

بستر پر بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا — تم تو بہت گہری باتیں کر رہی ہو سلمیٰ!

گہری نہیں، ضروری... انگریزوں اور جناح صاحب نے سوچا ہی نہیں تھا کہ جب ہندوستان

نام کا ملک تقسیم ہوگا جب میری جیسی ایک سلمٰی کیسے تقسیم ہوگی اور وہ اپنی عزت و عافیت کہاں تلاش کرے گی۔

— سلمٰی! ادیب نے اُسے بہت پیار سے پکارا تھا۔

— ہاں، ادیب... میں تمہارے ساتھ سلمٰی اور سہراب کے ساتھ حنا بن کر جی سکوں گی۔ تمہارے پاس سے لوٹ کر جب میں اپنے گھر کی سیڑھیوں پر کھڑی ہوں گی تو تالا کھول کر تیر کی طرح اندر جاؤں گی، اپنے کپڑے بدلوں گی تاکہ اُن میں تمہاری مہک نہ رہے اور کپڑے بدل کر سہراب کی حنا بن جاؤں گی اور خود کو سمجھاؤں گی کہ یہی سچ ہے۔ لیکن میرا سچ ہند و پاک کی طرح منقسم ہی رہے گا۔ شاید یہی ہندوستانی مسلمان عورت کا نصیب بن گیا ہے... عورت یہاں کی ہو یا وہاں کی، وہ پہلے بھی آدھی سے کم تھی، اس تقسیم نے تو اُسے آدھے سے بھی آدھا بٹنے پر مجبور کر دیا ہے...

سلمٰی دکھ بھرے لہجے میں بول رہی تھی اور گلدان سے گرے پھولوں کی پتیوں کو چنتی جا رہی تھی۔

درمیان میں خاموشی آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

ادیب نے سائڈ کیبنٹ میں رکھی کتاب اٹھائی تھی... وہ اس کے صفحات یوں ہی پلٹ رہا تھا۔

— کون سی کتاب ہے؟ سلمٰی نے پوچھا۔

— ہوں!... کتاب دیکھ کر ادیب بولا — پاگل!

— خدا کے لیے ان کتابوں کو بند کر دیجئے!

تبھی فراق کے اس کمرے میں لہراتی اور تیرتی ہوئی ایک غزل آ گئی۔

— آپ انہیں نے پہچانا نہیں... سلمٰی نے بکھری ہوئی پنکھڑیوں کو مٹھی میں بند کرتے ہوئے کہا۔

— جی... میں ہندوستان کی تازہ غزل ہوں...

— آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟

— یہی... کہ جن سیاسی حالات میں آپ بٹ گئی ہیں، ان سے گھبرائیے مت۔ میرے ساتھ کتنا برا ہوا، یہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ فیض اُس طرف رہ گئے، فراق اس طرف اکیلے پڑ گئے۔ میری تو فضیحت ہوگئی، لیکن جیتا تو مجھے بھی تھا۔ میں نے غلط سرحدوں کو قبول نہیں کیا۔ میری زبان کی یک جہتی نے مجھے بچا لیا۔ اُدھر انتظار حسین جیسے کہانی کار نے، اِدھر صلاح الدین پرویز، جیسے شاعروں نے... آپ تقسیم کی شمشیر کو اپنے دل سے نکال دیجئے!

— وہی تو نہیں ہو پاتا... ہر پل، ہر قدم، ہر کروٹ، ہر سانس کا بٹوارہ شمشیر کرتی ہے...

— تو صرف ان سطروں کا سہارا لیجئے...

— کون سی سطریں...

— کہ دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو، زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو...

اور وہ سطریں گونجتی رہیں... سلمٰی اٹھی اور جا کر کھلے سمندر کی طرف والی کانچ کی دیوار کے پردے ہٹا کر ہند مہاساگر کو دیکھتی رہی۔ ادیب بھی اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا... وہ دونوں سمندر کو دیکھتے رہے کہ تبھی سمندر کے لہراتے سینے پر ایک سمندری بیڑا دھیرے دھیرے ابھرتا دکھائی دیا۔ پھر ایک اور بیڑا، ابھرا، پھر ایک اور...

— یہ کیا ہے ادیب؟ سلمٰی نے پوچھا۔

— یہ شاید سمندری ڈاکوؤں کے بیڑے ہیں!

— یہ کہاں جا رہے ہیں؟

— مشرق کی طرف!

۳۱

ہند مہاساگر کو چیرتے وہ بیڑے مسلسل، پورب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ماریشس تب ایک کنوارہ ٹاپو تھا۔ وہاں لنگر ڈالنے کی سہولتیں نہیں تھیں۔ پرتگالی بیڑے شمال مشرق کی طرف نکلنا چاہتے تھے۔ جنوبی افریقہ میں واسکوڈی گاما کو ایک ہندوستانی مچھوارہ مل گیا تھا، وہ اس کی رہنمائی میں ہندوستان کی طرف بڑھ چلا تھا۔ ڈچ بیڑوں نے پہلی بار ماریشس کے کنارے لنگر ڈالے تھے۔

فرانسیسی اور انگلستانی بیڑے ماریشس کے پیچھے سے ہوتے ہوئے ہندوستان کے کناروں پر پہنچنے کی جلدی میں تھے۔ یہ بھی بیڑے دھن دولت کی تلاش میں نکلے تھے۔ یہ نئی دنیا کی تلاش کرنے والے ماہر فلکیات کے بیڑے نہیں تھے۔ یہ نیم بیوپاری، نیم محقق اور نیم لٹیروں کے بیڑے تھے، جو ایک دوسرے کے مفاد سے ٹکراتے اپنے اپنے مستقبل اور دھن دولت کی تلاش میں تھے۔ کولمبس بھی بھارت کی تلاش میں نکلا تھا، لیکن وہ امریکہ کے کنارے پر جا لگا تھا۔ اگر یہ ماہر فلکیات کے بیڑے ہوتے تو نئی دنیا کی تلاش میں یہ ایک دوسرے کے معاون ہوتے، لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ سب ایک دوسرے کے مخالف تھے اور ان میں آپس میں سمندری اور زمینی جنگ بھی مسلسل ہوتی رہتی تھی۔

اتہاس پرش بتا رہا تھا۔

یہ آنکھ کھولتی سترہویں صدی کا وہ دور تھا، جب بھارت اور چین کے علاقے میں پوری زمین کا تین چوتھائی صنعتی پیداوار ہوتا تھا۔ ہندوستان صرف زرعی ملک نہیں تھا، اس کے مسالے، کپڑے،

کلاری، چمڑا وغیرہ کی خصوصیات اور اوصاف عالمی شہرت کی تھیں تب یوروپی ترقی پذیر تھے۔ اُن کے سوداگر بھارت اور چین تک پہنچنے کے مقام اور پانی کے راستے تلاش کر رہے تھے۔

ایسے ہی دور میں انگریز بیوپاری تھامس را شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ جہانگیر، نور جہاں اور محل کے سپاہی اور خواص موجود تھے، قلعے سے کچھ ہی دوری پر توران کے خلیفہ کے وہ سات نمائندے بھی موجود تھے جو کئی دنوں سے شہنشاہ کے حضور میں باریابی کے منتظر تھے۔ دوسری طرف نمائندہ بیوپاریوں کا ایک وفد دوسرے ممالک سے ہوئی تجارت کا حساب کتاب دینے کے لیے حاضر تھا۔ تیسری طرف سلطنت کے وہ اعلیٰ افسران موجود تھے، جو تجارتی راستوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ سڑکوں کو صاف ستھرا رکھنا، سراؤں کی مرمت اور نئی پناہ گاہوں کی تعمیر بھی انہیں افسروں کی ذمہ داری تھی۔ منشیوں کی ایک جماعت انہیں کے ساتھ رہتی تھی جو آنے والے کارواں کی گنتی رکھتی تھی اور معمولی سا محصول وصول کرتی تھی۔ یہ محصول کارواں میں موجود اونٹ، اونٹ گاڑیوں اور خچروں کی تعداد کے مطابق طے ہوتا تھا۔ دور دراز کے ممالک سے آئے ہوئے بیوپاریوں کے اونٹوں خچروں کے ستانے کے لیے سایہ دار درختوں کے نخلستان جگہ جگہ موجود تھے۔ پانی کے جوہڑوں کی کمی نہیں تھی۔

ایک خاص فوجی دستہ ان غیر ملکی بیوپاریوں کو ریشم سڑک کی سرحد تک بحفاظت پہنچانے کے لیے ہمیشہ تعینات رہتا تھا۔ اسی لیے غیر ممالک سے آئے ہوئے بیوپاری خود کو اور اپنے مال و اسباب کو محفوظ پاتے تھے۔ اُن کے اپنے حفاظتی دستے بھی ہوتے تھے، جنہیں سرحد پر ہی رکنا پڑتا تھا۔ ہندوستانی حفاظتی دستے بیوپاریوں کو سرحد کے ٹھکانوں تک پہنچا کر، اُن کے حفاظتی دستوں کے سپرد کرتے تھے۔ تجارت کے اس چوطرفہ نظام اور حسن تنظیم کی ساری تفصیل ہر سال شہنشاہ کے سامنے پیش کی جاتی تھی۔

—ریشم سڑک کا داروغہ بھی بادشاہ سلامت کے سامنے پیش ہونے کے انتظار میں تھا۔ اجباس پرش نے بتایا۔

—شہزادی کی بیماری کی وجہ سے شہنشاہ عالم ملنے والوں کو وقت نہیں دے پا رہے تھے، لیکن آج امید بندھی تھی۔ شہزادی صحت یاب ہوئی تھی۔

تبھی قلعہ کے گنبد سے جہانگیر نے طلوع ہوتے سورج کو دیکھ کر عبادت میں سر جھکایا۔ نیچے کھڑی رعایا کی بھیڑ شہنشاہ سلامت زندہ باد، کے نعرے لگانے لگی... پیچھے کہیں کسی مندر سے سورج کی عبادت کی آواز گونج اٹھی۔

تب جہانگیر نے نور جہاں سے کہا—

— کتنا خوبصورت منظر ہے... ہمارے والد شہنشاہ اکبر اس جھروکے میں کھڑے ہو کر طلوع ہوتے سورج کی ہمیشہ عبادت کیا کرتے تھے... انہیں یہ رسم ہماری والدہ جودھابائی سے پائی تھی۔

—طلوع ہوتے سورج کو سلام کرنا اور ڈوبتے سورج کو نماز کے ساتھ وداع کرنا... یہ تو ہماری ہندوستانی روایت کا خاص حصہ ہے... نور جہاں نے کہا

ان باتوں کی بھنک سے طورانی خلیفہ کے نمائندوں کی جبینیں شکن آلود ہو گئیں۔ ایک نے آہستہ سے کہا—

—سنی یہ باتیں... اسلام پرست ہوتے ہوئے ان ہندوستانی بادشاہوں کا ذہنی نقشہ بدل رہا ہے...

—ہاں بیگم، یہی بنتے ہوئے ہندوستان کی نئی تہذیب کا نقشہ ہے۔ یہاں قدیمی فطرت کی طرح قدیمی ریت رواج اور مذہب موجود ہیں... یہاں کے مذہب قدرت کی اس کوکھ سے نکلے ہیں جو ہمیں موسم دیتی ہے، موسم کے ساتھ ساتھ اناج دیتی ہے۔ یہاں کے مذہب ہمیں قدرت کے ساتھ ساتھ یکساں رکھتے ہیں۔

تبھی نور جہاں نے نیچے موجود رعایا کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی۔

—اُدھر دیکھیے حضور! اتنے دنوں بعد آپ باہر نکلے ہیں۔ آپ کی رعایا آپ کی دیدار کے لیے امڈ پڑی ہے... تبھی بھیڑ کی پرجوش آوازیں آنے لگیں—

—بادشاہ سلامت، زندہ آباد!

—شہزادی کی صحت یابی مبارک ہو! مبارک ہو!

—عدل جہانگیری سلامت رہے! سلامت رہے!

—ہمارے سر پہ بادشاہ کا سایہ رہے!

— تبھی ایک درباری نے آکر درخواست کی—

— حضور عالی! طورانی خلیفہ کے نمائندے، سوداگروں کا ایک خاص وفد، ریشم سڑک کے داروغہ کے علاوہ دیگر حاکم، خاص طور سے انگلستان کے دو بیوپاری تھامس را اور ولیم فنچ آپ کے دیدار کے لیے دربار میں تشریف فرما ہیں۔

—تھامس را، جن کی دوا سے ہماری بیٹی نے شفا پائی ہے... شہزادی موت کے منہ سے بچ

کے نکل آئی ہیں۔ ہم اُن کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیں گے... انہیں ہمارے حضور میں پیش کیا جائے! شہنشاہ جہانگیر نے حکم دیا۔

اور کچھ ہی پلوں میں کورنش بجالاتے ہوئے تھامس رااور ولیم فنچ حاضر ہوئے۔ تھامس رانے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کہا—

شرف باریابی کی اجازت کے لیے تھامس را آپ کا شکر گزار ہے جہاں پناہ!

— شکر گزار تو ہم ہیں تھامس را! آپ نے ہماری بیٹی کو نئی زندگی دی ہے۔ یہ جان کر ہم اور بھی خوش ہیں کہ آپ ہمارے لیے اپنے ملک سے فن مصوری کے نادر نمونے... دلکش تصویریں بھی لائے ہیں...

— شہنشاہ ہند کی خوشی ہمارے لیے بیش قیمتی سرمایہ ہے جہاں پناہ!

— لیکن تھامس را، ہم یہ نہیں جان پائے کہ حقیقت میں تھامس را کون ہے؟ وہ ایک حکیم ہے یا ایک فنکار؟

تھامس رانے ادب سے شہنشاہ کو دیکھا، تو شہنشاہ نے آگے دریافت کیا— اور یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ تھامس را اپنے ملک سے اتنی دور کیوں آیا ہے؟

تو تھامس رانے عرض کیا— ناچیز ایک سوداگر ہے حضور... تجارت کی غرض سے آیا ہوں... انگلینڈ کے باشندے آپ کی رعایا کے ساتھ کاروبار کرنا چاہتے ہیں عالم پناہ!

— ضرور کریں! ہندوستان کے تاجر اور مہاجن ہر قسم کی تجارت کے قائل ہیں۔

— حضور عالی! بندہ اس مسئلے پر تفصیل سے بات چیت کرنا چاہتا ہے۔

— ضرور... ضرور... اس پر ہماری ملکہ غور کریں گی۔ ہمارے مسئلے کچھ اور ہی ہیں! کہتے ہوئے شہنشاہ دربار کی جانب مڑے اور درباریوں کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ تب ملکہ نور جہاں نے اُس سے کہا— شہنشاہ حضور اور ہم، آپ کے مشکور ہیں... بتائیے آپ کیا چاہتے ہیں؟

— ملکہ عالیہ! ہم کچھ انگریز تاجروں نے عیسوی ۱۶۰۰ء میں ایک تجارتی کمپنی قائم کی ہے... اُسی کے لیے ہم... کہتے کہتے تھامس را تھوڑا سا رکا۔

— رُک کیوں گئے؟ بلا خطر بیان کرو۔

— ملکہ حضور! ہم اپنی اسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے سورت کے بندرگاہ پر ایک فیکٹری قائم کرنا چاہتے ہیں!

— فیکٹری... ہم سمجھے نہیں...

— فیکٹری... مطلب ایک دوکان... ایک گودام، جہاں ہم تجارت کا سامان رکھ سکیں!

— او، صرف اتنی سی ضرورت... ہم آپ کی درخواست بخوبی منظور کرتے ہیں! ملکہ نور جہاں نے کہا تو وزیر تجارت نے ملکہ کو آگاہ کیا— ملکہ حضور دیکھیے— کیونکہ پرتگال کے گورے تاجروں کے بیڑے بھی ہماری اجازت سے سورت کے بندرگاہ پر لنگر ڈالے رہتے ہیں... اس پر غور فرمائیے!

تو تھامس رانے بیچ میں ہی دخل دیا— ملکہ حضور! ہمیں اُن پرتگالیوں سے کچھ لینا دینا نہیں... ہم تو آپ کی قدم بوسی کرتے ہوئے سورت اور مچھلی پٹنم جیسے بندرگاہوں کے راستے تجارت کرکے کچھ کھا کما لیں گے...

— بصد شوق ہم آپ کو تجارت کی اجازت دیتے ہیں!

— اور اُدھر طورانی خلیفہ کے ساتوں نمائندے بادشاہ سلامت جہانگیر سے ملنے کے بعد سلطنت کے بڑے اور اہم امراء و حاکموں سے مل کر رازدارانہ صلاح مشورے کر رہے تھے، اُن میں سے ایک کہہ رہا تھا— اسلام پرستی کو ہندوستان پرستی میں بدل دیا جائے، یہ مناسب نہیں ہے... یہی آپ کے بادشاہ اکبر نے کیا تھا اور یہی اب آپ کے شہنشاہ جہانگیر کر رہے ہیں... ان حالات پر آپ لوگ نظر رکھئے... وطن پرستی سے زیادہ ضروری ہے مذہب پرستی!

یہ جملہ سن کر وقت نے صدمے سے گہری سانس لی... یکا یک درختوں کے پتے جھلس گئے۔ آگ تو کہیں نہیں تھی، لیکن تازہ ہرے پتے جھلتے جا رہے تھے اور پرندے پریشان تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ قدرت نے ایسی سانس کیوں لی ہے، اس سے اُن کے گھونسلے بھی جھلنے لگے... گھونسلوں کے بچے چیخنے لگے... جو پرواز کر سکتے تھے، اُن بچوں کو لے کر اُن کی مائیں اُڑ کر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ لیکن جو نہیں اُڑ سکے اور جو ابھی تک انڈوں کے اپنے خول میں قید تھے، وہ وہیں گھونسلوں میں جھلس کر رہ گئے۔ موت سے بچتے پرندوں کا شور پوری فضا میں بھر گیا اور دھرتی اُن کے شکستہ اور مرجھائے پنکھوں کے پرت سے ڈھک گئی۔

پھر موسم بدلے۔ سورج نکلا۔ چاند چمکا۔ کھیتوں میں دھان اُگا۔ تیج تیوہار آئے۔ دھرتی نے گیت گائے۔ پرندوں نے گھونسلے بنائے۔ اساڑھ کی بارش میں سب مل کر نہائے۔

لیکن نہ معلوم ایک صدی بعد وقت نے پھر صدمے سے بھری گہری سانس لی اور پھر درختوں کے پتے جھلنے لگے۔

تب پتہ نہیں کہاں سے احساس پرش کی آواز آئی— پرندو! اطمینان رکھو... ہمیں معلوم ہے،

کب کہاں کیا ہوا ہے... گھبراؤ مت! کوئی بھی خیال جو انسان پرست نہیں ہے، مذہب پرستی کے نام پر خیال کو جھلسا کر اپنی گرفت میں لے سکتا ہے، لیکن اُسے جلا کر راکھ نہیں کر سکتا... اگر ایسا ممکن ہوتا تو دنیا میں سنت سادھو، صوفی، کبیر اور نانک نہ پیدا ہوتے...

پرندوں نے اجتاس پرش کو امید سے دیکھا۔ آواز پھر آنے لگی۔

—ہندستانی اسلام بھی یہاں کی دقیانوسی برہمنیت کا شکار رہا ہے! اسلام کی روحانیت سے جو آزاد خیال صوفی پیدا ہوا تھا اُسے اسلام کے ان کٹر برہموں نے حقارت سے نامنظور کیا تھا۔ خود انھوں نے ہندستانی اسلام کو ہندو طبقاتی نظام کے سانچے میں ڈھال لیا۔ تبھی تو کیا وجہ تھی کہ جو بھی ہندستانی کلمہ پڑھ کر مسلمان بنا، مغلیہ سلطنت میں وہ خادم اور چوبدار کے عہدے سے اوپر نہیں جا سکا... یہی تھی مغلوں کی ذات پرستی... اسی ذات پرستی کی وجہ سے صدیوں پہلے ہندو ہارا تھا اور اسی کے چلتے ملکی مسلمان کی مدد سے مغل محروم رہے تھے۔ جیسے ہندو چھتری کا ساتھ ہندو دلت نے نہیں دیا تھا، ویسے ہی مغل چھتری کا ساتھ ملک کے مسلم دلت نے نہیں دیا تھا۔ اسی اسلامی برہمنیت نے اکبر کی کوششوں کو ناکام کیا تھا... اسی نے جہانگیر کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ شاہجہاں پوری طرح اس کا شکار ہوا تھا اور تب اسلام کے نام پر اورنگ زیب مسلم برہمن بن کر، انسان پرستی کو چھوڑ کر مذہب پرستی کی راہ پر چل پڑا تھا۔

—یہ سراسر غلط ہے! ایک دوسری آواز نے اجتاس پرش کی باتوں میں مداخلت کی۔

غلط اور صحیح کی یہ بحث ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک کشتی جو شاید اپنے بیڑے سے بچھڑ گئی تھی، ٹھیک اس ہوٹل کی جیٹی سے آ کر لگی۔ ادیب اور سلمیٰ نے اس کشتی کے ملاح کو دیکھا اور کچھ کچھ پہچانا۔ شکل تو پہچانی جاتی تھی، لیکن وہ ملاح جس حال میں تھا، اس میں اُسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ تبھی سلمیٰ نے آہستہ سے کہا۔

—مجھے لگتا ہے، یہ تو آپ کے اردلی صاحب ہیں!

—ہاں، یہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟

—مجھے پہنچنا ہی تھا حضور... ایک بار جب آپ نے تہذیب کے جسم پر لگے زخموں کو جاننے کی ذمہ داری اٹھائی ہے، تب آپ اپنی ذاتی زندگی جینے کے لیے آزاد نہیں ہیں!

—تو ان چند لمحوں میں ایسا کیا ہو گیا کہ تم میری تلاش میں نکل پڑے ہو؟

—چند لمحے! حضور، دنیا کی سانسوں پر ایک ایک لمحہ اتنا بھاری پڑ رہا ہے کہ بیان سے باہر

ہے... افغانستان قبرستان بن گیا ہے۔ اُدھر لبنان سے پاکستان کا مرتضیٰ بھٹو خود اپنے ملک کو خون سے نہلا دینے کی دھمکی دے رہا ہے۔ وہ اپنے والد کی سیاسی وراثت میں اپنی بہن بے نظیر سے تقسیم کی مانگ کر رہا ہے۔ اُدھر عراق میں کرد اپنا پاکستان بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ گوری طاقتوں نے کویت کو عراق سے آزاد کرا دیا ہے۔ صدام حسین نے کردوں کے ٹھکانوں پر ہوائی حملے کیے ہیں... اور آپ پوچھ رہے ہیں کہ ایسا کیا ہو گزرا ہے؟ افغانستان میں لاشیں ہی لاشیں بچھی ہوئی ہیں۔ جب سے آپ اس آرام گاہ میں چھپے ہوئے ہیں تب سے دنیا میں تباہی مچی ہوئی ہے اور عدالت کے انتظار میں مردے دم توڑ رہے ہیں! اردلی نے کہا۔

اردلی کی بات سن کر سلمیٰ نے خود کو قریب قریب گنہگار پایا۔ اس نے ادیب کو دیکھا تو اُسے پچھتاوے کے اس احساس سے نکالنے کے لیے ادیب نے کہا۔

—ہم صرف آرام گاہ میں نہیں تھے... ہم نے یہیں سے پرتگالیوں، انگریزوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کے گزرتے بیڑوں کی شناخت کی ہے... وہ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے کچھ دیر پہلے یہاں سے گزرے ہیں...

—جی، وہ تو ٹھیک ہے... اُن کے بیڑے اپنے اپنے راستوں سے پورب کی طرف بڑھ گئے ہیں... یہ خبر بھی میں آپ کو صدیوں پہلے دینا چاہتا تھا... اُن بیڑوں نے کون سی تاریخ لکھی ہے، یہ مشرق جانتا ہے۔ تاریخ کی وہ عبارت بھی پڑھے جانے کا انتظار کر رہی ہے... فی الحال اگر آپ دم توڑتے مردوں سے مل سکیں... تو... کہتا کہتا اردلی رک گیا۔

سلمیٰ نے اُس کی گہری خاموشی میں کچھ پڑھا اور تبھی ادیب کو اپنے کندھے کے پاس ایک سسکتی سی آواز سنائی دی۔

—خدا حافظ!

ادیب چونکا— کیا مطلب؟

—یہی کہ اب میں چلتی ہوں۔ آپ جب بھی مجھے آواز دیں گے، میں لوٹ آؤں گی۔

—لیکن کیوں؟ تم جا کیوں رہی ہو؟

—مجھے جانا ہی چاہیے، نہیں تو وقت آپ کو معاف نہیں کرے گا اور پھر آپ کو بھی وقت کی بربادی کا ملال رہے گا!

—سلمیٰ!

—دیکھیے، آپ کے اردلی صاحب بے صبری سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چلنے سے پہلے

ایک درخواست ہے... دنیا سے ملنے کے پہلے آپ پاکستان کی سارا شگفتہ سے ضرور مل لیجیے... خود کشی کرنے کے بعد وہ بھٹک رہی ہیں...

—سارا شگفتہ...

—ہاں، تو میں اب چلتی ہوں... خدا حافظ...

—خدا حافظ! ادیب نے گہری اداس سانس لے کر کہا۔

اردلی نے راحت کی سانس لی۔

ادیب سوچنے لگا— سارا شگفتہ سے یوں تو اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی ہے، لیکن اپنی برادری کی جتنی شکلیں اس کے سامنے آتی تھیں، ان میں سے اُسے یہ احساس تھا کہ سارا شگفتہ ایک بے پناہ خوبصورت عورت اور نہایت بیباک شاعرہ ہے، جس کی ایک آنکھ سے آنسو اور دوسری آنکھ سے انگارے برستے ہیں... اس نے اپنے خوبصورت خوابوں اور خواہشوں کی قیمت خود اپنی خودکشی سے ادا کی ہے!

—سارا شگفتہ اس وقت کہاں ہے؟ ادیب نے اردلی سے پوچھا۔

—وہ اس وقت دلی، حوض خاص میں امرتا پریتم کے گھر موجود ہیں...

—امرتا جی کے یہاں!

—جی ہاں... وہ اور کہاں ہو سکتی ہیں؟ پورے ایشیا میں آنسوؤں اور الفاظ کا ایک ہی تو مکتب ہے— امرتا پریتم کا گھر!

ہوٹل ٹریفک سے انہیں حوض خاص پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ ادیب نے بڑھ کر سارا شگفتہ کا استقبال کیا۔

—اے ایشیا کی اعلیٰ ترین شاعرہ اور محترمہ! آپ پاکستان سے کب آئیں؟

—میں سارا شگفتہ نہیں، امرتا پریتم ہوں! سامنے موجود خاتون نے جواب دیا— وہ اُدھر والے کمرے میں اپنے آنسوؤں کی گنتی کر رہی ہیں... میں بلاتی ہوں۔

تب تک ایک اور خاتون وہاں آئیں تو انہیں دیکھ کر ادیب چونک اٹھا— ارے سلمیٰ، ابھی ابھی تم وہاں... اور اب... یہاں؟

—ادیب، میں سلمیٰ نہیں سارا شگفتہ ہوں!

ادیب الجھن سے دونوں کو دیکھنے لگا تو امرتا پریتم نے اس کی مشکل حل کر دی— ادیب... ماں بننے کے بعد ہر عورت کی شکل ایک ہو جاتی ہے... عورت اور عورت کی شکل میں فرق نہیں رہ جاتا...

بیٹھو، میں تم لوگوں کے لیے لیموں کی چائے بھجواتی ہوں...

ادیب نے بیٹھتے ہوئے کہا— سارا شگفتہ... ہم ادیبوں کی برادری آپ کو سلام کرتی ہے... ہم نے آپ کا شعری مجموعہ 'آنکھ' پڑھا ہے، اس میں آپ نے جو آخری خط جوڑا ہے، وہ حرفِ آخر ہے...

— نہیں، جس دن شاعری کا آخری حرف لکھ دیا جائے گا، اس دن کے بعد آنکھوں میں پانی نہیں رہ جائے گا۔ انسان بنجر ہو جائے گا... میں نے جو آخری خط جوڑا ہے، وہ ایک ماں کے آنسوؤں کا مرثیہ ہے! سارا شگفتہ نے خودکشی کی آخری سانس کے بعد کی سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

تب تک لیموں کی چائے آ گئی تھی۔

— ادیب! یہ تب کی بات ہے جب میری کوکھ میں کوئی سانس لینے کی بات کر رہا تھا۔ زندگی اپنا وجود مانگ رہی تھی۔ میں اُسے جنم دینے کے لیے درد سے کراہ رہی تھی۔ تبھی مکان مالکن نے میری تکلیف زدہ آواز سنی تھی اور وہ مجھے ایک اسپتال میں داخل کرا کر، ہاتھوں میں پانچ روپے کا ایک نوٹ تھما کے لوٹ گئی تھی۔ وہیں میری کوکھ نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ رات بہت سرد تھی۔ میرے بیٹے کو لپیٹنے کے لیے اسپتال میں ایک تولیا بھی نہیں تھا۔ نرس نے پانچ منٹ کے لیے اسے میری بغل میں لٹایا تھا۔ اس نے اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھا... پھر نہ جانے کیا ہوا... اس نے کیا سوچا... اس نے آنکھیں بند کیں اور ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

ادیب نے اداسی اور پریشانی سے سارا شگفتہ کو دیکھا۔

— ادیب تب سے میرے بدن میں اس کی دو نہیں، سیکڑوں لاکھوں آنکھیں، مسلسل اُگتی ہیں، جھپکتی ہیں، مجھے دیکھتی ہیں اور اپنے لیے کفن مانگتی ہوئی بجھ جاتی ہیں۔ شاید وہ زندگی کو کچھ ہی پلوں میں جان گیا تھا کہ یہ دنیا اس کے جینے لائق جگہ نہیں رہ گئی ہے۔ اس نے جینا مناسب نہیں سمجھا...

ادیب نے سارا کو پھر دیکھا۔

—میرے پاس صرف پانچ روپے تھے۔ میں نے اسپتال سے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ اجازت مجھے نہیں ملی۔ ایک تو اس لیے کہ ابھی میں گھر جانے لائق نہیں تھی اور دوسرے اس لیے کہ میرے بیٹے کی لاش وہیں پڑی تھی۔

—تب؟ سارا شگفتہ تب؟

—تب مجھے اسپتال کا خرچ چکانا تھا اور بیٹے کی لاش کو دفن کرنے کا انتظام کرنا تھا۔

—تب؟

— اُس وقت مجھے ایک سو تین ڈگری بخار تھا۔ اسپتال والوں کو اپنے پیسے چاہیے تھے۔ تب میں نے کہا تھا — میرے بیٹے کی لاش رہن رکھ لیجیے۔ میں پیسے چکا کر اسے لے جاؤں گی... ایک شخص نے تب مجھے شک کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ میں نے کہا تھا، میں بھاگوں گی نہیں، لوٹ کر آؤں گی... اور ادیب، تعجب یہ تھا کہ دنیا والوں میں ابھی تک یہ یقین موجود تھا کہ اور کوئی لوٹے یا نہ لوٹے، ماں اپنے زندہ یا مردہ بچے کے لیے ضرور لوٹ کر آتی ہے۔ میں جب چلی تو میری چھاتیاں دودھ کی نکاسی کے لیے مچل رہی تھیں۔ گھر پہنچ کر میں نے اپنی چھاتیوں کا دودھ نچوڑ کر ایک گلاس میں نکالا اور وہ گلاس ابھی رکھا ہی تھا کہ تمام شاعر اور ادیب ماتم پرسی کے لیے آ گئے۔ کچھ دیر وہ سب خاموشی سے دودھ بھرا گلاس دیکھتے رہے، پھر اپنی ہمیشہ کی بحثوں میں الجھ گئے، وہی فرائڈ، رمبو، لاکاں، سعدی، کامیو، کافکا، علامہ اقبال... وہ میرے بیٹے کی لاش کو بھول چکے تھے...

— پھر سارا؟

— پھر کیا، میں اس کی رہن رکھی لاش کو لے آئی...

— پھر؟

— دیکھیے تو حضور... بیٹے کی لاش تو سارا شگفتہ کی گود میں موجود ہے! یہ آواز اردلی کی تھی۔

تبھی لاشوں کے بازار کھلتے چلے گئے۔ صومالیہ میں شانتی قائم کرنے گئے پاکستانی فوجیوں کی لاشوں کا انبار لگا تھا۔ بوسنیا میں قتل کیے گئے مسلمانوں کی لاشوں کو کفن میں لپیٹ کر سجایا جا رہا تھا۔ آذربائیجان میں لاشوں کا بازار لگا تھا۔ گیدڑ، چیل، کوے، اور کتے اُن کا بٹوارہ کر رہے تھے۔ نائجیریا میں لاشوں کی شناخت ہو رہی تھی اور بولویا میں تمام لاشیں اپنی شہادت کا خطبہ پڑھے جانے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کشمیر میں پڑی لاشیں اپنے بیان درج کرا رہی تھیں... اُن لاشوں میں کشمیری مسلمان بھی تھے اور کشمیری پنڈت بھی۔ افغانستان میں لاشیں دفنانے کے لیے زمین کی کمی پڑ رہی تھی اور تعجب کی بات یہ کہ طالبان کے ذریعہ روند دیے جانے کے باوجود، اپنے اپنے حمایتیوں کی لاشوں کے ڈھیر پر برہان الدین ربانی، احمد شاہ مسعود، گلبدین حکمت یار اور طالبان کا ملا شاہ محمد عمر جیسے لوگ اپنے اپنے اسلام کا تاج پہنے شان سے کھڑے تھے۔ تبھی ایک مردہ دوڑتا ہوا آیا اور چیخنے لگا—

— ادیب عالی! اسلام کے نام پر افغانستان قبرستان بن چکا ہے... یہ چاروں تو اسلام کا تاج پہن کر بے شرمی سے کھڑے ہیں، لیکن کوئی دیکھے تو ہم جیسے عام اسلام پرستوں کا کیا حال ہوا ہے۔ حضور! ہم لاکھوں کروڑوں لوگ تو مارے گئے... ان چاروں کے دامن بے گناہوں کے خون سے تر ہیں۔ پورا ملک تباہ ہو چکا ہے...

ابھی وہ مردہ اپنی بات بھی کہہ رہا تھا کہ کراہتا ہوا بابر ادیب کے سامنے حاضر ہوا—

— ادیب عالی... میں تو آپ سے چھٹی مانگ کر اپنی قبر میں لوٹ گیا تھا لیکن جگہ جگہ برستے اور پھٹتے گولوں کی آواز نے میرا سکون سے لیٹنا مشکل کر دیا... اب تو افغانستان سے قدیمی مردوں کو بھی بھاگنا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ قبریں مسمار ہو چکی ہیں۔ لاشیں شہتوت کی طرح سڑ رہی ہیں... تیزابی بدبو اور سڑے ہوئے گوشت کو دیکھ کر گوشت خور جانور اور پرندے بھی ملک چھوڑ کر شمال یا جنوب کی طرف چلے گئے ہیں... ادیب عالی! افغانستان مر گیا ہے۔ میرا کابل مر گیا ہے۔ میرے کابل پر یہ قہر اسلام کے نام پر ڈھایا گیا ہے۔

— بابر، تم کس منہ سے یہ بات کہہ رہے ہو! تم نے بھی تو اسلام کے نام پر یہ قہر ہندوستان پر برپا کیا تھا۔ تاریخ کی ایک کتاب کے صفحات سے نکل کر سانگا نے بابر کو للکارا۔

— نہیں، یہ غلط ہے! ہندوستان میرے لیے ہندوؤں کا ملک نہیں، سونے کا ملک تھا۔ تمہارے ہندوستان میں تب سندھ ندی کے ریت میں سونے کے ذرّے بہہ کر آتے تھے... تم تو اَن پڑھ ہو۔ پتہ ہے، یونان کے ہیروڈوٹس نے کیا لکھا ہے؟ تمہارے سندھ علاقے کا راجہ خود منوں سونے کے ریت نکلواتا تھا اور فارس کے شہنشاہ سائرس سے اُس کی تجارت کرتا تھا۔ اسی سونے کی چڑیا ہندوستان پر میں قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ایک مضبوط سلطنت کی ضرورت تھی... میرا دشمن ہندوستان کا ہندو نہیں بلکہ آگرہ کا مسلمان بادشاہ ابراہیم لودھی تھا... اور کیا تم یہ بھی بھول گئے کہ ابراہیم لودھی پر حملہ کرنے کے لیے تم نے اور ابراہیم لودھی کے چچا پنجاب کے صوبیدار دولت خاں لودھی نے مجھے پیغام بھیجا تھا...

— تم غلط بیانی کر رہے ہو بابر! تم بھی محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کی طرح کافروں کے خلاف مذہبی جنگ کرنے آئے تھے۔ اسلام پھیلانے آئے تھے۔ تم تلوار کے زور پر اپنا مذہب پھیلانا چاہتے تھے! رانا سانگا نے تیز آواز میں کہا۔

— اسی طرح کی بحثوں سے مذہبی، طبقاتی اور تاریخی حقیقت کی سمتیں بدل جاتی ہیں اور بعد میں وہ علیحدگی، بائیکاٹ اور حسد کی وجہ بن جاتی ہیں... شکست خوردہ اس طرح کی یادوں کو جمع کر کے ایک دوسرا ہی من مطابق تاریخ لکھ لیتا ہے اور اُسی میں جینا شروع کر دیتا ہے! ادیب نے کہا تو سب اُس کی طرف تائید سے یا تردید سے دیکھنے لگے... اور فاتح جب ان مجتمع یادوں کی تاریخ کا سامنا کرتا ہے تو مذہب اُس کا معاون ہتھیار بن جاتا ہے۔ تب وہ مذہب کو اپنے اسلحہ خانہ میں شامل کر کے بے لگام ہونے کی حد تک چلا جاتا ہے... ابتدائی وسط مدتی حملوں کا ترقی یافتہ ہونا اور

بدنما سچ یہی ہے...

—یہ جزوی سچ ہو سکتا ہے... رانا سانگا نے مداخلت کی۔— مکمل سچ نہیں۔ پوچھیے اس بابر سے۔ اگر یہ تبدیلی مذہب کا حامی نہیں تھا تو اس کے علاوہ اس نے اسے غازی ہونے کا خطاب کیوں دیا تھا؟

—اس سے پہلے میں رانا سانگا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ابراہیم لودھی کے چچا دولت خاں لودھی اور انہوں نے جب مجھے حملے کا دعوت نامہ بھیجا تھا، تب کیا انہوں نے مجھے ہندوؤں کو مسلمان بنانے کے لیے بلایا تھا؟ بابر نے تلخی اور منطقی انداز میں پوچھا۔

—میں نے کوئی دعوت نامہ بابر کو نہیں بھیجا تھا! رانا سانگا نے طیش میں کہا۔

—تمہارا وہ دعوت نامہ میری تاریخ بابر نامہ میں درج ہے... اور وہ دستاویز آج کا نہیں، سولہویں صدی کا ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو تم نے تب کیوں نہیں کہا؟ آنے والی صدیوں میں تمہارے درباروں نے اُسے خارج کیوں نہیں کیا؟

—میں اس الزام کو منظور نہیں کرتا! رانا سانگا نے تلملا کر کہا۔

—تم منظور کرو یا نہ کرو، لیکن وقت گواہ ہے، تاریخ گواہ ہے! مجھے تو تم نے چاہا موقع دیا تھا تم نے... پھر اس سونے کی چڑیا کو چھوڑ کر چلا جاؤں، اتنا بے وقوف میں نہیں تھا۔ یہیں سے ہماری تمہاری دشمنی کا آغاز ہوا تھا۔ تب حکومت چلانے کے لیے مجھے اسلام پرست مسلمانوں اور بادشاہ پرست ہندوؤں کی ضرورت پڑی تھی...

—اسی لیے تم نے غازی مسلمان ہونے کا سہرا اپنے سر باندھ لیا تھا! ادیب نے طنز کیا۔

—تب حالات دوسرے تھے ادیب عالی! بابر بولا— میرے ساتھ جو لڑاکو سپہ سالار اور قبیلے، قندھار، خراساں، بدخشاں، تاجکستان اور شمالی ایران سے آئے تھے، وہ لڑتے لڑتے تھک گئے تھے۔ ہندوستان کے موسم کو وہ برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ گرمی، لو، ریت والے بھونچال، پسینے اور پت کے چکتوں نے انہیں بے حال اور بدحال کر دیا تھا۔ جنگ میں لگے اُن کے گھاؤ بارش کے موسم میں پھر کھل جاتے تھے... ان حالات میں وہ اپنے گھر لوٹ جانا چاہتے تھے۔ وہ مجھ سے بھی درخواست کر رہے تھے کہ سلطنت کی صوبیداری سونپ کر میں بھی واپس چل پڑوں... فرغنہ کو سر کروں اور وہیں رہوں، لیکن میرے لیے یہ مناسب اور ممکن نہیں تھا۔ تب لوٹنے والے فوجی قبیلوں اور سپہ سالاروں کو روکنے کے لیے میں نے مجبوری میں مذہب کا واسطہ دیا تھا۔ دھن دولت اور عہدوں کی پیش کش بھی انہیں نہیں روک پا رہی تھی۔ مجھے تو یہیں رہنا تھا۔ اسی لیے میں آگرہ میں دفن ہوا تھا... وہ تو بعد میں

میری نعش کو آگرہ سے کھود کر کابل میں دفن کیا گیا اور متعصب اسلام پرستوں کی ضروریات کی وجہ سے مجھے غازی بنایا گیا!

رانا سانگا نے پھر مداخلت کرنی چاہی تو ادیب نے انہیں روک کر حکم دیا— محمد بن قاسم کو پیش کیا جائے۔

اردلی طوفان کی طرح گیا اور خلیفہ الولید کی راجدھانی سے محمد بن قاسم کو پکڑ لایا۔ تئیس چوبیس سال کے اس چھیلے جوان کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ راستے میں ہی اردلی نے اُسے گرفتاری کی وجہ بتا دی تھی۔ عدالت کو ادب سے سلام کرنے کے بعد اس نے بیان درج کروایا—

— حضور ادیب! میں باادب کہنا چاہتا ہوں کہ میں عرب ہوں۔ میرے قبیلے کا مالک حجاج تھا۔ جناب الولید ہمارے خلیفہ تھے۔ اُن دنوں ہند کی دھن دولت کی داستانیں ہوا میں تیرتی تھیں۔ ہم نے کھجور، ریت، ریتیلی آندھیوں کے سوا کچھ دیکھا نہیں تھا۔ ہمارا قبیلہ نیا نیا مسلمان بنا تھا۔ ہمیں تو صرف یہ معلوم تھا کہ مذہب کو قبول کیا جاتا ہے۔ مذہب کو پھیلایا جاتا ہے، یہ ہمیں تب پتہ بھی نہیں تھا۔ میں تو تب خود سترہ سال کا تھا۔ تبدیلی مذہب کیسے کی جاتی ہے، اس کا مجھے علم تک نہیں تھا۔ اس لیے یہ الزام کہ میں تلوار کے زور پر ہندیوں کو مسلمان بنانے آیا تھا، بالکل بے بنیاد اور غلط ہے۔

—تو تم کس لیے آئے تھے؟ عدالت نے سوال کیا۔

— حضور! مجھے تو میرے مالک حجاج نے ہند کو لوٹنے بھیجا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے پیسہ اُدھار دیا تھا۔ اس شرط پر کہ اُن کا دیا ہوا پیسہ تو میں واپس کروں گا ہی۔ ساتھ ساتھ ہند کے زرخیز علاقے میں حکومت قائم کر کے میں انہیں ہمیشہ پانچ لاکھ دینار کی سالانہ مالگزاری بھی دیتا رہوں گا!... اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک خاص راز میرے حوالے کیا تھا... حضور! جنگ کے وقت تو ہمارا بچہ بچہ لڑتا ہے لیکن حجاج نے ہمیں یہ راز بتایا تھا کہ ہند میں پوری قوم نہیں لڑتی۔ روایت کے مطابق وہاں صرف چھتری لڑتا ہے۔ چھتری ہارتا تھا تو سب ہار جاتے تھے۔ یہ بات سچ ثابت ہوئی حضور! راجہ داہر ہارا تو سب ہار گئے۔ سارے ہندو برہمنوں اور بودھوں نے بھی شکست منظور کر لی... انہی ہندو برہمنوں کے مندروں اور بودھوں کے وہاروں میں بے پناہ دھن دولت کا خزانہ تھا۔ میں نے انہیں لوٹا۔ پھر مجھے انہی برہمنوں سے اطلاع ملی تھی کہ وہ جیاوان جو کشمیر کے مہاراجہ کا صوبیدار تھا حضور! اس نے ملتان کی بستی کے مشرق کی طرف بڑے تالاب میں ایک مندر بنوا رکھا ہے۔ ہندوؤں کے خزانے مندروں کے نیچے ہی زمین دوز رہتے تھے۔ تالاب والے اُس مندر کے نیچے اس نے تانبے کے چالیس گوداموں میں سونے کا چورا چھپا رکھا تھا۔ گودام توڑنے سے پہلے میں

نے مورتیوں کو توڑا تھا۔ مورتیاں توڑ کر مجھے تین سو من سونا ملا تھا... پھر جب تالاب کے اندر مندر کے نیچے والے چالیس گوداموں کو میں نے توڑا تو تیرہ ہزار دو سو من سونا میرے ہاتھ آیا تھا... تب میں مندروں کو کیوں نہ توڑتا ادیب عالی!

عدالت جیسے سکتے کے عالم میں سب کچھ سن رہی تھی۔

—اور پھر حضور! ہند کے باشندوں کا اللہ ایک نہیں تھا۔ یہاں ہر برہمن کا خدا الگ الگ تھا۔ ایک خدا لٹتا تھا تو دوسرا بچانے نہیں آتا تھا۔ دوسرا لٹتا تھا تو تیسرا بچانے نہیں آتا تھا۔ ان حالات نے میری مدد کی۔ میرے سامنے ہندو اور غیر ہندو کا سوال نہیں تھا۔ میں تو ہند ندی کے دہانے سے ٹکشیلا کے بودھ برہمنوں کو چیرتا ہوا کانگڑا تک جیتتا چلا گیا...

ابھی محمد بن قاسم کا بیان جاری تھا کہ کشمیر سے زبردست شور اٹھا۔ تاجکستان چیخنے لگا۔ عراق پر امریکی بمباری آتش بازی کی طرح دکھائی دینے لگی۔ بوسنیا کے مسلمانوں پر دوبارہ سربوں نے حملہ کر دیا۔ سری لنکا میں پربھاکرن نے جو دو ہزار شہری جان سے مار کر زمین میں گاڑ دیے تھے، ان کے ڈھانچے نکل نکل کر کراہنے لگے۔ سعودی عرب، سوڈان، افغانستان، پاکستان کے دہشت گرد جہاد کے نام پر معصوم شہریوں کو مارتے بھاگتے ہوئے ڈوڈہ، ادھم پور اور کلوستالی تک آگ زنی، قتل، اغوا اور لوٹ مار میں مشغول ہو گئے۔

اسی میں کراچی سے کراہتے زخمیوں کی آواز آئی—

—عدالت عالیہ! سنئے... لندن سے ہمارے ملک کو توڑنے کے لیے مہاجر الطاف حسین زہر اگل رہا ہے... یہ وہی طاقتیں ہیں جنہوں نے پہلے ہندوستان کو توڑا، اب پاکستان کو توڑنا چاہتی ہیں...

ادیب چیخا— سنو، کراچی کے باشندو! جتنا جو کچھ ٹوٹ گیا، اُسے بھول جاؤ۔ جو کچھ ٹوٹنے کے بعد بنا ہے، اُسے ٹوٹنے سے بچاؤ۔ جتنے ملک بنیں گے، وہ صرف انسان کو تقسیم کریں گے! ضرورت سے زیادہ اس دنیا کی تقسیم ہو چکی ہے... خدا کے لیے تقسیم کی اس ذہنیت کو ختم کرو۔

—لیکن جو غلط بٹوارے ہوئے ہیں، انہیں ختم کرنا ضروری ہے، نہیں تو ادیب عالی! دنیا میں قتل عام اور خون خرابہ بند نہیں ہوگا۔ یہ تیز طرار آواز سندھ پاکستان کے نیتا ڈاکٹر بلے پوتا کی تھی۔ مذہب کے نام پر تہذیبیں بھی خونخوار اور درندہ ہو جاتی ہیں... یہی ہم سندھیوں کے ساتھ ہوا ہے... ہم سندھی صدیوں سے خود مختار رہے ہیں... ہماری زبان، ثقافت، فلسفہ اور تہذیب ان پاکستانیوں سے الگ ہے۔ ہم چار کروڑ سندھیوں کو خود فیصلے کا حق چاہیے۔ ہمارے ساتھ ۱۹۴۷ء میں دغا ہوا ہے... پڑھئے پاکستان کے اُس اعلانیے کو جو ۱۹۴۰ء میں لاہور میں جاری ہوا تھا۔ اس میں ہم سندھیوں

کو پوری طرح سے خود مختاری دینے کا وعدہ ہے لیکن پاکستان بننے کے بعد سیاست کے ارادے بدل گئے۔ کٹھ پتلی حکمراں اور فوجی تاناشاہوں نے وہ وعدے پورے نہیں کیے۔ اسی طرح سے اور وعدے نہ نبھانے کی وجہ سے پاکستان ٹوٹا اور بنگلہ دیشیوں نے اپنا پاکستان بنا لیا۔ اب ہم اپنا سندھ آزاد چاہتے ہیں... سندھی مسلمانوں اور سندھی ہندوؤں کے لیے، کیونکہ ہماری زبان، تاریخ، ثقافت اور تہذیب ایک ہے!

اور ہوٹل کنشکا کے ایک کمرے میں تبھی تین لوگ بیٹھے دکھائی دیے... چوراسی سالہ ’جے سندھ‘ تحریک کے بانی جی ایم سید، ہال کوی بیراگی اور رامیشور ٹھکرال۔ جی ایم سید کہہ رہے تھے—

—ڈاکٹر بلے پوتا ٹھیک کہتا ہے۔ سندھ کی تہذیب الگ ہے۔ وہ اسلام اور ویدک دھرم کی ملی جلی تہذیب ہے... یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ہی ۱۹۴۳ء میں سندھ اسمبلی میں ہندوستان کی تقسیم کی تجویز مسلم لیگی ممبر کی حیثیت سے رکھی تھی لیکن دو سال گزرتے ہی ۱۹۴۵ء میں ہی پاکستان کی نفرت کا فلسفہ میری سمجھ میں آ گیا تھا... مجھے شک ہونے لگا تھا کہ جو جناح بھارت میں آج ہندوؤں سے نفرت کرنے کی سیاست چلا رہا ہے، وہ کل ہم سندھیوں سے بھی نفرت کرے گا۔ ۱۹۴۷ء میں اسی لیے میں نے بہت بجھے دل اور شکوک کے درمیان پاکستان بنانے کا استقبال کیا تھا...

—اگر تم سندھی ہندوؤں اور سندھی مسلمانوں کی زبان، ثقافت اور تہذیب ایک مانتے ہو تو پھر آج تقسیم کے اتنے سالوں کے بعد بھی ہندوستان گیا ہوا سندھی ہندو تم سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے؟ یہ سوال ایک پتھر کی طرح آ گرا۔

—یہ غلط ہے... ہماری غلطی سے تقسیم تو ایک سچے واقعے میں تبدیل ہو گیا تھا، لیکن تقسیم کے بھیانک دور میں بھی سندھ میں مارکاٹ نہیں ہوئی۔ ہم نے دل ہی دل میں اپنی تاریخی غلطی کو قبول کرتے ہوئے دکھ بھرے دل سے اپنے ہندو بھائیوں کو رخصت کیا تھا۔ سندھ سے جو بھی ہندو نکلا وہ جان مال اور عزت سمیت اس قدر محفوظ نکلا کہ اپنے پالتو طوطے تک کو پنجرے سمیت لے کر ہندوستان گیا۔ اُن ہندو بھائیوں کے ساتھ سندھی مسلمانوں نے کوئی بدسلوکی نہیں کی، بدسلوکی اگر کی تو سندھ میں بسنے والے پنجابی مسلمانوں نے، وہ پنجابی مسلمان تب بھی جاہل تھے اور آج بھی اُن کی جہالت کم نہیں ہے۔ ہم سندھی تب بھی اُن سے لڑ رہے تھے اور آج بھی لڑ رہے ہیں... ہماری لڑائی اُن سے مسلسل ہے۔ ہم مذہب کے لیے نہیں، اپنی ثقافت کے لیے لڑ رہے ہیں...

—یہ بیان تو بحز کانے کے لیے ہے... لیکن مسئلہ دوسرا ہے۔ سوال والے پتھر نے جملہ پھینکا۔

—ہاں، مسئلہ یہ ہے کہ تقسیم کے وقت ہمارے سندھ میں صرف گیارہ فیصد غیر سندھی تھے۔

ہندو تو تب تیرہ لاکھ ہی بھاگے تھے، لیکن ہماری چھاتی پر آج جو اڑتالیس فی صدی غیر سندھی آ کر بیٹھ گئے ہیں ان سے ہمیں اب زندگی بھر لڑنا ہے۔

— یعنی تم قائدِ اعظم محمد علی جناح اور پاکستان کے بانی شاعر علامہ اقبال کی وراثت سے لڑنا چاہتے ہو؟ سوال والے پتھر نے کروٹ بدل کر پوچھا۔

— ہاں، وہ وراثت ہے ہی نہیں... وہ تو مذہب کے نام پر لوٹا گیا صرف ایک علاقہ ہے، جسے ملک کہا گیا۔ یہ ملک تو ٹوٹے گا، ٹوٹ کر رہے گا... اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی... جناح کی کم نظری، ماؤنٹ بیٹن کی سازش اور مذہب تبدیل کیے ہوئے شاعر اقبال کی ذہنی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہ سارا خون خراب ہوا۔ جناح اپنے آپ کو تاریخ میں امر کرنا چاہتا تھا، اس کی ہوس کس قیمت پر پوری ہوئی ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ اقبال شاعر بڑا تھا لیکن اپنے ہندو خون کو سنبھال نہ پانے اور اُس سے بغاوت کی وجہ سے وہ بہت بے ہودہ اور پاکھنڈی آدمی بن گیا تھا...

— سید صاحب! معافی چاہوں گا... اقبال جیسے بڑے شاعر کے بارے میں یہ عدالت آپ کے بے ہودہ الفاظ برداشت نہیں کر سکتی۔

— میں معافی چاہتا ہوں ادیب عالی... میں عدالت کا احترام کرتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں ایک ادیب کی عدالت کے سامنے ہوں... مجھے تو یہی پتہ تھا کہ میں اڑتیس سال بعد بھارت آیا ہوں اور دلی کے کنشکا ہوٹل کے اپنے کمرے میں بال کوی بیراگی اور راجیشور ٹنکھرا کے ساتھ بیٹھا ہوں! غلام مرتضیٰ سید نے ادب سے کہا۔

— عوامی زندگی میں کام کرنے والوں کا کچھ بھی ذاتی یا اپنا نہیں ہوتا! وہ لوگ ہمیشہ عوام کی عدالت میں حاضر سمجھے اور مانے جاتے ہیں... اُن کے ذاتی خیال اگر اُن کے عوامی خیالات سے میل نہیں کھاتے تو ایسے لوگوں کو وہ اخلاقی حق نہیں ہے کہ وہ عوامی زندگی کے میدان میں رہیں! ادیب نے کہا۔

— لیکن حضور میں نے اپنی رائے کہاں بدلی ہے؟ آپ خیال اور رائے میں تو فرق کریں گے۔ میرے ذاتی اور عوامی خیالات میں فرق نہیں ہے، لیکن شاعر اقبال نے تو اپنی شاعری کے ساتھ زنا کیا ہے... آپ کے اسی شاعر نے پہلے کہا تھا— 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا...' اسی نے اپنی سطروں کو بدل کر کیا ایک شاعر کی اخلاقیات کو چنوتی نہیں دی ہے؟ آپ کا وہی اقبال پلٹ کر بولا— 'چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا، مسلم ہیں ہم وطن ہے، سارا جہاں ہمارا!' حضور، میں جاننا چاہوں گا کہ یہ کون سی اور کیسی شاعرانہ اخلاقیات ہے؟ کیا آپ جیسے ادیبوں اور شاعروں

کی کوئی اخلاقیات نہیں ہے؟ یا کہ آپ کسی عدالت میں حاضر اور جواب دہ نہیں مانے جاتے؟

ایک منٹ کے لیے عدالت خاموش ہو کر اردلی اور سارا شگفتہ سے مشورہ کرنے لگی۔ مشورے کے بعد اردلی چپ چاپ ایک کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ تب ادیب نے کہا—

— سید صاحب! ہر فرد کی ایک عدالت ہے... اپنی عدالت سے کوئی آزاد نہیں ہے، چاہے وہ ادیب ہی کیوں نہ ہو... لیکن یہ عدالت اُن لوگوں پر چل رہے مقدموں کی عدالت ہے جن کی انسانی روحیں اُن کے جیتے جی چل بسی تھیں، یا چل بسی ہیں یا چل بسیں گی... اور جو اپنے دور کے یا اگلے دور کے یا آنے والے دور کے آدمی کی زندگی، اس کی سوچ اور راحت سے جی سکنے کے لیے خطرہ بن گئے تھے، بن گئے ہیں، یا بن سکتے ہیں! ادیب نے بڑے گہرے انداز میں کہا، تو اردلی بغیر آواز کے تالی بجانے لگا۔

— تو حضور! میں بھی تو اسی خطرے کی بات کر رہا ہوں! سوچ کا خطرہ ہی تو جناح اور اقبال نے پیدا کیا تھا۔ مجھے اقبال کے شاعر کی شخصیت سے کچھ لینا دینا نہیں، لیکن شاعر بھی تو وہی ہوتا ہے جو دنیا کے روحانی درد کو سمجھتا ہے۔ جو شاعر درد کے دریا میں دوسروں کو مرنے کے لیے ڈبو دے، وہ شاعر کیسا؟ آخر غالب، شاہ اور کبیر بھی تو شاعر تھے... لیکن اقبال نے تو خون کا دریا بہایا، کیونکہ اس نے خدا کو صرف 'مسلمانوں کا خدا' بنا کر رکھ دیا۔ اقبال سے پہلے خدا سب کا تھا... ہندو کا تھا، مسلمان کا تھا، میرا کا تھا، کبیر کا تھا، نانک اور ٹیگور کا تھا، سبرامنیم بھارتی اور نذر الاسلام کا تھا، سنت ریداس اور گیانیشور کا تھا، وہ کس کا خدا نہیں تھا؟ لیکن اقبال نے خدا کو مسجدوں میں قید کر دینے کا گناہ کیا ہے۔ جناح اور اقبال اس صدی کے سب سے بڑے شیطان تھے! شیطان... جی ایم سید طیش میں تھے۔

عدالت میں سناٹا چھا گیا۔

— حضور! میں مہاتما گاندھی کی سمادھی پر ایک چراغ جلانے کے لیے جانا چاہتا ہوں! جی ایم سید نے التجا کی۔

— جائیے! اردلی نے ادیب سے پوچھ کر اجازت دے دی۔

تبھی کراچی سے خوف زدہ لوگوں کی آوازوں نے حملہ کیا— تو کیا یہ مہاجر الطاف حسین جو کچھ سندھ میں کر رہا ہے، وہ صحیح ہے؟

— نہیں، وہ بھی سراسر غلط ہے۔ یہ عدالت پاکستان نام کے ملک اور اُس کے اتحاد و یک جہتی کو اہمیت دیتی ہے اور اسے سمجھتی ہے لیکن یہ عدالت پاکستان نام کے اُس جذبے کو غلط اور خطرناک مانتی ہے جس کی بنا پر پاکستان بنایا گیا... اور مہاجر الطاف حسین جو کر رہے ہیں، وہ غلط ہے۔ اس

سوچ کو دفنایا نہ گیا تو اگلی صدیوں میں ایک انسانی کائنات نہیں بنے گی، تب یہی دنیا قبرستان بن جائے گی اور ہر فرد اپنی اپنی سوچ کا قبرستان بنانا چاہے گا، جسے وہ اپنا پاکستان کہے گا۔ تب اگلی صدیوں کی شکل کیا ہوگی؟ ادیب پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا — الطاف حسین اور ڈاکٹر ہیلے پوتا کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ پاکستانی عوام کو خون کے دریا میں ڈبو دیں!

— پاکستان کی تانا شاہی پنجابی حکومت میرے جیسے پاکستانیوں کے ارادوں کی تلوار کو نہیں چھین سکتی۔ ارادے ہاتھوں میں نہیں، ہمارے دلوں میں ہیں۔

— یہی تو سب سے بڑا خطرہ ہے، اے الطاف! دلوں کو تلوار بننے سے روکو۔ دلوں میں خدائی رحمت اور انسانی جذبے کو پہنچنے کا موقع دو۔ اگر انسان کے دل کی دھرتی کو تم نے خون کی خواہش سے سینچ دیا تو پاکستان بھی ویران ہو جائے گا اور یہ ویرانی، ہر ملک، ہر تہذیب، ہر تمدن میں پھیلتی چلی جائے گی۔ اس لیے اے الطاف حسین، انسان کے بنیادی جدوجہد کو پہچانو اور پاکستان میں پھر فوجی تاناشاہی کی حکومت کے دروازے مت کھولو... آج ہماری طبعیاتی میکانکیت کی غلام ہے۔ کوئی فوجی، کوئی آدمی میکانکیت کی مدد کے بغیر بہادر نہیں ہے، اسے سمجھو اور ذاتی دکھوں اور نفرت کی دنیا سے باہر نکل کر ایک بہتر اور منصفانہ پاکستان کی تعمیر میں ہاتھ بٹاؤ۔

— مجھے بدلہ لینا ہے! الطاف حسین چیخا — پاکستان ہم نے بنایا ہے۔ ان پنجابیوں، بلوچیوں، سندھیوں اور پختونوں نے نہیں۔ پاکستان بنانے کی قیمت ہم اودھ اور بہار کے مسلمانوں نے چکائی ہے... اصل پاکستانی تو ہم ہیں، ہمیں ان نقلی پاکستانیوں سے حساب چکانا ہے۔

— الطاف حسین... نفرت، انتقام کا جذبہ اور خون خرابے سے انسان کو آزاد کرو تاکہ آنے والی صدیاں گمراہ نہ ہونے پائیں ادیب بول ہی رہا تھا کہ اردلی نے طوفان کی طرح عدالت میں داخل ہوئے عراق کے صدام حسین کو جیسے تیسے سنبھالا، پھر پیش کیا —

— حضور! یہ عراق کے صدام حسین ہیں، یہ بہت چیخ رہے ہیں۔

— کیا بات ہے صدام حسین؟ عدالت نے پوچھا۔

— ادیب عالی! آج عراق اور ایران کے درمیان چل رہی جنگ کے ختم ہونے کی سالگرہ ہے! صدام نے بتایا۔

— یہ تو بڑی اچھی بات ہے!

— نہیں! کیونکہ امن کے اس سالگرہ کے دن اب امریکہ، سعودی عرب اور ایران نے اپنی اپنی وجوہات سے ہمیں ختم کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

— لیکن کیوں؟ آخر سعودی عرب اور ایران بھی تو مسلم ممالک ہیں۔ ایک ہی مذہب کو ماننے والے ممالک میں یہ دشمنی کیسی؟

— کیونکہ شیعہ ایران سنی عربوں کے خلاف ایک نسلی سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسلام کو اپنے دائرے میں باندھنا چاہتا ہے، اس لیے وہ میری اور میرے ملک کی مخالفت کرتا ہے۔ خاص طور سے اس لیے کہ ایرانی رگوں میں آریوں کا خون بہتا ہے اور وہ ہم عربوں اور سنیوں کو قبول نہیں کرتا۔

— لیکن صدام حسین! سعودی عرب تم سے زیادہ عربی ہے، وہ سنی بھی ہے، تب وہ تمہارا ساتھ کیوں نہیں دیتا؟

— کیونکہ انہیں شک ہے کہ دجلہ فرات کی وادی کے ہم عرب بھی بنیادی طور پر آریہ ہیں۔ ہماری رگوں میں بہتے خون کو سعودی عرب والے اور ان کے حمایتی بھی قبول نہیں کرتے... ہم سنی ہیں، لیکن عربی لوگ ہمارے خون کو عربی اسلامی خون سے الگ مانتے ہیں... صدام حسین بول ہی رہا تھا کہ اردلی نے درمیان میں ٹوکا —

— حضور! آپ تو غیر ضروری بحث میں الجھ گئے... ساری صدیاں رکی کھڑی ہیں... ہٹلر کھڑا ہے، محمد بن قاسم آٹھویں صدی سے کھڑا ہے، محمود غزنوی اپنے ثبوت لیے دسویں صدی سے موجود ہے... سولہویں صدی کا بابر ابھی اپنی بات اور جرح پوری نہیں کر پایا ہے اور سترہویں صدی کے بند ہوتے دروازے پر اورنگ زیب اپنی باری کا انتظار کر رہا ہے اور بیسویں صدی کی سارا شگفتہ ابھی تک اپنے بیٹے کی لاش لیے کونے میں کھڑی ہیں... شاہین کب سے اپنی بات کہنے کے لیے آپ کا انتظار کر رہی ہے... اور آپ کی سلمیٰ جو خدا حافظ کہہ کر چلی گئی ہے اس اہم عدالت کا کاروبار روک کر آپ کو پھر اپنے لیے حاصل کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے... اور ادھر آپ کے دوست بھوانی سین گپت ایران کے دارالسلطنت تہران سے لوٹ کر کچھ ضروری باتیں آپ سے کرنا چاہتے ہیں... مجھے آپ کا حکم چاہیے کہ میں کسے بلاؤں؟

— دیکھو اردلی دوست! آج ہی بھوانی سین گپت تہران سے لوٹ کر آئے ہیں اور آج ہی ہندوستان کی مخلوط تہذیب کے سب سے بڑے نمائندہ نورالحسن کا انتقال ہوا ہے... میرا دل دکھ سے بھرا ہوا ہے... مجھے تھوڑی سی چھٹی دو! ادیب نے کہا۔

— اوہ!... تب ٹھیک ہے۔

— اور سب کو روکو، بھوانی سین گپت سے کچھ اور وقت مانگو۔ شاہین سے کہو کہ وہ اور تھوڑا انتظار کرے۔ محمد بن قاسم سے بولو کہ وہ لوٹنا چاہے تو لوٹ جائے۔ محمود غزنوی سے کہو کہ اپنی لوٹ کا

حساب تیار کرے اور بابر سے کہو کہ طالبان کے توپوں کے گولوں کی پروا نہ کرے، وہ فی الحال اپنی قبر میں جا کر لیٹ جائے... اور ان تمام فرمانوں کو جاری کرنے کے بعد اورنگ زیب سے کہو — کچھ دیر بعد وہ عدالت میں حاضر ہو!

۲۲

اورنگ زیب دولت آباد کی اپنی قبر میں آرام سے سویا پڑا تھا۔ اردلی نے بڑی شائستگی سے اورنگ زیب کی قبر پر دستک دی۔

— کون ہے جو مجھے جگا رہا ہے؟ قبر سے آواز آئی۔

— حضور! آج اگلا وقت آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔

— تو کرو!

— معاف کیجئے شہنشاہ! اب وقت اور عدالتیں بدل گئی ہیں... اب آپ کو ایک ادیب کی عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا! اردلی نے کہا۔

— کیا؟ ادیب! شاعر؟ یہ لوگ تو اسی میراثی خاندان کے ہوتے ہیں... وہی لوگ جنہیں میں نے اپنے دربار اور سلطنت سے خارج کر دیا تھا! اورنگ زیب نے کہا۔

— آج وقت آپ کو خارج کرنے میں لگا ہے، اسی لیے آپ کو یاد فرمایا گیا ہے۔

— اچھا! کہتے ہوئے شہنشاہ اورنگ زیب اٹھ کھڑا ہوا تو سمتیں تھرانے لگیں۔ ندیوں نے اپنا پانی سمیٹ لیا تاکہ شہنشاہ کو پار کرنے میں دقت نہ ہو۔ وہ اردلی کے ساتھ چل پڑا۔

برہانپور کے آگے دھرمت کے پاس سے اورنگ زیب گزرا تو رک گیا... جیسے تاریخ اس کے سامنے ایک پل کے لیے رک گئی ہو۔

— یہیں... اسی میدان میں یہیں دھرمت میں، میں نے دارا شکوہ کے سپہ سالار راجہ جسونت سنگھ کی فوجوں کا سامنا کیا تھا... کیونکہ دارا مجھے حضرت سے ملنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

— حضرت! اردلی نے ادب سے پوچھا۔

— میرے ابا حضور! شہنشاہ شاہجہاں، جو تب گردے کی بیماری سے پریشان تھے، میں نے دکن سے کوچ کیا تب میں بیجاپور سے برہان پور پہنچا تھا، یہیں... دھرمت میں راجہ جسونت سنگھ سے ہوئی۔ اس جنگ میں ہزاروں لوگ مارے گئے تھے۔ یہ میدان لاشوں سے پٹ گیا تھا۔ جسونت سنگھ جودھپور کی طرف بھاگ گیا تھا... یہاں خون کا کیچڑ پھیلا تھا... اسی خونی میدان پر آج کھیت لہلہا

رہے ہیں! کتنا اچھا لگتا ہے یہ دیکھ کر!... عالمگیر نے کہا۔

تبھی چار پانچ سائے یکبارگی سامنے آ کر کورنش بجانے لگے۔

— عالم پناہ، آداب!

— کون؟ اوہ آپ لوگ! اورنگ زیب نے انہیں پہچانتے ہوئے کہا — آپ... کاظم شیرازی صاحب اور آپ محمد ساقی مستعد خاں صاحب... ارے خافی خان صاحب اور عاقل خاں رازی صاحب بھی... اچھا ہوا آپ مورخ مجھے وقت پر مل گئے، کیونکہ وقت کی عدالت نے مجھے یاد فرمایا ہے!

— اسی لیے تو ہم حاضر ہوئے ہیں۔

— میں تو خاص طور سے 'واقعات عالمگیری' کے مصنف عاقل خاں کو بھی ساتھ لایا ہوں... کیونکہ ان پر درباری مورخ ہونے کا الزام نہیں لگایا جاتا! مورخ کاظم شیرازی نے کہا۔

— حضور... چلئے! اردلی نے کہا۔

اور جب شہنشاہ، ادیب کی عدالت میں حاضر ہوا تو ادیب اُسے دیکھتا ہی رہ گیا...

اورنگ زیب! ایک مجھلے قد کا شاندار آدمی۔ دبلا، عمر اور الزامات کے بوجھ سے جھکے ہوئے کندھے۔ لمبی آریہ ناک، تیکھے تراشے ہوئے نقش۔ گول سفید داڑھی... جو اس کے بدن کے زیتونی رنگ پر اور بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ برف کی طرح صاف اور سفید ململ کا انگرکھا اور پگڑی میں چمکتا ہوا بڑا سا نگینہ۔

تیکھی اور بے لوث نظر سے اورنگ زیب نے ادیب کو دیکھا۔

اسی وقت سیکڑوں کبوتر فصیلوں سے اڑ کر آسمان میں سما گئے۔ تب ادیب نے اُسے اور زیادہ غور سے دیکھا۔

اورنگ زیب اپنے مورخین کے ساتھ کھڑا تھا۔ اردلی نے اُسے کرسی دی۔ وہ ایک شہنشاہ کی شان سے بیٹھ گیا۔

— عالمگیر! تمام الزام تم پر عائد ہیں۔ سب سے بڑا تو یہ ہے کہ تم ایک مذہبی کٹر پسند شہنشاہ تھے، کٹر سنی تھے... اسی لیے تم نے دکن کے گولکنڈہ، بیجاپور، خاندیش، برار اور احمد نگر کی ریاستوں کے اُن سلطانوں کو برباد کیا جو مسلمان تو تھے، لیکن سنی نہیں شیعہ تھے... اور یہ کہ تم نے اپنی ہندو رعایا کو ستایا، اُسے تلوار کے زور پر مسلمان بنایا، اُن کے تیوہاروں، تقریبات پر پابندیاں عائد کیں، اُن کے مندروں کو توڑا... تم مراٹھوں سے لڑے، جو تمہارے سب سے اچھے دوست بن سکتے تھے... اس کے علاوہ تم نے اپنے والد شاہجہاں کو قید کیا، اپنے بھائی دارا شکوہ اور مراد کو مروایا۔ شجاع کو جلاوطن

کیا۔ تم نے خون آلودہ ہندوستان کا تخت حاصل کیا... تم ہندوستان کو دارالحرب مانتے تھے۔ اسے دارالاسلام میں تبدیل کر دینا چاہتے تھے... تم نے کٹر خاص مسلمان کی طرح ریاست کو مذہب سے جوڑ دیا...

اورنگ زیب اپنی کرسی پر ویسے ہی بیٹھا رہا۔

اور عدالت کے سامنے سے ایک جلوس سا گزرنے لگا— چیختے چلاتے لوگوں کا...

— یہ پہلا شہنشاہ ہے جس نے مذہبی سنسر لگایا!

— تخت و تاج حاصل کرنے کے لیے ملاؤں کا غلام ہو گیا... اپنے بھائی دارا شکوہ کو مارنے کے لیے اسے کٹر مذہبی علماء کی ضرورت پڑی تاکہ اس کے جبریہ کارناموں پر کوئی انگلی نہ اٹھائے... اسی لیے اسے مذہب کی ضرورت پڑی اور اس کی حکومت میں مذہب کی دخل اندازی شروع ہوئی۔ یہ نقشبندی فرقے کا شاگرد بنا اور شیخ سرہندی کا پوتا مسلسل مذہبی رائے اور مشورہ دینے کے لیے اس کے دربار میں بیٹھنے لگا۔

— اس نے ہم موسیقاروں اور شاعروں کی بے عزتی کی... حالانکہ ہم زیادہ تر مسلمان تھے۔

— اس نے ہم جیوتشیوں کو دربار سے نکال دیا، کیونکہ ہم ہندو تھے۔

— ہمارے مغلیہ شہنشاہوں کا یہ رواج تھا کہ وہ عید اور دسہرہ میں ہمیشہ شامل ہوتے تھے، لیکن جودھپور کے مہاراجہ جسونت سنگھ کو ہرانے کے بعد عالمگیر نے ہندوؤں کے دسہرہ و دیگر تیوہاروں میں شامل ہونا بند کر دیا۔

— اور تو اور حضور! یہ تو ہماری روایت تھی کہ جب بھی کوئی ہندو راجہ تخت نشیں ہوتا تھا تو شہنشاہ اس کا تلک کرتا تھا، لیکن اس نے تلک کو ہندو روایت کہہ کر بند کر دیا۔

— یہ تو چھوڑیئے ادیب عالی! اس نے ہم مسلمانوں کو بھی نہیں بخشا... اس نے فرمان جاری کیا کہ کوئی مسلمان چار انگل سے زیادہ بڑی داڑھی نہیں رکھ سکتا... تب سلطنت کی ہر بستی، ہر محلے میں نائی قینچیاں لے کر گھومنے لگے اور ہم غریب مسلمانوں کا جینا محال ہو گیا۔

— اتنا ہی نہیں حضور!... ایک شخص نشے میں دھت ڈگمگاتا ہوا آیا اور چیخنے لگا— اس نے شراب بندی کا اعلان کیا... ہم جیسے شوقین اور دل جلے لوگوں کو شراب پینے کی وجہ سے اس نے سرعام پٹوایا اور یہ کہہ کر کہ دیوانِ حافظ پڑھنے سے شراب نوشی بڑھتی ہے اس نے مدرسوں سے اُسے خارج کرا دیا۔ اتنا ہی نہیں اس کے مصاحب محمد فاضل نے راج نگر کے جاگیردار رام سنگھ گوڑ کی جاگیر میں داخل ہو کر شراب کے سارے مٹکے توڑ دیے، مشکیں پھاڑ دیں... دو دن تک شراب نالیوں میں بہتی

رہی اور ہم جیسے شوقین لوگ پیاسے بیٹھے رہ گئے۔

— اردلی! اس شرابی کو عدالت سے باہر کرو۔ ادیب نے حکم دیا۔

— تو حضور... آپ بھی اورنگ زیب کی طرح پیش آنے لگے!... وہ شرابی لڑکھڑاتی زبان سے بولا— لیکن اتنا سن لیجیے کہ اس نے اپنے فرنگی توپچیوں کو پینے پلانے کی چھوٹ دی ہوئی تھی... اور دوسری طرف اُس کے وزیرِ خزانہ راجہ رگھوناتھ نے بھانگ کی کھیتی تک پر پابندی لگا دی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا، یہ بغیر سوچے سمجھے، غلط سلط حکم نامے کیوں جاری کرتا تھا۔

— حضور! ہم صوفی ہیں... اس پاگل شہنشاہ نے حضور پیغمبر کی سالگرہ پر گائے جانے والے ہمارے بھجنوں پر بھی پابندی لگا دی... تب ہم صوفی سنتوں کو اس کے مصاحب مرزا باقر کے خلاف گول بند ہو کر نکلنا پڑا۔ اس کے داروغہ نے ہم فقیروں پر قاتلانہ حملہ کیا۔ یہ احمد آباد کے ہمارے بزرگ اور پاک صوفی شیخ یحییٰ چشتی کی خانقاہ میں ہوا۔ کیونکہ اس کے دربار میں بیٹھے علماء، ملاؤں نے اسے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا تھا... یہ خود کے سواب کو کافر ماننے لگا تھا...

— حضور، ہم بھی کچھ فریاد کرنا چاہتے ہیں... ہم لوگ غریب کمہار ہیں۔ ہم سبھی مذہب والوں کے میلوں، نمائشوں، تیج تیوہاروں پر مٹی کے کھلونے بنا کر بیچتے تھے... پرندوں، جانوروں، آدمیوں، عورتوں کے کھلونے... اس شہنشاہ نے پوری سلطنت میں مٹی کے کھلونوں کا بنانا بند کرا دیا...

— ادیب عالی! ہم بوہرہ مسلمان ہیں... ہم زیادہ تر شیعہ ہیں۔ عالمگیر نے ہماری مسجدوں میں سنّی امام اور موذن تعینات کرا دیے۔

— اس کے علاوہ اس نے ہم شیعہ لوگوں کے محرم کے تیوہار پر بھی پابندی لگا دی۔ اس نے بڑے بڑے صوفی سنتوں کو نہیں بخشا۔ یہ بنگال کے درویش سید نعمت اللہ میاں میر کے شاگرد کشمیر کے ملا شاہ بدخشی اور الہ آباد کے شیخ محب اللہ جیسے فقیروں کو ذلیل کرنے سے باز نہیں آیا— اس نے سیکڑوں مسلمانوں کے سر قلم کرا دیے... حضور! اس کے دور میں دہشت چھائی رہی۔ ہر صبح ہمارے دل دھڑکتے رہتے تھے کہ کہیں آج پاگل پن سے بھرا کوئی اور فرمان نہ آ جائے۔ اس کے دربار میں گھٹیا ملاؤں اور مولویوں کی بھیڑ تھی... اس پر ان پچھلے اور اتھلے مذہبی رہنماؤں نے گھیرا ڈال رکھا تھا جو اسلام کی عظمت کو بھول کر ہمارے مذہب کو خود غرضیوں کے حدود میں قید کر رہے تھے اور یہ کٹھ پتلا ان کی ہر بات کو آنکھ موند کر قبول کرتا جاتا تھا۔ ظلم کے ہر قدم پر اپنی مہر لگاتا جاتا تھا... اس کا اسلام ہم مسلمانوں کو بھی نہیں بخشتا تھا... پتہ نہیں حضور، اس کا اسلام کون سا اور کیسا تھا۔

عدالت نے پوچھا— اورنگ زیب کیا کہتا ہے تمہیں؟

— کیا کہنا ہے مجھے؟... میں کوئی صفائی نہیں دینا چاہتا۔ مجھے جب جو ٹھیک لگا، وہی میں نے کیا... آخر میں شہنشاہ تھا... اورنگ زیب نے حقارت سے کہا — مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ابا حضور کو سات سال قید میں رکھنے، اپنے بھائیوں کو مار کر تخت حاصل کرنے، دکن کی اسلامی ریاستوں کو برباد کرنے، ہندوؤں کو ستانے اور اُن کے مندروں کو توڑنے اور مراٹھوں سے لڑ کر مغلیہ سلطنت کو زوال کی راہ پر ڈالنے کے تمام الزام مجھ پر ہیں۔ میں خود کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میرے ساتھ میرے دور کے ذمہ دار مورخ موجود ہیں۔ آپ جو کچھ بھی جاننا چاہتے ہیں، ان سے پوچھ لیجیے... تصدیق کر لیجیے۔

— یہ سارے مورخ اس کے درباری مورخ ہیں... یہ نہ سوچنے کے لیے آزاد تھے، نہ لکھنے کے لیے... حکومت کے زیر سایہ جو کچھ لکھا جا سکتا ہے، یا جو لکھوایا جاتا ہے، وہی انہوں نے لکھا ہے۔ میں خود اورنگ زیب کا چار ہزاری منصب دار رہا ہوں... میں نے خود ان مورخین کو بھگتا اور برداشت کیا ہے!... ایک شاہی راجپوت سے لگتے فوجی کی یہ آواز تھی۔

— آپ ہیں کون؟ عدالت نے جاننا چاہا۔

— جی، میں — راؤ چھتر سال بندیلا ہوں، مالوہ کا۔ مجھے انہوں نے اٹھارہویں صدی کے آغاز میں چار ہزاری منصب داری عطا کی تھی، کیونکہ میں مسلسل تیس برس ان سے لڑتا رہا تھا... مجھے بہت مجبوری میں چار ہزاری منصب داری قبول کرنی پڑی تھی... خیر... وہ الگ کہانی ہے... لیکن ان کے مورخین پر بھروسہ مت کیجیے۔ عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری، منتخب اللباب اور واقعات عالمگیری — یہ ساری تواریخ اس کے زر خرید غلاموں نے لکھے ہیں۔ یہ تواریخ قابل اعتبار نہیں ہیں! راؤ چھتر سال بندیلا نے کہا۔

— لیکن عاقل خاں تو آزاد تھا! بیشک آپ درباری مورخ مان لیجیے، لیکن واقعات عالمگیری تو انہوں نے چھپا کر لکھی تھی! کاظم شیرازی نے کہا — حضور! اس پر تو آپ بھروسہ کر ہی سکتے ہیں۔

— نہیں! ایک دہاڑتی ہوئی آواز آئی... اور ایک شاندار راجپوت بزرگ حاضر ہوئے۔

— آپ؟

میں راجہ جسونت سنگھ! جودھپور کا مہاراجہ... مغلیہ سلطنت کی جتنی خدمت میں نے کی ہے، اتنی تو جے پور کے مہاراجاؤں نے نہیں کی ہے۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کی ساری بڑی لڑائیاں میں نے لڑی ہیں... مجھے فی الحال اتنا ہی کہنا ہے کہ عاقل خاں نے اپنی تاریخ ضرور چھپا کر لکھی، لیکن یہ بھی عالمگیر کے دربار کا ایک ساامنت تھا... یہ بھی آزاد کہاں تھا! راجہ جسونت سنگھ نے حقارت سے کہا۔

— ٹھیک ہے، ٹھیک ہے... یہ معاملہ کافی پیچیدہ ہے۔

— پیچیدہ بالکل نہیں ہے حضور! راؤ چھتر سال بندیلا بولا — یہی اورنگ زیب نام کا وہ شخص ہے جس نے اپنے والد کو قید کیا۔ بھائیوں کو مارا... اور ہندوستان کی بنتی ہوئی تاریخ کو صلیب پر چڑھا دیا۔ دارا شکوہ کا قتل ایک نئے بنتے ہوئے ہندوستان کا قتل تھا۔

— تم کچھ کہنا چاہو گے اورنگ زیب؟ عدالت نے سوال کیا۔

— نہیں، کیونکہ جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ بھی سچ ہیں اور جو نہیں کہی گئی ہیں، وہ بھی سچ ہیں! اورنگ زیب بولا۔

— مطلب؟

— مطلب اورنگ زیب تھوڑا مسکرایا... مسکراہٹ میں کڑواہٹ تھی — آج یہ چند معمولی لوگ مجھ سے بغاوت کر رہے ہیں، میرے زمانے میں ان کی یہ جرأت نہیں تھی۔ تب وقت اور ہندوستان کا مستقبل میرا غلام تھا، میں کسی کا غلام نہیں تھا... کہہ کر اورنگ زیب یکبارگی اونچی آواز میں ہنسنے لگا، کچھ اس طرح جیسے کوئی الجھا ہوا آدمی اپنی ہی بات کہنے کے بعد اس کا مزہ لینے لگتا ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب یہ بھی بھول گیا کہ وہ وقت کی عدالت کے سامنے موجود ہے... وہ اپنا دربار لگا کر بیٹھ گیا اور پاگلوں کی طرح چیخنے لگا —

— سومناتھ مندر! کیا کہا؟ مندر موجود ہے... اسے تو محمود غزنوی نے مسمار کیا تھا... پھر کیسے کھڑا ہو گیا؟ اُسے زمیں دوز کر دو اور اڑیسہ... کیا؟ اڑیسہ میں پھر مندر بنائے گئے ہیں... تو اسد خاں کو حکم بھیجو کہ پچھلے دس بارہ سالوں میں جتنے بھی نئے مندر وہاں بنے ہیں، انہیں گرا دیا جائے اور پرانے مندروں کی مرمت کے لیے اجازت نہ دی جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی ہے، اس کی خبر قاضی کی مہر لگی تحریر کے ساتھ فوراً دربار میں داخل کی جائے۔ متھرا کے کیشو رائے مندر کو بھی گرا دیا جائے... اس مندر پر پتھر کی جو سیڑھی دارا شکوہ نے بنوائی ہے اُسے توڑ دیا جائے اور متھرا کے فوجدار کو حکم دیا جائے کہ حکم تعمیل ہوتے ہی اس کی خبر فوراً شاہی دربار کو دی جائے۔

اورنگ زیب ہانپتا ہوا ادھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا — اُس کے درباری زبان بند کیے بیٹھے تھے... کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد کچھ سرگوشی سی ہوئی —

— عالم پناہ عالمگیر کو یہ ہوا کیا ہے؟

— ایسا تو شہنشاہ شاہ جہاں اور جہانگیر کے زمانے میں بھی نہیں ہوا... خود شاہجہاں نے بہت سے مندروں کو تڑوایا، لیکن کبھی ایسے ضدی اور سخت فرمان جاری نہیں کیے۔

—سنا ہے کل دربار خاص میں شہنشاہ سے سرہند کے کئی علماء ملے تھے۔ اُن سے گھنٹوں بات چیت ہوتی رہی... وہاں شاہی قاضی عبدالعزیز بھی موجود تھے۔ اُن سب نے عالمگیر کو بہت سے مسئلوں پر مشورہ دیا... خاص طور سے سیاست اور مذہب کے معاملات میں...

— تمہیں کیسے پتہ چلا؟

— خواص میں سے ایک نے بتایا جو وہیں تعینات تھا۔

— کچھ خاص باتیں طے ہوئیں؟

—یہی کہ ہندوؤں کو دبا کر رکھا جائے... اکبر اور جہانگیر کے زمانے کا جو میل جول، ہندو مسلم مساوات کی جو روایتیں چلی آ رہی ہیں، انہیں ختم کیا جائے، ہندو کو رعایا مانا جائے اور ریاست کو نظام مصطفےٰ کے تحت چلایا جائے... جے پور کے مہاراجہ مرزا راجہ جے سنگھ کے بعد اُن کے خاندان کے کسی آدمی کو سلطنت میں وہ عزت و مرتبہ نہ دیا جائے جو انہیں حاصل رہا ہے۔ موقع پاتے ہی سلطنت کے وزیر خارجہ راجہ رگھوناتھ کو ہٹا کر یہ عہدہ کسی مسلمان کو دیا جائے۔ کسی ہندو افسر کے نیچے مسلمان کو تعینات نہ کیا جائے... اور اب کھل کر ان کافر ہندوؤں کو بتا دیا جائے کہ وہ رعایا ہیں، انہیں برابری کا حق نہیں حاصل ہے... کیونکہ مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کیا ہے اور آپ اس ملک کے شہنشاہ ہیں! اور یہ کہ آپ مسلمان ہیں! اسلام کے محافظ ہیں... بس تبھی سے عالمگیر کا دماغ خراب ہوا ہے...

اور تبھی ۱۶۶۹ء، چیختا ہوا آ گیا۔ چاروں سمت سے بھیانک آوازیں آنے لگیں... پورا ماحول دہشت سے بھر گیا۔ مندروں کی عمارتیں گرنے لگیں، ٹوٹے ہوئے گھنٹے لڑھکتے ہوئے اِدھر اُدھر چکراتے چلے گئے۔ مورتیاں ٹوٹنے لگیں... شہروں، بستیوں میں کہرام مچ گیا... کیشو رائے مندر کی جواہرات جڑی مورتیاں آگرہ لائی گئیں اور جہاں آرا مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے دفن کر دی گئیں۔ بلھ آچاریہ کے گووردھن مندر کی مورتیوں کو لے کر اس کا پجاری دامودر لال جودھپور کی طرف بھاگا... لیکن گووردھن کے بھگوان کو جودھپور میں پناہ نہیں ملی۔ آخر بھگوان چھ سال تک بھاگتے رہے... دامودر نے اپنے ساتھی پجاری گوپی ناتھ کو میواڑ کے رانا راج سنگھ کے پاس بھیجا۔ — سودیا رانا راج سنگھ نے بھگوان کی مورتی کا استقبال کیا اور انہیں اپنی ریاست میں پناہ دی — سیہر گاؤں میں... وہی سیہر گاؤں دھارمک ویشنو مرکز کی شکل میں فروغ پاتے پاتے بعد میں ناتھ دوارا کے نام سے مشہور ہو گیا۔

متھرا، برندابن، کاشی، پریاگ، اجین، پوری وغیرہ کے پجاری مورتیوں کو لیے ہوئے، چھپتے چھپاتے پناہ ڈھونڈ رہے تھے... شاہی فرمان کا فائدہ قاضی اٹھا رہے تھے... گجرات کے وکٹوں نے

قاضیوں سے سمجھوتہ کر لیا اور انہیں رشوتیں دے دے کر اپنے مندروں کو بچا لیا۔ لیکن تبھی کاشی سے آوازیں آنے لگیں... کاشی وشوناتھ مندر مسمار ہو گیا، مسمار ہو گیا! مغل بادشاہ نے ہم ہندوؤں پر حملہ کیا ہے، ہمارے اعتقاد اور مذہب پر حملہ کیا ہے...

—بدلہ! بدلہ! ہر ہر مہادیو! اللہ اکبر!

تبھی اپنی چھڑی پکڑے شمبھو ناتھ پانڈے آ کر عدالت پر چیخ پڑے — ادیب! تم سمجھدار آدمی ہو... یہ کیا کر رہے ہو۔ اس خونریزی، اس نفرت کو روکو! اور ہندوستان کو سچ بات بتاؤ کہ اورنگ زیب نے کاشی وشوناتھ کے مندر کو کیوں توڑا؟... وہ زمانہ اور تھا... پٹا بھی سیتا رمیا نے اپنی کتاب 'فیدرس اینڈ اسٹونس' میں لکھا ہے کہ — ''معاصر شاہی روایت کے مطابق، جب مغل شہنشاہ کسی سفر پر نکلتے تھے تو اُن کے ساتھ راجہ اور سامنتوں کی کافی بڑی تعداد چلتی تھی اور اُن کے ساتھ اُن سب کا اَنت پور بھی چلتا تھا۔ کہنا نہ ہوگا کہ مغل دربار میں ہندو سامنتوں کی تعداد بہت تھی۔ جب اورنگ زیب بنارس کے قریب صوبے سے گزر رہا تھا تو بھلا کیا ایسا کوئی ہندو ہوتا جو دلی جیسی ریاست سے آ کر گنگا اشنان اور وشوناتھ کی زیارت کے بغیر چلا جاتا، بالخصوص عورتیں۔ لہٰذا سبھی ہندو درباری اپنے خاندان کے ساتھ گنگا اشنان کرنے اور وشوناتھ کی زیارت کے لیے مندر آئے۔ وشوناتھ کی زیارت کر کے جب لوگ باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ قافلے کی ایک رانی غائب ہے۔ اُس رانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کچھ کی رانی تھی۔ لوگوں نے انہیں مندر میں جاتے دیکھا تھا، لیکن مندر سے باہر آتے کسی نے نہیں دیکھا... جب سختی اور ہوشیاری سے اس کی تلاش کی گئی تو مندر کے نیچے ایک تہہ خانے میں، انہیں کپڑے اور زیور کے بغیر، خوف سے پریشان وہ رانی دکھائی پڑیں۔ جب اورنگ زیب کو پنڈوں کی یہ کالی کرتوت معلوم ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوا اور بولا — جس مندر کے تہہ خانے میں اس طرح کی ڈکیتی اور زنا ہو، وہ مندر خدا کا گھر نہیں ہو سکتا اور اُس نے اُسے فوراً گرانے کا حکم دیا۔ حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ لیکن مندر گرائے جانے سے رانی بے حد دکھی ہوئی اور اُس نے شہنشاہ کے پاس پیغام بھیجا کہ اس میں مندر کا کیا قصور، شرارتی تو پنڈے ہیں۔ رانی نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اُس مندر کو پھر سے تعمیر کر دیا جائے۔ اورنگ زیب نے اپنے مذہبی عقیدے کی وجہ سے، جس کا ذکر اُس نے اپنے 'بنارس فرمان' میں کیا ہے 'کہ نئے مندر نہیں بنائے جا سکتے' اس کے لیے نیا مندر بنوانا ممکن نہ تھا، لہٰذا اُس نے مندر کی جگہ پر مسجد کھڑی کر کے رانی کی خواہش پوری کی۔

ادیب نے احترام سے پانڈے جی کی طرف دیکھا۔

—تو ادیب! یہ پٹا بھی سیتا رمیا کا پیش کردہ ایک واقعہ ہے۔ یہ واقعہ کتنا تاریخی ہے، یہ کہنے

کے لیے فی الحال کوئی ذریعہ نہیں ہے... اگر ایسا واقعہ حقیقت میں ہوا تھا تو اورنگ زیب ہی نہیں، کوئی بھی انصاف پسند حکمراں یہی کرتا۔ اگر اس واقعے کے پس منظر میں دشوناتھ مندر گرایا گیا تو اس کے لیے اورنگ زیب پر کسی طرح کا کوئی الزام نہیں لگایا جاسکتا... بولتے ہوئے پانڈے جی تھک کر اپنی چھڑی کا سہارا لینے لگے۔

—عالی جاہ پانڈے جی! آپ میں خواہش کی کمی نہیں ہے۔ آپ میں بھائی چارگی کی بھی کمی نہیں ہے، لیکن تاریخ کے احساس کو گاندھی وادنے جتنا آسان کرنا چاہا، اتنا ہی وہ رومانی ہوتا گیا... تلخ سچائیوں کا سامنا کرنے، انہیں پہچان کر قبول کرنے اور تب اُسے نقصان دہ اعلان کرنے کا جو حوصلہ ہونا چاہیے اُسے آپ کی یہ نیک خواہش لیپاپوتی کرکے کھوکھلا بنا دیتی ہے!... خیر... پتا بھی سیتا رمیا کو حاضر کیا جائے!

—جی میں حاضر ہو گیا ہوں! کھادی کی دھوتی سے اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے سیتا رمیا جی نے اپنی حاضری دی۔

—پانڈے جی نے آپ کے حوالے سے جو واقعہ بیان کیا ہے اس کا ذریعہ کیا ہے؟ عدالت نے پوچھا۔

اس واقعہ کا ذریعہ لکھنؤ کے ایک معزز مسلمان ہیں، جن کے پاس ہاتھ کا لکھا ایک صحیفہ تھا، جس میں اس واقعہ پر روشنی ڈالی گئی ہے... ان جناب کی بے وقت موت ہو گئی، اس لیے اس کا مناسب جائزہ نہیں لیا جاسکا اور نہ وہ صحیفہ روشنی میں آسکا ہے! سیتا رمیا نے کہا۔

—تو جناب! آپ نے اُسے سچ کیسے مان لیا؟

—یہ واقعہ سچ ہو بھی سکتا ہے! پانڈے جی نے تھوڑی تیزی سے کہا۔

—عالی جاہ! میری گذارش ہے کہ گاندھی وادی دانشوروں نے بھائی چارگی اور ایکتا کے جو آسان نسخے نکالے ہیں، وہ جاہل اور ادھ کچرے ہندوستانی کے لیے کارگر ہو سکتے ہیں— آج کے ذہین، منطقی ہندوستانی کے لیے آپ کی یہ جو بے حد آسان سادگی پسندی ہے، اسی نے ہندو کٹھ ملاؤں اور ہندوتو وادیوں کو غلط تاریخ لکھنے کی چھوٹ دی ہے!... ویسے اورنگ زیب ایک بھیانک ذہنی پیچیدگی اور خلل بھرے دماغی جنون کا شکار تھا کیونکہ اس نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اپنے باپ کو قید کیا اور اپنے بھائیوں کو مارا تھا۔

—لیکن اس کی ایک وجہ تھی! ایک بڑی مہذب آواز آئی۔

—آپ؟ آپ کون؟

—جناب! میں ہی نعمانی ہوں!

—اردلی! شبلی نعمانی صاحب کو کرسی دو... اور حضور! میں آپ کو آداب کرتا ہوں! عدالت شبلی نعمانی کو سامنے پاکر کھڑی ہو گئی اور جب تک اُن کے لیے کرسی نہیں آئی، کھڑی رہی۔

حضور فرمایئے! عدالت نے شبلی نعمانی سے گذارش کی۔

—جی، شکریہ! یہاں، آپ کی عدالت میں حاضر عالمگیر پر جتنے جرم عائد کیے گئے ہیں، وہ غلط تو نہیں، لیکن اُن کے حوالوں کو سمجھنا ضروری ہے!

تبھی مورخ شری رام شرما نے مداخلت کی— عدالت عالیہ! شبلی نعمانی صاحب نے اورنگ زیب کو اپنے بچے کی سی سرپرستی دی ہے، کیونکہ شبلی نعمانی خود ایک خداپرست ہندوستانی ہیں، لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں جو بھی تاریخ لکھی گئی، اُن میں وہی سب لکھا گیا جو اورنگ زیب نے چاہا اور شبلی نعمانی صاحب انہی درباری تواریخ کے حامی ہیں... ویسے اورنگ زیب تو خود یہاں موجود ہے، اگر اس کے پاس ضمیر باقی ہے تو یہ خود بتائے گا کہ اس نے تواریخ میں صرف اپنے رخ کو رکھا اور وہی لکھوایا جو اسے راس آیا...

—یہ غلط بھی ہے اور صحیح بھی! عالمگیر نے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

—اس کا مطلب؟

—یہی کہ جو میں نے کیا وہ غلط بھی تھا اور صحیح بھی تھا۔ سرزمین ہند کی نظر سے میں نے بہت کچھ غلط کیا، جو مجھے شاید نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اسلامی ملت کی نظر سے جو کچھ میں نے کیا، وہ شاید صحیح تھا! اورنگ زیب بولا۔

—اصل میں ادیب عالی! ہمیں اورنگ زیب کی ایک نفسیاتی گتھی کو گہرائی سے سمجھنا چاہیے۔ ہوتا یہ ہے کہ یا تو مذہبی لوگ آسانی سے مذہب کی طرف جاتے ہیں یا پھر وہ لوگ مذہب کی طرف دوڑتے ہیں جو جانتے ہیں کہ مذہب کے لحاظ سے ہم نے گناہ کیا ہے۔ اورنگ زیب نے ہندوستان کا تاج حاصل کرنے کے لیے جو ظلم ڈھائے تھے، اس کی گتھی ہی اس کا احساس گناہ بن گیا اور احساس گناہ کی اس کی یہی ذہنی پیچیدگی اُسے مذہب کی طرف لے گئی اور وہ کٹھ ملاؤں کا غلام بن گیا! شری رام شرما نے کہا— اور یہ بھارت میں ہندوؤں کا دشمن بن گیا۔

—ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہندو اس کے دشمن بن گئے ہوں اور تب دشمنی، نفرت، شہنشاہ، رعایا، فاتح اور مفتوح، مذہب و فرقے کی لڑائیوں کا یہ نیا سلسلہ شروع ہوا ہو... کیونکہ تب تک باقی سادھوؤں کی روایت شروع ہو چکی تھی، جن کے اپنے فرقے اور اکھاڑے تھے، جو چھاؤنیاں کہلاتے

تھے... یہ چھاؤنیاں تیرتھ استھانوں اور بڑے مندروں میں قائم کی گئی تھیں۔ یہ چھاپا مار سادھو ایک فوجی طاقت کے طور پر متحد ہوئے تھے۔ اورنگ زیب کے دور میں جو اسلامی سلسلہ شروع ہوا... اس کے ردِعمل میں ہندو ضرور متحد ہوئے ہوں گے اور لگتا ہے کہ اس متحدہ سادھو فوجی طاقت کو تباہ کرنے کے لیے اورنگ زیب نے خاص طور سے مندروں کو گرایا ہوگا...

— لیکن اس دلیل کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کوئی مدد نہیں کرتی... اور پھر میں پانڈے جی اور پتا بھی سیتا رمیا سے یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ کاشی وشوناتھ مندر کی تباہی میں کچھ کی رانی کی من گڑھت کہانی جوڑ دی گئی، لیکن متھرا، اڑیسہ، سومناتھ، اجین کے مندروں میں کون سے زنا کے واقعے ہوئے تھے، جن کی وجہ سے انہیں توڑا گیا؟ شری رام شرما نے پوچھا۔

— اس کا جواب میں دیتا ہوں۔

— آواز کی طرف سب نے دیکھا تو حضرت شبلی نعمانی بول رہے تھے۔ سب کی آنکھیں اس طرف اٹھ گئیں۔

— اس کا جواب یہ ہے کہ اس دور میں مندر اور مسجد عبادت گاہوں کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے مذہبی صلاح مشورے کے مراکز بھی ہوا کرتے تھے۔ ان عبادت گاہوں میں بغاوت کی سازشیں ہوتی تھیں۔ ایرانی، ہندوستانی اور انگریز مورخین کا یہ کہنا غلط ہے کہ عالمگیر نے مندر توڑے، اس لیے بغاوت ہوئی، صحیح وجہ یہ ہے کہ بغاوت ہوئی اس لیے مندر توڑے گئے۔

— تو ہندوؤں کی پاٹھ شالائیں کیوں بند کی گئیں؟

— اس لیے کہ اُن میں ہندو پنڈت، مسلمان بچوں کو اپنے مذہبی سائنس پڑھانے لگے تھے۔ شاہجہاں کے دور میں دارا شکوہ کی شہ پر ہندوؤں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے... آخر مسلمانوں کو ہندو دھرم شاستر اور وگیان پڑھانے کا مطلب کیا تھا... دارا شکوہ کی وجہ سے ہندوستان میں ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی حکمت عملی شروع ہوئی تھی... دارا، اسلام مخالف تھا! شبلی نعمانی نے زور دے کر کہا۔

— یعنی اورنگ زیب نے اسلام کے نام اور اس کے اصولوں پر سلطنت چلانے کی حکمت عملی طے کی تھی۔ اسی لیے اورنگ زیب نے ہندوؤں پر جزیہ نافذ کیا تھا! شری رام شرما نے سوال کیا۔

— وہ اس لیے کہ اکبر کے دور سے لے کر جہانگیر کے دورِ حکومت تک ہندوؤں کو سر پر چڑھا لیا گیا تھا اور وہ یہ بھولنے لگے تھے کہ مغلوں نے ہندوستان کو فتح کیا ہے۔ شاہجہاں نے اس غلطی کو سدھارا لیکن شاہجہاں کے آخری دنوں میں دارا شکوہ نے انہیں اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ہندو

مسلمانوں کی برابری کرنے لگے تھے، اس لیے جزیہ لگا کر انہیں یہ بتانا اور جتانا ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اوقات میں رہیں... اس کے علاوہ شاہجہاں کے دورِ حکومت میں جو بے تحاشہ خرچ مساجد، قلعے اور تاج محل بنوانے میں ہوا تھا، اس کی وجہ سے شاہی خزانہ خالی ہو گیا تھا...

— ان میں سے کون سی وجہ اہم تھی عالمگیر؟ ادیب نے پوچھا— تم ہندوؤں کو اُن کی اوقات بتانا چاہتے تھے یا خالی ہو گئے خزانے کو بھرنا چاہتے تھے؟

— وہ بھی صحیح تھا اور یہ بھی صحیح ہے! اورنگ زیب نے کہا— میرے حق میں یا میرے خلاف جو کچھ بھی کہا جاتا ہے، اس کی دونوں سمتیں صحیح ہیں...

— تم عجیب انسان ہو!

— عجیب نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا! ہر شہنشاہ عجیب ہوتا ہے، کیونکہ وہ شہنشاہ ہوتا ہے... تم ادیب لوگ تو صرف اُس کے آستانوں میں بیٹھ کر کہانیاں گڑھتے رہتے ہو! تمہاری اصلیت اور اوقات مجھے پتہ ہے۔ اورنگ زیب نے بڑے تلخ انداز میں کہا، لیکن جو کچھ اس نے کہا بہت شائستگی سے کہا۔

اس کی مسکراہٹ میں زہر سا تھا۔ پھر وہ خود ہی بولتا چلا گیا، بڑے نرم لہجے میں۔

— مجھے بتائیے ادیب عالی! وہ بولا۔

— ادیب عالی! یہ تخاطب تم کر رہے ہو، جو ابھی ایک لمحہ پہلے ادیبوں کے بارے میں تلخ کلامی کر رہے تھے۔

— حضور! میں بابر یا اکبر نہیں ہوں... میں وقت کا مارا ہوا ایک شہزادہ تھا، جسے ہندوستان کا تخت چاہیے تھا۔ اس کے لیے میں نے ہر طرح کی کوششیں کیں، یہ کوششیں غلط بھی نہیں تھیں، کیونکہ مغلیہ خاندان میں تخت حاصل کرنے کے شرائط اور قوانین طے نہیں تھے۔ میں نے اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو مروا کر اور حضرت ابا حضور کو قید کر کے وہی کیا جو میرے ابا حضور حضرت شاہجہاں نے اپنے دور میں کیا تھا... ہر دور کے تصور کو اس کے وقت کی روایت کی بنیاد پر طے کیجیے...

تبھی تاریخ کے کروڑوں صفحات سے چیختی ہوئی آوازیں آنے لگیں—

— اورنگ زیب، تم ظالم ہو! تم نے پوستے کا پانی پلا پلا کر مراد کو مارنا چاہا... جب وہ تندرست شہزادہ افیم کے پانی سے نہیں مرا تو تم نے اُسے جلادوں سے مروا دیا... اپنے اُس چھوٹے بھائی کو جسے تم نے اللہ اور پاک قرآن کی قسم کھا کر اپنا شہنشاہ قبول کیا تھا!

— یہ غلط ہے! شبلی نعمانی نے مداخلت کی— اصل بات یہ ہے کہ دارا کی فوجوں کو ہرانے کے بعد...

—لیکن وہ دارا کی فوجیں نہیں، شہنشاہ شاہجہاں کی فوجیں تھیں! مورخ شری رام شرما نے ٹوکا۔

—جی نہیں، کیونکہ دارا نے شاہجہاں کی بیماری کی وجہ سے انہیں اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ اس لیے شاہی فوجیں دارا کے حکم سے نکلی تھیں اور اورنگ زیب و مراد کی طاقت نے انہیں توڑا تھا۔ مراد ایک شیر کی طرح لڑا تھا... فتح حاصل کرنے کے بعد اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ دارا، شجاع اور اورنگ زیب کو تباہ کر کے وہ ہندوستان کے تخت کو حاصل کرے گا۔ اسی لیے اس نے اورنگ زیب کی فوج کے اہم فوجی سرداروں کو توڑنا شروع کیا۔ انہیں خلعتیں، انعام اور زیادہ تنخواہیں دے کر اس نے اپنی طرف انہیں ملا لیا۔ اس کے ان ناپاک ارادوں کا بدلہ اورنگ زیب نے لیا۔ شبلی نعمانی نے اپنی دلیل پیش کی۔

—اور عاقل خاں مورخ کے مطابق اس کا بدلہ لینے کا طریقہ اورنگ زیب نے یہ نکالا کہ پیٹ درد کی شکایت کر کے مراد کو اپنی چھاونی میں بلوایا! اُسے ضرورت سے زیادہ شراب پلائی اور بے ہوشی کے عالم میں اس کے پاس ایک کسبی بھیج کر اُسے غیر مسلح کر دیا۔ تب بے ہوشی اور کسبی کے ساتھ مستی کرنے کی مدہوشی میں اس کے خیمے میں داخل ہو کر شیخ میر نے اُسے زنجیروں سے جکڑ کر اورنگ زیب کا قیدی بنا لیا! مورخ شری رام شرما نے طنز سے حقیقت بیان کی۔

—ہاں! عالمگیر نے یہ کیا... اُسے زنجیروں سے باندھ کر صرف قید کیا... بہتر تو یہ ہوتا کہ عالمگیر اس کا سر قلم کر کے ختم کر دیتا... تب ہم اورنگ زیب کی دوراندیشی کو زیادہ مناسب سمجھتے! شبلی نعمانی بولے تو عدالت چیخ اٹھی—

—شبلی نعمانی صاحب! لگتا ہے آپ دانشور انسان نہیں، سمجھدار اور دانشور انسان ہونے سے پہلے آپ مسلمان ہو جاتے ہیں! عدالت نے شبلی نعمانی کو ٹوکا— یہی آپ کی دقت ہے...

—ہاں ہے! شبلی نعمانی نے کہا— کیونکہ میں مسلمان ہوں! ہوں!

—لیکن آپ مسلمان نہیں، انسان پیدا ہوئے تھے اور جب تک آپ معصوم انسان تھے اور آپ کے کان میں کلمہ نہیں پھونکا گیا تھا، تب تک آپ مسلمان نہیں تھے... پھر آپ کا ختنہ ہوا، تب بھی آپ سمجھدار نہیں تھے... مسلمان نہیں تھے؟ آپ کو مسلمان بنایا گیا... عدالت ابھی اپنی بات کہہ ہی رہی تھی کہ ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ عدالت میں لوگ چیختے چلانے لگے— ہمارے مذہب کی توہین کی جا رہی ہے۔ یہ ہم برداشت نہیں کریں گے!

—خاموش! کوئی مذہب انسان سے اوپر نہیں ہے... پہلے انسان پیدا ہوا پھر مذہب! ادیب چیخا۔

—تو شبلی نعمانی نے بات کا رخ پلٹنے کی کوشش کی— ادیب عالی، بات عالمگیر کی ہو رہی تھی... اس بات کو پورا کر لیا جائے۔ خود عالمگیر یہاں موجود ہیں... تو میں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ ان کا بڑکپن تھا کہ سلطنت کی ساری طاقت ہونے کے باوجود عالمگیر نے اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان نہیں کیا اور یہ بھی ان کا بڑکپن تھا کہ انہوں نے اسلامی شہنشاہ کے طور پر حکومت کی۔ اگر اکبری روایت چلتی رہتی تو تیموری خاندان کی سلطنت ایک غیر اسلامی حکومت میں تبدیل ہو جاتی۔ عالمگیر نے جب حکومت کی ذمہ داری سنبھالی تب ایک تہذیب اور مذہب کے سارے طور طریقے قریب قریب ختم ہو رہے تھے۔ شاہی دربار میں بھی لوگ ہندوؤں کے بیہودہ دھوتی نما پاجامے اور پگڑیاں پہن کر حاضر ہونے لگے تھے... ہندو چرن اسپرش یا سجدہ کرنا تب درباروں میں رائج تھا۔ غیر اسلامی جھروکہ درشن رائج تھا۔ ہندو لوگ مسلمان لڑکیوں سے کھلے عام شادیاں کرنے لگے تھے... عالمگیر نے ان تمام غلط اور غیر اسلامی روایات کو بند کیا اور ہندوؤں کی خوشنودی کی حکمت عملی کو ختم کیا۔ اسی لیے عالمگیر نے شرعی قانون کا صحیفہ تیار کرایا تاکہ 'فتاویٰ عالمگیری' کے مطابق انصاف عطا کیا جا سکے۔

—یعنی آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اورنگ زیب، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں سے زیادہ بڑا مسلمان ہے!

—بالکل... عالمگیر نے اپنے جڑوں کی تلاش کی!

—یعنی اس کی جڑیں ہندوستان میں نہیں تھیں؟

—تو کیا وہی تیموری خون، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، دارا، شجاع اور مراد کی نسوں میں نہیں تھا؟

—تھا، لیکن انہوں نے اپنے مذہب کی ضرورتوں کو نظر انداز کیا... مذہب کی طاقت کا فائدہ نہیں اٹھایا! اس نے مذہب کی تاثیر کو شمشیر کی طاقت بخش دی... اسی لیے تو میں اس شہنشاہ کو اورنگ زیب نہیں، عالمگیر پکارتا ہوں... کیونکہ راجہ جسونت سنگھ اور دارا کو ہرا کر جب عالمگیر آگرہ پہنچا تو خود شہنشاہ شاہجہاں نے اپنے اس دلیر بیٹے کے لیے عالمگیر نام کی چشتینی تلوار نذر کی تھی!

شبلی نعمانی بڑے جوش و خروش سے بتا رہے تھے— مذہب کی طاقت کا اگر کسی نے پہلی بار استعمال کیا تو وہ صرف وہی بہادر عالمگیر تھا!

—کہیں ایسا تو نہیں کہ اورنگ زیب نے اپنی کمزوریوں اور زیادتیوں کو چھپانے کے لیے اسلام کا سہارا لیا ہو؟... ادیب نے پوچھا تو ایک بزرگ مورخ اٹھ کر کھڑے ہو گئے—

—حضور، اس سے پہلے کہ آپ میرا تعارف پوچھیں، میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔ میرا نام محمد حبیب ہے۔ میں ہندوستان کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر تھا۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ وقت

پڑے یا اپنی ضرورت کے مطابق اپنے ذاتی اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے جنھوں نے اسلام کا سہارا لیا۔ اسلام کا استحصال صدیوں کیا گیا اور آج بھی جاری ہے۔ پیغمبر حضرت محمدؐ کے دور میں جو تلوار انصاف اور حفاظت کے لیے اٹھائی گئی تھی، اُس کا غلط استعمال کیا گیا، بعد میں وہ تلوار انتقام اور ذاتی مفاد کے لیے اٹھائی جانے لگی... اور اُسے اسلام پرستی کا نام دیا گیا! سن رہے ہیں آپ شبلی نعمانی صاحب؟ محمد حبیب نے آگے کہا—

—اور میں عدالت کے سامنے یہ بات بھی رکھنا چاہوں گا کہ یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ محمد بن قاسم سے لے کر بابر تک... ایک ہزار برسوں تک جو بھی حملے ہوئے، وہ ہندوستان کے ہندوؤں پر ہوئے۔ ویسے یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اسلام فقط ایک مذہب کا ظہور نہیں تھا۔ اسلام ایک ریاستی اقتدار کی شکل میں بھی ابھرا تھا اور ریاستی اقتدار کے قاعدے قانون الگ ہوتے ہیں، مذہب کے الگ۔ میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہوں گا، لیکن شبلی نعمانی صاحب کی اسلامی ذہنیت کا جواب اتنا ہی ہے کہ اسلام کو قبول کرنے والا کوئی بھی حملہ آور صرف مسلمان تھا، لیکن وہ اسلام کے نام پر ہندوؤں کے خلاف جہاد لے کر بھارت میں نہیں آیا تھا۔

—یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ حضرت شبلی نعمانی نے مداخلت کی۔

—محمد بن قاسم سے لے کر بابر تک جو بھی مسلمان حملہ آور ہندوستان میں آیا، عہد وسطی کی شہرت اور دولت کے لیے ہندوستان کو لوٹنے آیا۔ وہ اسلام کے غازی نہیں، وہ صرف اپنی سلطنتوں کے، اپنے ذاتی مفادات کے بانی تھے۔ اسلام کو بیچ میں مت گھسیٹیے... اسلام ایک مذہب کی شکل میں الگ تھا، لیکن جو مسلمان بنا اُس نے اپنی لوٹ مار کے لیے اسلام کا پرچم اٹھایا! ہاں، یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جو لٹیرے فارس کے ثقافتی اور مذہبی انقلاب کے بعد بھارت پر حاوی ہوئے، وہ مسلمان تھے... ہندوستان پر اسلام نے نہیں، مسلمانوں نے اپنے عہد وسطی کے شعور اور جاگیردارانہ اقتدار کے تحت مفادات کو حاصل کرنے کے لیے حملے کیے تھے! اس سچائی کو باریکی سے دیکھنا پڑے گا کہ ہندوستان کے ہندوؤں پر اسلام نے نہیں، اسلام قبول کرنے والے مسلمانوں نے حملے کیے تھے، کیونکہ انھوں نے اسلام میں موجود سیاسی طاقت کی اہمیت کو پہچانا تھا اور انھیں لگا تھا کہ اسلام کے نام پر وہ اپنی فوجوں کو لام بند کر سکتے ہیں... اس کے باوجود ساتویں صدی سے سولہویں صدی تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان خود مسلمان سے لڑتا رہا! اگر عدالت عالیہ چاہے تو امیر خسرو، برنی اور فرشتہ جیسے ادیبوں اور مورخین کو بلا کر حقیقت جان سکتی ہے! محمد حبیب بولتے بولتے ہانپ کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

—امیر خسرو، برنی اور فرشتہ کو باعزت عدالت میں حاضر کیا جائے! ادیب نے حکم دیا۔

—سر! لیکن دارا شکوہ اپنی دکھ بھری داستان پیش کرنا چاہتے ہیں! اردلی نے ادب سے کہا۔

—لیکن بھوانی سین گپت کب سے انتظار کر رہے ہیں، ماضی کے علاوہ ہمیں اس دور کی نبض پر بھی تو ہاتھ رکھے رہنا ہے، نہیں تو حال بھی ماضی کی تاریخ کی کہانی بن جائے گا... لیکن میں اتنے ہی ماضی کو دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہوں جو اس حال پر اپنا کالا سایہ ڈال کر ہماری آج کی زندگی میں نفرت اور انتقام کے پاکستانوں کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہے! ادیب نے اپنے کاغذات، کتابوں، دستاویزوں اور تاریخ کے انبار کے درمیان سے اٹھتے ہوئے کہا— دارا شکوہ اور امیر خسرو، برنی اور فرشتہ صاحب سے بات کر لو۔ جو پہلے آنا چاہیں، انھیں باعزت لایا جائے... میں سب کو خوش آمدید کہوں گا، خاص طور سے امیر خسرو صاحب کو، کیونکہ وہ ضلع ایٹہ کے ہیں اور میں مین پوری کا۔ دونوں ضلع ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے بیٹھے ہیں۔ دوسری بات یہ آگرہ میں ابھی ہوئی ہے جہاں مرزا غالب، میر اور نظیر پیدا ہوئے... میرے پاس تو ویدک آریوں سے لے کر، کبیر، امیر خسرو، اور غالب میر تک کی وراثت موجود ہے... اور ادیب نے پلٹ کر بھوانی سین گپت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا— کیوں دوست! ہم دارا شکوہ کو بلا لیں؟

—دارا شکوہ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر کالیکا رنجن قانون گو کو بھی بلوایے، کیونکہ شبلی نعمانی نے اورنگ زیب کو ایک پاک صاف اسلامی حکمراں کے طور پر پیش کیا ہے... پروفیسر حبیب بول رہے تھے— میں کہتا ہوں کہ ہفتے میں تین دن روزہ رکھ کر قرآن شریف لکھ کر کے اور غازیوں کی ٹوپیاں سل کر بھی اورنگ زیب اسلام کا پیروکار نہیں تھا۔ اس نے اسلام کو اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کیا تھا۔ نہیں تو کیا وجہ تھی کہ اُس نے اپنے بھائیوں دارا شکوہ اور مراد کا قتل کرا دیا... اُس نے اپنے بڑے بھائی شجاع کو ہندوستان سے برما کی طرف کھدیڑ کر بے دخل کر دیا۔ اُس نے اپنے باپ شہنشاہ شاہجہاں کو زندہ رہتے قید کیا اور خود ہندوستان کا بادشاہ بن بیٹھا۔ یہ تو مغلیہ خاندان یا تیموری خاندان کی روایت نہیں تھی... کیا یہ حرکتیں اسلام یا شریعت کے مطابق تھیں؟ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اورنگ زیب مسلمان تو تھا، مگر وہ اسلام پرست نہیں، ایک ظالم بادشاہ تھا! محمد حبیب نے کہا تو ادیب نے اردلی کو حکم دیا—

—دارا شکوہ، مراد، دارا کے بیٹے سلیمان شکوہ اور مورخ کالیکا رنجن قانون گو کو فوراً حاضر کیا جائے!

حکم کی تعمیل کرنے کے لیے اردلی نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ نیویارک ٹائمس کی کرس ہیجیج ہانپتی ہوئی حاضر ہوئی۔

—پتہ ہے آپ کو! مذہبی کٹر لوگ مصری بادشاہوں کی گھاٹی میں کیا کر رہے ہیں؟... دریائے نیل رو پڑی ہے... اس کے آنسوؤں کے سیلاب کا پانی مصر کے ہر شہری کی آنکھوں میں بھر گیا ہے... اُن کی آنکھیں ڈبڈبا رہی ہیں... اور وہ آنسو بھری آنکھوں سے اپنی تہذیب کی تباہی دیکھ رہے ہیں!... بادشاہوں کی وادی میں تین صدیوں سے لیٹے ہوئے فراعنہ اپنے اہراموں میں خوف سے تھر تھر کانپ رہے ہیں... وہ فراعنہ جن سے وسط ایشیا اور جنوب مشرقی یوروپ تھراتا تھا... جن کی دولت، خزانے اور بہادری کے تذکرے پوری دنیا میں ہوتے تھے... جنہوں نے ہندوستانی اور چینی تہذیب کے فروغ کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسانی تہذیب کی بنیاد رکھی تھی! آج وہ پوری تاریخ اور فخریہ تہذیب مسلمان کٹر پنتھیوں اور دہشت گردوں کے خوف سے کانپ رہی ہے... الجماعة الاسلامیہ اور جہاد جیسی انتہا پسند اسلامی تنظیمیں عام آدمی کی زندگی پر قہر برپا کر رہی ہیں!

—ہاں، ہاں! تم لوگ قہر کی بات کرتے ہو... ہم قیامت برپا کریں گے اور مصر میں ہم وہ کچھ بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے جو اسلام سے پہلے کا ہے! ہم اُسے برباد کر کے رہیں گے! یہ آواز عین وقت پر دور دراز امریکہ سے آئی— وہاں مصر کا ملا شیخ عمر عبدالرحمٰن چیخ رہا تھا، جو امریکہ میں بغیر اجازت داخل ہو گیا تھا اور غریب، اَن پڑھ مسلمانوں کو اسلام کے نام پر بھڑکا رہا تھا۔

—اس شیخ عمر عبدالرحمٰن کو یہاں حاضر کیا جائے! عدالت نے کہا۔

—لیکن حضور، وہ تو فی الحال امریکیوں کی قید میں ہے! اردلی نے بتایا۔

—اوہ، ٹھیک ہے! لیکن اس کی آواز کو مت روکو! آواز آنے دو! عدالت نے حکم دیا۔

ملا شیخ عمر عبدالرحمٰن کی آواز پھر دہاڑنے لگی— ہاں، ہم اسلام پرست ہیں۔ ہم نے ہی انور سادات کو مارا تھا کیونکہ اُس نے اسرائیلیوں سے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کیا تھا... اب ہم حسنی مبارک اور حسن الالسلمی کی حکومت کو بھی معاف نہیں کریں گے... مصر تو ہے کیا، وہاں کی حکومت تو ہم حاصل کر کے رہیں گے، لیکن ہم تو پورے شمالی افریقہ اور جنوبی یوروپ کو بھی ہلا کر رکھ دیں گے... الجیریا اور ترکی کو بھی ہم معاف نہیں کریں گے... کیونکہ یہ ملک مسلمان تو ہیں، لیکن یہ لا مذہب ہو گئے ہیں، انہیں ہم مذہب کے راستے پر لائیں گے!

—مذہب کا یہ راستہ نہیں ہے! تم اسلام کے نام پر ہماری تہذیب و تمدن اور تاریخ کو نہیں مٹا سکتے! میں بھی مسلمان ہوں، لیکن میں اپنی تاریخ سے انکار نہیں کرتا... مصر کے پاس صدیوں پرانی ثقافتی اور فکری روایت ہے... تمھیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم ہمارے فراعنہ، نیل تیکوں اور عیسائیوں کی اس وراثت کو مٹا دو! اسے مٹا کر تم اسلام کو بڑا کیسے ثابت کر سکو گے؟ انہیں مقابلے میں رکھو کر ہی

ہم اسلام کی سوغات کو سمجھ سکیں گے، کہ کیوں اسلام بڑا ہے؟ کیوں اتنا عظیم ہے...

عدالت میں آواز تو آ رہی تھی، لیکن وہاں موجود لوگ آواز والے شخص کو نہیں دیکھ پا رہے تھے— اردلی نے مشکل حل کر دی—

—سر! پہلی آواز تو امریکہ سے ملا شیخ عمر کی تھی۔ وہ آپ نے سنی۔ اس دوسری آواز کے مالک ہیں مصر کے قاضی، جج سعید اشماوی! میں دیکھ رہا ہوں کہ سعید اشماوی اپنے خیالات کے لیے خطرہ اٹھاتے ہوئے مسلح محافظ دستے سے گھرے ہوئے ہیں، کیونکہ سعید اشماوی جیسے دانشور کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی مسلسل جاری ہے اور وہ اس وقت بھی قاہرہ کے اپنے گھر میں، محافظ دستے کے گھیرے میں ہیں تاکہ جابر کٹر پنتھیوں کی دھمکی سچ مچ عمل میں نہ آ جائے!

—اوہ! عدالت چونکی۔

تبھی الاہرام اخبار نے خبر دی—

—فراعنہ کے مندروں اور غازہ کے پیرامڈ میں ابھی ابھی بم دھماکہ ہوا ہے... غازہ کی ریت دھوئیں کے بادلوں کی طرح مینار کی شکل میں آسمان کی طرف اٹھتی جا رہی ہے...

—یہی ہوگا ادیب! یہی ہوگا۔ دریائے نیل پر کشتیوں میں بیٹھ کر مصر کی عظمت اور حسن کو دیکھنے والے ہیں گورے سیاحوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے الجماعۃ الاسلامیہ کا کٹر دہشت گرد چیخا— یہی ہوگا! یہ یہودی اور عیسائی یہاں ناچ دیکھنے آتے ہیں... جسم کے بازار میں یہ کھلے عام ننگے ہو کر گھومتے ہیں اور فراعنہ کے مندروں میں جا کر یہ پتھروں اور منتروں سے پوجا کرتے ہیں... ہمارا اسلام اسے قبول نہیں کرتا... ہم تو ان غیر اسلامی نشانوں، علامتوں، پرانے تہذیب کے پرچھوں کو مٹانے اور ختم کرنے میں دسویں صدی سے لگے ہوئے ہیں! ہمارے علمائے دہر نے تو بھی اس اڑنے والے زنگی گھوڑے ابوالہول کی ناک توڑ دی تھی... پھر ہمارے شیوخ نے فراعنہ کے ان مندروں پر حملے کیے تھے...

—لیکن یہی قدیم مندر اور پیرامڈ غریب کو اپنے پتھر دیتے رہے ہیں تاکہ وہ اپنے گھر بنا سکیں... اور تمہارے وہی لالچی شیخ جنہیں تم اسلام کا علمبردار بتا رہے ہو، چودھویں صدی میں ان مندروں پیرامڈوں کو گرانے نہیں، وہ ان کے دھن دولت لوٹنے آئے تھے... وہ اسلام کے سپاہی نہیں، وہ اسلام کے نام پر لوٹ مار کرنے والے ڈاکو قبیلے تھے جنہوں نے اپنی اصلی پہچان چھپانے کے لیے مذہبی مبلغوں کے لبادے پہن لیے تھے! مسلح محافظ دستے سے گھرے قاضی سعید اشماوی نے انہیں للکارا— میں بھی قاضی ہوں... میں بھی اسلامی شریعت اور حدیث کے مطابق انصاف کرتا

ہوں... تم ان ڈاکوؤں کو جو ملاؤں کی پوشاک پہن کر آئے تھے، اسلام کا سپاہی کہہ کر اسلام کی توہین کر رہے ہو!

یہ تیز بحث جاری تھی کہ لکسر مندر کے شمال مشرق کی طرف ابوحجاج مسجد سے امام واحد محمد حنفی نے خوف زدہ آنکھوں سے جھانک کر دیکھا... یہیں اسی مسجد میں اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم ابوحجاج دفن ہیں... اور جن کی 'کشتی' کا جلوس آج بھی نکلتا ہے... ویسے ہی جیسے پرانے مصری اپنے بھگوان امن کی کشتی کا جلوس نکالا کرتے تھے...

اور امام واحد محمد حنفی اونچی آواز میں بولنے لگے — ہمیں اپنی زندگی، اپنے عقائد کے ساتھ جینے دو... یہ پرانے مندر، یہ پیرامڈ (اہرام) ہماری تہذیب کی علامت ہیں، انہیں مٹا دو گے تو کہاں سکون پاؤ گے؟ اس سے انکار کرو گے تو پیپرس کا کاغذ بنا کر فکری دنیا میں انقلاب کرنے کا ثواب کیسے کماؤ گے؟ ریمزے کے محل میں پیپرس کے ڈنٹھلوں کی طرح کھڑے، چھریلے ستون کے درمیان، دوپہر کی روشنی سے روشن امام واحد محمد بول رہے تھے — سنو! یہاں صدیاں بولتی ہیں... جب تک اپنے پرانے کھنڈروں کو تم پیار نہیں کرو گے، تب تک مستقبل کو کھنڈر ہونے سے نہیں بچا پاؤ گے ارے گنہگارو! ابوحجاج کی یہ پاک مسجد بھی اسی زمین پر کھڑی ہے جس میں پرانے گرجے اور فراعنہ کے مندروں کی بنیاد موجود ہے اور یہاں سے دریائے نیل کی طرف دیکھو — سامنے رومن فن تعمیر کے عالی شان مینارے کھڑے ہیں... یہ وہ جگہ ہے جہاں تمام تہذیبیں کندھے سے کندھا ملائے موجود ہیں... یہ ساری وراثت ہمیں بتاتی ہے کہ آج ہم جتنے جانکار اور سمجھدار ہیں، وہ انہیں کی وجہ سے ہیں!

— اور اسی وراثت کو دیکھنے کے لیے فرانسیسی تانا شاہ نپولین آیا تھا اور فراعنہ اور ریمزے کے ان مندروں اور اہراموں کے سامنے سجدہ ریز ہوا تھا۔ لوٹ کر وہ اپنے فرانسیسی فنکاروں، دانشوروں اور ماہرین آثار قدیمہ کو لایا تھا، اس لیے کہ انسان کی اس قدیم تہذیب کے بنیادی عناصر کو پہچانا اور جانا جا سکے۔ یہیں رومن اور یونانی آئے تھے... یونانی فلسفی اور مورخ ہیروڈوٹس آیا تھا اور مصری تہذیب کے اس معجزے کو اس نے جذب کیا تھا... اس نے کہا تھا کہ ان کھنڈروں، مندروں، ان بے جان پیرامڈوں میں ایک زندہ تہذیب سانس لے رہی ہے... سعید اشوامی نے کہا۔

— کچھ بھی ہو ہم اس ماضی سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتے جو اسلامی نہیں ہے۔ یہ اہرام، یہ ابوالہول مورتیاں ہیں... ہمارے رسولؐ نے مورتیوں کو قبول نہیں کیا، ہم بھی انہیں قبول نہیں کرتے... ہم ان مورتیوں کو جو اہرام اور ابوالہول کی شکل میں یہاں موجود ہیں، انہیں توڑ کر اور مٹا کر ثواب

کے حقدار بنیں گے... یہ اہرام، یہ مندر، یہ ابوالہول تب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غزہ کے ریگستان میں دفن ہو جائیں گے! اسا تم نے... انہیں ہم انسان کے حافظہ سے ختم کر دیں گے! یہ دھمکی مصر کا ایک معمولی دہشت گرد ملا شیخ علی یحییٰ دے رہا تھا۔

— یعنی تم مصر میں بھی اپنا الگ مصر بنانا چاہتے ہو۔ تم مسلمان اور مسلمان کے درمیان بھی پاک اور ناپاک کی تفریق کرنا چاہتے ہو! ادیب نے سوال کیا تو شیخ علی یحییٰ کی آواز خاموش ہو گئی۔ امریکہ سے بھی ملا شیخ عمر عبدالرحمٰن کی کوئی آواز نہیں آئی...

یکایک سناٹا چھا گیا۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔

ادیب تب بہت شان سے اٹھا اور پوری دنیا کو مخاطب کرتے ہوئے بولا — دیکھا... یہ آوازیں اپنے آپ خاموش ہو گئیں۔ آوازوں اور خیالوں کو مت روکو۔ ان پر کوئی پابندی مت لگاؤ... عوام کی رائے اور عوام کے جذبات خود ان انسان مخالف طاقتوں کا جواب دیں گی۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ مذاہب میں ایکتا نہیں ہے لیکن یہ جاننا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ہر مذہب کا انسانی پیغام ایک ہے!... جمہوریت پسندوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ چاہے جتنے بھی حنفی، مہلک اور انسان مخالف نظریات کیوں نہ ہوں، اُسے کھلی، بے روک، اظہار کی آزادی ملنی چاہیے۔ اظہار کی اس آزادی سے ہی ان بے رحم، مخالف اور مہلک نظریات کا خاتمہ ہوگا، ان کی سرکوبی ہوگی؟ کیونکہ ان کے پاس اشتعال ہے، طاقت نہیں۔

— حضور! آپ پھر تقریر کرنے لگے! اردلی نے عدالت کو آگاہ کیا۔

— کیوں؟ کیا ہندوستان کے جج، پڑھے لکھے لوگ آخر میں ہزار دو ہزار صفحہ کی تقریر نہیں کرتے؟... خیر مجھے ان کی اچھی عادتوں سے بچنا چاہیے۔ پھر بھی اپنی تقریر کے آخر میں کہنا چاہوں گا کہ پچھلے دور کی ضرورتیں ذاتی، جنگی اور بنیادی طور پر معاشی تھیں... مذہبی نہیں! انہیں مذہب، اخلاقیات اور قبائلی انصاف و ناانصافی کے سوالات سے جوڑ کر مذہبی بنا دیا جاتا تھا... مذہب کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور اجتماعی قتل یا تبدیلی مذہب کیا جاتا تھا۔ آج کی دنیا میں یہ دونوں ہی واقعہ ناممکن ہیں... پچھلے ادوار کی اس تباہ کن فطرت کو انسانیت خارج کر چکی ہے... پھر بھی ان کے باقیات موجود ہیں۔ ان نظریاتی کھنڈروں سے اپنے دور...

حضور! آپ پھر... اردلی نے درمیان میں اُسے عاجزی سے ٹوکا۔

اوہ! میں بھول ہی گیا... ارے بھوائی سین گپت کہاں ہیں؟

۲۳

اس سے پہلے کہ صومالیہ کے مردے دستکیں دیتے اور اُدھر برازیل اور بولیویا میں مارے گئے بے قصور لوگ اپنی داستان سناتے، بھوانی سین گپت نے انہیں روکا —

— یہا کارتو ہے، پوری دنیا میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ تشدد، قتل، اذیت، ظلم، جبر، بے ایمانی، بدکاری کے سیلاب اُمڈ رہے ہیں... خود بھارت میں خون کے تالابوں میں کمل اگائے جا رہے ہیں... لیکن پھر بھی کچھ ایسا بھی ہے جو شبھ ہے!

— ہاں! ادیب نے کہا — جو ہمارے ضمیر کی حفاظت بھی کر رہا ہے، جو وقوع ہو رہا ہے لیکن وقوع ہوتے دکھائی نہیں دیتا، جو سنائی پڑتا ہے لیکن سنا ہوا معلوم نہیں پڑتا، جو سوچا جا رہا ہے لیکن سوچا ہوا معلوم نہیں پڑتا، جو سمجھا جاتا ہے پر سمجھ میں نہیں آتا... یہی ہمارے وقت کا المیہ ہے... کیونکہ ہم سب شعور اقدار کے باوجود اقدار کے زوال کی لپیٹ میں ہیں!

— اسی لیے تو میں جنوبی افریقہ، اسرائیل اور فلسطین سے ایران ہوتا ہوا لوٹا ہوں... تیونس میں بھی یاسر عرفات سے ملا اور اسرائیل میں رابن اور پیریز سے بھی۔ یہودیوں اور فلسطینیوں نے اپنے اپنے پاکستانوں کی دیواروں کو جھکا کر آدمی کو یہ مہلت دی ہے کہ وہ ایک دوسرے کا انسانی بیج دیکھ سکیں اور انسان کی بنیادی آزادی کو پہچاننے کی کوشش کر سکیں! یہودی اور فلسطینی ذہن نے ایک دوسرے کی دھڑکنوں کو سمجھا ہے اور بندوقیں میزائلیں اور انتفاضہ کے اُڑتے ہوئے پتھر تھم گئے ہیں! یہ ایک فیصلہ کن قدم ہے! یہ سمجھوتہ ہو گیا ہے کہ یہودیوں کے اسرائیل میں رہنے کے حق کو فلسطینی منظور کریں گے اور یہودی انہیں غازہ پٹی اور مغربی کنارہ میں خود اپنا ملک قائم کرنے اور حکومت چلانے کی ضمانت دیں گے۔ راجدھانی جیریکو ہوگی اور یروشلم، گولان پہاڑیوں کا مسئلہ بعد میں طے ہوگا۔

بھوانی سین گپت بڑے حوصلے سے بتا رہے تھے —

— اور اُدھر جنوبی افریقہ میں تین سو چالیس سالوں سے چل رہی نسلی تعصب والی حکومت کا خاتمہ ہوا ہے... نیلسن منڈیلا نے آخری فتح حاصل کی ہے اور لمبی لڑائی میں شکست کھا کر گوروں نے دنیا میں نسلی تفریق کے خاتمے کا اعلان کر دیا ہے... اور ابھی میں تہران سے لوٹا ہوں... ایران کے اسلامی انقلاب کو مغرب نے حیوانی، بھیانک اور انسانیت کے خلاف کہا تھا اور وہ مسلسل مشتہر کرتے رہے کہ وہاں پر انسانی اقدار کا خون کر دیا گیا ہے... وہاں بے رحم اسلام کا طلوع ہوا ہے... میں خود وہاں گیا... یہ دیکھنے کہ مغربی ممالک مشرقی ممالک کو کس چشمے سے دیکھتے ہیں... ایران کو دیکھنے کا ان کا چشمہ بھی غلط ہے، اسی لیے مغرب والے ایران کے اسلامی انقلاب کو جذب نہیں کر پائے۔ آیت

اللہ خمینی کے اسلامی انقلاب نے ایران جیسے مہذب ملک کو پھر ایک بار اُس کا محور دے دیا اور آج اپنے محور پر لوٹ کر ایران اپنے علاقے کی دونوں بڑی تہذیبوں، ہندوستان اور چین کے ساتھ مکمل سکون اور دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے!

تبھی شوبینا کا آدمی بیچ میں بول اٹھا — یہ مت بھولو کہ مسلمان جابر ہیں... وہ اپنے ہم مذہبوں کو بھی نہیں چھوڑتے تو وہ ہمیں کیسے چھوڑ سکتے ہیں... ایران اور عراق، دو مسلم ممالک آٹھ سال تک لڑتے رہے!

— ہاں! لیکن کیا مہابھارت کے دونوں لڑاکو دَل، پانڈو اور کورو ہم مذہب نہیں تھے؟ وہ بھی تو لڑتے رہے! اس لیے دھرم کو بیچ میں مت گھسیٹو! بھوانی سین گپت کی بات سنو تاکہ کچھ راحت ملے...

تبھی بوسنیا کے مسلمانوں کی چیخ و پکار آنے لگی تو عدالت کے دروازے پر دستکوں کی بوچھار ہونے لگی۔ چیخوں اور کراہوں سے سارا ماحول بھر گیا۔ مسلمان عورتیں اپنی عزت لٹ جانے کی داستانیں لے کر حاضر ہوئیں... اور سربوں و کروٹ لوگوں نے جن مسلمانوں کے ساتھ ظلم کیے تھے، وہ مسلسل چیخ چلا رہے تھے —

— کیا ہماری بات سننے والا کوئی بھی نہیں ہے! کوئی بھی ملک کیا ہمارے اوپر ہو رہے مظالم کو روک نہیں کر سکتا؟ ہم بوسنیا میں بھوکے مر رہے ہیں، ہماری عورتوں کے ساتھ مسلسل ظلم اور زنا ہو رہے ہیں۔ ہمارے بچے گھروں سے نکال نکال کر مارے جا رہے ہیں۔ ہمیں بے گھر اور بے عزت کیا جا رہا ہے اور سارے ممالک خاموش ہیں... بوسنیا کا ایک مسلمان مردہ اپنے ملک کی حالت بیان کر رہا تھا...

— لیکن اب حالات کچھ ٹھیک ہیں۔ یوگوسلاویہ کے کروٹ، سرب اور مسلمان ایک ساتھ نہیں رہنا چاہتے ہیں... اسی لیے سب نے تقسیم منظور کر لیا ہے! بھوانی سین گپت نے بڑے دکھ سے کہا — یوگوسلاویہ کی تینوں ذاتیں سارے علاقے کا بٹوارہ کر کے، آزاد ملک کے طور پر الگ رہنے کو راضی ہو گئی ہیں!

— کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یعنی یوگوسلاویہ میں تین پاکستان بن گئے! یہاں ذاتیں تو دو ہی ہیں — سرب اور کروٹ، تیسرا تو اسلام مذہب ہے، اس کے ماننے والے مسلمان ہیں، وہ کوئی ذات تو نہیں ہیں۔ وہ کروٹ بھی ہو سکتے ہیں اور سرب بھی! یعنی یوگوسلاویہ میں بھی وہی تنگ دلی، حسد اور نفرت کارگر ہو گئی؟ ادیب نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

— لیکن اس بار تو عیسائیوں نے مسلمانوں کو خود اپنے سے الگ کیا ہے... وہ مسلمانوں پر

بھیانک ظلم کر رہے تھے... سرائیوو شہر کو انہوں نے اپنے اپنے بموں سے کھنڈر میں بدل دیا ہے، مسلمانوں کا زندہ رہنا مشکل کر دیا ہے... اُن کی عورتوں کو عیسائی اٹھا لے جاتے ہیں۔ اُن کے ساتھ وہ اس قدر وحشیانہ سلوک کرتے ہیں جتنا پاکستانی فوجوں نے بنگلہ دیش کی عورتوں کے ساتھ نہیں کیا تھا! عورتوں کے ساتھ بدسلوکی، زنا اور حیوانی ظلم کی اس سے وحشیانہ مثال اور کہیں نہیں مل سکتی اور پھر وہاں تو سب الٹا ہوا ہے۔ اس بار تو سرب اور کروٹ عیسائیوں نے اپنے ہی ملک کے مسلمانوں کو اپنا پاکستان بنانے پر مجبور کیا ہے! اُن کا حقہ پانی بند کر دیا ہے!

—یہ بھی ایک وحشیانہ کام ہے... انسان کا انسان کے ساتھ رہنے سے انکار کرنا ایک انسانی جرم ہے... مذہب بدلنے سے تاریخ کی جڑیں نہیں بدلتیں' ادیب ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ غازی آباد کے دہرہ گاؤں کی رپورٹ لے کر خصوصی نامہ نگار اوم پرکاش حاضر ہوئے— ادیب کا دل دھڑکنے لگا... اوم پرکاش کو دیکھتے ہی ادیب نے گہری سانس لے کر پوچھا—

— کیوں بھائی... ہندوستان کے غازی آباد میں پھر کوئی خون خرابہ یا مار کاٹ ہوئی ہے کیا؟

— نہیں! اس بار ایسا کچھ نہیں ہے... بلکہ میں ایسی رپورٹ لایا ہوں جس سے آپ کو، دنیا کی تمام مظلوم اور بے چین روحوں کو کچھ راحت ملے گی! دنیا جانتی ہے راجپوتوں اور مغلوں کے درمیان مسلسل جنگ ہوتی رہی۔ مہارانا پرتاپ نے کبھی اکبر کی غلامی قبول نہیں کی... مغل عہد کے اسی دور کی کہانی کہتا ہے غازی آباد ضلع کا دہرہ گاؤں۔ دہرہ مسلمان راجپوتوں کا گاؤں ہے... یہ سسودیا ہیں اور مہارانا پرتاپ کے آل اولاد ہی نہیں، اُن کے خاندان کے ہیں۔ ان کے مذہب کی تبدیلی اورنگ زیب کے زمانے میں ہوئی... یہ مسلمان راجپوت اپنے سلف مہارانا پرتاپ کی مورتی اپنے گاؤں میں نصب کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کا ماننا ہے کہ تبدیلیٔ مذہب سے خون نہیں بدل جاتا۔ وہ اپنی پہچان دہرا مانتے ہیں کہ وہ صرف مسلمان نہیں ہیں، وہ مسلم راجپوت ہیں۔ ساٹھ گاؤں کے ساٹھے میں سے ساڑھے آٹھ گاؤں میں سسودیا مسلمان ہیں، باقی میں ہندو سسودیا، لیکن یہ بھی اپنے کو ایک خون اور ایک ہی خاندان کا مانتے ہیں۔ ان کے اسلاف پرتھوی راج چوہان کی محمد غوری سے ہوئی جنگ میں یہ راجستھان سے یہاں آئے تھے۔ یہیں ان راجپوتوں کا ڈیرہ پڑا تھا، اسی ڈیرہ کو آج دہرا کہتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی سسودیا راجپوتوں کے لیے دہرا ایک شجرہ کا ایک مرکزی نقطہ ہے۔ ساٹھے میں کل آٹھ گاؤں مسلمانوں کے ہیں لیکن سب کے نمبر دار مکھیا ہیں— مہر علی راجپوت! وہ کہتے ہیں— تبدیلیٔ مذہب کی وجہ سے ضرورت محسوس ہوئی تو مندر کی دیوار کے سہارے ہی ہم نے مسجد کھڑی کر لی ہے۔ آج بھی مسلمان بہن اپنی اولاد کی شادی کے وقت بھیا کو بھات لانے کے

لیے بلانے جاتی ہے تو یہی لوک گیت گاتی ہے— بھیا رگھوبیر بھات ہمارو لائیو... ' اس مسلمان بہن کے ہونٹوں پر رگھوبیر اس کی سنسکرتی کا لفظ ہے... لا مذہبیت کا نہیں! عدالت عالیہ— دلی سے گڑھ مکتیشور تک بیچ بیچ میں راجپوتوں کے مختلف خانوادوں کے گاؤں پھیلے ہوئے ہیں... ہر خانوادے سے کچھ گاؤں مسلمان ہوئے ہیں۔ ساٹھے کے بغل میں ہی چوراسی ہے۔ تومر ہندو مسلمانوں کے چوراسی گاؤں، بغل سے بارہ گاؤں تروان راجپوتوں کے ہیں، چھ ہندو اور چھ مسلمان... یہی حالت اس علاقے کے تیاگیوں، گوجروں اور چودھریوں کی بھی ہے... ان راجپوتوں، برہمنوں نے مذہب تبدیل کرنے کے بعد بھی اپنی تہذیب کی توہین نہیں کی ہے... یہی صورت حال ادھر مغرب میں الور راجستھان تک پھیلے میواتی مسلمانوں کی ہے... وہ مسلمان ہیں لیکن اپنے قدیم تمدن اور عوامی روایات سے اب بھی جڑے ہوئے ہیں...

—اسی لیے کوئی بھی تہذیب پاکستانوں کی تعمیر کے لیے جگہ نہیں دیتی۔ تہذیب تنگ دل نہیں فراخ دل ہوتی ہے... وہ موت کا جشن نہیں مناتی، وہ زندگی کے جشن کا لامتناہی سلسلہ ہے... اسی ساجی تہذیب کی ضرورت ہمیں ہے کیونکہ وہ زندگی کا احترام کرتی ہے!

— حضور! یہی کوشش تو میں نے کی تھی! ایک بڑی شائستہ اور گونجتی ہوئی آواز آئی تھی...

سامنے ایک بے حد خوبصورت شہزادہ کھڑا تھا۔

اُسے دیکھتے ہی عدالت میں موجود اورنگ زیب یکایک چونکا...

—داراشکوہ تم...!

—ہاں، میں!

چاروں طرف ایک عجیب سی حیرانی بھرا سناٹا سا گیا۔ کھچا کھچ بھری ہوئی عدالت داراشکوہ کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ چاروں طرف عجیب سی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کچھ آوازیں اسلامی درویشوں کی تھیں، اذانوں کی تھیں اور انہیں کے ساتھ بودھ پراتھناؤں، عیسائی کورَس کی اور انہیں میں ملی جلی مندروں کے گھنٹوں اور پوجا کی تھیں، جنگوں کی آوازیں بھی انہیں میں گڈمڈ ہو رہی تھیں اور مرتے کٹتے سپاہیوں کی چیخیں بھی اسی میں شامل تھیں...

خبر ملتے ہی بابر اپنے بدنصیب پڑپوتے داراشکوہ کو دیکھنے خاص طور سے آیا تھا۔ بہت پیار سے اپنی اولاد کو دیکھ رہا تھا... بالخصوص داراشکوہ کو۔ اُس وقت آسمان میں ست رنگی قوس قزح پھیلی ہوئی تھی۔

—عدالت عالیہ! میں نے یہی چاہا تھا کہ ہندوستان میں بھائی چارہ کی ایک نئی تہذیب جنم لے... وہ تہذیب جسے صوفی سنتوں نے قبول کیا تھا... خواجہ معین الدین چشتی ہی ہمارے مغل خاندان

کے سرپرست صوفی تھے۔ میں انھیں کا مرید تھا۔ میری بہن جہاں آرا بھی انھیں کی مرید تھی... اس نے تو "مونس الارواح" نام سے خواجہ کی سوانح بھی لکھی تھی! دارا ابھی بول ہی رہا تھا کہ اورنگ زیب نے اُسے ٹوکا—

—یہ سراسر غلط ہے! قندھار سے لوٹتے ہوئے یہ لاہور کے بابا لال کا شاگرد بنا تھا... پھر بعد میں یہ لاہور کے فقیر میاں میر کا شاگرد ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی نادرہ بیگم بھی اُن کی مرید بن گئی تھی۔ میاں میر قادریہ سلسلہ کے صوفی تھے... شیخ عبدالقادر جیلانی کے شاگرد! اس نے اُسی سلسلہ سے تعلیم حاصل کی اور خود کو قادری اور حنفی ماننے لگے تھے!

—ہاں لیکن صوفی صوفی میں فرق کہاں تھا؟ اور پھر ابا حضور بھی تو میاں میر کو اپنی عقیدت پیش کیا کرتے تھے... اور میں صوفی عبدالقادر جیلانی کے اس بیان سے متفق تھا کہ— 'دوزخ کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے جائیں اور جنت کے دروازے مسلمانوں اور کافروں، ملحدوں کے لیے مساوی طور پر کھول دیے جائیں' حضور، عبدالقادر جیلانی سبھی کا بھلا چاہتے تھے اور وہ ہندو مسلم کی تفریق مٹا دینا چاہتے تھے! دارا شکوہ نے اپنی بات کہی— اور حضور عالی! میں نے دیکھا کہ ہندوستان کا ہر شخص توحید کا پیروکار ہے... صوفی ازم کی وحدانیت اور ویدک دھرم کی وحدانیت میں کہیں کوئی فرق نہیں ہے! توحید کی راہ سمجھداری، ہم آہنگی اور رحم کی ہے... یہ توحید ہی وحدانیت کی شاہ راہ ہے... لیکن میں نے خراساں کے سب سے بڑے صوفی ابوسعید فضل اللہ کے مطابق اس بات کو بھی قبول کیا کہ خدا ایک ہے، لیکن اس کی وحدت کے راستے سیکڑوں ہی نہیں، لاکھوں اور کروڑوں ہیں، کیونکہ وحدانیت کا ہر پیروکار کس طرح اپنے خدا سے یک جان ہونا چاہتا ہے، یہ اُس کی آزادی ہے۔ توحید یہ ہی کہتی ہے کہ نہ تو وہاں اپنے پن کا وجود ہے اور نہ خدا کے علاوہ کسی اور شے کا وجود... یعنی شے اور شخص خود پگھل کر ایک خدا میں سما جاتے ہیں! یہ سمجھ لینے کے بعد میری تشنگی در طلب توحید بجھتی ہی گئی... دو سطروں میں کہوں تو— 'جا کارن جگ ڈھونڈیا سو تو گھٹ ہی ماہیں، پردہ دیا بھرم کا تاتے سوجھی ناہیں!'

—یہ تب بھی پاگل ہو گیا تھا اور اب تک پاگل ہے! شبلی نعمانی نے مداخلت کی۔

—ہاں، ہر وہ شخص جو وحدت و اتحاد سے ہوتا ہوا اتفاق سے جذب و جنون... تکمیلیت کی کیفیت حاصل کر کے بلندی... عروج کے زینے پر پہنچ کر توحید کو حاصل کرتا ہے، وہ شخص انھیں پاگل ہی دکھائی دیتا ہے جن کے پاس آنکھیں نہیں ہیں... اسی لیے تمہارے عالمگیر کو سرمد بھی پاگل دکھائی دیا تھا— اور اُس یہودی صوفی سرمد کو اسی عالمگیر نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر قتل کرا دیا تھا! آج اس

بیسویں صدی میں اورنگ زیب کا وہ پاکستان نفرت کی بنیاد پر کھڑا دکھائی دیتا ہے اور میرا ہندوستان اسی پاکستان کی آبادی سے زیادہ مسلمانوں کو اپنی سرزمین کا بیٹا مان کر سنبھالے ہوئے ہے اور مشترکہ تہذیب و تمدن کی بنیاد پر کھڑا ہے— اورنگ زیب کے پاکستان سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی میرے ہندوستان میں ہے! دارا شکوہ کچھ طیش میں بول رہا تھا۔ اسلام جابر فاتحوں کا مذہب نہیں، وہ دنیا کو خوبصورت بنانے والے بھائی چارہ باہم پر یقین رکھنے والوں کا مذہب ہے... پاک رسولؐ نے خود قبول کیا ہے کہ اُن سے پہلے اللہ نے خدا کی راہ دکھانے کے لیے اور نبیوں کو بھی بھیجا ہے...

ابھی یہ بات چیت اور بحث چل ہی رہی تھی کہ فلک پر چھائے قوس قزح کے رنگ اچانک مٹنے لگے اور آسمان سے خون کی برسات ہونے لگی۔ افغانستان کی پتھریلی وادیوں اور پہاڑی پٹھاروں پر کلاشنکوف بندوقوں کی بھیانک آواز تڑتڑانے لگی، معصوم باشندے تڑپنے، کراہنے اور چیخنے لگے... وہی چیخیں وسط ایشیا کی چھاتی کو چیرتی ہوئی ترکی تک پہنچیں اور افریقہ کے سوڈان سے مصر ہوتی ہوئی سعودی عرب کو ہلانے لگیں... اور پاکستان کی سرزمین سے ہوتی ہوئی کشمیر تک پہنچ کر اور بھی زیادہ تباہی ڈھانے لگیں۔

—یہ درندے کون ہیں؟ ادیب نے خون کی بارش میں لت پت تمام ممالک کے مردوں کو اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے پوچھا تو صحافی نکھل چکرورتی بوکھلائے سے اندر داخل ہوئے...

ادیب نے اُٹھ کر اُن کا استقبال کیا۔

—ادیب! تمھیں پتہ ہے کہ آسمان پر چھائے ہوئے قوس قزح کیوں مٹ گئے؟ نکھل چکرورتی نے پریشانی سے پوچھا— کیا تمھیں یہ پتہ ہے کہ خون کی یہ بارش کیوں ہو رہی ہے؟

—تب تک وہاں سے پربھو جوشی خون کی بارش میں برباد ہوگئی اپنی پینٹنگس لیے ہوئے تڑپ کر بتانے لگے— ادیب بھائی صاحب! میری ان پینٹنگس نے تو حسن کی تخلیق کی ہے... یہ تو بھی ملکوں کے بیچ کے فن پارے ہیں... اس خون کی بارش کو کیا حق ہے کہ یہ میری ساری تخلیق کو مٹا دے!

—اے ادیب! اے فنکار! نکھل چکرورتی نے زخمی آواز میں کہا— افغانستان سے وسط ایشیا تک اور عراق کے گرد و نواح کے علاقوں پر سے ترکی، شمالی افریقہ کو گھیرتی، مصر سے سعودی عرب تک یہ جو خون کی بارش ہو رہی ہے، یہ اُن مجاہدین کی وجہ سے ہے جو افغانستان سے فارغ ہو کر نئے جنگ کی تلاش میں گھوم رہے ہیں!

— کیونکہ یہ بھٹکے ہوئے بے سمت فوجی اب جہاد کے نئے ٹھکانے تلاش کر رہے ہیں... وہ مجاہدین جو روس کے خلاف ہیرو بنے ہوئے تھے، اب افغانستان کی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ ہیرو

سے ولین بن گئے ہیں۔ ان کی یہی قسمت تھی۔ آج وہی ممالک ان کٹر اور اندھے مجاہدین کے شکار ہیں جنہوں نے انہیں جنم دیا تھا۔ یہ عجیب سا سر والی کیفیت ہے۔

—ہاں، یہ صحیح ہے! یہ فرنڈ انکلسٹ جنہیں خود عرب ممالک نے افغانستان کو آزاد کرنے کے لیے جنم دیا تھا، ان کی کارستانیوں سے اب پریشان ہیں — یہ بیکار مجاہدین اب ایک نئی جنگ کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں... ان جنگی اور خون کے پیاسے مجاہدین نے مصر، الجیریا، اردن اور تیونس میں تہلکہ مچا رکھا ہے...

تبھی ویت نام کے جنگلوں سے کچھ امریکی فوجی نکل کر آئے۔ وہ بن مانس کی طرح لگ رہے تھے اور چیخ رہے تھے۔

—جنگ کہاں ہے۔ جنگ کہاں ہے؟

—ویت نام کی جنگ دہائیوں پہلے ختم ہو چکی ہے! پربھو جوشی نے انہیں سمجھانا چاہا — جیسے ویت نامیوں نے تمہیں جنگل میں کھدیڑ دیا تھا ویسے ہی انہوں نے تمہاری امریکی فوج کو اپنے ملک بھاگ جانے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ وہ دہائیوں پہلے ہار کر اپنے ملک جا چکے ہیں... ویت نام کی جنگ ختم ہو چکی ہے۔

— نہیں! او بن مانس چپے — جنگ کبھی ختم نہیں ہوتی!

— کیونکہ تم اُسے ختم ہونے نہیں دیتے۔ تمہاری رائفلیں زنگ لگنے سے کند ہو گئی ہیں، تمہاری بندوقوں کی نلیاں اور کندے جامد ہو گئے ہیں اور اُسی جمود میں تمہاری عقل قید ہو چکی ہے۔ تم جنگ ہی چاہ سکتے ہو... جنگ اور تباہی...

— کچھ بھی ہو ہمیں صرف جنگ چاہیے —

— جو جنگ میں شامل نہیں ہو پائیں گے وہ اپنے سماج کے لیے ڈاکو اور قاتل بن جائیں گے۔ اے ادیب عالی! آپ ہماری مجبوری کیوں نہیں سمجھتے... ہم جنگجو، خون کے پیاسے نہیں تھے۔ ہم بھی انسان کی اولاد کی طرح معصوم پیدا ہوئے تھے... لیکن حکومت اور اقتدار کی دوڑ نے ہمیں اپنے مفاد کے لیے درندوں میں بدل دیا ہے... ہمیں کوئی اور ہنر نہیں آتا، ہمیں بس موت کا کھیل کھیلنے کا ہنر آتا ہے... کاش! ہمیں کچھ اور سکھایا گیا ہوتا تو ہم بھی کھیت کھلیانوں، کارخانوں میں کام کر رہے ہوتے... کہتے کہتے ایک افغانی مجاہد رو پڑا۔

اُس کے آنسوؤں میں جنگل سے نکلے امریکی فوجیوں کے آنسو بھی گھل مل گئے...

— اب ہم کیا کریں؟ سارے فوجی ایک ساتھ چیخے — ہماری قسمت میں یہی ہے کہ ہم

لڑتے رہیں۔ ہمیں بددعا لگی ہے ادیب عالی، بددعا لگی ہے۔ ہم موت کے سوا کسی چیز کو جنم نہیں دے سکتے!

کہتے ہوئے ہزاروں طالبان اور امریکی فوجی، امریکی، چینی اور روسی ہتھیاروں کو لیے ہوئے بوسنیا، صومالیہ، اردن، مصر، لیبیا، تیونس کی طرف دوڑ پڑے... موت کی آندھی چلنے لگی۔ خون کی ندی بہنے لگی اور اُسی میں تمام خونی دھارائیں ملنے لگیں۔ الجیریا سے اسلامک سالویشن فرنٹ، اردن سے محمد آرمی، تیونس سے اسلامک پارٹی، کشمیر سے حزب المجاہدین، لشکر طیبہ، جے کے ایل ایف، جیسی دہشت تنظیموں کا کہرام مچا ہوا تھا... اور وہ کہرام عدالت کے احاطے سے نکل کر دنیا کے مصیبت زدہ ممالک کی طرف شور مچاتا ہوا چلا گیا۔

ادیب اپنی کنپٹیاں پکڑ کر بیٹھ گیا —

— تبھی اُس کے کانوں کے بند دروازوں کو چیرتی ہوئی دارا شکوہ کی آواز آئی —

حضور عالی! میں اپنے ملک کو انہیں خونی آندھیوں سے بچانا چاہتا تھا۔ میرا ملک دنیا کی سب سے بڑی تہذیب کا مرکز ہے... ہماری تہذیب نے لوہے اور بارود کے مادی ہتھیار نہیں، روح اور روح مطلق کے روحانی اسلحوں کی ایجاد کی تھی، ہم نے اندھے کٹر مذہبی مجاہدین پیدا نہیں کیے۔ ہم نے پیر، فقیر، صوفی، سنت، درویش اور مہاتما پیدا کیے... ہمارے جنگلوں سے جنگ پکارتے درندے نہیں، شانتی، شانتی کا پیغام دیتے سادھو، سنت نکلتے ہیں... اسی لیے تخت و تاج سے پہلے میں نے انسانی ایمان کی تلاش کی تھی اور توحید کے اُسی عالم میں، میں نے شاہ دلربا جیسے فقیر اور صوفی کو لکھا تھا کہ مجھ جیسے فقیر کے دل سے اسلام کے خارجی جسے اب غائب ہو گئے ہیں اور سچا کفر، یعنی مذہب پرستی لامذہبیت مجھ میں عیاں ہو گئی ہے... میں جنیو دھاری بت پرست ہو گیا ہوں... نہیں، میں خود اپنا عابد، خود پرست ہو گیا ہوں... کیوں کہ ہر بت میں زندگی چھپی ہوئی ہے اور کفر — غیر اعتقاد کے پیچھے اعتقاد، ایمان چھپا ہوا ہے۔ اس ایمان کو میں نہیں توڑ سکتا۔ توڑوں گا تو انسان ہر طرح کے یقین، ایمان سے عاری ہو جائے گا۔ یہ ایمان ہی انسان کے وجود کی کنجی ہے، کیونکہ اسی ایمان کے سہارے وہ 'کئی' کو 'ایک' میں پیوست پاتا ہے۔ سچا مسلمان یہی دیکھتا ہے... تکثیر کو وحدت میں دیکھنا ہی توحید ہے... یہی توحید کا فلسفہ ہے۔ یہی وحدانیت ہے... خدا کے نام کی ایکتا نہیں، وہ نام ہمیشہ الگ الگ رہیں گے، لیکن مذاہب میں موجود وحدانیت کے بارے میں کوئی بھی اختلاف رائے کسی مذہب میں نہیں ہے۔

ابھی دارا یہ کہہ رہا تھا کہ پھر توپیں گرجنے لگیں، عمارتوں کی بنیادیں ہلنے لگیں... پربھو جوشی نے فوراً راجندر ماتھر کو آواز دی۔ آوازیں آنے لگیں—

—افغانستان کی خانہ جنگی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ جلال آباد معاہدہ بے کار ہو گیا ہے۔ اب یہاں کے ولن آپس میں لڑ کر یہ طے کرنا چاہتے ہیں کہ ولنوں کا ولن کون ہے۔ کل رات سے یہ ولن ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں، تبھی سے افغانستان کے ہر شہر کی دیواریں تھرا رہی ہیں... یہاں کی خونی شطرنج کے سارے مہرے اپنے پالے بدل چکے ہیں... چاروں طرف سے شیلنگ ہو رہی ہے... راکیٹس گر رہے ہیں، بمباری مسلسل جاری ہے۔ ہر بستی کے معصوم عوام اپنے بال بچوں کو لے کر پاکستان کے سرحد کی طرف بھاگ رہے ہیں... کابل تباہ ہو چکا ہے... مزار شریف شکست کھا کر کراہ رہا ہے...

—اوہ! کابل تباہ ہو گیا... تب تو میری قبر مسمار ہو گئی ہوگی... میں اب لوٹ کر کہاں جاؤں گا! کہاں سوؤں گا... بابر پریشانی سے بولا۔

—یہاں زندہ لوگوں کے لیے جگہ نہیں ہے، تازہ مردے لاوارث پڑے ہوئے ہیں۔ تم تو پھر بھی اتنی صدیوں تک آرام سے سو لیے!... راجندر ماتھر کی آواز نے بابر کو جواب دیا اور آگے کا حال بتانے لگی۔

—دراصل سوویت فوجوں کی واپسی اور نجیب اللہ حکومت کا تختہ پلٹنے کے بعد یہاں امریکی ڈالر کی آمد بند ہو گئی ہے— افغانستان کا پٹھان سعودی عرب اور پاکستان کے کٹر اسلامی زنجیروں کو بھی قبول نہیں کر پا رہا ہے... کیونکہ اس کے خون میں آزادی موجود ہے۔ اس کا اسلام بھی دیگر ممالک کے اسلام سے آزاد ہے۔

—اسلام ہر جگہ آزاد ہے! سیف الدین سوز نے مداخلت کی۔ وہ ہمایوں روڈ دلی سے آئے تھے۔ کشمیر کا اسلام کشمیر میں، ایران کا ایران میں، مصر کا مصر میں اور ترکی کا اسلام ترکی میں آزاد ہے... اور اسلام کی یہی عظمت ہے کہ اس نے زمین کے ہر حصے کی تہذیب کو اپنا بنایا۔ اسی لیے کشمیر کا مسلمان کشمیری ہے، وہ ایرانی یا تورانی مسلمان نہیں ہے۔ وہ پاکستان کے پنجابی مسلمان کے ساتھ ایک گھنٹے زندہ نہیں رہ سکتا... وہ اپنی ثقافتی روایت میں جینے والے کشمیر کے ہندو پنڈتوں کے ساتھ صدیوں زندہ رہا ہے اور رہے گا۔ للیشوری اور حبہ خاتون کا بٹوارہ کشمیر میں نہیں ہو سکتا۔ پان کشمیر کے جو کشمیری ہندو پنڈت میرے علاقے میں ہندو ہوم لینڈ مانگ رہے ہیں، وہ کشمیر کے ہندو پنڈتوں کا نقصان کر رہے ہیں... ہماری روایت صوفی اور رشیوں کی روایت ہے۔ کٹرپن کی روایت نہیں، یہ

کشمیری اسلام کی ایک نئی روایت ہے جو زین العابدین، للیشوری اور حبہ خاتون سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔

ادیب نے تب ٹوکا— تو سیف الدین سوز صاحب، کشمیر کے یہ ہندو پنڈت اپنا ہندو ہوم لینڈ اپنا ہندو پاکستان کیوں مانگ رہے ہیں؟

—پاکستان سے پاکستان پیدا ہوتا ہے... یہ چھوت کی ایک بیماری ہے۔ جب تک مذہب، نسل، ذات اور دنیا کی پہلی طاقت بننے کا نشہ نہیں ٹوٹتا، جب تک اقتدار اور برتری کی ہوس نہیں ٹوٹتی، تب تک اس زمین پر پاکستان بنائے جانے کی مہلک روایت جاری رہے گی... کمل چکرورتی نے مداخلت کی۔

—یوگوسلاویہ برباد ہو گیا... اسی طرح افغانستان برباد ہو رہا ہے۔ طالبان کے پاس اب پیسے کہاں ہیں؟ وہ نقلی دواؤں کے اسمگلنگ سے ہی آئے گا... نقلی دواؤں کے ان راستوں پر حق جمانے کے لیے کابل میں اقتدار کی ضرورت ہے۔ جو برسر اقتدار ہوگا وہی حکومت کرے گا اور نقلی ادویات کے اربوں کھربوں روپیوں کی آمدنی کا حقدار ہوگا۔ اسی لیے پاکستان کی انٹر سروس ایجنسی طالبان کے ساتھ سرگرم ہے اور چاہتی ہے کہ اس کے ذریعے وہ اپنی آمدنی کی راہ کھلی رکھ سکے... پاکستان سرکار کے پاس بھی اتنا پیسہ نہیں ہے کہ وہ آئی ایس آئی کو زندہ رکھ سکے۔ اس لیے آئی ایس آئی کو زندہ رہنے کے لیے نقلی ادویات کی صنعت پر قبضے کی ضرورت ہے، لیکن تکلیف دہ صورت حال یہ ہے کہ نقلی ادویات کے ہراتی بیوپاری اب مشہد نہیں جاتے بلکہ وہ پاکستان کے جنوب مشرقی علاقوں میں جاتے ہیں، قندھار اور کوئٹہ جاتے ہیں... وہ بلوچستان کے جنوبی سمندری ساحلوں اور ان علاقوں تک دوڑ لگاتے ہیں جو ایران اور پاکستان کی سرحدوں میں واقع ہیں! یہیں اسی علاقے میں رہتی ہیں وہ قبائلی ذاتیں اور قبیلے، جو ہمیشہ آزاد رہے ہیں۔ یہ قبیلے اپنی آزادی کو آج بھی پاکستان کی حکومت کو سونپنا نہیں چاہتے۔ اپنی آزادی کے دیوانے یہ قبیلے بے حد خوددار ہیں، پھر وہ چاہے وزیر قبیلے کے لوگ ہوں، مسعود ہوں، بھتانی، منگل، بنگش، اورک زئی، آفریدی، مہمند، احسن خیل، یا ترکل زئی قبیلے کے لوگ!

تبھی ایک گونجتی لیکن بھاری آواز آئی—

—مغلیہ خاندان اور اس کی وراثت کے بغیر افغانستان کی تاریخ طے نہیں ہوگی... اور ہندوستان کی تاریخ بھی اس کے بغیر پوری نہیں ہوگی! اس لیے آپ کو مجھے سننا پڑے گا ادیب عالی!

—آپ کون؟

— میں شاہجہاں ہوں... شاہجہاں، یعنی شاہجہاں! میں اپنے ہندوستان کے شہر آگرہ کے پھر یلے قلعے سے اٹھ کر آیا ہوں۔ میری بیٹی جہاں آرا مجھے یہاں تک لائی ہے... میں بے حد بیمار ہوں... ابھی کل ہی حکیم ہاشی نے مجھے غسلِ صحت کروایا ہے!

— لیکن... لیکن... آپ شاہجہاں! یہاں کوئی بھی آپ کو پہچان نہیں پا رہا ہے اور نہ میں آپ کو پہچان پا رہا ہوں! ادیب نے تذبذب سے کہا۔

— آپ کیسے پہچانیں گے! وقت کو بلائیے، وہ مجھے پہچان لے گا... بیماری کی وجہ سے میں بہت بدل گیا ہوں ادیب عالی! میں وہ نہیں دکھائی دیتا، جو میں ہوا کرتا تھا... ادیب! میں تمہیں تاریخ میں لے کر چلتا ہوں۔ اُس تاریخ میں جو نہ تمہارے شبلی نعمانی کی ہے نہ کاظم شیرازی کی۔ وہ تاریخ ساقی مستعد خاں کی بھی نہیں ہے اور نہ خافی خاں کی اور اگر تم عاقل خاں راضی کا نام لو گے تو، اس کی لکھی ہوئی تاریخ بھی جھوٹی پڑ جائے گی کیونکہ اس نے چاہے دربار سے آزاد تاریخ لکھی ہو لیکن وہ بھی تو اُسی وقت کا غلام تھا جو وقت دربار کا غلام تھا! کہہ کر شاہجہاں ہانپنے سا لگا تھا۔ جہاں آرا نے اسے سنبھالا۔

— میں نے یہ وقت بڑی تکلیف سے گزارا ہے ادیب، بہت تکلیف سے! یہ کہتے اور خلا میں دیکھتے شاہجہاں کی آنکھوں میں آنسو تیر آئے تھے۔ جہاں آرا نے اپنے دوپٹے میں ابا حضور کے اُن موتیوں کو چن لیا۔

— کاش! میں وہ سب دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہتا... جہاں آرا نے میری بیماری کے دوران خدمت کرتے ہوئے مجھ سے بہت کچھ چھپائے رکھا۔ اگر دارا کا بیٹا، میرا پوتا سپہر شکوہ میرے پاس نہ آیا ہوتا تو مجھے کچھ معلوم ہی نہ پڑتا۔

— لیکن ابا حضور، میں نے وہ تکلیف دہ خبریں آپ کی گرتی صحت کی وجہ سے نہیں دیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ شجاع، اورنگ زیب، مراد اور روشن آرا کی سازشوں کی چوٹ سے ہندوستان کے شہنشاہ اور میرے ابا حضور کا دل ٹوٹے... ہمارے لیے آپ کی زندگی زیادہ ضروری تھی، ملک کی سلطنت نہیں!

— مجھے معلوم ہے بیٹی... سب معلوم ہے! تکلیف اس بات کی ہے کہ اورنگ زیب اور روشن آرا، میرے ایک بیٹے اور ایک بیٹی نے مل کر میرے خلاف سازش کی! شاہجہاں پھر بہت پست آواز میں بولا۔

— یہ بات غلط ہے، عالم پناہ! شبلی نعمانی نے درمیان میں ٹوکا— اورنگ زیب اور روشن آرا پر جو الزام آپ لگا رہے ہیں، اُسے تاریخ بھی قبول نہیں کرتی... اس دور کی تاریخ یہ نہیں کہتی!

— تاریخ بڑی ہے یا تاریخ بنانے والا! ادیب نے نعمانی صاحب کو ٹوکا— تاریخ کچھ نہ کہے، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ روشن آرا نے جامع مسجد کے شاہی امام اور قاسم خاں کو اپنی سازش میں ہی نہیں، اپنی محبت کی آغوش میں بھی لپیٹ لیا تھا... وہ چاہے اُس کا ناٹک ہی رہا ہو، لیکن روشن آرا نے ایک خوبصورت شہزادی ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھایا... اور نعمانی صاحب! ایک ادیب کے دل کی گواہی کسی بھی مورخ کے دلائل کی گواہی سے زیادہ بڑی اور اہم ہے۔

شبلی نعمانی پھر کچھ کہنا چاہتے تھے تو شاہجہاں نے ادیب کا دھیان اپنی طرف کر لیا— ادیب، اس بحث میں کیوں پڑتے ہو۔ کچھ لوگ سچائیوں کے لیے نہیں صرف بحث کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں... چھوڑو اس بحث کو... میں چاہوں گا کہ تم اپنے دل اور اپنے وقت کی آنکھیں لے کر میرے دور میں داخل ہو جاؤ... اور دیکھو کہ تب کیا ہوا تھا اور جو ہوا، وہ کیوں ہوا تھا!

شاہجہاں کے یہ کہتے ہی وقت پیچھے دوڑنے لگا۔ لڑکھڑاتی صدیاں الٹنے لگیں... اور آ کر دلّی پر رک گئیں۔

(۴۳)

وقت ہانپتا لڑکھڑاتا ہوا آیا اور آ کر دلّی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ ایک بہشتی مشک لیے گزر رہا تھا۔ ادیب نے اُسے پکارا اور وقت کو پانی پلانے کے لیے کہا۔ بہشتی نے چاندی کے کٹورے میں پانی نکالا اور اُسے پکڑا دیا— وقت نے پانی پی کر راحت کی سانس لی۔

— ادیب عالی! وقت نے گہری سانس لے کر کچھ ٹھیک ہوتے ہوئے کہا— وقت کے ساتھ ایک برا وقت بھی ہوتا ہے۔ برے وقت کی مار سے میں بہت بار لہولہان ہوا ہوں... یہ صدی میری نہیں، اُسی بُرے وقت کی ہے کیونکہ ہندوستان کی مغلیہ سلطنت برباد ہونے کے دہانے پر ہے... ہندوستان کے تاج کے لیے یہاں سازشوں کا دور چل رہا ہے۔ اکبر اور جہانگیر کا دور ختم ہو چکا ہے۔ شاہجہاں بیمار ہے۔

دلّی سے ہی ادیب کو دکھائی دیا... آگرہ کے قلعے کی بارہ دری میں شاہی پلنگ پر بیمار شاہجہاں لیٹا ہوا ہے۔ جہاں آرا اُس کے ماتھے پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔

— بادشاہ بیگم!

— جی ابا حضور!

— سمجھ میں نہیں آتا، اس سلطنت کی قسمت میں کیا لکھا ہوا ہے... غلطی میری ہے بادشاہ

بیگم... میں نے اپنے چاروں بیٹوں کو اچھی اور اعلیٰ تعلیم نہیں دی، شاید اسی لیے یہ چاروں چار سمتوں کی طرح الگ الگ چل پڑے... دارا تو حق کی تلاش میں اُپنشدوں کی طرف چل پڑا وزیر سعد اللہ خاں کی گرفت میں آکر اورنگ زیب کٹر اور متعصب مسلمان بنتا جا رہا ہے اور وہ نامراد مراد تو بس شراب اور شباب کا غلام ہو گیا ہے۔

ادیب نے غور سے دیکھا— وقت اور سست گیا— پھر وہ ایک خوبصورت سنہرے پرندے جیسے سون ہنس میں بدل گیا، جیسا پرندہ کبھی بابر نے آگرہ کی گدّی فتح کرنے کے بعد پہلی بار دیکھا تھا۔ سون ہنس ہوا میں اُچھلتی گرتی لہروں کی طرح پنکھ پھیلا کر ایک سمت کی طرف اڑنے لگا۔ اُس کے پنکھوں میں کوئی آواز نہیں تھی لیکن طرح طرح کی روشنیوں کے ٹکڑے اُس کے برف کے سفید پنکھوں کو چھوتے ہوئے گزرنے لگے اور روشنی کے وہ ٹکڑے کاغذوں کی طرح اِدھر اُدھر اڑنے لگے...

دیکھتے ہی دیکھتے وہ کاغذ جیسے پوری کائنات میں بھر گئے اور پھر صحیفوں کی شکل میں تبدیل ہونے لگے... بادشاہ نامہ، عمل صالح، عالمگیر نامہ، لطیف الاخبار، تاریخ شجاعی، منتخب اللباب، مآثر الامرا، دبستان المذاہب، مرآۃ الخیال، واقعات عالمگیری اور مآثر عالمگیری سامنے آنے لگے... منوچی اور برنیر کی تفصیلات کے صفحات پھڑ پھڑانے لگے... دستاویزوں کا ایک محل سا بن گیا۔

ادیب اُس محل میں داخل ہوا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ دستاویزوں کی کتنی بڑی دولت ہے ہندوستان کے پاس! دستاویزوں کا وہ محل کچے تیل کی خوشبو سے لبریز تھا... اُس میں فارس کی مہک تھی، ترکی کی بھی اور خراساں، فرغنہ، سمرقند، اندیجان، بلخ، بخارا، غزنی، قندھار، کابل، پیشاور، لاہور اور نہ جانے کتنے شہروں باشندوں اور ممالک کی بھی۔ ویدک، بودھ دھرم اور اسلام کی خوشبو بھی۔ ہزاروں لاکھوں سوچ سکنے، سوچنے والوں کے بت اس محل میں موجود تھے... اور تبھی ریگستانوں سے ریت کے سیکڑوں بگولے اٹھنے لگے... اور اُن گرم ہواؤں کے ساتھ ساتھ یکا یک سرد ہوائیں بھی آنے لگیں اور ہندوکش، پامیر اور شوالک کی پہاڑیوں پر برف پڑنے لگی۔ خراسان، سمرقند اور پشاور کے میدانوں میں اولے پڑنے لگے۔ تبھی ادھر لداخ، کشمیر اور تبت میں پت جھڑ آیا اور چنار سرخ ہو کر جھڑنے لگے، سفیدے خنگ ہو گئے اور چیڑ کے جنگلوں کے نیچے بادامی سوئیوں کے قالین بچھ گئے۔ موسم بڑا عجیب تھا...

تبھی وقت نے آواز دی— اے ادیب! ساری تہذیبیں، ساری کتابیں، تیرے سامنے کھلی پڑی ہیں... انہیں پڑھ اور دنیا کو سکون کی راہ دکھا...

— اے میرے وقت عالم! ہر کتاب کوئی نہ کوئی راہ دکھاتی ہے، لیکن ہر دور اپنی کتاب لکھنا

چاہتا یا لکھواتا ہے... اس لیے ہر سچی کتاب جھوٹی بن جاتی ہے اور ہر جھوٹ سچ بن جاتا ہے! ایسے میں میں کیا کروں؟

— ایسے میں... ایسے میں تو صرف اس کائنات کے آنسوؤں کا رنگ دیکھ... وہی جو تو نے ماریشس کے تھراک ہوٹل کے پانی میں دیکھا تھا... جو اپنے دور کے آنسوؤں کا رنگ پہچان لیتا ہے، وہی اپنے دور کے صحیح معنی کو ڈھونڈ سکتا ہے... اے ادیب! اپنے آنسوؤں کے سمندر کو سنبھال... جس دور کے آنسو سوکھ جاتے ہیں۔ اُس دور کا ادیب مر جاتا ہے... زندگی کا تقاضہ ہے تو اس ضروری سفر پر نکل جا!

سترہویں صدی سامنے کھڑی تھی۔

اور تب ادیب نے آواز لگائی— شہنشاہ بابر، اورنگ زیب اب اپنے اپنے تخت سے ہٹ جائیں کیونکہ وقت کا مستند پیمانہ اپنے ترازو پر سب کو ٹھیک ٹھیک تولنا چاہتا ہے!

وقت کے ہرکارے دوڑنے لگے۔ ایلچی اور جاسوس خبریں دینے لگے—

— حضورا شہنشاہ اکبر کی صلح کل کی حکمت عملی کو جاری رکھتے ہوئے دارا شکوہ نے اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کی شادی کا پیغام مرزا راجہ جے سنگھ کی بھانجی کے لیے بھیجا ہے۔ ساتھ ہی اُدھر شہنشاہ شاہجہاں کے دوسرے بیٹے شجاع اور تیسرے بیٹے اورنگ زیب کے درمیان ایک خفیہ خاندانی معاہدہ ہو گیا ہے۔ شجاع کی بیٹی گل رخ بانو کی سگائی اورنگ زیب کے بڑے بیٹے سلطان محمد سے ہو گئی ہے۔ حالانکہ اسے پوشیدہ رکھا گیا لیکن پھر بھی یہ خبر پھیلتی جا رہی ہے۔ مرزا راجہ جے سنگھ کی بھانجی کا ہاتھ مانگ کر دارا شکوہ نے اپنی اُس غلطی کا تدارک کر لیا ہے جو قندھار کی تیسری گھیرا بندی کے دوران، اُن دونوں کے درمیان ہو گئی تھی جسے لے کر رشتے ٹوٹ جانے کی حد تک پہنچ گئے تھے۔

اردلی نے ٹہوکا لگایا— دیکھا آپ نے... مغلیہ دور میں شادیاں بھی شطرنج کی چالوں کی طرح چلی جاتی ہیں۔ یہی دارا اور مرزا راجہ جے سنگھ کے درمیان ہوا ہے اور یہی اورنگ زیب کے لڑکے اور شجاع کی لڑکی کے درمیان ہوا ہے... اتنی بڑی سلطنت کو قائم رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

تبھی ایک اور خبر رساں خبر لے کر آیا— حضورا میواڑ کے مہارانا نے چتوڑ گڑھ کی مرمت بڑے پیمانے پر شروع کر دی ہے۔ اس سے بہت بڑا فساد کھڑا ہو سکتا ہے۔

تیسرے خبر رساں نے آکر خبر دی— حضور اعلیٰ! اس وقت شہنشاہ عالم شاہجہاں کے دربار میں کچھ اہم فیصلے لیے جا رہے ہیں۔ میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں... میواڑ کا مسئلہ اٹھتے ہی شہنشاہ عالم نے اپنے اعلیٰ وزیر سعد اللہ کی طرف دیکھا۔ اس کی بھنووں میں گرہیں پڑ گئیں۔ لیکن بہت شائستگی سے اُس

نے کہا— اس مرمت کے پیچھے کے ارادوں کو جاننا ضروری ہے۔ راجپوتوں، خاص طور سے میواڑ کے سسودیوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا... ظاہر ہے حضور! شہزادہ دارا نے سعد اللہ کے تیوروں کو بھانپنے کی کوشش کی...

ہاں! مجھے اس بات کا احساس ہے کہ دارا نے کیا سوچا ہوگا! وقت نے کہا— دارا جانتا ہے کہ سعد اللہ پانچ وقت کا نمازی ہے اور کٹر سنی۔ اس کے دل و دماغ میں یہ بات بہت گہرائی سے بیٹھی ہوئی ہے کہ مغلوں نے ہندوستان کو فتح کیا ہے، اس لیے حکمراں اور محکوم کا فرق بنائے رکھنا ضروری ہے۔ اس بات کو لے کر دارا اور سعد اللہ میں کئی بار تناچاقی بھی ہو چکی ہے۔ مجھے یاد ہے بھرے دربار میں کئی بار سعد اللہ نے زور دے کر کہا تھا— ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم تیموری خاندان کے شہنشاہ بابر کی تلوار کے زور پر فرغنہ سے ہندوستان آئے ہیں... نہیں تو کھوجند کی شکارگاہوں میں ہم آج بھی سفید ہرنوں، پہاڑی بکروں، بارہ سنگھوں، خرگوش، تیتر وغیرہ کا شکار کھیل رہے ہوتے اور انگور، خوبانی اور انار کے باغوں میں بیٹھے آتشکدہ— وہی اپنا قبائلی ساز بجا رہے ہوتے!

ایک بار سعد اللہ نے یہی بات پھر دہرائی تھی تو دارا برداشت نہیں کر پایا تھا۔ اس نے شہنشاہ کے سامنے کہا تھا— معزز وزیر اعلیٰ، وہ دور اور تھا... اب ہندوستان کی یہ سرزمین ہمارا ملک بھی ہے اور مادر وطن بھی! ہم یہیں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں دفن ہوں گے!

سعد اللہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن سب پر یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ مغلیہ حکومت کی حکمت عملی کو لے کر وزیر اعظم اور شہزادے کے درمیان بنیادی طور سے نااتفاقی ہے۔

ایلچی نے بتایا— لیکن حضور! اس بار اعلیٰ وزیر نے ایک اہم پرانے دستاویز کا حوالہ دیا ہے، وہ یہ بھی بولے کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شہنشاہ جہاں گیر اور میواڑ کے رانا امر سنگھ کے درمیان معاہدہ کا وہ حلف نامہ موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ چتوڑ کے قلعے کی توسیع نہیں کی جائے گی اور شاہی اجازت کے بغیر قلعہ بنانے کا کوئی کام ہاتھ میں نہیں لیا جائے گا!

تبھی ایک اور خبر رساں آن پہنچا۔ اس نے خبر دی— تازہ ترین حالات یہ ہیں کہ شہنشاہ کی اجازت لے کر اعلیٰ وزیر نے عبدل بیگ کو میواڑ کے مہارانا کے پاس کسی خاص مقصد سے روانہ کر دیا ہے، اس فرمان کے ساتھ کہ دکن کے صوبیدار اورنگ زیب کی خدمت میں وہ فوجوں کا ایک خاص دستہ فوراً روانہ کر دے... حضور! اصل میں عبدل بیگ کا کام یہ ہے کہ وہ رانا کی طاقت میں اضافے اور قلعے میں مرمت کے نام پر ہو رہی تعمیر اور توسیع کا پتہ خفیہ طور سے لگائے۔

عبدل بیگ نے لوٹتے ہی تفصیل سے اپنی رپورٹ پیش کی اور اس کی بنا پر یہ مان کر کہ چتوڑ

کے مہارانا کے ارادے نیک نہیں ہیں... وزیر سعد اللہ تیس ہزار فوجوں کا دستہ لے کر میواڑ کی طرف بڑھ چلا ہے۔ وہ مہارانا کو جنگ کے لیے مجبور کرنا چاہتا ہے۔ آخر دارا کو مداخلت کرنی پڑی۔ میواڑ کے مہارانا کا ساتھ دے کر اس نے شاہجہاں سے فرمان جاری کروایا کہ میواڑ پر حملہ نہ کیا جائے۔ سعد اللہ نے اس مداخلت کی مخالفت کی ہے۔ وہ شاہی فرمان کی حکم عدولی نہیں کر سکتا، لیکن موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اور مہارانا کو سبق سکھانے کی نیت سے اس نے کچھ سخت شرطیں لگا کر میواڑ ریاست کے کچھ علاقوں کو اپنے حمایتیوں کے لیے آزاد کرا لیا ہے۔ یہ بھی طے کرا لیا ہے کہ مہارانا کا بڑا لڑکا مستقبل میں شاہی دربار کی حفاظت میں رہے گا۔

دارا نے مہارانا کو مکمل بربادی اور شکست کی ذلت سے بچا لیا، لیکن مہارانا نے اس احسان کو بھی ذلت کی شکل میں لیا اور وہ دارا کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب کا دوست بن گیا ہے۔ یہی سعد اللہ چاہتا تھا۔ سعد اللہ کے سامنے آگے آنے والی وراثت کی جنگ کی بساط بچھی ہے، وہ بہت سوجھ بوجھ اور قاعدے سے اپنے مہرے بساط پر بٹھا رہا ہے۔ وہ دارا کی وطن پرستی اور قومی اتحاد کا حامی نہیں ہے۔

اپنے سب سے زیادہ معزز دوست وزیر سعد اللہ اور اپنے سب سے زیادہ عزیز بیٹے شہزادہ دارا کے درمیان چلتے مقابلے سے شاہجہاں اسی طرح دکھی تھا جیسے اپنے زمانے میں اکبر سلیم اور ابوالفضل کی دشمنی کو لے کر تھا۔ دارا کو سعد اللہ کی طاقت سے بھی اتنی ہی نفرت تھی جتنی کہ اس کے کٹر سنی ہونے سے۔ ساتھ ہی وہ اعلیٰ وزیر سعد اللہ اور اورنگ زیب کے گہرے تعلقات کو بھی قبول نہیں کر پاتا تھا۔

اورنگ زیب خود کو سعد اللہ کا شاگرد مانتا اور قبول کرتا ہے۔ سعد اللہ اور دارا کے درمیان مسلسل نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔ دربار میں حاضر شہزادوں کے وکیل اور خبر رساں یہ خبریں اپنے اپنے مالک شہزادوں، شجاع، مراد اور اورنگ زیب کو پہنچاتے رہتے ہیں۔ سعد اللہ نیک اور ذہین آدمی ہے لیکن وہ اپنے راستے کے پتھروں کو قبول نہیں کرتا۔ دارا کے دل میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن یہ دو اہم افراد کی انا اور آرزوؤں کی جنگ ہے۔ دارا جذباتی، مطالعہ کرنے والا اور ہر دلعزیز شہزادہ ہے۔ سعد اللہ ایک فاتح ذات کا حامی، سنجیدہ، قابل وزیر اور کٹر مسلمان ہے۔

شاہجہاں کا دور حکومت اندرونی سازشوں کا دور ہے جہاں کٹر مذہب بھی ہے اور فراخ دل انصاف پسند ترقی پسندی بھی۔

اور پھر موجود ہے دکن کا مسئلہ، جہاں کا صوبیدار ہے اورنگ زیب۔ دکن کے سوال پر اعلیٰ وزیر

سعد اللہ، اورنگ زیب اور روشن آرا کا گرم گروپ ایک طرف ہے اور دوسری طرف ہے — دارا اور جہاں آرا کا نرم گروپ! بالآخر یہ گروپ بندی جنگ، وراثت کی جنگ کا بنیادی سبب بن رہی ہے۔

ادیب نے اس ساری تاریخ کی تمہید تو جان لی، لیکن شہزادوں کے دماغوں میں چھپی بساط پر وراثت کی جنگ کے مہروں میں جان پڑ چکی تھی اور وہ اپنی اپنی جگہ اپنی چالیں چلنے کے لیے مجبور تھے۔ ادیب نے آواز دی —

— اے وقت... تم کہاں ہو؟

— بولو! وقت نے پوچھا۔

— جب تم نے مجھے تاریخ میں داخل ہونے کا وردان دے ہی دیا ہے تو میری ایک مدد اور کرو...

— کیا؟

— یہی کہ تاریخ کے پیچھے جو تاریخ دبی پڑی ہے، اُس تاریخ کی شریانوں میں بہتے ہوئے خون کی روانی کو، حادثات کے پیچھے وقوع پذیر دماغی سازشوں، خواہشات اور سیلاب کو میں دیکھنا چاہتا ہوں... اُس غیر مجسم، ماورائی، غیر متشکل سچ کو میں کیسے دیکھوں؟

— ادیب! میں تو صرف ایک اَن دیکھا سلسلہ ہوں جسے تمھیں نے مہاکال جیسا عظیم طاقت ور نام دیا ہے... تمھیں نے مجھے طاقت ور اور مسلسل بنایا ہے۔ پھر تمھیں نے اپنی سہولت کے لیے، ادوار، سنین، صدیوں، دہائیوں، پہروں اور لمحوں میں بانٹا ہے... اور وہ تاریخ، جس کے اندر تم مورخ بن کر داخل ہوئے ہو، وہ بھی تو میرے ان تمام ادوار کا ایک ٹکڑا ہے! اُسے دیکھ پانا یا اس میں مضمر سچ کو واضح کر پانا تمہارے لیے تو قطعی مشکل نہیں ہے! وقت نے کہا۔

اب ادیب کو خود پر بھی بھروسہ کرتا تھا... اس لیے ادیب نے گولکنڈہ کے ناقابلِ تسخیر قلعہ کو آواز دی... اور گولکنڈہ کا وہ قلعہ حاضر ہوا۔

— تمہارے خلاف کیا سازشیں ہیں؟ ادیب نے پوچھا۔

— سازشیں تو بہت ہیں۔ ایک سازش تو اسی کے خلاف ہے کہ ہم اپنے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے ماتحت شیعہ ہیں، ہم سنی نہیں ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہندوستان میں شاہجہاں کے چاروں بیٹوں کے درمیان وراثت کی جنگ شروع ہو چکی ہے، اس لیے اورنگ زیب سنی ہونے کے نام پر گولکنڈہ اور بیجاپور کی شیعہ ریاستوں کو فتح کرکے، اُن کی تین لاکھ افواج کو اپنے ماتحت کرنا چاہتا ہے۔ اورنگ زیب اتنا ذہین نہیں ہے، جتنا اُسے سمجھا جاتا ہے... یہ سازش ہے اُس کی بہن روشن آرا کی

تاکہ وراثت کی جنگ میں اورنگ زیب اپنی فوجی برتری اور طاقت کا مظاہرہ کر سکے اور اس میں ساتھ دے رہا ہے، شہنشاہ کا اعلیٰ وزیر سعد اللہ۔ اسی لیے اورنگ زیب ہمارے قلعے پر چھ مہینے سے ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے اور ہماری رعایا اور فوج کی رسد کے راستے بند کر دیے ہیں!

گولکنڈہ کا قلعہ بول رہا تھا — ہمیں تو یہی معلوم ہے کہ مغل شہنشاہ شاہجہاں نے اورنگ زیب کو محض اتنا حکم دیا ہے کہ وہ صرف اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے، تاکہ گولکنڈہ سے میر جملہ کے خاندان کو آزادی مل جائے۔ اس حملے کے لیے یہ لنگڑی دلیل نکالی گئی ہے کہ یہ میر جملہ گولکنڈہ کے نہیں، شاہی دربار کے نوکر ہیں... یہی بہانہ بنا کر اورنگ زیب ہمارے قلی قطب شاہ کو مار کر ہماری ریاست پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور یہی اُس نے بیجاپور ریاست کے ساتھ کیا۔ اس میں شہنشاہ شاہجہاں کی چالاک بیٹی روشن آرا اور اُن کا وزیر اعظم سعد اللہ اورنگ زیب کا بھرپور ساتھ دے رہا ہے، کیونکہ سعد اللہ شیعوں اور ایرانی صوفیوں کو اسلام کے خلاف مانتا ہے... اصل میں اورنگ زیب کی نظر گولکنڈہ، بیجاپور پر نہیں، مغلیہ سلطنت کے تختِ طاؤس پر ہے۔ وہ ہم دونوں ریاستوں کو ہرا کر ہماری فوجیں اپنی اگلی جنگ کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہے!

تبھی ایک زلزلہ سا اٹھا... تلوار سے زیادہ خطرناک اور چمکدار قلم آسمان کا سینہ چیر کر نکلا! بادلوں میں چھپی بجلیاں کڑک کر ٹکرائیں اور آسمان کے سینے سے بجلیوں کی دھجیاں کٹ کٹ کر گرنے لگیں! ادیب نے تلوار سے زیادہ کارگر اس قلم کو دیکھا اور دریافت کیا کہ یہ کس کا قلم ہے؟

اردلی نے ادیب سے کہا — حضور، یہ اعلیٰ دانشور شبلی نعمانی کا قلم ہے اور وہ پہلے سے ہی آپ کے سامنے حاضر ہیں! ادیب نے شائستگی سے کہا — شبلی نعمانی صاحب! آپ کو وقت کی اس تحریر میں کچھ اور اضافہ کرنا ہے؟

— ہاں ادیب... اب تک جو کچھ سوچا اور کہا گیا وہ غلط ہے! سراسر غلط ہے! شبلی نعمانی نے دلیل دی — اصل میں یہ دارا کی سازش ہے۔ اُس نے شہنشاہ کو بھڑکا کر یہ شاہی فرمان بھجوایا ہے کہ اورنگ زیب گولکنڈہ کا گھیرا اٹھا لے۔ اورنگ زیب نے بیجاپور کو گھیر لیا ہے اور چھ مہینے کے گھیرے کے بعد جب یہ قریب قریب صاف اور طے ہو گیا کہ بیجاپور کے علی عادل شاہ کو شکست دے کر اورنگ زیب اپنی جیت کا جھنڈا گاڑ دے گا، تبھی دارا کی سازشوں کے تحت، شہنشاہ نے اپنے فرمان کو الٹ کر یہ حکم بھیجا ہے کہ اورنگ زیب کے ساتھ گولکنڈہ اور بیجاپور میں جنگ میں شامل مہابت خاں اور بہتر سالہ بوڑھا سمیت اُن کی فوجوں کو فوراً آگرہ واپس بھیج دیا جائے! یہ فرمان دیکھتے ہی اورنگ زیب سکتے میں آ گیا ہے... کہ آخر یہ کیسا فیصلہ ہے۔ لیکن شہنشاہ شاہجہاں چونکہ دارا کے ہاتھ کی کٹھ

چکی بن چکا ہے اور دارا چاہتا ہے کہ وراثت کی جنگ کے لیے اس کا بھائی طاقتور نہ بننے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کو بتائے بغیر شہنشاہ شاہجہاں کی طرف سے بیجاپور کے سربراہ علی عادل شاہ کی پیش کش پر، دارا کے ذریعہ معاہدہ کرا دیا گیا! یہ اورنگ زیب کے خلاف دارا کی گھٹیا سازش ہے...

— نہیں! اور اس نہیں کے ساتھ ایک اور زلزلہ آیا... مورخ قانون گو بھی اپنا جلالی قلم چلاتا ہوا چیخا — یہ الزام غلط ہے! اورنگ زیب خود دکن میں اپنی طاقت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے گھیرے سے پریشان و بدحال گولکنڈہ کے سلطان کے سامنے اس نے خود معاہدے کی یہ تجویز رکھی تھی کہ تم اپنی ماں کو ہمارے پاس گروی رکھ دو اور اپنی لڑکی کی شادی تم میرے بیٹے سے کردو اور یہ عہد نامہ لکھو کہ اس سے پیدا ہونے والی اولاد ہی گولکنڈہ کے تخت کی وارث ہوگی!... مورخ قانون گو چیخا۔

— ادیب عالی! اس عہد نامے اور اس کی شرطوں کی کوئی جانکاری اورنگ زیب نے شہنشاہ شاہجہاں کو نہیں دی!... یہ ایک سازش تھی جو اورنگ زیب نے کی تھی، کیونکہ یہ دکن میں اپنی ریاست اور حکومت کی مستقل بنیاد طے کرنا چاہتا تھا۔ اپنی سازشوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے وہ سارے الزام دارا شکوہ پر لگاتا رہا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وراثت کی جنگ میں اس کی آخری لڑائی دارا شکوہ سے ہی ہونے والی ہے۔ اسی کے ساتھ اصل بات یہ تھی ادیب عالی کہ شاہجہاں اورنگ زیب سے پریشان تھا، اس میں اُسے اپنی ہی گنہگار روح کی پرچھائیں دکھائی دیتی تھی۔ شاہجہاں نے خود اپنے والد جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تھی اور اپنے بڑے بھائی کا قتل کیا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ اورنگ زیب کہیں اسی تاریخ کو پھر نہ دہرائے۔ وہ اورنگ زیب کو لے کر بے چین و فکرمند رہتا تھا کہ دکن میں اپنی صوبیداری کو پختہ کرکے، گولکنڈہ اور بیجاپور کی عظیم الشان فوجوں کے زور پر دلّی کی سلطنت پر حق جمانے کے خواب کو کہیں عملی جامہ نہ پہنا دے! اس امکان کو جڑ سے مٹا دینے کی خاطر ہی شاہجہاں نے سوچا تھا کہ دکن کی صوبیداری شجاع کو سونپ دی جائے۔ اس بارے میں شاہجہاں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے شجاع کو ایک خط بھی لکھا تھا۔ لیکن ادیب عالی! شاہجہاں اپنے اس فیصلے کو عمل میں نہیں لا سکا۔ کیونکہ وہ ۶ ستمبر ۱۶۵۷ء میں ہی بیمار پڑ گیا۔ اس وقت دارا شکوہ کی عمر بیالیس سال تھی اور شاہجہاں کی بیماری کے ساتھ ہی یہ وراثت کی جنگ شروع ہوگئی۔

تبھی ایک بزرگ عالم کھڑے ہوئے اور اجازت لے کر بولنے لگے —

— حضور! وہ زمانہ دوسرا تھا... یہ سارے لوگ اس بے رحم جاگیردارانہ زمانے کو آج کی قدروں، ترقی یافتہ ملوکیت اور آج کے زمانے کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اسلام نے اپنے نظام

حکومت کے لیے وارثانہ حقوق کے قدرتی حق جیسے ارادے پر بھی غور ہی نہیں کیا تھا، اسی لیے مسلم حکمرانوں کے یہاں وراثت حق کی بنا پر نہیں، تلوار کے زور پر طے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تیمور خاندان میں وراثت کے لیے کی گئی بغاوت یا خونریزی بھی قابل مذمت نہیں مانی جاتی۔ وہاں جائز اور ناجائز کا سوال ہی نہیں، وہاں وہی جائز ہے جو تلوار طے کردیتی ہے!

اس کے علاوہ! ایک دوسرے عالم نے بات آگے بڑھائی — شہزادوں کی شخصیت، کردار اور مذہبی خیال اُن کی وراثت کی جنگ کے قطعی ذمہ دار نہیں ہیں۔ دارا اور اورنگ زیب کے درمیان جو وراثت کی جنگ ہوئی وہ ہندو رعایا اور مسلمان رعایا کی جنگ نہیں تھی، یہاں مذہب کا سوال ہے ہی نہیں... نہیں تو بارہا کے سیدوں نے دارا کا ساتھ نہ دیا ہوتا اور اورنگ زیب کی طرفداری کے لیے جے پور کے مہاراجا راج سنگھ اس کے حمایتی نہ ہوتے!... حضور، میں شبلی نعمانی صاحب کی اس کٹر دلیل سے بھی اتفاق نہیں کرتا کہ دارا شکوہ غیر مذہبی ہوگیا تھا... دارا کی نااتفاقی ملاؤں سے ہوسکتی ہے اور تھی بھی، لیکن وہ ہمیشہ مسلمان تھا، رہا اور مسلمان ہی مرا! اس بات کو دارا کے مخالف مورخ برنیر نے بھی قبول کیا ہے!

شبلی نعمانی خود کو روک نہیں پارہے تھے۔ وہ بول ہی پڑے —

— کچھ بھی کہا جائے، لیکن یہ بات طے ہے کہ شاہجہاں دارا کو تخت سونپنا چاہتا تھا۔

— وہ اس لیے کہ شاہجہاں کو اورنگ زیب سے خون خرابے اور بغاوت کا ڈر تھا... اس خون خرابے میں اورنگ زیب شاہجہاں کو بھی مار سکتا تھا! قانون گو نے شبلی نعمانی کو ٹوکا۔

— لیکن ویسا ہوا تو نہیں! شبلی نعمانی نے آواز اونچی کرکے کہا۔

— تلوار سے نہ سہی، لیکن اس نے شاہجہاں کو قید میں ڈال کر تل تل ذلیل ہو کر مرنے کے لیے مجبور کیا! قانون گو نے کہا۔

— جو بھی ہو... شبلی نعمانی نے اپنی بات جاری رکھی — دارا کو شاہجہاں نے اپنے دامن سے کبھی دور نہیں ہونے دیا۔ شاہجہاں نے تیس برس حکومت کی، لیکن دارا سال بھر یا پندرہ مہینوں سے زیادہ کبھی دربار سے دور نہیں رہا۔ جنگ میں بھی اس نے کبھی کوئی خاص کارنامہ نہیں دکھایا، پھر بھی وہ ساٹھ ہزار ذات کا عہدہ دار بن بیٹھا۔ یہ عہدہ تو تینوں بھائیوں کے مشترکہ عہدے سے زیادہ بڑا تھا۔ یہاں تک کہ دارا کے بیٹوں تک کو زیادہ بڑا مانا گیا... سلیمان شکوہ کابل کا غیر حاضر صوبیدار تھا۔ اُسے بارہ ہزاری کا عہدہ دیا گیا ہے۔ شہنشاہ نے شاہی خزانہ، فوجیں، سارے گھوڑ سوار اور سلطنت کا سارا گولہ بارود اس کے حوالے کردیا... وراثت کی جنگ سے پہلے ہی شہنشاہ شاہجہاں نے سونے کا ایک

تخت بنوا کر اپنے تخت طاؤس کے بغل میں رکھوایا تھا، جس پر انھوں نے دارا شکوہ کو بٹھایا تھا... اس کے بعد تاج پوشی کی رسم میں باقی کیا رہ گیا تھا؟

— تو اس میں غلط کیا تھا؟ کیونکہ دارا شہنشاہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور مغلیہ سلطنت کو اب تک ہندوستان کی سرزمین پر حکومت کرتے قریب ایک سو دس سال ہو چکے تھے اور وراثت کی ہندوستانی روایت سے شاہجہاں اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ خود اُس کے دل کا گناہ کہ اس نے اپنے بڑے بھائی کا قتل کر کے تاج حاصل کیا تھا، اُسے اندر ہی اندر ملامت کر رہا تھا۔ شاید اسی لیے وہ اپنے بیٹوں کو خون خرابے سے بچانے کے لیے وراثت کی ہندوستانی اور زیادہ مہذب روایت کی تائید کرنا چاہتا تھا، لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکا! قانون گو نے اپنی جرح پیش کی۔

ادیب نے اپنے اردلی کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹھا سب نوٹ کر رہا تھا۔

— یہ تم کیا کر رہے ہو؟ ادیب نے اُس سے پوچھا۔

— میں گنیش کی طرح اس مہابھارت کو نوٹ کرتا جا رہا ہوں تاکہ حضور اس تاریخ کو لکھ سکیں!

— حضورِ عالی! غلط تاریخ نہ لکھی جائے! یہ آواز شبلی نعمانی کی تھی۔

— تو کیا آپ کی تاریخ کی نگاہ، جرح اور دلائل کو آخری مان لیا جائے؟ ادیب نے سوال کیا۔

— وہ تو ماننا ہی پڑے گا! کیونکہ شہنشاہ شاہجہاں ہندوستان پرست نہیں، اسلام پرست تھا... وہ سچا مسلمان تھا... شبلی نعمانی ابھی کہہ ہی رہے تھے کہ ایک بوڑھے عالم نے طنز کیا—

— شاید اسی لیے وہ اسلام پرست اورنگ زیب سے ہندوستان پرست دارا شکوہ کو زیادہ چاہتا تھا؟ کیوں؟

— یہ کوئی دلیل نہیں ہے! شبلی نے کہا۔

— ہے! ادیب بولا— شبلی نعمانی صاحب، ہمیں آپ کے لکھے صفحات سے ہی معلوم ہوا ہے کہ آپ کی نظر میں شاہجہاں اورنگ زیب سے زیادہ ہندو مخالف تھا۔ اُس نے اورنگ زیب سے زیادہ ہندو مندروں کو گروایا تھا... انھیں بہت زیادہ ستایا تھا... وہ اورنگ زیب سے زیادہ کٹر مسلمان تھا۔

— جی! یہی سچائی ہے!

— تو پھر اُس نے اپنے ہندو مخالف کٹر سنی بیٹے اورنگ زیب کا ساتھ نہ دے کر ہندو پرست دارا کا کیوں ساتھ دیا؟

— اس کے بارے میں میں کچھ نہیں بتا سکتا! شبلی نعمانی نے کہا۔

— لیکن میں بتا سکتا ہوں! خون کی سیاہی سے تلواروں نے جو تاریخ دھرتی کی چھاتی پر لکھی

ہے، وہی فیصلہ کن تاریخ نہیں ہے... یہ تو وہ تاریخ ہے جو پیشہ ور مورخ لکھ سکتے تھے، یا اُن سے لکھوایا گیا۔ ان تواریخ کے علاوہ تاریخ کے انھیں ہیروؤں کے دل، ارادوں، پشیمانیوں کی ایک زیادہ بڑی تاریخ ہوتی ہے جو پیشہ ور مورخ نہیں لکھ سکتے— اسی لیے بابر کا بابرنامہ تاریخ کی زیادہ صحیح اور سچی کتاب ہے... بابر نے ہندوستانی ہندو کا حوصلہ توڑنے کے لیے چاہے جتنی زیادتیاں کی ہوں، لیکن وہ ہندوستان سے لوٹ کر فرغنہ نہیں جا سکا... اسی لیے وہ آگرہ میں دفن ہوا تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ بعد میں اُسے اسلام کا غازی ہونے کا درجہ دے کر آگرہ کی قبر سے اُس کی دیمک لگی ہڈیوں کو نکالا گیا اور کابل میں دفن کیا گیا... لیکن کابل بھی اس کی جائے پیدائش یا وطن نہیں تھا!

اردلی نے بیان نوٹ کیا۔

— میں مانتا ہوں بابر حملہ آور تھا... لیکن اس کی پشیمانی کو کبھی سمجھا ہی نہیں گیا۔ ادیب نے کہا— سوچئے ذرا... اُس سے ہزاروں برس پہلے اڑیسہ کا کلنگ ریاست بھی خودمختار ریاست نہیں، اپنے راجہ کے ماتحت آزاد ملک تھا۔ اشوک نے کلنگ پر جب حملہ کیا تو وہ بھی حملہ آور تھا... جنگ میں اتنا خون بہا کہ دیا ندی کا پانی لال ہو گیا تھا... اپنی اس بربریت کا کفارہ جب اشوک نے پنچ شیل اور اہنسا کے نظریات کو پیش کر ادا کیا تھا۔ اگر اشوک کا کفارہ ہندوستانی تھا تو ہندوستان کو اپنا ملک مان لینے والے کفارے کے لحاظ کو ہم غیر ہندوستانی کیوں کہنا چاہتے ہیں؟ وہ عربی، ترکی، تاتاری یا افغانی پشیمانی کے لمحے نہیں، وہ ہندوستان کی سرزمین پر طلوع ہوئے، اُن کے شدید پشیمانی کے لمحے تھے۔ اکبر اُس ہندوستانی پشیمانی کی سب سے روشن مثال ہے... لیکن خودغرض شہنشاہ کبھی مذہب، کبھی نسل، کبھی اچانک فتیابی سے حاصل شجاعت کے بہانے اپنی فتیابی کے قصے کی بڑائی میں اپنی انسانی روح کے المیے کو بغیر لکھے چھوڑ گئے ہیں۔ ہمیں بنا لکھے المیے کی اس تاریخ کو دوبارہ لکھنا ہے— عہد وسطی کے حملہ آوروں کی اس ذہنی پشیمانی کے پہلو کو ہندوستانی روایات اور تناظر میں دوبارہ عکاسی کرنا ہے۔

... دوستو! مجھے لگتا ہے کہ بابر اور ہمایوں کی پشیمانی اور رنج کا مجسم شکل تھا— اکبر! اور جہانگیر و شاہجہاں کی پشیمانی کا نتیجہ تھا— دارا شکوہ! لیکن مشکل یہ ہے کہ ملوکیت کی کوئی مذہبی تنظیم، کوئی مذہبی تحریک کسی رنج اور پشیمانی کو قبول نہیں کرتی... کیونکہ دھرم یا مذہب زندگی کی سچائیوں سے ہمیشہ صدیوں پچھڑا رہتا ہے! اور یہی تمام بے بنیاد پاکستانوں کی بنیاد بنتا ہے!... حضرت شبلی نعمانی جیسے لوگ ہی ان غیر فطری پاکستانوں کی بنیاد ڈالتے ہیں... مصر، تیونس، ترکی، صومالیہ، الجیریا، لبنان اور عراق میں کیا ہو رہا ہے؟ وہاں تو مسلمان ہی مسلمان سے لڑ رہا ہے تو شبلی نعمانی صاحب! یہ لڑائی

دھرم کی نہیں، دھرم اور مذہبی کٹرپن کی ہے۔ اسلام جیسا مذہب ہی خود اپنے مذہبی کٹرپن سے لڑ رہا ہے اور شاید دنیا کے ہر مذہب کو اپنے کٹرپن سے لڑنا اور اُسے جیتنا پڑے گا۔ آپ اپنے مذہبی کٹرپن کے دلائل سے پاکستانوں میں سے اور پاکستان بنائیں گے، لیکن مذہبی دنیا اپنے مذہبی عقائد کو زندہ رکھتے ہوئے ایک انسانی مذہب کے آئین کا تصور کرے گی... یہ کسی ایک مذہب کی دنیا نہیں ہوگی، یہ کثیر مذہبی لوگوں کی ایک مذہبی دنیا ہوگی۔ اپنے اپنے مذہب کے کٹرپن سے لڑتے رہنے والے مذہب پرست لوگوں کی دنیا!

— آپ تو بھاشن دینے لگتے ہیں! اپنا قلم رکھ کر اردلی نے ادیب سے کہا — ہم تاریخ لکھ رہے تھے، آپ نے فلسفیانہ باتیں شروع کر دیں... وقت نے آپ کو مورخ بننے کا موقع دیا ہے تو آپ تاریخ کو دیکھیے... اردلی نے پیش کش کی تو شبلی نعمانی نے تاریخ کا اگلا حصہ بیان کرنا شروع کر دیا —

— دیکھیے... حضور عالی! اورنگ زیب اور دارا شکوہ میں بچپن سے ہی نا اتفاقی تھی۔ یہ ۲۸ مئی ۱۶۳۳ء کا واقعہ ہے — آگرہ گڑھ کے نیچے جمنا کے ریتیلے میدان پر دو ہاتھی، سدھاکر اور صورت سندر لڑانے کے لیے اتارے گئے۔ یہ ایک شاہی شغل تھا۔ شہنشاہ اور شہزادے موجود تھے۔ غصے سے پاگل سدھاکر ہاتھی نے صورت سندر ہاتھی کو پچھاڑ دینے کے بعد سامنے گھوڑے پر سوار اورنگ زیب پر حملہ کر دیا۔ گھوڑا گر گیا، لیکن پندرہ سال کا شہزادہ اورنگ زیب اُس ہاتھی کی زد سے بچ نکلا۔ اُس غصے میں پاگل ہاتھی پر تب حملہ کر کے شجاع، مرزا راجہ جے سنگھ اور اورنگ زیب نے مار ڈالا۔ دارا شکوہ بھی وہیں تھا، لیکن اُس نے اپنے بھائی اورنگ زیب کو بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی! شبلی نعمانی بولے، تو قانون گو نے دوسرا رخ پیش کیا —

— وہ اس لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ دارا اس ہاتھی کے پیچھے تھا... حملہ آور ہاتھی پر وہ کوئی کارگر حملہ کر پانے کی حالت میں نہیں تھا! تبھی دوسرے عالم نے کہا، لیکن اپنی زندگی اور موت کا سوال اٹھاتے ہوئے تب اورنگ زیب نے شہنشاہ سے کہا تھا — اگر میں ہاتھی کے حملے میں مارا جاتا تو وہ کوئی شرم کی بات نہیں ہوتی، کیونکہ وہ تو ایک غصے سے پاگل جنگلی جانور تھا، شرم کی بات تو میرے بھائیوں کے اخلاق و کردار میں تھی! شبلی نعمانی صاحب! یہ الفاظ بالکل وہی ہیں جو اورنگ زیب کے زیر سرپرستی حمید الدین خاں مورخ نے لکھے ہیں۔ اس بیان میں اورنگ زیب کی چالاکی اور بیان کا نشتر واضح ہے، کیونکہ اپنے بھائیوں کو لے کر جمع کا استعمال کرتے ہوئے اُس کا اشارہ صرف دارا کے لیے تھا۔ لیکن خود اسی واقعے کو لکھتے ہوئے اورنگ زیب کے سرکاری مورخ نے لکھا ہے کہ —

دارا چاہتے ہوئے بھی اورنگ زیب کی مدد نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ وہ دوسری طرف تھا اور کچھ ہی پلوں میں یہ باب ختم ہو گیا۔ اس کے علاوہ ایک بے حد اہم واقعہ اور ہے جناب! دارا نے آگرہ میں اپنے نئے محل کی تعمیر کرائی تھی۔ وہ موسم گرمیوں کا تھا۔ دارا نے شہنشاہ اور اپنے تینوں بھائیوں کو بہت عزت اور پیار سے اپنے محل کی عافیت گاہ میں مدعو کیا تھا۔ شہنشاہ کے ساتھ شجاع اور مراد تو اُس عافیت گاہ میں اندر چلے گئے، لیکن اورنگ زیب باہر دروازے پر ہی بیٹھا تھا۔ اُس کے اس عجیب برتاؤ کی وجہ سے شاہجہاں نے اُس سے بہت پوچھ گچھ کی، لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس بات کو لے کر سات مہینوں تک اورنگ زیب کا دربار میں آنا بند کر دیا گیا۔ تب اورنگ زیب نے اپنی بہن روشن آرا کو بتایا تھا کہ — چونکہ اُس عافیت گاہ میں صرف ایک ہی دروازہ تھا، اس لیے اُسے یہ شبہ ہوا کہ کہیں دارا، شہنشاہ کے ساتھ ساتھ اُس کو اور اس کے بھائیوں کو قتل نہ کر دے، اس لیے وہ اندر نہیں گیا، کیونکہ تب سبھی کا قتل کر کے دارا کے لیے تخت حاصل کرنے کا راستہ صاف ہو جاتا! اس لیے میں اُس اکلوتے دروازے پر سنتری بن کر بیٹھ گیا تھا! یہ واقعہ اور اس کی تفصیل اورنگ زیب کے فرماں بردار مورخ حمید الدین خاں نے 'اورنگ زیب کی سرکاری تاریخ' میں خود درج کیا ہے!...

مورخ قانون گو نے تمام دستاویز لہراتے ہوئے شک ظاہر کیا — کیا یہ واقعہ اور اس کے پیچھے چھپی ذہنی سازش یہ واضح نہیں کرتی کہ ایک دن، کسی نہ کسی دن، مستقبل میں اورنگ زیب اپنے والد اور بھائیوں کا قتل کرے گا! نہیں تو اورنگ زیب دارا کے منصوبوں کو توڑنے کے بہانے اپنے اندرونی شکوک کو یہ شکل نہ دیتا... اورنگ زیب شروع سے ہی وراثت کی جنگ کے لیے تیار تھا اور اُسی کے مطابق وہ اپنی ساری تیاریاں کر رہا تھا۔ اُس نے وراثت کی جنگ کے لیے دارا شکوہ کو اپنا نشانہ بنا رکھا تھا، کیونکہ دارا ہی اُس کی راہ کا کانٹا تھا۔ شجاع اور مراد کو وہ اپنی سیاست سے سنبھال سکتا تھا... اس کا اُسے یقین تھا۔ تبھی تو اُس نے پاک قرآن کی قسم کھا کر گجرات کے صوبیدار اپنے چھوٹے بھائی مراد کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ اُسے ہندوستان کا شہنشاہ بنا دینے کے بعد، خود حج پر چلا جائے گا اور اپنی باقی زندگی مکہ مدینہ میں ایک حاجی اور درویش کی طرح گزارے گا۔ وراثت کی جنگ میں اورنگ زیب نے ہندو نفرت کی تلوار کو ہی سب سے کارآمد سمجھا۔ تبھی تو اُس نے وزیر اعظم سعد اللہ خاں کو لکھا تھا — کہ بہار کے چھبیلا نام کے برہمن نے رسولؐ کے خلاف کچھ نامناسب بات کہی ہے... لہٰذا اسے سزائے موت دے کر دوزخ میں بھیج دیا جائے... تاکہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف ہو اور ہندوؤں کی، مذہب مخالف سازشوں کے لیے انہیں سزا دی جا سکے۔ اُن کی بے جا چیخ پکار کی کوئی سنوائی نہ کی جائے! قانون گو بول رہے تھے کہ ادیب نے ٹوکا —

— دیکھئے! میں اُس وراثت کی جنگ کی تاریخ جاننا چاہتا ہوں۔

اور تب تھکا ہوا وقت سامنے حاضر ہوا—

— میں بتاتا ہوں تمہیں اُس خونی وراثت کی جنگ کی سچی داستان، جس کا گواہ صرف میں ہوں، یا اِس ہندوستان کی ندیاں اور جغرافیہ!

ادیب کی عدالت میں تجسس بھری خاموشی چھا گئی۔

— اتنا اداس اور غمگین ہونے کی ضرورت نہیں ہے ادیب! وقت نے کہا— میں بتاتا ہوں... سچائی یہ ہے کہ ہندوؤں میں اورنگ زیب کے اتنے مخالف نہیں تھے جتنے کہ کٹر مسلمانوں میں دارا کے مخالف موجود تھے! کیونکہ اِس دور میں مذہب کو سب مانتے تھے؟ لیکن مذہب کی بات کوئی نہیں مانتا تھا... جاؤ، اب تمہیں اُس دور میں جانا ہوگا جو خون سے نہانے کی تیاری کر رہا ہے!

۲۵

ادیب نے آسمان کی طرف دیکھا— اوپر سرخ بادل چاروں طرف سے اُمڈ رہے تھے۔ اُس نے اردلی سے کہا— کالے بھورے، سلیٹی اور سفید بادل تو دیکھے تھے۔ طلوع یا غروب ہوتے سورج کے ساتھ بادلوں کی کناری میں روپہلا اور سنہرا گوٹا لگا بھی دیکھا ہے، لیکن خون کی طرح لال، ایسے بادل تو کبھی دیکھے نہیں...

— حضور! وقت نے بتایا تھا نہ... کہ یہ تاریخ کا وہ دور ہے جب خون کی بارش ہونے والی ہے... یہ اسی کی سرگرمی ہے... اردلی نے کہا۔

— ان سرگرمیوں کا خلاصہ کون کرے گا؟ یہ اتنے ہاتھی، گھوڑے، اِدھر سے اُدھر آتے جاتے فوجی، گھوڑوں پر دوڑتے اور خبریں پہنچاتے خبر رساں... ایلچی، مخبر اور پیامبر! کہاں احمد آباد، کہاں اورنگ آباد اور کہاں بنگال کا راج محل... ڈرے اور گھبرائے ہوئے لوگ... شہروں سے باہر انتظار میں بیٹھی گدھوں کی فوج، لاوارث کتوں کا جھنڈ... آخر یہ سب ہے کیا؟ کیا گدھوں، کتوں اور چیلوں کو پہلے سے پتہ چل گیا ہے کہ کیا ہونے والا ہے... ادیب نے اپنا ماتھا ٹھونکتے ہوئے کہا۔

— حضور! اس صدی میں کیا کیا ہوا، ان ساری سرگرمیوں کے بارے میں جمنا ہی بتا سکے گی! اردلی نے کہا۔

— جمنا کون؟

— جمنا ندی! اِس ملک کی سبھی ندیاں یہاں کے تاریخ کی چشم دید گواہ ہیں...

— تو جمنا کو بلاؤ!

— ہم خود ہی چلے چلیں حضور! کہیں کنارے پر بیٹھ کر آپ تھوڑا سا آرام بھی کر لیں اور بات چیت بھی۔

دونوں جا کر ندی کے کنارے بیٹھ گئے۔ جمنا اپنا ہرا آنچل لہراتی آ گئی...

— یہ سب کیا ہو رہا ہے... یہ بادل خون کی طرح سرخ کیوں ہیں؟ یہ عجیب سی دہشت، سازش جیسا ماحول، گھبرائے خاموش لوگ... یہ گھوڑسوار فوجوں کی اُچھل... انتظار میں بیٹھے لکڑ بگھے، گدھ اور کتے... یہ سب کیا ہیں؟ ادیب نے پریشانی سے پوچھا۔

جمنا نے بتانا شروع کیا—

— دیکھو سورداس!

— کیا؟ ہمارے ادیب عالی سورداس نہیں ہیں! اردلی نے ٹوکا۔

— میرا تو سب سے بڑا ادیب سورداس تھا۔ اس لیے ہر ادیب میرے لیے سورداس ہی ہے۔ جس کے من کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، وہی سورداس ہو جاتا ہے۔ میرے سورداس کی خوش نصیبی تھی کہ اُس نے بہت خوبصورت اور ایک معصوم دنیا دیکھی تھی۔ لیکن تم بدقسمت ہو کیونکہ تمہیں دھوکہ فریب، خواہشوں، سازشوں، گولے بارود اور قتل کی اِس تھر تھر کانپتی دنیا میں خوبصورتی اور پیار کی تلاش میں نکلنا پڑا ہے... اُس کے لیے بھٹکنا پڑ رہا ہے... جمنا نے بہت اداسی سے کہا— لیکن میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں— دیکھو، مغلیہ سلطنت کی وراثت کی جنگ اب ایک خاص موڑ پر آن پہنچی ہے... وہ سردیوں کے دن تھے... میں اُٹھتی نرم بھاپ کا دوپٹہ اوڑھے سو رہی تھی کہ تبھی میری نیند گھوڑوں کی تیز ٹاپوں سے ٹوٹی۔ میں نے دیکھا کہ دکن سے شہزادہ اورنگ زیب آگرہ میں داخل ہو رہا ہے... راج محل بنگال سے شہزادہ شجاع بھی آگرہ پہنچ رہا ہے۔ دونوں شہزادے شہنشاہ کی اجازت کے بغیر آگرہ پہنچے ہیں۔ یہ بات شاہجہاں کو اچھی نہیں لگی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دونوں آتے بھی، تو جیسی روایت ہے، اس سے پوچھ کر آتے... یہ تو شاہی طور طریقے کی بات تھی۔

اور یہیں سردیوں کے انہیں تین دنوں کے درمیان آپسی دعوتوں اور خاطر مدارات کے دوران اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے سلطان محمد کی شادی شجاع کی بیٹی گل رخ بانو سے طے کر دی۔ یہ بات شہنشاہ شاہجہاں کو بہت ناگوار گزری۔ آخر وہ بادشاہ ہی نہیں، خاندان کا بڑا بھی تھا اور اُس سے اُسی کے پوتے، پوتی کی سگائی کے معاملے میں رائے تک نہیں لی گئی تھی۔ یہیں سے شاہجہاں کو سازش کا شک ہوا تھا۔ اس مسئلے کو لے کر شہنشاہ اور اورنگ زیب کے درمیان بہت تخت اور تلخ خلاء

کتابت بھی ہوئی تھی۔ شہنشاہ چاہتا تھا کہ اس سگائی کو توڑ دیا جائے... آخر کوئی اور ترکیب نہ دیکھ کر شہنشاہ نے شجاع کو توڑنا چاہا تھا۔ اس نے شجاع کو اعتماد میں لے کر کہا تھا کہ دکن میں اورنگ زیب کی حکومت ناکام ہوگئی ہے... اور وہ چاہتا ہے کہ بنگال کے ایک صوبے کے بدلے شجاع دکن کے پانچ صوبوں کا صوبیدار بن جائے... لیکن تب تک شجاع، اورنگ زیب اور مراد بخش کے درمیان اگلی سازش کا تانہ بانہ بنا جا چکا تھا... وہ دور بیت چکا ہے ادیب!

—اور یہ خاموش سی سنسنی جو اس وقت چھائی ہوئی ہے... اتنے کارندے، ایلچی اور خبر رساں جو بدحواس سے دوڑتے آتے ہیں اور پھر لوٹ جاتے ہیں... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ادیب نے پوچھا۔

—اب یہاں شک کی آندھیاں چل رہی ہیں... شاہی دربار، پُراسرار، مخبروں، سازشوں کا بازار بن گیا ہے۔ یہ مسلسل اِدھر سے اُدھر دوڑتے گھوڑسوار کارندے دربار کی ایک ایک خبر تینوں باغی شہزادوں تک پہنچانے کا کام کر رہے ہیں۔ اورنگ زیب نے مخبروں کا جال بچھا رکھا ہے... اندر سے اعلیٰ وزیر سعد اللہ اور اورنگ زیب کی بڑی بہن روشن آرا اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ سب سے چھوٹی بہن گوہر آرا بہت آرزو مند ہے... وہ مراد کو اندر کی ساری خبریں دیتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تینوں باغی شہزادوں کے درمیان آپسی خطوط اور منصوبوں کی معلومات کا لین دین ہوتا رہتا ہے... یہ گھوڑسوار جاسوس اسی کام کو انجام دے رہے ہیں۔ تینوں باغی شہزادوں کے درمیان شہنشاہ اور دارا کے خلاف خفیہ سمجھوتہ ہو چکا ہے... لیکن اندر کی ایک اور خاص بات بتاؤں؟ جمنا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

—کیا؟ بتائیے نا...

—یہی کہ اس سازش کا سرغنہ ہے اورنگ زیب... وہ کم بولتا ہے، سنتا زیادہ ہے اور زیادہ تر خاموش رہتا ہے۔ وہ اپنے چہرے پر خوشی، ناخوشی کو کبھی ابھرنے نہیں دیتا۔ حالانکہ شجاع، اورنگ زیب، اور مراد کے درمیان ایک غیر تحریری معاہدہ ہے، لیکن اورنگ زیب اچھی طرح جانتا ہے کہ دارا کے بعد تخت کا دعویدار شجاع ہی ہوگا۔ دارا کے بعد وہ شجاع کو اپنے مستقبل کے دشمن کے طور پر دیکھ رہا ہے... اسی لیے اورنگ زیب نے الگ سے مراد کے ساتھ ایک اور معاہدہ کر رکھا ہے، اس نے ایک خفیہ رسم الخط ایجاد کی ہے، اس کی کنجی بھی اس نے مراد کو ۲۳ اکتوبر ۱۶۵۷ء کو بھجوائی ہے تاکہ اس کی خفیہ تحریر کے معنی مراد اور مراد کی خفیہ تحریر کے معنی صرف وہ سمجھ سکے۔ اس نے 'اپنی' تینوں کے لیے کئی خداؤں والا، ملحد، دارا کو دشمن بتایا ہے اور 'اپنی' دونوں کے لیے اس نے مراد کو بتایا ہے کہ

شجاع 'رافضی' یعنی غیر مذہبی شیعہ ہے... اس نے مراد کے دل میں یہ بات بھی بٹھا دی ہے کہ شہنشاہی کے لیے وہ تینوں میں سے سب سے زیادہ اہل ہے۔ اورنگ زیب اپنی ذاتی خواہشات کے لیے وراثت کی جنگ کو مذہبی شکل دینے کی کوشش کر رہا ہے — اور عیاش، نااہل، بڑبولا مراد اس کے اس جال میں پھنس کر کٹرسنی دکھنے کی جی توڑ کوشش کر رہا ہے! سو رواس! یہ تو اب طے ہے کہ شہنشاہ کے خلاف تینوں بھائی مل کر بغاوت کریں گے اور بڑے بھائی دارا شکوہ کو شکست دینے کے بعد اُن تینوں کے درمیان ایک بار پھر وراثت کی جنگ ہوگی...

ادیب نے وقت کی دوربین سے پیچھے دیکھا—

—آگرہ شہر میں ہنگامہ برپا ہے! کوئی کہہ رہا ہے— شہنشاہ بیمار ہے، کوئی کہہ رہا ہے— شہنشاہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔ ایک عجیب سی بدحواسی چاروں طرف جاری و ساری ہے... سوداگروں نے اپنے گوداموں پر سخت پہرہ لگا دیا ہے۔ روزمرہ کی چیزیں زمیں دوز کر دی ہیں۔ قیمتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ عدم تحفظ اور خوف کا ماحول حاوی ہوتا جا رہا ہے... باہر سے آئے بیوپاری اپنا سامان اونٹوں پر لاد، لاد کر واپس چل دیے ہیں... بنگال، دکن اور گجرات سے آنے والے راستوں پر سناٹا چھانے لگا ہے... بادلوں کی سرخی اور بڑھ گئی ہے...

—یہ سب تو آپ نے دیکھا ہوگا! ادیب نے دوربین سے آنکھیں ہٹا کر جمنا سے پوچھا۔

—یہ پوچھو کہ کیا نہیں دیکھا... چلو وقت کا صفحہ پلٹ دیتے ہیں اور اگلا صفحہ تمہیں پڑھ کر سنا دیتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی بدقسمتی ہے کہ ایسے سازشی وقت میں شاہجہاں بیمار پڑ گیا ہے۔ یہ ۱۶۵۷ء کی گرمیوں کے دن ہیں۔ ستمبر آتے آتے وہ بہت زیادہ بیمار ہو گیا۔ اس کی بیماری کی ساری خبریں بغاوت پر آمادہ تینوں شہزادوں تک مسلسل پہنچ رہی ہیں اور جب دارا شہنشاہ کی تیمارداری اور دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا، تبھی مخالفین کے ذریعہ یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ شاہجہاں کی موت ہو گئی ہے... شاہجہاں اس افواہ کے پھیلنے سے ہونے والے خون خرابے کو دیکھ سکتا تھا۔ شہنشاہ نے افواہ کو غلط ثابت کرنے اور رعایا کو اعتماد میں لینے کے لیے ۱۳ ستمبر ۱۶۵۷ء کو قلعہ کے نیچے جمع ہزاروں لوگوں کو اپنے خواب گاہ کے جھروکے سے دیدار کرایا۔ ایک دربار بھی کیا گیا۔ بیماری کی حالت میں ہی شاہجہاں نے اپنے قابلِ اعتبار افسروں اور خاص درباریوں کو بلا کر ان کے سامنے وصیت اور انہیں حکم دیا کہ وہ سب دارا شکوہ کے حکم کی تعمیل کریں! تاج پوشی تو نہیں لیکن ایک طرح سے دارا شکوہ کو شہنشاہ کے سارے حقوق دے دیے گئے! اور اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ شہنشاہ کی حالت سدھرنے لگی... اور زیادہ صحت یابی کے لیے دلی کی آب و ہوا زیادہ مفید مانی گئی... ۱۸ اکتوبر ۱۶۵۷ء کو شہنشاہ کے شاہی قافلے نے دلی

کے لیے کوچ کیا... اس خبر سے تینوں باغی شہزادوں کے حوصلے کچھ دیر کے لیے پست ہو گئے... لیکن اورنگ زیب معمولی آدمی تو تھا نہیں، اس نے زور شور سے یہ مشتہر کیا کہ شہنشاہ اب زندہ نہیں ہیں اور جو شخص خواب گاہ کے جھروکے سے رعایا کو دیدار کراتا رہا ہے، وہ ایک بوڑھا خوجہ ہے جسے ان کا شاہی لباس پہنا کر دیدار کرانے کا ناٹک کیا جاتا رہا ہے... اورنگ زیب کی حمایتی بہن اور قلعے میں موجود روشن آرا نے جب شہنشاہ کے موت کی تردید کی تو پیشتر ابدلا گیا اور کہا گیا کہ دارا شکوہ نے بیمار شہنشاہ کو اغوا کر کے انہیں قیدی بنا لیا ہے اور اقتدار پر قبضہ کر لیا ہے... اور تب تینوں شہزادوں — شجاع، اورنگ زیب اور مراد نے جنگ کے لیے کمر کس لی اور صرف اتفاق نہیں، اس افواہ کو پھیلا کر کہ شہنشاہ کی موت ہو گئی ہے، شجاع نے تاج پہن کر خود کو ہندوستان کا شہنشاہ اعلان کر دیا اور ساتھ ہی اس نے اپنے بنگال کی صوبائی راجدھانی راج محل سے نکل کر دارا کے ماتحت صوبے بہار پر حملہ کر دیا۔ شاہجہاں تو زندہ تھا... اسے یہ برداشت تو نہیں ہوا، لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ خانہ جنگی کی آگ میں اس کے اپنے ہی بیٹے کا نقصان ہو... یا مارا جائے!

— تب؟ اس کے بعد؟

— اس کے بعد کی تاریخ تو اب گنگا، چمبل، نرمدا، ستلج، ویاس اور سندھ ندیاں ہی بتا سکتی ہیں یا پھر وہ کردار جو اس خانہ جنگی میں شامل رہے ہیں! جمنا نے کہا اور اپنا ہرا آنچل لہراتی ہوئی سرد بھاپ میں سما گئی۔

تبھی اردلی نے آواز لگائی —

— سترہویں صدی کی ہندوستانی خانہ جنگی کے سبھی ہیرو، سائڈ ہیرو، ولن اور چشم دید گواہ ادیب عالی کی عدالت میں حاضر ہوں!

اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں بھیڑ لگ گئی... دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب، مراد، جودھپور کا راجہ جسونت سنگھ، جے پور کا مہاراجہ مرزا راجہ جے سنگھ، دارا کے دونوں بیٹے سلیمان شکوہ اور سپہر شکوہ، ڈمراؤ کا راجپوت اُجیاں، شاہجہاں پور کا روہیلہ سردار دلیر خاں، حصار کا داؤد خاں، خلیل اللہ خاں، بارہہ کے سید سردار، پنشن یافتہ ایرانی اور تورانی فوجوں کے سپہ سالار، دارا کا اطالوی توپچی منوچی، فرانس کا حکیم برنیئر اور سیکڑوں لوگوں کے علاوہ گنگا، نرمدا، چمبل، ستلج، ویاس اور سندھ ندیاں تو موجود تھیں ہی۔

سب سے پہلے گنگا نے اپنا بیان شروع کیا — اردلی بیان نوٹ کرنے لگا۔

— میں گواہ ہوں! گنگا نے کہا — شجاع اس وراثت کی جنگ کے لیے پہلے سے ہی تیار تھا۔

شہنشاہ کی موت کی جھوٹی خبر کو بہانہ بنا کر شجاع نے اپنے صوبے سے نکل کر بہار صوبہ پر حملہ کیا۔ میری چھاتی پر اس کی جنگی کشتیاں دوڑنے لگیں اور شجاع کی فوجیں سارے صوبے کو روندتی کچلتی، آگرہ تک پہنچنے کے لیے بے چین ہونے لگیں۔ اسے معلوم تھا کہ گجرات سے مراد اور دکن سے اورنگ زیب کی فوجیں نرمدا ندی کی طرف کوچ کر چکی ہیں۔ شہنشاہ نے ایک سخت فرمان بھیج کر شجاع کو ڈرانا چاہا، لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے دارا سے اس کے صوبے بہار کے مونگیر قلعے کی مانگ کی! آخر کسی طرح دارا نے شہنشاہ کو منا لیا کہ شجاع کی بڑھتی فوجوں کو روکنے اور شکست دینے کے لیے فوراً فوج بھیجی جائے۔ شاہجہاں نے یہ تجویز بڑے بجھے دل سے منظور کی کیونکہ اس خانہ جنگی سے وہ مغلیہ سلطنت کی تباہی دیکھ رہا تھا۔ آخر دارا کے بڑے بیٹے سلیمان شکوہ کی رہنمائی میں شاہی فوج نے بنارس کی طرف کوچ کیا۔ سلیمان شکوہ تب صرف بائیس سال کا تھا لیکن تھا بہت دلیر۔ اس کے ساتھ ہی راجپوت فوج کو روانہ کیا گیا جس کے فوجدار تھے جے پور کے مرزا راجہ جے سنگھ۔ انہیں سلیمان شکوہ کا صلاح کار بھی بنایا گیا۔ آخر شاہی فوجیں بنارس میں میرے کنارے آ لگیں... مرزا راجہ جے سنگھ اور ان کی فوج کو بنارس تک آنے میں کیوں دیر لگ رہی تھی، اس کی وجہ تو بعد میں معلوم ہوئی۔ اصل میں جے پور گھرانے کا مرزا راجہ جے سنگھ اورنگ زیب کا غیر اعلانیہ حمایتی تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اورنگ زیب کے منصوبے میں شامل شجاع کو کوئی نقصان پہنچایا جائے... حالانکہ سلیمان شکوہ تین دن بنارس میں میرے کنارے رہا۔ اس کے بعد کشتیوں کا پل بنا کر اس کی فوج نے مجھے پار کیا... شجاع بھی بنارس تک جلد سے جلد پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ شاہی فوج کو بنارس میں، میرے اُس پار، غیر معینہ مدت کے لیے روکا جا سکتا تھا... اور شجاع چاہتا تھا کہ میرے دکنی ساحل سے چنار اور پٹنہ سے ہوتے ہوئے جو شاہراہ راج محل تک جاتی تھی، وہ اس کے لیے بے خطر کھلا رہے۔ سلیمان شکوہ نے اپنا پڑاؤ بہادر گڑھ میں ڈالا۔ شجاع بھی اپنی فوجوں کا بیڑہ لے کر بڑھتا آ رہا تھا، لیکن اُسے رکنا پڑا۔ آخر اس نے اپنی فوجوں کا پڑاؤ میری دھارا کے پیچھے ایک ایسی دشوار جگہ پر ڈالا، جو چھوٹی چھوٹی پہاڑوں، جنگلوں اور نالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ہی میری دھارا بہہ رہی تھی، جس پر شجاع کے جنگی بیڑوں کا قبضہ تھا۔ اس لیے آبی راستے سے رسد اور گولہ بارود پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔

دونوں فوجوں کے پڑاؤ پڑے رہے... یہیں پر روہیلہ سردار دلیر خاں اور ڈمراؤ کا راجپوت سردار اُجیاں بھی اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ سلیمان شکوہ کے ساتھ ہو گئے۔ مرزا راجہ جے سنگھ بھی اب تک پہنچ گیا تھا لیکن فوجی صلاح کار ہونے کے ناطے وہ حملہ کو روکے ہوئے تھا۔ آخر سلیمان شکوہ کو

حملے کی اجازت ملی۔ اس درمیان سلیمان شکوہ نے اپنے جاسوسوں کے ذریعہ ساری ضروری معلومات جمع کر لی تھیں۔ پھر ۱۴ر فروری ۱۶۵۸ء کی صبح سلیمان نے شجاع کے فوجی پڑاؤ پر زبردست حملہ کیا۔ شجاع سکتے میں آ گیا۔ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر اپنے سرداروں اور سپاہیوں کو پکارنے لگا، لیکن تب تک بہت سے فوجی گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالے گئے تھے یا جان بچانے کے لیے بھاگ گئے تھے۔ شجاع بزدل نہیں تھا۔ اس نے شاہی فوج کا سامنا کیا۔ سلیمان شکوہ اور روہیلہ دلیر خاں نے اُسے جا گھیرا۔ تب تک مرزا راجہ جے سنگھ اور امیر دوہ کوڑ بھی شجاع کے ہاتھی کے پاس تک پہنچ گئے... زبردست جنگ ہوئی، شجاع کا ہاتھی زخمی ہوا۔ تب بھی اس کا ماہر مہاوت زخمی ہاتھی کے ساتھ شجاع کو لے کر میرے کنارے پر لگے بیڑوں تک پہنچ گیا۔ شجاع فوری موت اور قید سے بچ گیا۔ وہ اپنے چیختے کراہتے زخمی فوجیوں کو وہیں چھوڑ کر پٹنہ کے راستے راج محل کو بھاگا۔ اب باقی کام تو قتل اور لوٹ کا تھا... شجاع تو اپنی لاچار فوج سلیمان کی تلوار اور میری دھار کے درمیان چھوڑ کر بھاگ لیا تھا۔ میری چھاتی تیرتی لاشوں کا قبرستان بن گئی تھی۔ میرے پانی کا رنگ بدل گیا تھا۔ سلیمان کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تھی اور دو کروڑ روپے سے زیادہ کی دولت اور جنگ کا ساز و سامان اس کے ہاتھ آیا تھا۔

اُدھر شجاع الٹے پاؤں بھاگتا پانچ دنوں میں پٹنہ پہنچ گیا تھا، لیکن اس کا پیچھا کر کے گرفتار کرنے کا کام انجام دینے والے مرزا راجہ جے سنگھ کو پٹنہ پہنچنے میں تیس دن لگ گئے۔ شجاع کو گرفتار کرنے کے لیے سلیمان خود اس لیے نہیں بڑھا تھا کیونکہ وہ اس صوبے کے جغرافیہ سے واقف نہیں تھا، جب کہ مرزا راجہ جے سنگھ کو اس علاقے کے چپے چپے کا پتہ تھا۔ پٹنہ سے بھاگ کر شجاع مونگیر پہنچا تھا۔ وہاں سے چندرو میل دور سورج گڑھ میں شجاع مارچ مہینے کے آخر تک ڈٹا رہا... آخر سورج گڑھ کو بھی شاہی افواج نے جیتا، لیکن شجاع یہاں سے بھی بچ کر نکل بھاگا۔ وہ اب میرے پہاڑ اور کھڑگ پور کی پہاڑوں کے درمیان گھر گیا تھا... لیکن تب بھی مرزا راجہ جے سنگھ کی فوج اس ہارے ہوئے اور فرار ہوتے شہزادے کو گرفتار نہیں کر پائی... جیتنے کے بعد مرزا راجہ جے سنگھ ہارے ہوئے شجاع کے ساتھ امن کی بات چیت میں الجھا رہا اور اس کے ایلچی مرزا جان بیگ کا شاہی ٹھاٹ باٹ سے خاطر مدارات کرتا رہا۔

—اسی کے ساتھ ایک اور بھیانک جنگ کی کہانی متوازی چلتی ہے! ایک ندی درمیان میں بولی تو ادیب نے پہچانا، وہ نرمدا تھی۔

—جی بتائیے! ادیب اور اردلی ایک ساتھ بولے۔

—ہوا یہ کہ مشرق میں شجاع کی بغاوت اور حملے کی خبر اورنگ زیب اور مراد کو مل گئی تھی۔ وہ دونوں جنوب اور جنوب مغرب سے آگرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ جاسوسوں نے یہ اطلاع دربار کو دی۔ شہنشاہ کو اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ تینوں شہزادے مل کر حکومت کے اقتدار اور طاقت سے ٹکرانے کے لیے کمربستہ ہیں۔ فوراً جودھپور کے راجا جسونت سنگھ اور قاسم خاں کو اجازت دی گئی کہ وہ تیزی سے آگے بڑھ کر میرے ساحل پر پڑاؤ ڈال دیں اور اورنگ زیب کی فوجوں کو مراد کی فوجوں کے ساتھ شامل نہ ہونے دیں۔ لیکن راجا جسونت سنگھ اور قاسم خاں دیکھتے رہ گئے۔ اورنگ زیب نے اپنی چالاکی اور جنگی مہارت دکھاتے ہوئے اپنی فوجوں کو مراد کی فوجوں تک پہنچا دیا۔ وہیں شپرا ندی پر بسے اجین شہر سے چودہ میل دور دھرمٹ کے میدان میں تب خوفناک جنگ ہوئی۔ یہ ۱۵ر اپریل ۱۶۵۸ء کی بات ہے۔ قاسم خاں کی فوج کے مسلمان سپاہیوں نے غداری کی۔ دھرمٹ کی اس کانٹے کی لڑائی میں شاہی فوجوں کی بھیانک شکست ہوئی۔ اورنگ زیب اور مراد کو فتح ملی۔ اپنی توہین آمیز ہار کی وجہ سے راجا جسونت سنگھ جودھپور کی طرف بھاگا۔ جودھپور قلعے پر جب وہ پہنچا تو اس کی مایہ ناز سسودیا رانی نے اپنے ہارے ہوئے شوہر کا استقبال کرنے سے انکار کر دیا۔

—ہاں! شپرا بولی— دھرمٹ میں شاہی فوجوں کے ہار کی یہ خبر مرزا راجہ جے سنگھ کو تب ملی، جب وہ شجاع کے ساتھ سورج گڑھ، امن کی بات چیت میں مشغول تھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اُس کی خوشی کے دو سبب تھے، ایک تو یہ کہ اورنگ زیب فاتح ہوا تھا اور دوسرا یہ کہ شاہی دربار میں برابری کا دعوا کرنے والا اُس کا 'دشمن' جسونت سنگھ دھرمٹ کی جنگ میں ہار گیا تھا اور اس کے سرپرست دارا شکوہ کو منہ توڑ جواب مل گیا تھا۔ اُس شام اس خوشی میں مرزا راجہ جے سنگھ نے گنگا کے کنارے جشن منایا اور ۷ر مئی ۱۶۵۸ء کو اس نے شجاع کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط بھی کر دیے تھے...

ادیب عالی! اگر دھرمٹ کی جنگ میں شاہی فوجیں نہ ہارتیں تو ہندوستان کی تاریخ دوسری ہی ہوتی۔

—اس کے بعد بھی تاریخ کی دھارا بدل سکتی تھی، جسونت سنگھ کی ہار اور مرزا راجہ جے سنگھ کی غداری کے باوجود ابھی بھی بہت امید باقی تھی! یہ چمبل ندی تھی، جو اپنا بیان دے رہی تھی۔

—مجھے معلوم ہے! چمبل بولی... جب ساموگڑھ کی لڑائی کے کالے بادل منڈلا رہے تھے تب شاہجہاں نے مرزا راجہ جے سنگھ کو حکم دیا تھا کہ وہ بہار سے جلد سے جلد واپس آئے اور اورنگ زیب و مراد کی بڑھتی فوجوں کے خلاف دارا شکوہ کا ساتھ دے۔ میرے ساحل پر ساموگڑھ کی یہ جنگ ۲۹ر مئی ۱۶۵۸ء کو ہوئی تھی۔

اور کتنی المناک اور پیچیدہ تھی یہ صورت حال کہ سلیمان شکوہ کو مرزا راجہ جے سنگھ کی سازشوں کا پتہ چل چکا تھا۔ اس لیے آگرہ لوٹتے وقت وہ اپنی فوج کو جے سنگھ کی فوج کے پیچھے رکھنا چاہتا تھا۔ اسے یہ خطرہ تھا کہ اگر جے سنگھ کی فوج اُس کے پیچھے رہی، تو وہ غدار کبھی بھی پیچھے سے حملہ کر کے اُسے دھول چٹا سکتا تھا۔ ادیب عالی! گنگا ندی درمیان میں اپنا بیان دے رہی تھی — اکبر کے زمانے سے یہ جے پور گھرانہ مغلوں کا وفادار اور بھروسہ مند بن گیا تھا اور اُس پرانے اعتماد کا ناجائز فائدہ اب مرزا راجہ جے سنگھ اٹھا رہا تھا۔ یہی حالت گوالیار کی تھی۔ جمنا اور چمبل میری اس بات کی تائید کریں گی کہ جے پور کا گھرانہ مسلسل اپنے شاہی مفادات کے لیے ناانصافی اور بدچلنی کی حمایت کرتا رہا اور گوالیار ہمیشہ سیاسی قیدیوں کی اذیت گاہ بنا رہا۔ گوالیار کے اسی گھرانے نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا ساتھ دیتے ہوئے جھانسی کی مہارانی لکشمی بائی کے ساتھ غداری کی...

—ہاں! جمنا بولی— تاریخ یہی ہے! دھرمٹ کی لڑائی میں اپنی فوجوں کی شکست کی خبر دارا کو بلوچ پورہ میں تب ملی، جب وہ شہنشاہ شاہجہاں کو صحت یابی کے لیے دلّی لے جا رہا تھا۔ شکست کی یہ خبر ملتے ہی شہنشاہ کا قافلہ بلوچ پورہ سے آگرہ لوٹ آیا۔

تبھی عدالت میں سنسنی سی پھیل گئی۔ سرگوشی ہونے لگی کہ — ارے! شہنشاہ شاہجہاں کچھ کہنا چاہتے ہیں! ایک بہت خوبصورت بوڑھا، پیٹ کی بیماری سے زار و زار اور ملک کی محکمہ سیاسی خانہ جنگی سے پریشان اور بدحال، تب خود ہی عدالت کی بھیڑ میں سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

— حضورِ عالی! میں اس سے پہلے بھی بیان دے چکا ہوں... لیکن میں اس بھیڑ میں آپ کی نظروں سے اوجھل تھا... دوبارہ بتا دوں کہ میں ہندوستان کا بادشاہ شاہجہاں ہوں! میری گواہی کے بغیر آپ کی تاریخ پوری نہیں ہوگی۔ میں بتاتا ہوں... مجھ سے زیادہ بدنصیب باپ اور بادشاہ اس دنیا میں دوسرا نہیں ہے۔ پیٹ کی اس جان لیوا بیماری نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں... میں پاگل ہو گیا ہوں... کبھی میں دارا کو اپنے ہی باغی شہزادوں کے خلاف فوجی کارروائی کی صلاح دیتا ہوں، تو کبھی مرزا راجہ جے سنگھ کو ہارے ہوئے شجاع کے ساتھ صلح کی رائے دیتا ہوں... کبھی سلیمان شکوہ اور جے سنگھ کو جلد سے جلد آگرہ لوٹنے کا حکم دیتا ہوں، تو یہ سوچ کر دل دھڑکنے لگتا ہے کہ میں خود ہی اپنے بیٹوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑا رہا ہوں۔ ادیب عالی! میں کچھ بھی سوچ نہیں پاتا... میرا دماغ کام نہیں کرتا... میں صرف اس خوں ریز خانہ جنگی سے اپنے مغلیہ خاندان کو بچانا چاہتا ہوں... دربار میں طرح طرح کی باتیں سامنے آئی ہیں... میں جانتا ہوں کہ میری رعایا دارا شکوہ کو پسند کرتی ہے لیکن ہمارے جاگیردار، وزیر اور ملا، دارا کو بالکل پسند نہیں کرتے... میں، میرا خدا جانتا ہے، میں پکا

مسلمان ہوں! اور سارے ظلم ڈھانے، مندروں کو توڑنے، ہندو رعایا پر زیادتیاں کرنے کے بعد میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان میں اسلام کی شکل کچھ دوسری ہی ہوگی... دارا اسی کوشش میں لگا ہوا تھا لیکن اُسے اب کٹر بھیڑیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے... دوسری طرف میرے کچھ درباری اورنگ زیب کی حمایت کرتے ہیں... تو میں کبھی کبھی اُن کی طرف جھک جاتا ہوں... کبھی میں روشن آرا کی دلیلیں سنتا ہوں جو کھلے عام اورنگ زیب کے ساتھ ہے، پھر جہاں آرا مجھے دارا کے بڑکپن اور ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں بتاتی ہے تو میں اُس سے متفق ہو جاتا ہوں... اور میری تیسری بیٹی گوہر آرا جب مراد کی خصوصیات بتاتی ہے تو مجھے مراد بھی ٹھیک اور سچ لگنے لگتا ہے... اُدھر میں نے مرزا راجہ جے سنگھ اور سلیمان شکوہ کو خبر بھیجی ہے کہ وہ دونوں جلد سے جلد آگرہ پہنچ جائیں تاکہ ہم اورنگ زیب اور مراد کی فوجوں کا مقابلہ کر سکیں... لیکن پتہ نہیں، وہ دونوں کہاں اٹکے ہوئے ہیں... اگر ان کے پہنچنے سے پہلے جنگ ضروری ہوگی، تو لڑنا تو پڑے گا ہی!

—جی ہاں! یہی ہوا۔ شاہجہاں کے دربار میں بہت گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ آخر میں اورنگ زیب اور مراد کی بڑھتی فوجوں کے خطرے کو پہچانتے ہوئے شاہجہاں نے دارا کو حکم دیا کہ وہ اُن باغی فوجوں کو روکے! اب چمبل بول رہی تھی— ۲۲ مئی ۱۶۵۸ء کو دارا دھولپور پہنچا اور میرے ساحل کے حفاظتی حصار کو مضبوط کرنے میں مصروف ہو گیا— میں نے تب دارا کو آنکھ بھر کر دیکھا تھا... وہ تو بالکل صوفی درویش لگتا تھا... اور اس سے پہلے کہ دارا میرے ساحل پر مضبوط قلعہ بندی کرے، ۲۳ مئی کو ہی دھولپور سے ۴۰ میل دور مجھے پار کر کے اورنگ زیب نے دارا کی فوجوں کی صف کو الٹ دیا۔ تب دارا میرے ساحل سے آگرہ کی طرف بھاگ کر نو میل دور سامو گڑھ میں رُکا تھا اور وہیں اُس نے اپنی چھاؤنی ڈالی تھی۔ وہیں سامو گڑھ میں دارا اور اورنگ زیب کی بھیانک فیصلہ کن جنگ ہوئی اور خلیل اللہ کی فوجوں کی غداری کی وجہ سے دارا ہار گیا...

— خلیل اللہ کو حاضر کیا جائے! ادیب نے اردلی کو آواز دی۔

اور خلیل اللہ ہاتھ جوڑے سامنے کھڑا تھا۔

—جی حضور! ہم نے دارا کے ساتھ بے حد مجبوری میں غداری کی... کیونکہ تب جے پور کے مرزا راجہ جے سنگھ نے تمام ہندو راجاؤں کو چٹھیاں لکھ کر اور ایلچی بھیج کر انہیں اورنگ زیب کا حمایتی بنا لیا تھا... اور پھر ہم طورانی تھے۔ ہندوستانی، ہندو مسلم فوج کے ساتھ ہماری پٹتی بھی نہیں تھی۔ وہ ہمیں اپنے ملک کا نہیں، کرائے کا فوجی مانتے تھے... اس لیے بھی ہم اندر ہی اندر شاہی ہندوستانی فوج کے خلاف تھے۔ ادیب عالی! ہم نے دارا کے ساتھ جان بوجھ کر غداری نہیں کی تھی، لیکن جب

سامو گڑھ میں اورنگ زیب کی فوجیں ہم پر ٹوٹ پڑیں، تو ہم نے ہارتے ہوئے دارا کے بجائے، جیتتے ہوئے، سنی مسلمان اورنگ زیب کا ساتھ دینا بہتر سمجھا... ہم تو کرائے کے سپاہی ہیں... جینے کے لیے پیسہ کماتے ہیں، مرنے کے لیے نہیں۔ ہم لڑتے ایمانداری سے ہیں، لیکن ہارنے لگیں تو ہماری زندگی جیتنے والے کے ہاتھ ہوتی ہے اور پھر دارا شکوہ کی فوج میں ایرانیوں، طورانیوں، راجپوتوں، باہر کے سیدوں اور یہیں پیدا ہوئے دیسی مسلمانوں کو لے کر بھی ناچاقیاں، غلط فہمیاں اور رنجشیں تھیں... سامو گڑھ کے اس ریت کے میدان میں دارا نے اپنی فوجیں تعینات کر دی تھیں۔ اس کا توپ خانہ برقنداز خاں اور منوچی کے حوالے تھا۔ اس توپ خانے کے پیچھے پیدل فوجیوں کے شاندار دستے تھے، اُن کے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں۔ ان کے پیچھے پانچ سو اونٹ تھے، جن کی پیٹھوں پر چکر دار توپیں موجود تھیں۔ ان کے پیچھے لڑاکو اسلحوں کی قطاریں تھیں۔ یہ فوج پانچ حصوں میں تعینات کی گئی تھی... اگلے دستے میں راجپوت اور پٹھان تھے۔ اُن کی کمان راؤ چھتر سال اور داؤد خاں کے ہاتھوں میں تھی۔ درمیان میں دس ہزار فوجیوں کا دستہ تھا۔ اس میں خود ہاتھی پر سوار شہزادہ دارا تھا... اس کے چاروں طرف قریب چھ ہزار جانے پہچانے وفادار لڑاکو تھے۔ میں اپنی پندرہ ہزار فوج کے ساتھ دائیں طرف تھا۔ جنگ شروع ہوئی۔ توپیں گرجنے لگیں... اورنگ زیب کی طرف سے کافی دیر تک گولہ باری ہوئی پھر خاموشی چھا گئی۔ تو لگا کہ برقنداز خاں اور منوچی نے اورنگ زیب کا توپ خانہ بیکار کر دیا ہے... بس یہیں پر غلطی ہوئی... ہمیں حملے کا حکم ملا... گھمسان کی جنگ ہوئی... اورنگ زیب کے اگلے دستوں کی فوجوں کو کاٹ ڈالا گیا۔ تب دارا نے خود آگے بڑھ کر اورنگ زیب کے سامنے والے دستے پر حملہ کیا۔ دشمن تتر بتر ہوا تو نقارچیوں نے دارا کی جیت کے نقارے بجا دیے... یہ دوسری بڑی غلطی ہوئی... پھر تو ہم پر اورنگ زیب کا قہر برپا ہو گیا۔ اپنے بیٹے، بھائی اور تین بھتیجوں سمیت راؤ چھتر سال مارا گیا۔ اُدھر رستم خاں مرا تو سپہر شکوہ اپنی بچی کھچی فوج کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا... چکر دار توپوں والے اونٹ اور جنگی ہاتھی پیچھے چھوٹ گئے... دارا بھی اب گھرا ہوا تھا۔ اس کی حفاظت کے لیے اب صرف داؤد خاں تھا۔ ایسے میں تیسری غلطی ہوئی— دارا اپنے ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا... وہ کٹتے مرتے فوجیوں کو دکھائی دینا بند ہو گیا۔ اسی وقت چمبل کی طرف سے گرم ریتیلی آندھی آئی... اس میں ہم بھٹکنے لگے... دارا نے اپنے وفادار سپاہیوں کو تڑپتے، زخموں سے کراہتے اور پانی پانی چیختے چلاتے سنا تو اس کا دل کانپ گیا... تبھی کچھ دوری پر اس نے سپہر شکوہ کو روتے اور آواز لگاتے دیکھا تو اس کا صبر ٹوٹ گیا... ایسے میں میں کیا کرتا؟ میں نے بھی میدان چھوڑ دیا... حضور یہ کہنا غلط ہے کہ جب دارا اپنے بائیں بازو کی مدد کے

لیے بڑھا اور جب اورنگ زیب کے بیٹے سلطان محمد نے سامنے سے حملہ کیا، تب میں جان بچا کر بھاگ نکلا! اصل بات تو یہ ہے حضور کہ دارا کو ان خونی جنگوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس میں اپنی فوجوں میں جوش بھرنے والی پھرتی، چالاکی اور بہادری کی خوبی بھی نہیں تھی۔ اورنگ زیب جیسے چالاک اور تجربہ کار لڑاکو کے سامنے دارا ٹھہر ہی نہیں سکتا تھا...

—جو کچھ بھی ہوا چمبل چیخی— سامو گڑھ کی یہ جنگ صرف تخت و تاج کی جنگ نہیں، یہ جنگ تو اس ملک کے مستقبل کی فیصلہ کن جنگ تھی... کیونکہ اس جنگ سے اکبر کے دور کا خاتمہ ہوا تھا... اکبر نے اسلامی حکومت کو نہیں، قومی حکومت کو جنم دیا تھا... اور اسے دارا بھی جاری رکھنا چاہتا تھا... دارا مذہب اور من کی توحید... وحدانیت کی راہ تلاش کر رہا تھا۔ وہ شریعت کو اسلام کے ماننے والوں تک محدود نہیں رکھنا چاہتا تھا... وہ شریعت کی مطابقت کے تصور کو مذہب سے اوپر لے جا کر فقط انسان کے لیے عائد کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسلام کا فائدہ انہیں بھی پہنچانا چاہتا تھا جو مسلمان نہیں تھے۔ وہ اسلام کو صرف مسلمانوں کے مذہب کے طور پر نہیں، ایک عظیم انسانی مذہب کے طور پر پھیلانا چاہتا تھا... یہ ٹھیک ہے کہ قندھار کے ناکام رکاوٹ کے بعد جب دارا لوٹا تھا تب وہ ویدانتی صوفی سنت بابا لال کے پاس لاہور کے کوٹل مہراں میں تین ہفتے رکا تھا۔ اس نے اپنشدوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا تھا... لیکن وہ صوفی ملا شاہ کا بھی شاگرد بنا تھا۔ وہ شیخ محب اللہ الہ آبادی سے بھی ملا تھا۔ سنت شاہ دلربا، شیخ محسن فانی اور سرمد سے بھی اس کی مسلسل بات چیت ہوتی رہتی تھی... یہ کوئی گناہ تو نہیں تھا۔

—اس کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ مغلیہ حکومت کا سب سے بڑا شہزادہ اور تخت کا وارث تھا... اور وہ انسان کی بہتری کی تاریخ کا نیا باب لکھنے کی کوشش کر رہا تھا!— کہتے ہوئے ادیب پریشانی سے ٹہلنے لگا۔ اردلی اُسے فکر سے دیکھ رہا تھا۔

تبھی اندھیرا پھیلنے لگا۔ ادیب نے اترتے اندھیرے کو دیکھا اور جیسے پہچان کر چیخا— یہ تو سترہویں صدی کی وہی تاریکی ہے جو سامو گڑھ کے ریتیلے میدان میں چھا گئی تھی... خون سے لبالب لال بادل بھی اب کالے پڑ گئے ہیں اور ہاتھ ہاتھ بھر کی دوری پر ریت میں سماتے خون نے گہرے باریک سوراخ بنا لیے ہیں... گدھ آ کر اتر پڑے ہیں۔ کتے کمزور زخمیوں کو جھنجھوڑ رہے ہیں... اردلی دیکھو... اس دہلا دینے والے ہولناک منظر کو دیکھو... اور تلاش کرو— دارا کہاں ہے؟

تبھی ایک گڑگڑاتی آسمانی آواز آئی— دارا شکوہ یہاں سے تین کوس دور ایک پیڑ کے نیچے موجود ہے۔ وہ اپنا زرہ بکتر اتار رہا ہے!

ادیب نے دیکھا—

اس گھنے اندھیرے درخت کے نیچے دارا کچھ سپاہیوں کے ساتھ موجود ہے۔ اس نے اپنا زرہ بکتر اُتار کر پھینک دیا ہے اور تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا ہے۔ ہانپتے اور جھاگ اگلتے گھوڑے کھڑے ہیں... پھر نقاروں کی تیز گونجتی آواز... وہ گڑگڑاتی آواز ادھر ہی بڑھی آرہی تھی۔

ایک زخمی سپاہی نے کہا—

— حضور! یہاں سے چلیں... دشمن کے نقارے اور دستے ادھر ہی آرہے ہیں!

— نہیں، میں کہیں نہیں جاؤں گا... آخر کیا ہونے والا ہے؟ جو کچھ ہونا ہے، ابھی ہو جائے... دارا نے کہا۔

— آپ کو چلنا ہی ہوگا!... یہ پہلی جنگ ہے... ابھی تو آپ کو کئی جنگیں لڑنی ہیں۔

— اس لڑائی کا رخ بدل جاتا... اگر مرزا راجہ جے سنگھ بہار سے ہماری شاہی فوج لے کر بروقت پہنچ جاتا... اسی کی وجہ سے سلیمان شکوہ بھی نہیں پہنچ سکا... وہ جے سنگھ کی فوجوں کے آگے چلنے کا خطرہ نہیں اٹھا سکتا تھا... شاید اللہ کو یہی منظور تھا... دارا بولا۔

پھر ادیب نے دیکھا، اپنے وفادار معاونین کے کہنے سے دارا گھوڑے پر سوار ہو کر آگرہ کی طرف چل دیا۔

— ہاں، رات قریب نو بجے دارا اپنے محل میں پہنچا— جمنا بھیگی آنکھیں پونچھتے ہوئے بتا رہی تھی۔

— اس نے اپنے محل کو بند کرلیا... آگرہ کے ہر گلی محلے سے لوگوں کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پورا شہر ماتم منا رہا تھا۔ شہنشاہ شاہجہاں نے تب ایک مخبر رساں کے ہاتھوں فرمان بھیجا کہ وہ فوراً آکر اس سے ملے... لیکن دارا یہ بات قبول نہ کر سکا۔ اس نے شہنشاہ کو لکھ بھیجا کہ اس شرمسار، پست اور ہارے ہوئے بیٹے کا منہ دیکھنے کی خواہش آپ چھوڑ دیں۔ بس میری یہی گذارش ہے کہ آپ مجھ جیسے بدنصیب، بدحواس اور نیم مردہ بیٹے کو اس کے سامنے موجود لمبے سفر اور رخصتی کے لیے اپنی دعائیں دیں!... اور قریب تین بجے رات دارا اپنی بیگم نادرہ بانو، اپنے بچوں، ناتی پوتوں اور اپنے بچے کچھے وفادار سپاہیوں کو لے کر دلی کی طرف نکل گیا...

پھر وہی آسمانی آواز گونجی— اور ۳ رجون ۱۶۵۸ء کی صبح ہی اورنگ زیب کی فوجوں نے راجدھانی آگرہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

آسمانی آواز پھر جیسے ایک پرچھائیں میں گھر گئی... اور وہ پرچھائیں ادیب کی طرف بڑھنے لگی اور حیرت سے ادیب اور اردلی نے دیکھا— وہ پرچھائیں کسی اور کی نہیں— وہ خود دارا شکوہ

تھا... ادیب نے اُسے چونک کر دیکھا۔

— دارا شکوہ تم!

— ہاں ادیب عالی! میں ہی ہوں وہ بدنصیب شہزادہ، جو اورنگ زیب کے پاکستان کو بننے سے نہیں روک پایا۔

تو اُسکے بعد کیا ہوا— جب اورنگ زیب نے آگرہ کو گھیر لیا؟ اردلی نے بہت ادب سے پوچھا۔

— جب تک اورنگ زیب کی فوجوں نے آگرہ کو گھیرا... تب تک میں دلی کی طرف کوچ کر چکا تھا! کہتا ہوا دارا وہیں ادیب کے پاس آکر بیٹھ گیا اور بولا— حالانکہ میں شہنشاہ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، لیکن اُن حالات میں یہی مناسب تھا کہ میں آگرہ چھوڑ دوں... دیکھئے ادیب! میرے فرار کی ایک لمبی داستان ہے۔ میں کہاں کہاں در بدر نہیں بھٹکتا رہا... اُس وقت میرے لیے سب سے محفوظ دو ہی ٹھکانے تھے، الٰہ آباد اور لاہور... میں نے لاہور جانا بہتر سمجھا۔ پھر تو میں نے پورے ہندوستان کی خاک چھانی... بہت دردناک ہے میری یہ کہانی...

(۲۶)

دارا بتا رہا تھا—

— میرے فرار کی کہانی بھیانک ہے، میں کٹی پتنگ کی طرح نہ جانے کتنے آسمانوں اور کتنے جھکوروں میں چکر کاٹتا رہا، کتنے خاردار پیڑوں میں الجھا، کتنی کلیوں نے مجھے چھیدا، پھٹے پرچم کی طرح لہرایا... کہ اب بس... میرا ڈھانچہ ہی باقی رہ گیا ہے۔

اداس جمنا پاس ہی بیٹھی تھی۔ اس نے دھیرے سے کہا—

— دارا! تم نے کبھی وقت اور سیاست کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جب تم سامو گڑھ میں ہارے تھے تو اورنگ زیب کی اس فیصلہ کن فتح سے شجاع کا ماتھا ٹھنک گیا تھا اور شجاع اورنگ زیب کا دشمن ہو گیا تھا... اس لیے تمہاری حکمت عملی یہی ہونی چاہیے تھی کہ تم شجاع سے دوستی کرتے اور اس کے ساتھ مل کر ایسی قلعہ بندی کرتے کہ تم دونوں بھائی مل کر پورب سے اورنگ زیب کا صفایا کر دیتے— تم میں اور شجاع میں نظریاتی تنگی اور مذہبی تشدد بھی نہیں تھا اور تم حکومت کی رعایا کو یقین دلا سکتے تھے کہ تم دونوں، شہنشاہ شاہجہاں کی سلامتی اور آگرہ کا گھیرا توڑنے کے لیے مشترکہ قدم اٹھا رہے ہو... تم شجاع کے ساتھ معاہدہ کرتے، تب اعلانیہ مقاصد کے لیے تمہیں ہندوستان کی پوری رعایا کی حمایت ملتی۔

—میں نے یہ کوشش کی تھی! اسی لیے تو میں نے سلیمان شکوہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ شجاع کے افسروں کو الہ آباد کا علاقہ لوٹا دے! دارا بولا۔

— لیکن پھر بھی حکمت عملی اور سیاسی دور اندیشی کا حوصلہ تم نے نہیں دکھایا... تم نے شجاع پر متوقع یقین نہیں کیا... نہیں تو اورنگ زیب کے خلاف پورا ہندوستان کھڑا تھا۔ مشرق میں شجاع تھا، مراد بھی شجاع سے معاہدہ کے لیے تقریباً تیار تھا۔ راجستھان میں جودھپور کا جسونت سنگھ موجود تھا۔ پنجاب اور کابل میں اورنگ زیب کا کوئی وجود نہیں تھا۔ دکن میں اورنگ زیب کے دشمن گولکنڈہ اور بیجاپور موجود تھے۔ اورنگ زیب کی حالت تو بہت ہی مشکلوں بھری ہو جاتی۔ اگر تم نے سیاسی اور جنگی دور اندیشی سے کام لیا ہوتا۔ لیکن تم نے لاہور جانے کا ارادہ کیا، اس لیے اورنگ زیب کو ایک ایک دشمن سے الگ الگ نپٹنے کا موقع مل گیا۔ سب سے بڑی غلطی تم نے یہ کی کہ شجاع کے ساتھ پورب میں فوجی معاہدہ کرنے کے بجائے تم نے سلیمان شکوہ کو ہمالیہ کے نیچے نیچے ترائی کے راستے واپس آ کر لاہور میں ملنے کا حکم دیا۔

— شاید یہی غلط ہوا... دارا نے گہری سانس لے کر کہا— اور شاید جب کچھ غلط ہوتا ہے تب سب کچھ غلط ہو جاتا ہے... یہیں سے میری بدقسمتی کی داستان شروع ہو جاتی ہے... میں ۱۴ جون ۱۶۵۸ء کو دلی سے چل کر ۳ جولائی ۱۶۵۸ء کو لاہور پہنچا۔ وہیں مجھے جموں کے راجپوتوں کا راجہ راج روپ ملا... اس نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا... میرے اس کے تعلقات کو ہندوستانی عہد میں باندھنے کے لیے میری بیگم نادرہ نے اُسے اپنی چھاتیوں کا دودھ بھیجا۔ وہ ماں اور بیٹے کے رشتوں میں بندھ گئے... داؤد خاں اور عزت خاں کے ساتھ میں نے ستلج ندی پر روپڑ میں گھیرابندی کی۔ اورنگ زیب کا سپہ سالار بہادر خاں میرا پیچھا کرتا بڑھ رہا تھا۔ اس کے فوجی دستوں اور بیڑوں نے رات میں ستلج پار کر لی... مصیبت بڑھ گئی۔

— میں نے دارا کو دیکھا تھا... وہ میرے ساحلوں پر اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا... ستلج ندی بول رہی تھی— تب تک اورنگ زیب نے مرزا راجہ جے سنگھ اور خلیل اللہ کو دارا کے خلاف بہادر خاں کی مدد کے لیے روانہ کر دیا تھا۔

— ہاں، یہ وہی خلیل اللہ تھا، جس نے سامو گڑھ میں مجھے دھوکہ دیا تھا۔ دارا چیخ کر بولا— میں نہیں چاہتا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے میرے بیوی بچوں کا قتل ہو... اس لیے میں ملتان کی طرف نکل گیا۔

— لیکن بھاگنا آسان تو نہیں تھا... اورنگ زیب کے فوجی دستے دارا کو زندہ پکڑنا چاہتے تھے، تب میری بہن ویاس ندی نے دارا کی حتی الامکان حفاظت کی تھی۔ ویاس نے اپنے پانی کا پھاٹ پھیلا دیا تھا۔ پیچھا کرتی فوجوں اور دارا کے درمیان بس اب ویاس ندی کے چوڑے پھاٹ کی دوری تھی۔

— ہاں! صرف ویاس ندی کے چوڑے پھاٹ کی دوری تھی... لیکن پھر بھی دشمن کو اتنے قریب دیکھ کر میرا سب سے بھروسے مند سپہ سالار داؤد خاں بھی اپنے گھر والوں کی حفاظت کو لے کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ میرا بدنشی تو پکی منوچی اور سپہر شکوہ میرے پاس پہنچ گئے تھے، لیکن ٹھٹھ میں داؤد خاں نے مجھ سے اجازت مانگی اور وہ جیسلمیر ہوتا ہوا اپنے گھر حصار لوٹ گیا۔ ہارے ہوئے فوجی کا ساتھ صرف بدقسمتی دیتی ہے۔ میرے سپاہی مجھے چھوڑنے لگے... باقی عہدیدار بھی مجھے چھوڑ کر اپنی جاگیروں پر واپس لوٹنے لگے اور وہ... وہ ذلیل راجہ راج روپ، جسے نادرہ نے اپنا دودھ بھیجا تھا، وہ ویاس ندی کے ساحل پر جا کر اورنگ زیب کی فوجوں سے مل گیا۔ اسی غدار راج روپ نے بعد میں دیورائی کی جنگ میں میری فوج کے پچھلے حصے کو الٹ دیا تھا... یہ تو بعد کی بات ہے اور... اور میں جیسے تیسے ۳ ستمبر ۱۶۵۸ء کو ملتان پہنچا۔

تبھی وقت نے مداخلت کی—

— ادیب عالی! وقت نہ ہندو ہے نہ مسلمان... تاریخ گواہ ہے کہ رجواڑوں اور سلطنتوں کے لوگ ہندو یا مسلمان تو تھے لیکن ان کے مفادات اور خواہشات نے ان لوگوں کو اور زیادہ ہندو یا مسلمان بنا دیا تھا۔ جب جب یہ اپنی طاقت سے اپنی خواہشات کو حاصل نہیں کر سکے ہیں، تب تب انہوں نے مذہب کا دامن تھاما ہے... نہیں تو مجھے بتایئے کہ کتنے راجا، مہاراجا اور صوبیدار و شہنشاہ ہیں جنہوں نے مذہب کی خاطر اپنی گدی کو ترک کیا ہو؟ سچائی یہ ہے کہ آج تک کسی شہنشاہ نے اپنی داخلی مذہبی ضرورتوں کے لیے اپنی سلطنت نہیں چھوڑی۔ نہیں تو کیا وجہ تھی... وقت چیخ رہا تھا— کہ اورنگ زیب جو پاک قرآن کی آیتیں لکھتا رہا اور ٹوپیاں سل کر اپنے گزارے کا انتظام کرتا رہا، اگر وہ واقعی دل سے مذہب پرست تھا تو وہ یقین دہانی کے تحت مراد کو ہندوستان کا شہنشاہ بنا کر خود حج پر کیوں نہیں چلا گیا اور اس نے اپنی باقی ماندہ زندگی مکہ و مدینہ میں ایک حاجی درویش کی طرح کیوں نہیں گزاری؟ میں پھر اپنی وہی بات دہراؤں گا کہ اپنے مفادات کے لیے سب مذہب کو مانتے تھے، لیکن مذہب کی بات کوئی نہیں مانتا تھا۔

وقت کی بات سن کر ایک عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ ایک سوچتا ہوا سناٹا۔ اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولتا ہوا سناٹا...

اپنے محور پر گھومتا ہوا دنیا کا گولا جیسے ٹھٹھک کر رک گیا تھا۔

—اے وقت! جب جب انسان اپنے ضمیر کو توڑتا ہے تو محور پر گردش کرتی اس کائنات کے دل کی ایک دھڑکن اپنا دم توڑ دیتی ہے... ادیب نے کہا— لیکن مجھے یہ تو بتاؤ کہ پھر کیا ہوا؟

وقت نے اپنا بیان جاری رکھا—

—دارا شکوہ لاہور کی طرف بھاگا تھا... یہی اس نے غلطی کی!

دارا نے تائید کی نگاہ سے وقت کو دیکھا۔

—اورنگ زیب کی حملہ آور فوج سے بچنے کے لیے یہ دارا شکوہ دریائے سندھ سے سندھ ندی کے دکن کی طرف اُتر کر بھکر چلا گیا! کیونکہ بھکر سے پچاس میل نیچے، قندھار ہو کر ایران جانے کا راستہ وہیں سے ملتا ہے۔

—تو میں اور کیا کرتا! پست ہمت دارا نے تکلیف سے کہا۔

وقت بگڑ اٹھا—

—تم نے بھی وہی راستہ اختیار کیا جو تمہارے سلف ہمایوں نے بھی اختیار کیا تھا!... اور حضور عالی! جب اس ڈر سے گھبرائے دارا شکوہ نے اپنی بیوی اور دیگر عہد یداروں کے حرم کے ساتھ ایران کے حکمراں شاہ عباس کی مملکت میں پناہ لینے کے لیے پیغام بھیجا تو ساری خواتین نے بغاوت کر دی تھی کہ کچھ بھی ہو، ہم اپنے وطن کی سرزمین پر بے موت مر جائیں گی، لیکن ایران کے شاہ عباس کے حرم میں شامل ہو کر ہم اُس کی وحشت کا شکار نہیں بنیں گی! ہم نہیں اپنے ملک کی راجپوتی بہادر خواتین کی طرح جوہر کی رسم ادا کریں گی اور خود کو ختم کر لیں گی۔ لیکن ہم ایران کے شاہ کے حرم میں پیش نہیں ہوں گی۔

تبھی مدھم ہوا کا ایک مہکتا لرزتا جھونکا آیا اور سب کے ماتھے کا پسینہ پونچھتا ہوا وہیں کھڑا ہو گیا۔

—تم کون ہو؟ اردلی نے اس جھونکے سے سوال کیا۔

—میں ہندوستانی تہذیب ہوں!

—تمہارا اس تاریخ اور اتہاس سے کیا واسطہ؟ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ ہمارے ادیب، وقت اور دارا شکوہ گہری جانچ پڑتال اور چھان بین میں مشغول ہیں... تمہاری یہ دخل اندازی ہمیں منظور نہیں! اردلی نے تہذیب کو ڈانٹا۔

تو ہندوستانی تہذیب نے اُسی مدھم اور ملائم آواز میں جواب دیا— سنو اعلیٰ ادیب کے اردلی! عورت کی آبرو ہی تہذیب کے معیاروں کو طے کرتی ہے... جو تہذیب اپنی عورت کی آبرو کو عزت نہیں دے سکی وہ روم، یونان اور مصر کی طرح مٹ گئی، چاہے یہ تُھلم ہی گئے لیکن ہندوستان میں جب

اس کی تہذیب عورت کے آبرو کی حفاظت نہ کر سکی تو خود عورت نے اپنی تہذیب کی حفاظت کی خاطر اپنی قربانی دے کر اس تمدن کا چہرہ روشن کیا ہے... اور دارا شکوہ کی بیوی نادرہ بانو اور باقی عہد یداروں کی عورتیں اسی شخصی وجود اور ہندوستانی تہذیب اور روایت کے تحت موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہیں... اس ظالم دور میں اگر عورت اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے، بغاوت کرتی ہے تو یہ ہندوستانی عورت کا فیصلہ ہے اور اُسے اس کا حق ہے۔ جوہر کی روایت اور پر بہرا ظلم ہے لیکن عورت کی عصمت کی بے قدری اور اُس کی خلاف ورزی کرنا تو اور بھی بڑی بربریت ہے... سمجھے اردلی صاحب!— کہتے ہوئے تہذیب وہیں اداس اور ناراض سی بیٹھ گئی۔

تبھی سفید اور کالے پنکھوں والی کئی صدیاں ہندوستان کو سلام کرتی ہوئی گزر گئیں... اور ماحول میں یکایک اقبال کا ترانہ گونجنے لگا—

اے آبِ رودِ گنگا، وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اور یہ ترانہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اختر الایمان بڑی گہری، سنجیدہ اور تکلیف دہ آواز میں اپنی نظم پیش کرتے ہوئے آگئے۔ بولے— یہ تو کل کی بات ہے... یہاں بھی سب لوگ ویسے ہی بیٹھے ہیں!

—کیسے ہیں اختر بھائی! ادیب نے اُن کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

—ویسا ہی، جیسے ادیب تم، تمہارا اردلی، دارا شکوہ، وقت اور ہماری تہذیب یہاں موجود ہیں!... ایسے ہی...

—ایسے ہی کیا؟ ادیب نے جاننا چاہا۔

ایسے ہی بیٹھے تھے ادھر بھیا داہنی جانب
اُن کے نزدیک بڑی آپا شبانہ کو لیے
اپنی سسرال کے کچھ قصے، لطیفے باتیں
یوں سناتی تھیں، قہقہے پڑتے تھے سب
سامنے اماں وہیں کھولے پٹاری اپنی
منہ بھرے پان سے مدھم سی انہیں باتوں پر

جھنجھلاتی تھیں، کبھی طنز سے کچھ کہتی تھیں
ہم کو گھیرے ہوئے بیٹھی تھیں، نعیمہ، شہناز
وقفہ وقفہ سے کبھی دونوں میں چشمک ہوتی
حسبِ معمول سنبھالے ہوئے خانہ داری
منجھلی آپا کبھی آتی تھیں، کبھی جاتی تھیں
ہم سے دور ابا اُسی کمرے کے اک کونے میں
کاغذات اپنے اراضی کے لیے بیٹھے تھے
یک بہ یک شور ہوا — اک نیا ملک بنا
اور اِک آن میں محفل ہوئی درہم برہم
آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ زمیں لال ہے سب...

اتنا پڑھتے پڑھتے اختر الایمان کی آنکھیں بھر آئیں... وہ سسک پڑے، اگلی سطریں وہ نہیں پڑھ سکے...

— روؤ مت اختر الایمان! وقت نے انہیں ڈھارس بندھایا — کاش! اک نیا ملک بنے اور سرخ خون کے فواروں سے دھرتی کے رنگ جانے کے بجائے یہ پیچ تمہاری اماں کے پان کی لال پیک ہوتی! لیکن ایسا نہیں ہوا۔

— اور ایسا ہی اس وقت ہوا جب خون کی لکیر دارا شکوہ کا پیچھا کرتی ہوئی دیورائی کے جنگی میدان تک پہنچ گئی تھی!... میں گواہ ہوں سارے حالات کا... اس سچائی کا جب غدار ہندوؤں کی کمزوری اور سازش کی وجہ سے ۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب نے خود اپنے بڑے بھائی دارا شکوہ کو شکست دے کر ہندوستان میں ہی اپنا پاکستان بنایا تھا! اُن دنوں ملکوں کے نام نہیں، شہنشاہوں کے نام بدلتے تھے اور شہنشاہ کے بدلنے کے ساتھ ہی بدلتا تھا، حکومت کا رویہ اور ذہنیت... اور پاکستانوں کے بننے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا! یہ آواز تہذیب کی تھی۔

— لیکن میں اپنی اولاد کی دلی اور جذباتی کیفیت نہیں بدلنے دیتی۔ میں انسان کی رگوں میں بہتے خون اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو بجھنے نہیں دیتی! تہذیب اپنی رو میں بولے جا رہی تھی — یہی وجہ ہے کہ میں پانچ ہزار برسوں سے آج تک زندہ ہوں...

تہذیب کی یہ بات سنتے ہی آسمان میں کھڑکیاں کھلنے لگیں... ہر کھڑکی میں ایک ایک چہرہ موجود تھا... دنیا کے سارے اعلیٰ ادیب اُن کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے...

ادیب نے حیرانی سے تہذیب کی طرف دیکھا۔

— ادیب! یہ تمہاری ہی برادری ہے جس نے مجھے زندہ رکھا ہے... سیاست نے تو میرے دو ٹکڑے کر دیے، لیکن میں کوئی زمین کا حصہ تو نہیں کہ کوئی میرے ٹکڑے کر سکے! تہذیب بہت فلسفیانہ لہجے میں اپنی بات کہہ رہی تھی — میں بھی تو آتما کی طرح ہوں جو صرف اپنا روپ بدلتی ہے... آج میں جس روپ میں تمہارے سامنے ہوں، وہی تو میرا روپ نہیں تھا، میں نے موہن جوداڑو اور ہڑپا میں اپنا روپ بدلا تھا۔ ویدک آریہ جب یہاں آئے تھے تو جنگ کے اسلحے نہیں، ہاتھوں میں اناج اور بالیاں اور اناج اُگانے کے اوزار لے کر آئے تھے... وہ حملہ آور نہیں تھے... حملے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ زمین خالی پڑی تھی، کوئی کہیں بھی بس سکتا تھا... تب بھی میں نے اپنا روپ بدلا تھا... ادیب! میں ہمیشہ بدلتی رہنے والی ہوں، اسی لیے سناتن ہوں... یہ ٹھیک ہے کہ اس دور میں جناح نے ایک سیاسی دیوار کھڑی کر لی، لیکن کوئی دیوار میری آواز اور سانسوں کو نہیں روک سکتی!

تبھی اردلی نے ادیب کو ایک چٹ دی، جس میں لکھا تھا کہ تہذیب کی آواز سن کر جوگندر پال اور کرشنا جی وزیر آغا کو لے کر اس بحث کو سننے کے لیے تشریف لا چکے ہیں... ادیب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تینوں کو سلام کیا۔ وہ بھی خاموشی سے بیٹھ گئے... ان کی آتما پر بھی تقسیم سے زیادہ ان صدیوں کے درد کا بوجھ تھا، جن میں وہ اپنا قلم دے کر شامل نہیں ہو پائے تھے۔

— ہم اور وزیر آغا نہیں تھے تو کیا ہوا! جوگندر پال نے دھیرے سے کہا — لیکن تب بھی وہ صوفی سنت موجود تھے جنہوں نے اپنے دور اور اپنی صدیوں میں مذہبی جنگ کی راہ بند کر کے مذہبوں کی ہم آہنگی اور ان کے اشتراک کی تلاش کی راہ ایجاد کی تھی۔

— یہی تو میں نے کیا تھا! دارا شکوہ یکایک بول پڑا — اگر میں نے بھی ایسا کیا تھا تو کیا غلط کیا تھا؟

وقت دارا شکوہ کو تکلیف سے دیکھ کر بولا — دارا شکوہ! تمہاری سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ تم نے اپنے دور کے مفادات اور خواہشات کو نہیں دیکھا، تم ہندوستان کے مستقبل کو دیکھ رہے تھے۔

تبھی مورخ قانون گو نے مداخلت کی —

— لیکن اورنگ زیب کو ملک کے مستقبل سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے مستقبل کو دیکھ رہا تھا۔ اس لیے دارا کا پیچھا کرتا ہوا ملتان تک پہنچ گیا تھا۔ شجاع خود سلطنت اور تاج حاصل کرنے کے لیے الٰہ آباد تک بڑھ آیا تھا۔ اورنگ زیب تو جیسے شکار پر نکلا تھا۔ وہ طے کر چکا تھا کہ اُسے مغلیہ

سلطنت کا تاج حاصل کرنا ہی ہے۔ یہ خبر پاتے ہی کہ شجاع آگرے کی طرف بڑھ رہا ہے، اورنگ زیب ملتان سے لوٹ پڑا، کیونکہ دارا شکوہ دریائے سندھ سے ہوتے ہوئے بکھو کی طرف بڑھ رہا تھا اور اورنگ زیب جانتا تھا کہ دارا شکوہ بھاگتا، پناہ لیتا ہوا صرف اس خرگوش کی طرح تھا جو اپنی جان اب نہیں بچا سکتا تھا۔ اس لیے اس نے دارا شکوہ کا پیچھا کرنے کے لیے صف شکن خاں کو تعینات کیا اور وہ خود باغی شجاع کا مقابلہ کرنے کے لیے الہ آباد کی طرف نکل پڑا!!

یہ بیان دیتے ہوئے قانون گو نے تب حضرت شبلی نعمانی سے سوال کیا—

— حضرت شبلی نعمانی صاحب! اگر اورنگ زیب آپ کا عالمگیر، ہندوستان کی سلطنت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تو وہ دارا کو چھوڑ کر شجاع کے خون کا پیاسا کیوں ہو گیا تھا؟

جب یہ سوال پوچھا گیا تو حضرت شبلی نعمانی اپنے چبوترے پر آرام سے بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور چیخے—

— مجھ سے سوالات کرنے کی جرأت کون کرتا ہے؟

تو ان کے سامنے وقت نے حاضر ہو کر بتایا کہ تاریخ کے ہر ورق اور اس ورق میں درج حقیقت کے بارے میں اگلی صدیوں کو سوال اٹھانے اور اپنا جواب مانگنے کا حق ہے۔

— یہ حق انہیں کس نے دیا؟ شبلی نعمانی نے پوچھا۔

— یہ حق تہذیب خود حاصل کر لیتی ہے! وقت نے جواب دیا— کیونکہ تہذیب ہمیشہ بدلتے ہوئے وقت کا ساتھ دیتی ہے!

— شبلی نعمانی تم نے حقیقت کا دیدار نہیں کیا! تہذیب چیخی— تم عالمگیر کی ساری دماغی سازشوں کا فلسفہ اور دستاویز نہیں بن سکتے۔ تم جواب کیوں نہیں دیتے کہ تمہارا عالمگیر ملتان سے شجاع کی بڑھتی فوجوں کا سامنا کرنے کے لیے الہ آباد کی طرف کیوں لوٹ پڑا تھا؟

— یہ تو مجھے نہیں معلوم— اس کی تفصیل میں نہیں بیان کر سکتا! شبلی نعمانی خاموش ہو گئے تھے۔

تو وقت نے آگے کہا— ادیب عالی! ہندوستان کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب ہندوستان پر کسی نے حملہ کیا تبھی تک وہ بدیشی رہا... حملے کے بعد ہر حملہ آور ہندوستانی تہذیب و تحریک کا حصہ بنتا گیا... یہاں تک کہ ہندوستان آ کر جن صوفی سنتوں نے اسلام کی تبلیغ و تشہیر کی وہ اسلام بھی ہندوستانی اسلام بنتا گیا۔ اس ملک کی مٹی میں وہ طاقت اور تاثیر ہے کہ یہ سب کو جذب کر لیتی ہے... اس لیے اس بات کا قائل ہوں کہ نہ تو دارا شکوہ اس مٹی سے الگ تھا اور نہ عالمگیر اورنگ زیب۔ دونوں یہیں کے اولاد تھے...

— اور میں بھی یہیں کی اولاد ہوں! ایک تیز آواز تبھی وہاں گونجی۔ سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔

— کون ہو تم؟ اردلی نے دریافت کیا۔

— میں ہوں جموں کا راجہ راج روپ!

دارا شکوہ نے اسے فوراً پہچانا— ہاں ادیب! یہی ہے راج روپ... جموں کا راجہ۔ اسی نے مجھے مدد کا وعدہ کیا تھا کہ یہ میرے لیے پہاڑی راجپوتوں کی ایک فوج کھڑی کر دے گا... اس وقت جب سامو گڑھ میں ہوئی شکست کے بعد میں دلی سے لاہور کی طرف فرار ہو رہا تھا...

— یہ میں نے اس لیے کیا تھا کیونکہ دارا شکوہ ہمیشہ ہندوؤں کو پناہ دینے والا اور ان کا حمایتی تھا! راج روپ نے کہا۔

دارا نے تب بڑی تکلیف سے کہا— اور اسی بدبخت احسان فراموش پر یقین کر کے میری بیوی نادرہ نے اپنی چھاتیوں کا دودھ اتار کر اس راج روپ کے لیے بھیجا تھا تاکہ ماں کا دودھ پی کر یہ ہندو راجپوت میرے ساتھ جڑ جائے اور مشکل وقت پار کر کے ہم اس ہندوستان کی ملی جلی نئی تاریخ لکھ سکیں... لیکن دودھ پی کر، دنیا میں یقین کا سب سے بڑا حلف لے کر بھی اس راجپوت نے اپنی منہ بولی ماں کے دودھ کی توہین کی۔ میں نے اسے لاکھوں مہریں دیں... لیکن ایک سال بعد ہی دیورائی کی فیصلہ کن جنگ میں اس راجپوت راج روپ نے میرے ساتھ غداری کی اور اس فیصلہ کن جنگ میں اسی راج روپ نے قسم توڑ کر اورنگ زیب کا ساتھ دیا!

— شیم! شیم! یہ آوازیں جوگندر پال، کرشنا جی اور وزیر آغا کی تھیں۔

— خاموش! راج روپ چیخا— اس میں میرے لیے شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں راجپوت ہوں! میں ہندو ہوں... اور مجھے فخر ہے کہ ہر ہندو نے غداری کو ہی اپنی زندگی کا شیوہ بنا لیا تھا... دارا شکوہ کے لیے وطن اور ملک کا کوئی مطلب اور معنی رہا ہوگا، لیکن ہم ہندو اس عہد وسطیٰ میں صرف اپنے لیے جی رہے تھے... ہمارا کوئی دیش یا ملک نہیں تھا۔

— شیم! شیم! پھر جوگندر پال، کرشنا جی اور وزیر آغا کی آواز گونجی۔

— خاموش! راج روپ پھر چیخا— تم ادیب لوگ تو دھرم اور مذہب سے اوپر اٹھ گئے ہو... تم نے اپنے اوپر انسانی قدروں کی بندشیں لگا لی ہیں، اس لیے تم بھوکوں مرتے ہو اور ہمیشہ مظلوم و ذلیل رہتے ہو... ہم جیسے ذہین راجہ، مہاراجاؤں اور ہماری خواہشات کے مذہب کو تم کم نظر لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ میں پھر پوری ہمت اور شدت سے کہتا ہوں کہ اس دور میں ہم ہندوؤں کا کوئی ملک،

کوئی وطن، کوئی ہندوستان نہیں تھا۔ میں نے ہی نہیں جودھپور کا وہ مہاراجہ جسونت سنگھ جو دارا سے اپنی دوستی اور وطن پرستی کی قسمیں کھاتا تھا، اس نے بھی آخری دنوں میں دارا شکوہ کے ساتھ غداری کی تھی۔ جے پور کے مرزا راجہ جے سنگھ نے تو کھلم کھلا اورنگ زیب کا ساتھ دیا تھا۔ میواڑ کا مہاراجہ جے سنگھ جس کی حفاظت دارا نے اعلیٰ وزیر سعد اللہ اور اورنگ زیب سے کی تھی، وہ بھی بانسواڑہ، ڈونگر پور، بساور کے ساتھ پانچ اور تعلقہ کی رشوت لے کر دارا شکوہ کے خلاف ہو گیا تھا۔

—راج روپ صحیح فرما رہا ہے! مورخ کا مستقبل نے بھی مداخلت کی— میں سیاح برنے کے سفرنامے کے حوالے سے یہ دستاویز آپ کی عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ادیب نے مورخ کا مستقبل کو دیکھا اور پوچھا— کیسی دستاویز؟

—حضور، یہ اورنگ زیب کے حمایتی اور دارا کے مخالف جے پور ریاست کے مرزا راجہ جے سنگھ کا وہ خط ہے جو انہوں نے جودھپور کے مہاراج جسونت سنگھ کو ڈرانے، دھمکانے اور بہلانے کے لیے لکھا تھا تاکہ وہ دارا شکوہ کا ساتھ چھوڑ دے!

—اس دستاویز کو پڑھا جائے! ادیب نے کہا تو اردلی نے وہ خط لے کر پڑھنا شروع کیا—

—جودھپور مہاراج جسونت سنگھ کے نام جے پور کے مرزا راجہ جے سنگھ کا خط— آپ کو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے کہ اس کم نصیب شہزادے دارا شکوہ کو آپ تعاون دینے کی کوشش کریں۔ اس کام میں لگنے سے آپ کا اور آپ کے خاندان کی تباہی یقینی ہے اور اس سے دارا کے مفادات کو بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ شہزادہ اورنگ زیب بھی آپ کو معاف نہیں کرے گا۔ میں خود راجہ ہوں اور آپ سے حلفیہ گذارش کرتا ہوں کہ راجپوتوں کا خون نہ بہائیں۔ آپ اس امید میں نہ بہہ جائیں کہ دوسرے راجاؤں کو آپ اپنے گروپ میں ملا لیں گے، کیونکہ ایسی کسی کوشش کی پیش بندی کرنے کے ذرائع میرے پاس ہیں۔ اس کام سے سبھی ہندوؤں کا تعلق ہے اور میں آپ کو یہ آگ لگانے کی اجازت نہیں دے سکتا، جو فوراً ہی سارے حکومت میں پھیل جائے گی اور جو پھر کسی طرح شانت نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اگر شہزادے دارا شکوہ کو آپ اس کی قسمت کے بھروسے چھوڑ دیں تو شہزادہ اورنگ زیب ساری پچھلی باتوں کو بھلا دے گا اور وہ آپ سے وہ دولت بھی نہیں مانگے گا جو آپ نے کھجوہ میں قبضہ کر لیا ہے، ساتھ ہی وہ فوراً آپ کو گجرات کا اقتدار سونپ دے گا۔

—رکو! رکو! قانون گو نے ٹوکا— گجرات کا صوبیدار تو شہزادہ مراد بخش تھا... اس کے علاقے کا حق، مرزا راجہ جے سنگھ جودھپور کے مہاراج جسونت کو سونپنے کی پیش کش کیسے کر سکتا تھا؟ یہ خط اورنگ زیب کی منظوری اور سرپرستی کے بغیر نہیں لکھا جا سکتا تھا۔

—اس کا مناسب جواب تو حضرت شبلی نعمانی ہی دے سکتے ہیں! ادیب نے کہا۔

—اس معاملے میں میری معلومات پختہ نہیں ہیں! شبلی نعمانی نے ایک سچے دانشور کی طرح جواب دیا۔

تب تک سبھاش پنت نے اردلی کے ہاتھ سے وہ دستاویز لے لیا تھا جو دہرہ دون سے چل کر ادیب سے ملنے آئے تھے اور وہ بولے—

—مجھے اس خط کی اگلی سطریں پڑھنے کا موقع دیا جائے کیونکہ ہمارے بزرگ شاعر رگھوپتی سہائے فراق کے مطابق سچ تک پہنچنے کے لیے، ماضی، حال اور مستقبل کے لمحوں کو توڑ کر منقسم نہیں کرنا چاہیے...

—جی ہاں! ادب کے تسلسل اور تحریک کو جب جب توڑا جائے گا، تب تب تہذیب اور تمدن کا بکھراؤ ہوگا... اور تہذیب اگر قومی اور فرقہ وارانہ ٹکڑوں میں بٹ گئی تو پھر ایک دن وہ آئے گا، جب ہر اکیلے آدمی کی ایک ذاتی پرتشدد تہذیب ہوگی... تب اکیلا تنہا انسان اپنے پرانے راگ اور رشتوں کی غیر موجودگی کے لیے ترسے گا اور آٹھ آٹھ آنسو روئے گا۔ آدمی کی زندگی تو برسوں میں بندھی ہے، وہ تو کبھی بھی مر جائے گا لیکن تہذیب کا پرانا راگ، پیدا ہونے والے آدمی کو اس کی روحانی شخصیت، اپنی کلا اور لوک آرٹ کی سانسیں دے کر موت کی سرحد کے پار بھی اس کا ساتھ دے گا۔

خاموش بیٹھی تہذیب کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور اس نے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھ کر وزیر آغا اور جوگندر پال کی طرف دیکھا۔

جوگندر پال کے ہونٹ ہلکے سے لرز اٹھے اور تہذیب کو اتنا پگھلتا دیکھ کر وہ خود کو روک نہیں پائے۔ لرزتے ہونٹوں نے انہیں پکارا—

—ماں! ایک ماں ہمیں اپنی کوکھ میں پال کر جنم دیتی ہے لیکن تم ہمیں قبول کرتی ہو اور موت کی سرحد کے پار بھی تم ہمارا ساتھ دیتی ہو! تم انسان پرست سوچ کی سب سے بڑی طاقت ہو... اگر ایسا نہ ہوتا تو تم تہذیبوں کی سرحدوں کو توڑ کر خود اس فلسفی ہیگل کو پیدا نہ کرتیں جس کی تھیسس کو مارکس کی فکر ایک اینٹی تھیسس کی شکل میں قبول کرتی ہے اور اس سے آگے بڑھ کر عالمی تہذیب کا سب سے بڑا رہنما مہاتما گاندھی اس کی اینٹی تھیسس میں سے سن تھیسس کا فلسفہ پیش کرتا ہے۔

—یہی فلسفہ دارا شکوہ نے پیش کیا تھا... وقت نے اٹھ کر عرض کیا— اسی لیے اورنگ زیب دارا شکوہ کو کافر، ناقابل اعتبار اور ملحد، کئی خداؤں والا پکارتا تھا۔

ادیب اس بحث کا بیچ جز نکال رہا تھا۔ اپنی بھنویں چڑھاتے ہوئے اس نے اعلان کیا—

—تہذیب کے تحت انسان پھر بھی ایک دوسرے کے لیے تحمل اور ایک ہونے کی کوشش میں کامیاب ہوسکتا ہے، لیکن انسان کا خدا کبھی ایک نہیں ہوسکتا۔ انسان کا خدا تب ایک ہوگا، جب انسان کا دکھ ایک ہوگا۔ یہ استحصال، ناانصافی اور ناہمواری کی دنیا، جو ہر پل ہزاروں طرح کے دکھ پیدا کرتی ہے، یہ نہ تو انسان کے سکھ کو متوازن اور ہموار ہونے دے گی اور نہ ہی اس کے دکھ کو متحد ہونے دے گی... جس دن انسانیت کا دکھ متحد ہوجائے گا، اس دن پوری دنیا کے باشندوں کا خدا بھی ایک ہوجائے گا!... اور تب وہ خدا طاقتوں کی عدالت کا غیرمجسم منصب نہیں، وہ انسانیت کے سکھ کا آخری مرکز بن جائے گا اور وہ غیرجسمی فلسفیانہ اصولوں کی الجھی سچائیوں سے آزاد ہوکر خود ایک خوشنما اور مجسم سچائی میں تبدیل ہوجائے گا۔ تب خدا مشورہ دینے والے بزرگ کی طرح ہر گھر کا حصہ بن جائے گا۔

حضور! اردلی نے ٹوکا— آپ تو پھر بھاشن دینے لگے۔ آپ اس عادت سے باز آیئے، نہیں تو آپ اپنی جرح کو کسی ٹھوس اور اطمینان بخش انسانی منزل تک نہیں پہنچا سکیں گے۔

—تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ ادیب نے اپنے اردلی سے جواب طلب کیا۔

—یہی حضور کہ صدیاں رکی کھڑی ہیں۔ وقت اور تہذیب آپ کی عدالت میں آپ کی مدد کرنے کے لیے موجود ہیں، لیکن آپ لہولہان صدیوں سے نتیجہ نکالنے اور اگلی آنے والی صدیوں کی مدد کرنے کے بجائے اپنا فلسفہ بگھارنے لگے...

—اردلی، ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں! ادیب نے کہا— ہم ادیب ہی نہیں، کبھی اصول اور جماعتیں عام آدمی کا وسیلہ اور واسطہ دے کر ہمیشہ فن کے نام پر آپ کو پھلانگ کر نکل جانے کی سازش کرتے رہے ہیں...

—تو پھر میرے اعلیٰ حضور... ادیب عالی! عوام کے خلاف چل رہی اس سازش کا پردہ فاش کیجئے اور یہ بتایئے کہ عام آدمی کے مفاد کے خلاف کب اور کہاں بلاتکار کیا گیا ہے، تاکہ اقتدار اور نظام کی جکڑبند طاقتوں کو للکارا جاسکے اور اُن کی زیادتیوں اور ظلم سے آنے والی صدیوں کو بچایا جاسکے۔ اردلی ایک زخمی انسان کی طرح پیروی کررہا تھا— آخر ہمیں یہ سارے زخم انہیں خونی صدیوں نے دیے ہیں... اورنگ زیب اور دارا شکوہ کے اس ظالمانہ اور خونی جنگ کی قیمت ہم نے اور ہماری نسلوں نے چکائی ہے۔

—اردلی صاحب! اب تو تم بھی میری طرح بھاشن جھاڑنے کے شکار ہوگئے۔ ادیب نے کہا اور پھر پوچھا— تاریخ اس وقت کہاں رکی ہوئی ہے۔

—وہیں! سبھاش پنت نے مرزا راجہ جے سنگھ کے خط کو سامنے کرتے ہوئے کہا— وہی سترہویں صدی ہے اور وہی سال!

—تو جودھپور کے مہاراج جسونت سنگھ کے نام لکھے گئے جے پور نریش مرزا راجہ جے سنگھ کے خط کو آگے پڑھا جائے۔ ادیب نے حکم دیا۔

سبھاش پنت نے خط آگے پڑھنے سے پہلے تبصرہ کیا— حضور عالی! حالانکہ اورنگ زیب گجرات کا صوبیدار نہیں تھا، لیکن پھر بھی مرزا راجہ جے سنگھ کی معرفت اُس نے جودھپور کے مہاراجہ جسونت سنگھ کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ شہزادہ مراد بخش کے گجرات کا علاقہ اُس کی ماتحتی میں دے گا۔ یہ اورنگ زیب کی ایک سیاسی اور کمینی چال تھی جسے ہندوستان کے غدار ہندوؤں کے ذریعہ اُس نے کارگر کردیا تھا۔

—وہ کیسے؟ ادیب نے سوال کیا۔

—یہ سنئے... ہندوستان کا راجپوت ہندو مرزا راجہ جے سنگھ دوسرے راجپوت جودھپور کے ہندو راجہ جسونت سنگھ کو خط میں لکھتا ہے کہ— 'گجرات کا علاقہ قبضے میں کرکے آپ اورنگ زیب کے زیرِ سایہ صوبہ گجرات پر حکومت کرنے کے فائدے کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں' یہ الفاظ ہیں مرزا راجہ جے سنگھ کے۔ سبھاش پنت نے کہا— اور آگے سنئے، اس پیش کش کے علاوہ اورنگ زیب کے حوالے سے مرزا راجہ جے سنگھ یہ یقین دہانی بھی کراتا ہے کہ— 'وہاں پر آپ کو مکمل تحفظ اور امن حاصل ہوگا اور یہیں پر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے، اُس پر پوری طرح سے عمل ہوگا۔

سب لوگ حیران تھے! ادیب نے بریدے کے سفرنامے کا وہ حصہ سبھاش پنت سے لیا اور سوچتے ہوئے کہا—

—ہندوؤں نے چاہے جتنی بزدلی دکھائی ہو اور کتنی بھی غداری کی ہو، لیکن اس سے ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ اقتدار اور شاہی تخت کے لیے چل رہی اس جنگ میں نہ اورنگ زیب اچھوت ہے اور نہ دارا شکوہ... اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ چھتری دھرم اور راجپوتی بہادری کی چاہے جتنے قصیدے گائے جائیں— شیواجی اور رانا پرتاپ کے علاوہ چھتری بہادری ہمیشہ بے قوت اور نامرد رہی ہے... شیواجی اور پرتاپ کے سوا چھتری دھرم کی قسم کھانے والا کیا ایسا ایک بھی راجہ یا رانا و مہارانا ہے جس نے ایک بھی جنگ فتح کی ہو۔ مہارانا پرتاپ کی بہادری اور شجاعت کو نشان زد کیا جاسکتا ہے کہ اس جواں مرد نے مسلسل مخالفت کی اور اپنے وعدے کو آخری سانس تک نبھایا... رانا پرتاپ بے خوف اور ایثار پسند تھا... انہوں نے دیگر راجپوتوں کی طرح موقع پرست بن کر اقتدار کی ہوس نہیں دکھائی... اور تاریخ کے اس دور تک آتے آتے مغلیہ سلطنت کے وارث

مسلمان ہندوؤں کے لیے لامذہبی ضرور تھے لیکن وہ بدیشی نہیں تھے۔

—اور حضور! تبھی یہ سچائی بھی سامنے آتی ہے کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت میں تھے، اُن کی ریاستیں بھی تھیں، لیکن ہندوستان کبھی بھی ہندو راشٹر نہیں تھا۔ تب ہندو راشٹر نام کا کوئی فلسفیانہ اور مذہبی نکتہ موجود نہیں تھا۔ ہندوستان کا ہندو اقتدار کی علامت نہیں تھا، اسی لیے یہاں کی سرزمین پر کوئی مرکزی مذہبی حکومت موجود نہیں تھی اور ہندو اپنے دھرم کو جانتے اور قبول کرتے ہوئے بھی مذہبی اقتدار کی حکومت سے آزاد تھے۔ اردلی نے ایک تجزیہ نگار کی طرح اپنا تجزیہ رکھا تو وہاں موجود لوگ اُسے حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔

یہ دیکھ کر اردلی کی ہمت اور بڑھ گئی اور وہ بولا— حضور! ہندوستان کی پوری ایک اور زمینی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں ہمیشہ سچ اور تہذیب کے لیے مذہبی جنگ لڑی گئی لیکن کسی مذہب خاص کی مرکزیت اور بالادستی کے لیے کوئی جنگ عظیم نہیں ہوئی۔ یہ 'مذہبی جنگوں' کی سرزمین نہیں ہے... یہاں تک کہ رام اور راون کی جنگ بھی مذہبی بالادستی اور اقتدار کی جنگ نہیں تھی، وہ ظلم، بداخلاقی، بدتہذیبی اور بدکرداری کے خلاف لڑی گئی ایک عظیم اخلاقی جنگ تھی۔

—بریوو! بریوو! سبھاش پنت، جوگندر پال، وزیر آغا اور کرشنا جی نے زوردار تالیوں سے اردلی کے تجزیے کا استقبال کیا—

اردلی کا حوصلہ اور بلند ہوگیا اور وہ بولتا چلا گیا— مہابھارت کی جنگ بھی مذہبی عقیدوں کے لیے لڑی گئی جنگ نہیں تھی... وہ لامذہبیت، استحصالِ نسواں، جھوٹ اور مطلق العنانی کے خلاف لڑی گئی ایک عظیم جنگ تھی۔ اشوک کے کلنگ کی جنگ بھی کسی مذہبی اقتدار کی جنگ نہیں، وہ مطلق العنان حکومت اور ہوس کے خلاف ایک عظیم جنگ تھی اور سکندر کے خلاف لڑی گئی پورس کی لڑائی لامذہبیوں کے مذہب کو تباہ کرنے کی جنگ نہیں، وہ بدیشی حملہ آور کی سامراجی کو شکست دینے کی ایک فخریہ جنگ تھی۔

—تم نتیجہ کیا نکالنا چاہتے ہو، ادیب نے سیدھا سوال کیا۔

—یہی حضورِ عالی کہ ہندوستان کی یہ زمین کبھی بھی مذہبی جنگوں کی سرزمین نہیں رہی ہے۔ لیکن ہمارے شبلی نعمانی صاحب نے دارا شکوہ کے خلاف اورنگ زیب کی جنگ کو ایک کافر کے خلاف ایک غازی کے جنگ کی شکل میں پیش کر کے ہندوستان کی تاریخ کو مذہب کی بیساکھیوں پر کھڑا کرنا چاہا ہے... اتنا ہی نہیں شبلی نعمانی نے دارا شکوہ کو ملحد یعنی کئی خداؤں کو ماننے والا ثابت کر کے ہندو سے بھی بڑا ہندو بنا کر اورنگ زیب کو اسلام کے محافظ کے طور پر کھڑا کیا ہے... جب کہ

تاریخ گواہ ہے کہ شاہجہاں اپنی اسلام پرستی میں اپنے بیٹے اورنگ زیب سے زیادہ کٹر اور متعصب تھا، لیکن وہی شاہجہاں وراثت کی جنگ میں اپنی مذہب پرستی کے باوجود اورنگ زیب کا نہیں بلکہ فراخ دل دارا شکوہ کا ساتھ دیتا ہے۔

—یہ سوال میں شبلی نعمانی صاحب سے پہلے بھی پوچھ چکا ہوں اور اس کا کوئی جواب اُن کے پاس نہیں ہے! ادیب نے کہا— اور جموں کے راجپوت راجہ راج روپ کی طرف دیکھا— راجہ راج روپ! تم کوئی بیان دے رہے تھے... اُسے جاری رکھا جائے۔

—میں وہی بات دہرانا چاہوں گا ادیب عالی کہ اُس دور میں ہم ہندوؤں کا نہ کوئی ملک تھا، نہ وطن اور نہ ہی کوئی ہندوستان۔ کچھ تھا تو ہماری اپنی ریاست، اقتدار اور فوج تھی۔ ہندو کسی سے نہیں ڈرتا تھا، وہ صرف طاقت ور کی طاقت سے ڈرتا تھا اور اسی کے سامنے دم ہلاتا تھا۔ نہیں تو کیا وجہ تھی کہ کچھ کا وہ راؤ جس نے دارا کے بیٹے سپہر شکوہ سے اپنی بیٹی کی سگائی کی تھی۔ وہ بھی اورنگ زیب کی طاقت سے ڈر گیا اور دارا شکوہ کا مخالف ہو گیا تھا۔ جب دارا سامو گڑھ میں ہوئی شکست کے بعد دربدر بھٹکتا رہا تھا تب اُسی کے سمدھی کچھ کے راؤ نے اس کے ساتھ غداری کی اور احسان فراموشوں کا سا سلوک کیا تھا۔

—لیکن تم نے خود نادرہ کا دودھ پینے کی قسم سے بندھے ہونے کے باوجود میرے ساتھ کیا کیا تھا؟ دارا شکوہ نے تلخی سے پوچھا تھا۔

—میں نے دیورائی کی فیصلہ کن جنگ میں تمہارا یقین توڑ کر گوکلا کی مشکل پہاڑیوں پر چڑھ کر پیچھے سے تمہاری فوج پر اچانک حملہ کیا تھا.. تمہارے سپہ سالار شاہنواز خاں کے پاؤں اکھاڑ دیے تھے اور وہ جنگ میں مارا گیا تھا! راج روپ نے بڑی شان سے اپنا بیان پورا کیا— تم سے مجھے کیا ملتا؟ اقتدار اور طاقت اورنگ زیب کے ہاتھوں میں آتی جا رہی تھی، اس لیے میں نے اُس کا ساتھ دیا تھا۔

تبھی کچھ کے کچھار سے نمکین آندھیوں کا اٹھتا غبار دکھائی دیا... اور دلدل کی ایک گیلی دیوار بے قابو لہر کی طرح آسمان کی طرف اٹھنے لگی۔ دیوار کے چھیدوں میں خاردار جھاڑیاں ایسے الجھی تھیں جیسے انہیں وہاں ٹانک دیا گیا ہو...

پھر اُن خاردار جھاڑیوں کی ٹہنیاں خود بخود ٹوٹ کر پنکھ ہلاتے پرندوں کی طرح پرواز کرنے لگیں... آسمان چھپ گیا اور زمین پر کالے سائے منڈرانے لگے۔

گھبرا کر ادیب نے پوچھا— یہ کیا ہے؟

یہ کلنگ ہے جناب! اردلی نے اُلجھتے ہوئے جواب دیا۔

۲۷

—جی ہاں حضور! میں کلنگ ہوں۔

ادیب ایک دم چونکا۔ اُسے دیکھ کر بولا— تم کلنگ ہو! لیکن تم تو وقت ہو، وقت! ہے!

میرا نام منشیوں نے بدلا ہے... اپنی سہولت کے لیے... آج کل میرا نام کلنگ ہے... اور اب تک میں آپ کی عدالت میں ہندوستان اور دارا شکوہ کی بدنصیبی سے بھری کہانی سنانے اور بتانے کے لیے رُکا ہوا ہوں کیونکہ اس کہانی سے زیادہ ظالمانہ اور بے رحم کہانی اور کہیں نہیں ہے۔ اگر اجازت ہو تو صدیوں پہلے دل و دماغ میں جو پاکستان بنا تھا، میں اُس کی کہانی بیان کروں!

—اجازت ہے!

اور جب کلنگ نے گہری سانس لے کر کہانی شروع کی—

—دیورائی کی جنگ میں شکست کھا کر دارا اپنے واحد زندہ سپہ سالار فیروز میواتی اور اپنے بیٹے سپہر شکوہ کو لے کر ۱۴ر مارچ ۱۶۵۹ء کی شام کو گجرات کے کچھ کی طرف بھاگا۔ مصیبت زدہ ساری عورتیں پہلے ہی ہاتھیوں پر بیٹھ چکی تھیں اور انا ساگر جھیل کے ساحل پر وہ دارا کے بھروسہ مند خوجہ مقبول کے زیرِ نگرانی بھاگنے کے لیے تیار تھیں...

دارا نے اُداس آنکھوں سے وقت کو دیکھا۔

وقت نے پھر گہری سانس لی— حضور عالی! اب مجھے صاف صاف دکھائی دے رہا ہے، رات ہوئی ہے۔ دارا کا صرف دو ہزار فوجوں کا لشکر فیروز میواتی کی کمان میں بیویوں اور بچوں کو لیے ہوئے میرٹھا کی طرف کوچ کر رہا ہے... پوری رات اور پورا دن گزرتا ہے اور میرٹھا سے دارا گجرات کے لیے دکن کی راہ پکڑتا ہے...

—جی حضور! مجھے امید تھی کہ میرا ہمدم کچھ کا راؤ مجھے ہر حالت میں پناہ دے گا... تبھی میرے ایک ایلچی نے آ کر خبر دی کہ اورنگ زیب کے فرمان کے مطابق مرزا راجا جے سنگھ ۴۰ ہزار کا لشکر لے کر نکل پڑا ہے اور اسے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ وہ مجھے زندہ یا مردہ اورنگ زیب کے حضور میں حاضر کرے۔ ساتھ ہی جودھپور کے مہاراجہ اور میرے پرانے دوست جسونت سنگھ کو یہ حکم ملا ہے کہ وہ مرزا راجہ جے سنگھ کا ساتھ دے... ادیب عالی! میں الزام نہیں لگانا چاہتا لیکن آج اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے جس مشترکہ تہذیب کے لیے اپنے دادا جان اکبر کے بعد کوشش کی تھی، اُس میں مجھے اورنگ

زیب کی طاقت نے نہیں، میرے ملک اور وطن کے ہندو راجہ، مہاراجوں نے شکست دی تھی... احسان فراموشی اور اندرونی ضرب کا اتنا شرمناک رویہ ہی ہندوستان کی ثقافتی تباہی و بربادی کی دردناک داستان ہے۔

جب دارا شکوہ نے یہ کہا تو، اب تک خاموش بیٹھی ہوئی تہذیب کراہ اٹھی اور گہری سانس لے کر بولی— میرے ٹکڑے تو نہیں کیے جا سکے لیکن میرے آنچل کی پرسکون چھاؤں میں جو کروڑوں لوگ سانس لے رہے تھے۔ وہ اقتدار اور خواہشات کی عالمگیری تلوار سے کاٹ ڈالے گئے... ہر شخص اپنا کٹا ہوا سر ہتھیلی پر لے کر گھوم رہا تھا اور اُس کی نکال لی گئی آنکھوں کی پتلیوں کے حلقے میں کپاس کی لو کانپ رہی تھی۔

ادیب نے تہذیب کی طرف دیکھا۔

—اور میرے اعلیٰ حضور! وہ دور ایسا تھا، جب کپاس کی بتیوں کی لو روشنی سے زیادہ اندھیرا پیدا کر رہی تھی اور سوئی ہوئی بدکار صدی کے سر کا ہلکا سا گندھا سیاست کے تکیے پر موجود تھا... سیاست کے الاؤ میں ہندوستان کی یہ دوغلی صدی اپنا جسم گرما رہی تھی اور شاہی بستروں پر انیڈتی ہوئی شہوت اور عیاشی کی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ ہر ہندو راجہ اور مہاراجہ اپنی لڑکی کو ایک مہکتے گلدستے کی طرح سیاست کے بازار میں نیلام کر رہا تھا اور اپنی لڑکیوں کے بدلے میں، اپنے آرام و خلوتوں اور جاگیروں کا سودا کر رہا تھا! ہندو لڑکیوں کی فروخت اور تجارت کے لیے خود ہندو سوداگر بازار میں مول بھاؤ کے لیے موجود تھا۔

ادیب نے گہری نظر سے تہذیب کی طرف دیکھا۔

—تو حضور! تہذیب نے کہا— ایسے بازار اور دوغلے وقت میں ہارے ہوئے دارا شکوہ کی طرف کون دیکھتا! اگلی صدیوں کی طرف کون نظر ڈالتا۔ اسی لیے اورنگ زیب سے ٹھیک پہلے کا یہ وہ دور ہے جب ہندوستان کا ہر آدمی اپنی غیرت اور عظمت کی شان سے صفر ہو چکا تھا... تب اس ملک میں پرچھائیاں تھیں... انسان نہیں تھا...

—جی ہاں اعلیٰ حضور! دارا نے بیچ سے بات کو پکڑا— جب میں اپنی جان اور غیرت کے لیے جگہ جگہ بھاگا تو مجھے میرے دوست یا جیتے جاگتے عظمت پسند لوگ نہیں ملے... مجھے صرف ان کی پرچھائیاں ملیں۔ وہ پرچھائیاں جن کی پچھلی پرچھائیاں غدار تھیں۔

—حضور! لیکن احسانوں اور یادوں کی وہ پچھلی پرچھائیاں دارا کا بہت دور تک ساتھ نہیں دے سکیں... کیونکہ پرچھائیاں آزاد تو نہیں ہوتیں، وہ فرد کے ساتھ بدل جاتی ہیں! وقت نے پھر

تاریخ کا سرا پکڑا—

—حضورا میں دیکھ رہا ہوں کہ اب دارا کی دو ہزار فوجوں کا لشکر بھی منتشر ہو چکا ہے— دارا باریک ململ کی بنڈی اور دو چھدام کی چپل پہنے ویرم گاؤں سے چھوٹے رن کی سوکھے ریگزار کی طرف بڑھ رہا ہے... اور اب اُس کے بچے ہوئے فوجیوں کے پاؤں میں چپلیں بھی نہیں ہیں اور وہ بھوک اور پیاس سے پست ہیں... کچھ کے رن میں کوئی جانور بھی نہیں، جسے مار کر وہ کھا سکیں، وہاں خار دار جھاڑیوں کی صرف زہریلی سینگریاں ہیں جو انہیں زندگی نہیں، موت دے سکتی ہیں... پانی ہے نہیں... وہ صرف مٹی کے برتنوں کے بھیگے اور ٹوٹے ٹکڑوں کو چوستے ہوئے کچھ کا رن پار کرتے ہوئے سندھ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

—وہ اس لیے اعلیٰ حضور کہ مرزا راجا جے سنگھ نے میرے خلاف پوری ناکہ بندی کر دی ہے... اُس نے ایک سیاسی جال بچھا دیا ہے۔ اُس نے میرے آگے بڑھنے کے سارے راستوں کو روک کر صرف میرے لیے خودسپردگی اور موت کا راستہ کھلا چھوڑا ہے! دارا بول رہا تھا— مرزا راجا جے سنگھ نے میرے فرار کے سارے راستے بند کر دیے ہیں۔ دکن میں سروہی اور پالن پور، دکن مشرق میں ویرواڑ اور شمال میں کاٹھیاواڑ اور کچھ کا راستہ بند ہے...

—اب اس وقت حضورا گنگی وقت نے بیان شروع کیا— دارا شکوہ کے پاس صرف چار سو فوجیوں کی کمک رہ گئی ہے جس کا پیچھا کچھ کے دل دلوں کو پار کرتی مرزا راجا جے سنگھ کی فوج کے تیس ہزار فوجی کر رہے ہیں اور اب حال یہ ہے حضور کہ دارا شکوہ فرار ہوتا ہوا سندھ ندی پار کر کے جان بچانے کے لیے قندھار کے راستے سے ایران بھاگنے کا منصوبہ بناتا ہے... لیکن یہ بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے دارا شکوہ اب افغانستان کی طرف سرحدی قبیلوں کی پناہ میں پہنچ جانا چاہتا ہے... کیونکہ افغانستان میں دادر ریاست کا وہ رئیس ملک جیون موجود ہے— جسے اُس نے اپنے ابا شہنشاہ شاہجہاں کے غصے اور موت کی سزا سے بچایا تھا۔ ہندوستان کے بولن درے کی سرحد سے تو کل دور دادر کا یہ گڑھ موجود تھا۔ افغانستان کے اس دادر علاقے کا یہ سردار ملک جیون ہے تو دوغلا، لیکن یہ ہندو باپ کی اولاد ہے۔ دارا کو ہندو پٹھان ملک جیون پر بہت اعتماد ہے کہ وہ اُس کی جان بچانے کا احسان بھولا نہیں ہوگا۔

عدالت میں موجود سارے لوگ وقت کی یہ تحریر بہت غور سے سن رہے تھے۔ وقت نے اپنا بیان جاری رکھا— حضور اعلیٰ! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ 'تاریخ شجاعی' میں بھی قلمبند ہے... اپنی حفاظت کے لیے تب پرائی پرچھائیوں کو پکڑتا ہوا شہزادہ دارا شکوہ ملک جیون کے محفوظ علاقے کی

طرف بڑھتا ہے... اور بدنصیبی کے حالات یہ ہیں کہ ملک جیون کے علاقے میں پہنچنے کے دو کوس پہلے ہی ۶ رجون ۱۶۵۹ء کو دارا شکوہ کی بیوی نادرہ آخری سانس لیتی ہے... اور وہ اپنی بیوی کے غم میں پاگل ہو جاتا۔ مرتے، مرتے نادرہ نے آخری خواہش یہی ظاہر کی ہے کہ اُسے بدیش میں نہ دفنایا جائے، اُس کی میت کو واپس ہندوستان بھیج دیا جائے۔

—رنج کا یہ خوفناک وقت تھا... میرا تو سب کچھ لٹ گیا تھا! دارا بولا— نصف بہتر، میری صلاح کار، میری شریک حیات، میری شاگردہ— وہ سب کچھ تھی۔ میرا جسم سونا ہو گیا تھا اور میں اپنے جسم کی قبر میں صرف سانسیں لے رہا تھا... کہتے ہوئے دارا بری طرح سسک کر رو پڑا تھا— لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ اس کے آنسو پلکوں تک لہروں کی طرح آتے اور پھر واپس لوٹ جاتے تھے۔

اپنے ان آنسوؤں کی حفاظت اسی طرح کرو دارا کیونکہ صدیاں تمہارے لیے روئیں گی... تمہاری آنکھوں کے آنسو ویران ہو گئے تو صدیوں کے دل بنجر ہو جائیں گے... تہذیب نے دارا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپ تھپایا— ہندوستانی تہذیب تمہیں ہمیشہ نم آنکھوں سے یاد کرے گی... شہنشاہوں اور عالمگیروں کو نہیں...

وقت نے ہاتھ ہلا کر جیسے دھند کو صاف کیا—

—اس وقت ہندوستان کے شہزادہ عالم دارا شکوہ کے پاس صرف ستر سپاہی ہیں، سپہر شکوہ ہے، چار خوجے ہیں اور اس کی بیوی کا جنازہ، وہ بھی پردیس میں۔ بدن پر باریک ململ کی وہی بنڈی اور پیروں میں دو چھدام کی وہی چپلیں— اسی وقت ملک جیون اپنے گڑھ سے نکل کر آتا ہے اور دارا کو اپنا عقیدت پیش کرتا ہے اور نادرہ کے لیے افسوس...

—ملک جیون دارا کی حالت اور دکھ دیکھ کر جیسے پگھل اٹھتا ہے۔ اعلیٰ حضورا میں تو آپ کے احسانوں تلے دبا ہوں۔ میری ایک معمولی سی غلطی کی وجہ سے جب ملتان کے صوبیدار نے مجھے پکڑ لیا تھا اور گرفتار کر کے مجھے دربار میں بھیج دیا تھا، تب آپ ہی نے مجھے شہنشاہ کے غصے سے بچایا تھا، نہیں تو مجھے ہاتھی کے پیروں تلے کچلوا دیا جاتا... آپ نے ہی تب میرے جان کی حفاظت کی تھی...

دارا کی نم آنکھوں نے تب ملک جیون کو اپنے پن سے دیکھا تھا۔

—آج آپ دربدر بھٹک رہے ہیں! اپنا دیس چھوڑ کر پردیس میں ہیں اور آپ پر اتنی بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے... ملک جیون نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا— اسے آپ پردیس نہ مانیں! ملک جیون کا یہ دیس اب آپ کا دیس ہے...

—میں نادرہ کی میت کو باعزت لاہور بھیج دینا چاہتا ہوں! نادرہ کی یہی آخری خواہش تھی کہ

اُسے پردیس میں نہیں، اپنے وطن میں دفن کیا جائے اور میں چاہتا ہوں کہ نادرہ کو لاہور میں میاں میر کی قبر کی مقدس قربت میں ہی سلایا جائے!

— تو اس میں وقت کیا ہے! سارا انتظام ہو جائے گا... آپ تو ہندوستان لوٹ نہیں سکتے، کیونکہ وہاں آپ کے لیے خطرہ ہے... اور یہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو گرفتار کرنے کے لیے اورنگ زیب کا وہ زرخرید غلام بہادر خاں فوج کے ساتھ سرحد کی طرف طوفان کی طرح بڑھا آ رہا ہے... اس لیے یہ مناسب نہیں کہ آپ خطرہ اٹھائیں! ملک جیون نے کہا۔

— میں نادرہ کی آخری خواہش پوری کر کے خود قندھار کی طرف نکل جانا چاہتا ہوں... تاکہ میں وہاں سے ایران پہنچ سکوں! دارا نے اپنی خواہش ظاہر کی۔

— سارا انتظام ویسا ہی ہوگا، جیسا آپ چاہتے ہیں۔ لیکن نادرہ آپا کا جنازہ یہاں بے قدری سے پڑا رہے، یہ مجھے گوارہ نہیں... میں چاہوں گا کہ جب تک نادرہ آپا کی میت کو لاہور بھیجنے کا انتظام نہیں ہوتا، تب تک آپ سب دادر گڑھ میں ہمارے ساتھ آرام کریں! ملک جیون بولا۔

— ٹھیک ہے ملک جیون! نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ نماز ادا کرنے کے بعد ہم نادرہ کی میت کے ساتھ تمہارے گڑھ میں پہنچنے کا کام سرانجام دیں گے! دارا نے کہا اور نادرہ کی میت کے پاس پہنچ کر اس نے نماز پڑھنے کی تیاری کی تو اس کے اکلوتے وفادار گل محمد نے ٹوکا—

— حضور! کیا آپ مشرق کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے جا رہے ہیں؟

دارا نے گل محمد کو دیکھا اور اُسے آگاہ کیا— گل محمد، ان بیکار کی باتوں میں مت پڑو... یہ نماز جنازہ ہے اور اس طرف سے میں نادرہ کا چہرہ بخوبی دیکھ سکتا ہوں... مشرق مغرب کی تفریق مت کرو اور یاد کرو کہ جب اللہ کے پاک رسول پیغمبر محمدؐ نے بیت المقدس یروشلم کے بدلے، کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنی شروع کی تھی تو یہ بات یہودیوں اور عیسائیوں کو بہت ناگوار گزری تھی کیونکہ وہ انہیں غیر ضروری باتوں پر مذہب کا دارومدار سمجھتے تھے اور انہیں معمولی مسئلوں کو سچ اور جھوٹ کی کسوٹی جانتے تھے۔ جب اُن لوگوں نے اعتراض کیا اور پاک رسولؐ سے پوچھا کہ آپ نے اپنی عبادت کی سمت کیوں بدل دی، تو پاک رسولؐ نے سورۂ بقر کی یاد دلائی اور کہا— مشرق اور مغرب دونوں اللہ کے ہیں، اس لیے جس طرف بھی تم مڑو، اُدھر ہی اللہ ہے!... اور آگے پیغمبر نے کہا کہ— مذہب اور نیکی اس میں نہیں کہ نماز کے وقت تم نے اپنے منہ مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف! مذہب یہ ہے کہ آدمی اللہ کو مانے! آخرت یعنی اپنے اعمال کے نتائج کو مانے، فرشتوں کو مانے، سبھی مذہبی کتابوں اور سارے نبیوں کو مانے! یہی پاک رسول کا پیغام ہے...

اور دارا نماز ادا کرنے میں مشغول ہو گیا۔

وقت نے اس کے آگے کا بیان جاری رکھا—

— حضور اعلیٰ! دارا نے جب تک نماز ادا کی تب تک پورے انتظام اور احترام کے ساتھ ملک جیون نادرہ کے جنازہ کو دادر گڑھ لے جانے کے لیے واپس آ گیا۔ دارا کو راحت ملی کہ اس کی شریک حیات کی میت کو پردیس میں لاوارث ہونے کا صدمہ نہیں اٹھانا پڑا اور نہ کسی طرح کی ذلت برداشت کرنی پڑی۔ دارا نے دل ہی دل میں ملک جیون کا شکریہ ادا کیا اور رنج و الم کے اس موقع پر پناہ دینے کے لیے دعائیں دیں...

دارا نے اداسی سے وقت کی طرف دیکھا اور خاموش بیٹھا رہا... اس نے صرف ایک گہری سانس لی۔

ادیب نے اس گہری سانس کی مایوسی کو پہچانا اور وقت سے گذارش کی کہ وہ اپنا بیان جاری رکھے۔ وقت نے اگلے واقعات کا سرا پکڑا—

— ادیب عالی! دارا اب تک بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ دو دن بعد دادر گڑھ سے جب نادرہ بیگم کے جنازے کو لاہور لے جانے کا کام انجام پایا تو دارا نے اپنے بچے ہوئے وفاداروں کو جمع کیا، جو گنتی میں بہت زیادہ نہیں تھے اور اعلان کیا— میں ہندوستان نہیں لوٹ سکتا۔ لیکن میں کسی کو اپنا وطن چھوڑنے کے لیے مجبور و بے بس بھی نہیں کر سکتا... جب میں اپنی روح نادرہ بیگم کو خود لاہور بھیج رہا ہوں تو آپ سب بھی وطن لوٹ جانے کے لیے آزاد ہیں۔ میت کے ساتھ رہیں گے۔ خواجہ مقبول جنہوں نے نادرہ کی پرورش اور خدمت کی ہے... اور خواجہ مقبول کے ساتھ میت کی حفاظت کے لیے گل محمد لاہور جائیں گے... اس لیے جو لوٹنا چاہتے ہیں وہ جنازے کے ساتھ چلے جائیں اور جو رکنا چاہتے ہوں وہ میرے ساتھ ایران کی طرف کوچ کرنے کے لیے رُک جائیں۔

— میں اس بیان کی تائید کرتا ہوں! دارا شکوہ نے کہا— اور سارے لوگ، سپہر شکوہ اور پانچ سات خوجوں اور نوکروں کو چھوڑ کر، واپس ہندوستان لوٹ گئے! نادرہ بیگم کا جنازہ لے کر گل محمد لاہور چلا گیا۔

— اور... اور... اگلے دن صبح تاریخ تھی— ۹ر جون ۱۶۵۹ء! جب ملک جیون کے دادر گڑھ سے دارا سپہر شکوہ اور اور آٹھ دس بھروسے مند نوکروں کے ساتھ بولن درّے کی طرف روانہ ہوا...

تبھی ایک زلزلہ سا آیا۔ اچانک بولن درّے کی پتھریلی گھاٹی گھڑگھڑانے لگی اور اس کی چٹانیں پتھروں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر آسمان کی طرف اڑنے لگیں اور جون کے تپتے مہینے میں برفیلے

طوفان کی ایسی آندھیاں چلیں کہ زمین دوز چٹانیں بھی کانپنے لگیں۔

— وقت! یہ کیسا نظارہ ہے جو میں دیکھ رہا ہوں! ادیب چیخا!

— حضور عالی! پتھریلی چٹانوں کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون اچانک سرد ہو گیا ہے... وقت نے جواب دیا۔

— کیوں؟ ادیب نے تلخی سے پوچھا۔

— حضور، جیسے ہی ہندوستان کا شہزادہ دارا شکوہ بولن درّے سے قندھار کی طرف چلا اور پتھریلی سڑک پر پہنچا تو ملک جیون اور اس کی ظالم فوج نے دارا کو گھیر لیا۔ دارا کے ساتھ یہ سب سے بڑی اور گھناؤنی غداری تھی۔ دو دن خاطر کرنے کے بعد ملک جیون نے ایران کی طرف فرار ہوتے دارا شکوہ کو صرف گھیر ہی نہیں لیا بلکہ اُسے گرفتار کرلیا اور اُس نے دارا کی گرفتاری کی خبر دو تیز گھوڑسواروں کے ذریعہ اورنگ زیب کے اُن دو سپہ سالاروں کو بھیج دی، جو اب تک دریائے سندھ پار کر چکے تھے۔ اورنگ زیب کے یہ سپہ سالار تھے — جے پور کے مہاراجہ مرزا راجہ جے سنگھ اور بہادر خاں...

ہاہاکار کرتی سترہویں صدی پچھاڑیں کھانے لگی... بولن درّے کی سرد چٹانوں نے شرمسار ہو کر اپنی نگاہیں نیچی جھکا لیں۔ آسمان زرد پڑ گیا اور ہزاروں پرندوں نے بولن درّے سے دلّی تک کے فاصلے کو اپنی لاشوں سے پاٹ دیا...

— اور... اور... وقت کا بیان جاری تھا — ۲۳؍ جون ۱۶۵۹ء کو ملک جیون نے قیدی دارا شکوہ اور سپہر شکوہ کو اورنگ زیب کے سپہ سالار بہادر خاں کے سپرد کر دیا۔ اس غداری کے لیے اورنگ زیب نے ملک جیون کو جاگیریں دیں، خلعت اور عہدہ دیا...

— جی ہاں حضور عالی! دارا شکوہ بولا — اُس نامراد اور احسان فراموش ملک جیون نے صرف جاگیریں، آرام اور آرائش ہی حاصل نہیں کی بلکہ مجھے دھوکہ دینے کے ساتھ ساتھ اس ہندو پٹھان نے اپنے ضمیر کو بھی دھوکہ دیا۔ اپنا مذہب تبدیل کر کے وہ ہندو ملک جیون سے سلطان بختیار خاں ہو گیا۔

— یہاں سے آگے یاد رکھیے کہ وہ ملک جیون ہی اب بختیار خاں ہے!... وقت نے کہا۔

— ملک جیون عرف بختیار خاں کو حاضر کیا جائے! ادیب نے اپنے اردلی کو حکم دیا۔

اردلی نے آواز لگائی — ملک جیون عرف بختیار خاں حاضر ہو۔

وہ حاضر ہوا تو دارا نے اُسے حقارت کی نظر سے دیکھا اور نفرت سے اپنا منہ موڑ لیا۔

— تمہاری دھوکے بازی کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ کو ایک نہایت تباہ کن موڑ لینا پڑا۔ تمہیں اپنی اس دھوکے بازی کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ ادیب نے ملک جیون کو اپنا بیان دینے کا موقع دیا۔

— حضور عالی! جسے آپ آج دھوکے بازی کہتے ہیں، ہمارے دور میں یہ دھوکے بازی نہیں بلکہ اپنی خواہشات کو پروان چڑھانے کا ایک دستور تھا... تب آدمی مذہب کے لیے نہیں، اپنی سلطنت اور جاگیر کے لیے جیتا تھا اور جدوجہد کرتا تھا۔ تبدیلیٔ مذہب تو تب ایک سہولت کی بات تھی... جیسے ہم جنگ میں اپنے زخمی گھوڑے بدلتے ہیں۔ ویسے ہی ہم مذہب تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگاتے تھے... ہمیں تو دولت اور سلطنت کی جنگ جیتنی ہوتی تھی۔

دارا نے اُسے ایک بار پھر حقارت سے دیکھا، لیکن کوئی مداخلت نہیں کی۔

— جب مجھے پتہ چل گیا کہ مغلیہ سلطنت کی جنگ میں دارا شکست کھا کر قندھار کی طرف فرار ہو رہا ہے تبھی میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس سے زیادہ مناسب موقع میرے ہاتھ پھر نہیں آنے والا ہے، اسی لیے میں اس تاک میں تھا کہ دارا کب میرے علاقے میں قدم رکھتا ہے... یہ 'وقت' جو آج آپ کے سامنے بڑی دلیری سے بیان دے رہا ہے، اس سے بڑی اور خوشگوار موقع پرستی کی مثال آپ کو دوسری نہیں ملے گی... اُس دور میں یہی وقت میرا دوست تھا اور اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ نادرہ بیگم کی موت نے مجھے نایاب موقع دیا اور میں نے دارا شکوہ اور سپہر شکوہ کو اپنی معصومیت کی گرفت میں لے لیا۔

ادیب جیسے اچانک بے چین ہوا... اور چیخا —

— کون سی جگہ ہے یہ... جہاں سے دل سوز خاموش رونے کی آوازیں آ رہی ہیں... اور یہ آنسوؤں کی ندی کیسی ہے جو میری طرف بڑھتی آ رہی ہے... اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اس علاقے کے سارے درختوں کی چھال سوکھ کر جھڑ رہی ہیں! کون سی ہے یہ جگہ؟ اور یہاں یہ انہونی کیسے ہو رہی ہے؟

تو کلرک نے احترام سے دخل اندازی کی — ادیب عالی! خاموش رونے کی آوازیں تبھی دل پر دستک دیتی ہیں جب انسانی اصولوں کا قتل ہوتا ہے اور آنسوؤں کی ندی تبھی اُمڈتی ہے جب کوئی تمدن سوکھنے والی ہوتی ہے۔ تب انسان کی لاچاری کے آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے نہیں دکھائی دیتے بلکہ وہ زمین میں جذب ہو کر اس سمت میں بہہ نکلتے ہیں جہاں کوئی نئی تہذیب جنم لے رہی ہوتی ہے۔ حضور عالی! آدمی کے آنسو ہی نئے تمدن کو پیدا کر کے اُسے سینچتے ہیں... جس تمدن کے

آنسو سوکھ جاتے ہیں، وہ اجڑ جاتا ہے...

— لیکن مجھے میری بات کا جواب نہیں ملا! یہ جگہ کون سی ہے جہاں سے آنسوؤں کی ندی اچانک بہہ نکلی ہے اور سارے درختوں کی پتیاں سوکھ کر جھڑ رہی ہیں؟ ادیب نے پوچھا۔

— حضور! وقت نے بتایا — یہ جگہ دلّی ہے اور یہاں ایک اجڑتی تہذیب کا یہ منظر اس لیے موجود ہوا ہے کہ احسان فراموش، غدار پٹھان ملک جیون دارا شکوہ اور سپہر شکوہ کو قیدی بنا کر مرزا راجہ جے سنگھ اور بہادر خاں کے ساتھ دلی پہنچ چکا ہے! اسی لیے دلّی سسک رہی ہے... اور اس وقت دلّی کا نظارہ یہ ہے...

— دارا اور اُس کے بیٹے سپہر شکوہ کو نظر بیگ کی سخت نگرانی میں رکھ دیا گیا ہے۔ تاریخ کے حساب سے یہ دن ۲۳/اگست ۱۶۵۹ء کی ہے۔ نظر بیگ اپنے آقا اورنگ زیب کا بہت ہی وفادار غلام ہے۔ نظر بیگ نے دارا اور سپہر شکوہ کو دلی — شاہجہاں آباد والی سڑک کے محلّے خواص پور کی ایک حویلی میں قیدی بنا کر رکھا ہے... یہ حویلی تین میل دکن میں ہے...

— دو دن بعد نظر بیگ اورنگ زیب کے سامنے حاضر ہوا اور اُس نے قیدیوں کی حالت کی تفصیل پیش کی... یہ دن ہے ۲۵/اگست ۱۶۵۹ء۔

— اس کے چار دن بعد اورنگ زیب حکم دیتا ہے کہ کافر دارا اور اُس کے بیٹے کو سرِ عام ذلیل کیا جائے... یہ ۲۹/اگست ۱۶۵۹ء کی بات ہے۔

— اسی دن کی بات ہے۔ عظیم شاہی فوج کی پہرے داری میں دارا کا یہ 'تذلیلی جلوس' شاہجہاں آباد کی شاہراہوں سے نکالا جاتا ہے اور دلی کے عوام کے سامنے یہ ثبوت پیش کیا جاتا ہے کہ اصل دارا شکوہ یہی ہے۔ قیدیوں کو خاص طور سے موٹے اور گندے کپڑے پہنائے گئے ہیں...
انہیں شاہی پگڑیوں کی جگہ معمولی پگڑیاں دی گئی ہیں اور اوپر لپیٹنے کے لیے چھٹی ہوئی سوتی کشمیری شالیں دی گئی ہیں۔ وہ شالیں محل کے نوکر چاکروں اور غلاموں کو پہننے کے لیے دی جاتی ہیں۔ دو بوڑھی ہتھنیوں کو بدبودار گندگی اور میلے سے سجایا گیا ہے۔ ایک پر سپہر شکوہ ہے اور اس کے ہودے کے پیچھے نظر بیگ ننگی تلوار لیے موجود ہے...

— دارا کی ہتھنی کے ساتھ ساتھ ملک جیون عرف بختیار خاں خود گھوڑے پر تعینات ہے اور گھوڑ سوار فوجیوں کا ایک دستہ اُس کے ساتھ چل رہا ہے۔ سب سے آگے ہاتھی پر سوار ہے۔ بہادر خاں، جو دارا شکوہ کے ذلت آمیز جلوس کی رہنمائی کر رہا ہے اور اب ذلت کا یہ جلوس لاہوری دروازے سے ہوتا ہوا اُن جگہوں سے گزر رہا ہے جو دارا شکوہ سے وابستہ رہی ہیں۔ ذلت کے اس طوفان کو

برداشت کرتا دارا سر جھکائے ہاتھی کے ہودے میں بیٹھا ہے اور جلوس آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

سڑکوں پر دونوں طرف غمگین بھیڑ ہے۔ وہ اپنے چہیتے شہزادے کو اس حال میں دیکھ کر بے حد دکھی، مایوس اور بے بس ہیں۔ اُن کی آنکھوں کے آنسو زمیں دوز ہو گئے ہیں...

تبھی لاہوری دروازے کے پاس بھیڑ میں کھڑا ایک بھکاری چیخ اٹھتا ہے — شہزادے دارا شکوہ... آپ نے ہمیں ہمیشہ بھیک دی ہے؟ لیکن ہم بدنصیبوں کے پاس آج آپ کی مہربانیوں کے بدلے میں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔

دارا نے اُس بھکاری کو آنکھ اٹھا کر دیکھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ہیں۔ دارا نے سرگوشی کی — میرے پاس اور تو کچھ نہیں لیکن کچھ آنسو ابھی بھی باقی بچے ہیں... اور یہ اُن ہندوستانیوں کے لیے جو میرے ہی طرح بدنصیب ہیں... تو! میرے ان آنسوؤں کو سنبھالو... اگر تم نے ان آنسوؤں کو سوکھنے نہ دیا تو کسی اور دارا شکوہ کو تم پھر جنم دے سکو گے...

— دارا کی خاموش آنسو بھری آنکھیں جب یہ پیغام دے رہی تھیں، اُس وقت کا چشم دید گواہ میں ہوں! ایک فرنگی سے لگتے آدمی نے مداخلت کی۔

— تم کون ہو؟ اردلی نے دریافت کیا۔

— میں برنیے ہوں۔ میں ایک مسافر بھی ہوں اور دارا شکوہ کا دوست اور اس کا حکیم بھی۔ دارا کے اُن مشکل کے دنوں میں میں اُس کے ساتھ رہا ہوں۔ جب دارا کو ذلیل کرنے کے لیے اس کا جلوس نکالا گیا، تو چاندنی چوک سے سعد اللہ خاں بازار تک غمزدہ لوگوں کی بے پناہ بھیڑ تھی اور وہ سب رو رہے تھے... رونے کی آوازوں کی ایک چادر تن گئی تھی... روتی ہوئی آوازوں کی چادر میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی... آخر قلعہ کی دیواروں سے ہوتا ہوا وہ تذلیلی جلوس خضر آباد واپس پہنچا اور خواص پور کی اُسی حویلی میں دارا اور سپہر شکوہ کو پھر قید کر دیا گیا۔

جلوس جب گزر رہا تھا تب دلی کے عوام کا غصہ آنکھوں کے کڑاہوں میں ابل رہا تھا اور ان کی غمزدہ سانسوں کی جھلسانے والی آندھیوں نے راجدھانی کے پورے علاقے کو اپنی زد میں لے لیا تھا... جب عوام کی دارا سے محبت کی اس آندھی نے اورنگ زیب کو گھیرا اور خاموش تردید کے اس طوفان کی خبر اُسے ملی تو وہ اندر ہی اندر کانپ اٹھا تھا۔ یہ بیان کتھک کا تھا — اورنگ زیب کو لگا تھا کہ عوام بغاوت کر سکتی ہے اور دارا شکوہ کی زندگی اور آزادی کے لیے جان بھی دے سکتی ہے تو وہ فکرمند ہو گیا تھا... فکرمندی نہیں وہ منحرف ہونے کی کیفیت تک پہنچ گیا تھا۔ اُس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا اور اُس کی انگلیاں و پسلیاں کانپ رہی تھیں... وہ خوف زدہ تھا... وہ پوری رات سو نہیں سکا تھا۔ وہ

شک کی اسی کیفیت میں اپنے آرام گاہ کی دیواروں اور سامنے پچھلی کالی رات کی گھنی سیاہی کو دیکھ رہا تھا! اس سیاہ رات کے اندھیرے میں اُسے اپنا مستقبل دکھائی ہی نہیں پڑ رہا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے کہ اُس کا حال جگہ جگہ سے چیخ کر ٹوٹ گیا ہو اور وہ اپنے اعمال کے ملبے میں دب گیا ہو!

— یا اللہ چیختے ہوئے اورنگ زیب اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا کمرے کی دیوار سے ٹکرایا تو روشن آرا نے آ کر اسے سنبھالا۔

— اے میرے خوش بخت بھائی! یہ وقت کشمکش اور وہم کا نہیں، یہ وقت فیصلہ کن چوٹ کا ہے! تمھیں تاریخ نے یہ موقع دیا ہے جو دنیا میں اس وقت کسی کو حاصل نہیں ہے! اس لیے اپنی روح کے رستے اس پسینے کو پونچھو اور دارا شکوہ پر فیصلہ کن وار کرو!

— آپا! اورنگ زیب نے کراہتے ہوئے کہا— آپا! میں کیا کروں... بھائی جان دارا شکوہ کو کوئی بھی سزا دینے میری روح کانپتی ہے... ہندوستان کے سارے عوام اُسے چاہتے ہیں... آج کے موجودہ ماحول کی جو اندرونی خبریں مجھے ملی ہیں وہ ہولناک ہیں اور ہندوستان— خاص طور سے دلی کی عوام کبھی بھی میرے خلاف بغاوت کر سکتی ہے...

— تو اس بغاوت کو دبانے کا ایک ہی طریقہ ہے! روشن آرا نے کہا۔

— کیا؟

— یہی کہ ہندوستانی عوام کی مذہب پرستی اور مذہب کے لیے اُس کی بنیادی کمزوری کا تم اس نازک وقت میں فائدہ اٹھاؤ... روشن آرا نے اُسے مشورہ دیا۔

— کیسے... کیسے؟ اورنگ زیب نے اپنی مدھم اور لگ بھگ خاموش آواز میں پوچھا۔

— وہ ایسے کہ دارا شکوہ کے خلاف کافر اور غیر موحد ہونے کا الزام لگا کر علماء سے اُس کی سزائے موت کا فتویٰ جاری کروا! روشن آرا نے مشورہ دیا۔

— لیکن ایسا فتویٰ جاری کرانا کیسے ممکن ہوگا؟ اورنگ زیب نے جاننا چاہا۔

— میں ان ملا، مولویوں اور علماء کی رگ رگ پہچانتی ہوں۔ یہ عرب اور ایران نہیں ہے— یہ ہندوستان ہے اور یہاں شاہی حکومت کے سامنے انھوں نے ہمیشہ دم ہلایا ہے! روشن آرا نے کہا— تم ابھی ان کی میٹنگ بلاؤ اور اپنا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے دارا کی زندگی کے بارے میں بہت شائستگی سے فیصلے کا حق انھیں سونپ دو اور تم دیکھنا اُن کا فیصلہ وہی ہوگا— جو تمھارا اور میرا فیصلہ ہے!

خوف زدہ اورنگ زیب نے میٹنگ بلائی۔ سبھی لوگ شام کو قلعے کے دیوان خاص میں جمع ہوئے۔ روشن آرا نے دھیرے سے اورنگ زیب کے کان میں کہا— تم خاموش رہنا اور حکمت عملی

سے کام لیتے ہوئے صرف اس بات کی کوشش کرنا کہ دارا کو سزائے موت دیے جانے کا میرا اور تمھارا فیصلہ اُن سب کا فیصلہ بن جائے، تاکہ تاریخ ہمیں قصوروار نہ ٹھہرائے اور آنے والی صدیوں میں یہی کہا جائے کہ یہ فیصلہ عام رائے سے ہوا تھا— اور یہ کہ اورنگ زیب اپنے ملاؤں اور خاص الخاص درباریوں کا یہ فیصلہ ماننے اور منظور کرنے کے لیے مجبور تھا کیونکہ عام اور اعلیٰ ذہنوں کی آرا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اُس شام دیوان خاص میں چل رہی اس سیاسی میٹنگ میں موصلہ یا انصاف کا ماحول نہیں بلکہ ماتم کا سا ماحول تھا۔ اہم اور خاص درباری جیسے راج کاج کا کوئی سنگین مسئلہ سلجھانے یا اُس پر فیصلہ لینے کے لیے موجود نہیں تھے بلکہ فاتحہ پڑھنے آئے تھے۔ یہ سیاسی میٹنگ زیادہ دیر تک نہیں چلی کیونکہ فیصلہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا، علماء کو تو اُس پر صرف مہر لگانی تھی۔ درباری دانش مند دارا کا سخت مخالف تھا، لیکن اس کے باوجود اُس نے میٹنگ کے طے شدہ فیصلے کو جانتے ہوئے بھی دارا شکوہ کو سزائے موت دیے جانے کی مخالفت کی۔ اُس نے کہا— شہزادے دارا کو سزائے موت دیے جانے کی کوئی وجہ یا جواز نہیں ہے... بہتر یہی ہوگا کہ شہزادے دارا شکوہ اور اُس کے بیٹے سپہر شکوہ کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا جائے اور انھیں عمر قید دے کر سخت پہرہ لگا دیا جائے!

میٹنگ میں اس بات سے کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں اور دانش مند جیسے خاص درباری کی رائے سے جب روشن آرا کو بازی پلٹ جانے کا اندیشہ ہوا تو اس نے پھر اورنگ زیب کے کان میں کہا— اگر یہی فیصلہ ہوتا ہے تو دارا کو عمر قید میں ڈال کر اہر کی دال کے ساتھ افیم کا پانی دے کر اُسے دھیرے دھیرے مرنے کے لیے مجبور کر دیا جائے!

— نہیں، میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں! اورنگ زیب نے دھیرے سے روشن آرا سے کہا— اور اسی وقت اُس کے ذہن میں آیا کہ دارا سے نپٹنے کے بعد اُسے عیاش مراد بخش سے بھی نپٹنا ہے... اس عیاش کے خاتمے کے لیے روشن آرا والا نسخہ خاصا کارآمد ہوگا۔ اس نسخے کو مراد پر لاگو کرنے کے لیے اُس نے دل ہی دل میں گرہ باندھ لی۔

تب تک دارا کا شدید مخالف درباری خلیل اللہ خاں، شائستہ خاں اور حکیم تبرک خاں نے دانش مند کی رائے کی بازی پلٹ دی تھی۔ یہ کرشمہ ہونا ہی تھا۔ علماء، مولوی، ملا تو شروع سے ہی 'غیر مذہبی' دارا کے خلاف تھے۔ شریعت اور مذہب کے دانشوروں، مذہبی عالموں کو دارا سے طرح طرح کے خطرے تھے... اُن کا خون پہلے سے ہی اُبل رہا تھا اور انھوں نے درباری دانش مند کی مداخلت کو مسترد کر کے دارا شکوہ کے خلاف موت کا فتویٰ جاری کر دیا۔

کلنجک بولا — روشن آرا اور اورنگ زیب نے راحت کی سانس لی... کہ دارا شکوہ کو اسلام مخالف قرار دے کر علماء نے موت کی سزا تجویز کر دی ہے... مغلیہ سلطنت کا تاج حاصل کرنے اور شہنشاہ بننے کی اُس کی چھپی ہوئی ہوس کو اس فتویٰ نے ظاہر ہونے کے خطرے سے بچا لیا تھا... کیونکہ اگر اورنگ زیب کے چھپے ہوئے ارادے کھلے عام سامنے آجاتے تو پورا ہندوستان خانہ جنگی کا خونی میدان بن جاتا اور قریب ہوا بھی وہی، لیکن چھوٹے پیمانے پر۔ اُس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ مذہبی فتوے کے سامنے بے بس ہے۔

کہتے ہوئے کلنجک نے حضرت شبلی نعمانی کی طرف نظر ڈالی۔ وہ ست اور پشیمان سے بیٹھے تھے۔ ادیب کو اُن کی اس پشیمانی سے تکلیف ہوئی اور اُسے خود بھی برا لگا۔ آخر شبلی نعمانی اُس کے بزرگ ہی نہیں، اس کی برادری کے اعلیٰ ترین دانشور بھی تھے۔ اُن کی خاموشی سے بے چین ہو کر ادیب نے کہا — اے اعلیٰ حضور! آپ کی پشیمانی ہمیں منحرف کرتی ہے، لیکن کیا کریں، ہر صدی کو اپنا سچ تلاش کرنے کی آزادی ہے... اور حضور اعلیٰ! آپ بھی جانتے ہیں — سچ تو انسان کی عظیم خواہشات کا ایک سپنا ہے، اس لیے ہر صدی میں سچ انسانی فلاح کے لیے تہذیب کی بھٹی میں تپا کر پھر پاک صاف کر لیا جاتا ہے... سچ کبھی ناپاک رہ ہی نہیں سکتا...

شبلی نعمانی نے ادیب کو گہری نظروں سے دیکھا — جیسے وہ اس کی بات سے بہت حد تک متفق سے ہو رہے ہوں، لیکن کچھ سوچ کر انہوں نے وضاحت کی — ادیب عالی! میں نے جو کچھ بھی عالمگیر کے بارے میں لکھا ہے وہ اس فرد کا سچ ہے اور اُس سچ نے سترہویں صدی کی تقدیر کا فیصلہ کیا ہے!

کہ تبھی اپنے پاجامے کا ناڑہ سمیٹے اور دوسرے ہاتھ میں چھڑی اور سگریٹ تھامے رگھوپتی سہائے فراق اپنی بڑی بڑی پانی دار آنکھوں سے عدالت کی مجلس کو دیکھتے ہوئے حاضر ہوئے اور سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر دھواں اگلتے ہوئے بولے — حضرات کوئی بھی انسان کتنا ہی بڑا ہو، اس کا سچ کسی قوم کی تقدیر کا فیصلہ نہیں کر سکتا... یہ حق شہنشاہوں اور تانا شاہوں کو بھی نہیں کیونکہ — 'تقدیر تو قوموں کی ہوا کرتی ہے، اک انسان کی تقدیر کوئی تقدیر نہیں!' اور شبلی نعمانی صاحب! آپ کا عالمگیر صرف ایک شخص تھا... شہزادہ تھا... وہ اپنے دور کا رہنما نہیں تھا!

کہتے سگریٹ کا ایک اور کش لیتے اپنی رو میں فراق جیسے آئے تھے، ویسے ہی لوٹ گئے۔ تہذیب نے انہیں روکا بھی لیکن فراق صاحب نہیں رکے! مجلس دیکھتی رہ گئی۔

آخر اردو ی نے کلنجک کو بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

کلنجک نے آگے کا احوال بیان کرنا شروع کیا — ادیب عالی! دارا شکوہ کو موت دی جائے، یہ فتویٰ جاری کرنے کے بعد سازشوں کا دربار برخاست ہوا اور دوسرے ہی دن صبح دیوان عام میں ایک خاص جلسہ ہوا۔ یہ ۱۶۵۹ء کے اگست کی ۳۰ ر تاریخ تھی۔ یہ جلسہ ملک جیون کی گل پوشی کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ دارا شکوہ کے ساتھ کی گئی غداری اور اورنگ زیب سے کی گئی وفاداری کے انعام کے طور پر ملک جیون کو بختیار خاں کا نام دیا گیا اور اُسے مغل جاگیرداروں میں ملک ہزاری بنایا گیا۔ دارا کے ساتھ کی گئی غداری کا انعام لے کر اب ملک ہزاری بختیار خاں سینہ تانے اپنے افغان فوجیوں کے ساتھ چاندنی چوک سے گزرا تو دلی کے عوام اپنا ابلتا غصہ نہیں روک سکے اور اُس نے ملک ہزاری بختیار خاں اور اس کے فوجی دستے پر حملہ کر دیا اور بلوہ شروع ہو گیا۔ بھیانک مار کاٹ ہوئی۔ عورتوں نے اُس پر گالیوں، کوڑے کچڑے اور گندی کے کوزوں کی بوچھار کی۔ مردہ جانوروں کی آنتیں اُس پر پھینکی گئیں اور چولہوں کی جلتی لکڑیوں اور انگاروں سے اُس پر وار کیا گیا۔ اُس بغاوت میں ملک ہزاری بختیار خاں کے کئی سو افغان فوجی مارے گئے۔ اس بھیڑ کی بغاوت کو اگر دلی کا کوتوال وقت رہتے نہ دباتا تو ملک ہزار بختیار خاں زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ شام ہوتے ہوتے دلی میں موت کا سناٹا چھا گیا۔ عام آدمی کی اس بغاوت نے دارا شکوہ کے آخری وقت کو اور پاس لا دیا۔

— میں اس کی تائید کرتا ہوں! برنیے نے سر ہلا کر کہا۔ میں اُس وقت ہوئی بھیانک مار کاٹ کا چشم دید گواہ ہوں اور 'عالمگیر نامہ' تاریخ کی اُس کتاب کو بھی میں اُدھیڑنا چاہوں گا جو کہتی ہے کہ دارا شکوہ کو صرف مذہبی فتویٰ کے تحت قتل کیا گیا! مذہبی فتویٰ تو ایک بہانہ تھا کیونکہ اورنگ زیب دارا شکوہ کو قتل کرنے کی بات پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ اگر دارا کا قتل پہلے سے طے نہیں تھا تو، پھر ملک جیون کو بختیار خاں کا عہدہ دینے اور ملک ہزاری بنانے کی کیا وجہ اور ضرورت تھی؟ دارا شکوہ کے ساتھ غداری کرنے کا ہی یہ انعام اُسے دیا گیا تھا۔ اُس رات دلی ویران تھی اور چاروں طرف موت منڈرا رہی تھی۔

— اور اُس خوفناک رات کے اندھیرے میں اورنگ زیب نے اپنے سب سے بھروسے مند جلاد نظر قلی بیگ کو بلایا۔ اُس کمبخت نے آکر کورنش کی تو اورنگ زیب نے حکم دیا — خواص پورہ کی حویلی میں جاؤ۔ سپہر شکوہ کو اُس کے باپ سے الگ کرو اور اُس کافر دارا شکوہ کا سر دھڑ سے الگ کر کے میرے سامنے پیش کرو۔ اس کام کو انجام دینے میں شفیع خاں تمہارے ساتھ رہے گا!

— وہ بھیانک رات تھی... ۳۰ ر اگست ۱۶۵۹ء! خواص پورہ کی وہ حویلی — اُس میں دارا شکوہ کا اندھیرا کمرہ۔ ساتھ میں سپہر شکوہ! کمبخت نظر بیگ اور شفیع خاں نے جس وقت دارا کے کمرے میں

قدم رکھا، اُس وقت شہزادہ دارا شکوہ ماش کی دال پکا رہا تھا۔ اُن دونوں کو دیکھتے ہی دارا کو کسی برے کا شبہ ہوا۔ جلاد نظر بیگ کی طرف دیکھ کر دارا نے سوال کیا — تم اس وقت؟ کیوں اور کس لیے؟

— حکم ہے کہ سپہر شکوہ کو آپ سے الگ کر دیا جائے! نظر بیگ نے کہا۔

سپہر شکوہ یہ سن کر چوکنا ہوا۔

— کیا تمھیں ہمارے قتل کے لیے بھیجا گیا ہے؟ دارا نے تختی سے پوچھا۔

— اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے! کبڑے نظر بیگ نے ہی جواب دیا اور سپہر شکوہ سے بول اٹھا۔ اٹھو!

سپہر شکوہ خوفزدہ ہوا اور وہ دارا کے گھٹنے سے اپنا گھٹنا سٹا کر بیٹھ گیا! تبھی شفیع خاں اور نظر بیگ نے اُسے الگ کرنے کے لیے پکڑ کر کھینچا۔ دارا یہ برداشت نہیں کر سکا، وہ چیخا — شاہی خون کے توہین کی قیمت تمھیں چکانی ہوگی!

لیکن دارا کی ناراضگی اور سپہر شکوہ کے چیخنے چلانے پر اُن دونوں جلادوں نے کوئی دھیان نہیں دیا، انھیں تو اپنے شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم کو تعمیل کرنا تھا... موت کے کمرے میں دارا کے پاس اپنی حفاظت کے لیے کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ اس نے قلم تراشنے والا صرف ایک چھوٹا سا چاقو تکیے میں چھپا رکھا تھا، اُسے نکال کر دارا نے خود کو بچانے اور سپہر شکوہ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے ان دونوں پر وار کیا... اسی درمیان جلاد نظر بیگ نے خنجر نکال کر سپہر شکوہ کی بانہہ چیر دی — سپہر درد سے چیخ پڑا...

دارا نے پھر بھی اپنی طاقت بھر ان دونوں جلادوں کا مقابلہ کیا اور کسی طرح سپہر شکوہ کو ان کی گرفت سے چھڑا لیا اور چیخا — جاؤ اور میرے اُس ظالم بھائی سے کہو... اس معصوم نے اُس کا کچھ نہیں بگاڑا ہے... اسے مجھ سے جدا نہ کرے!

— ہم کسی کے خبر رساں نہیں ہیں! ہمیں تو صرف عالمگیر کے حکم کی تعمیل کرنی ہے! کبڑا قصائی نظر بیگ بولا۔

— اور ہم وہی کر رہے ہیں! کہتے ہوئے شفیع خاں نے زخمی سپہر کو پھر اپنی گرفت میں لے لیا۔ دارا کو اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ آخری طور پر جان گیا تھا کہ اس کی موت کا حکم جاری ہو چکا ہے... اب شفیع خاں اور نظر بیگ سپہر کو گھسیٹتے اُس کالی کوٹھری سے باہر لے جا رہے تھے تو دارا نے اُسی چھوٹے چاقو سے شفیع خاں پر وار کیا تھا۔ وہ چاقو شفیع خاں کی ایک بغل میں جکڑ کر رہ گیا تھا۔

اُن دونوں جلادوں نے سپہر شکوہ کو کمرے کے باہر انتظار کرتے فوجیوں کے حوالے کر کے دارا

کے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ سپہر کی بانہہ سے بہتے ہوئے خون کی اندر آتی کالی لکیر دیکھ کر دارا کانپ گیا تھا، لیکن اب کوئی چارہ نہیں تھا... دیوار کے اُس پار والے کمرے سے اب سپہر شکوہ کی دراوؤنی چیخیں آرہی تھیں... کہ جیسے اُس کی بوٹی بوٹی کاٹی جا رہی ہو...

— میرے بیٹے پر یہ ظلم مت کرو!... جا کر اس ظالم عالمگیر کو بتاؤ کہ وہ غازی نہیں ڈھونگی ہے... وہ عبادت گزار ہونے کے ساتھ ساتھ گنہگار بھی ہے... میں نے عبادت نہ کی ہو، لیکن میں نے خود کو ہمیشہ گناہ سے بچایا ہے... اس سے کہو، یاد کرے — پاک جابر نے کیا کہا ہے — عبادت کرنے والا اُس کے برابر نہیں ہو سکتا، جو گناہ سے خود کو بچاتا ہے... اُسے جا کر بتاؤ... کہ اُس کے ملاؤں کا فتویٰ صرف گناہ ہے... کفر ہے...

تبھی سپہر کی چیخوں نے اُسے شکست دے دی، وہ بولا... سپہر کو بخش دو اور تمھیں جو بھی حکم عمل میں لانا ہو، اس کی تعمیل مجھ پر کرو!

تبھی عدالت کے اوپر اندھیرا چھانے لگا۔ ادیب نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا — وہ عجیب ماحول تھا...

آسمان کے آدھے ستارے بجھتے چلے جا رہے تھے اور آدھے پھوٹ پھوٹ کر چمکیلے کرچوں کی طرح زمین کی طرف آ رہے تھے۔ چاند کے اوپر منجمد بادل دھجیوں کی طرح پھٹ گئے تھے اور چاند ایک بھیانک آواز کے ساتھ شیشے کی طرح جگہ جگہ سے چٹخ گیا تھا...

ادیب یہ نظارہ دیکھ کر گھبرا اٹھا۔ اس نے اردلی سے پوچھا — یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟

— حضور! وقت پیچھے لوٹ گیا ہے... یہ ۳۰ راگست ۱۶۵۹ء کی رات کا آخری پہر ہے... ۳۱ راگست ۱۶۵۹ء کی صبح ہونے والی ہے، لیکن ہو نہیں پا رہی ہے، کیونکہ سورج کالا لبادہ اوڑھ کر ماتم منا رہا ہے!

— سورج ماتم منا رہا ہے؟ ادیب نے حیرت سے پوچھا۔

— جی حضور! خواص پورہ کی اس حویلی میں مسور کی دال کی ابلتی پتیلی اب صرف گرم سانسیں لے رہی ہے... کیونکہ دارا شکوہ کا قتل کیا جا رہا ہے!

— قتل کیا جا رہا ہے؟ لیکن یہ کلمے کی کیسی آواز آ رہی ہے؟

— یہ دارا شکوہ کی آواز ہے حضور! اب وہ کلمۂ شہادت پڑھ چکا ہے اور اب... اب اُس کی گردن جسم سے الگ ہو چکی ہے۔

اندھیرا اور سناٹا چھا گیا تھا۔ سورج کالا ماتمی لباس پہنے دھرتی کے کنارے سے جھانک رہا تھا۔

— ادیب عالی! جب سورج نے کالا لباس پہن کر جھانکا، اسی وقت دارا کا کٹا ہوا سر اورنگ زیب کے پاس لایا گیا! کلچگ نے آگے بتایا — اورنگ زیب کا ایک اتنی تاب نہیں لا پایا کہ وہ اس کٹے ہوئے سر کو دیکھے، لیکن دیکھنا تو تھا ہی... تاکہ یہ یقین کر کے مطمئن ہو سکے کہ وہ سر دارا کا ہی ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا تو وہ اپنی عادت کے خلاف زور سے چیخا — اے بدبخت! مجھے تم کافر کا منہ دیکھنا گوارہ نہیں ہے... کہتے ہوئے اورنگ زیب نے منہ پھیر لیا اور حکم دیا — اس کا خون صاف کر دیا جائے اور اسے ایک بڑی رکابی میں رکھ دیا جائے!

تبھی روشن آرا بیگم اورنگ زیب کے کمرے میں آئی اور اس نے اگلا حکم دیا — دارا شکوہ کے سر کو خوشبودار کر کے ایک صندوق میں بند کرو اور اس سر کو عالمگیر کی طرف سے ابا حضور کے پاس تحفے کے طور پر بھجوا دو...

حکم کی تعمیل کرنے کے لیے دارا کا خون میں لپٹا سر لے کر نظر بیگ اور شفیع خاں چلے گئے۔

دارا شکوہ کے قتل کی خبر جنگل کے آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔

اور تب ایک عجیب نظارہ پیش آیا۔ ادیب نے سامنے دیکھا — چاندی سے چمکتے چار پنکھ زمین پر پڑے تھے۔ چونک کر ادیب نے اردلی سے پوچھا — یہ پنکھ کس کے ہیں؟

— حضور، یہ پنکھ اُن فرشتوں کے ہیں جو دارا شکوہ کی روح کو باعزت ساتھ لے جانے آئے تھے... وہ فرشتے دارا کے قتل کا صدمہ سہہ نہیں پائے اور اُن کے یہ خوبصورت پنکھ خود ہی جھڑ پڑے ہیں... ادیب نے بھی ایک عجیب سا صدمہ محسوس کیا اور اُس نے دارا کی طرف دیکھا۔ دارا کی نظریں اس سے ملیں اور اس نے دھیرے دھیرے کچھ کہا —

— مجھے تو وہیں تک کا حادثہ یاد ہے جہاں تک میں نے کلمہ پڑھا تھا، اس کے بعد مجھ پر ایک عجیب سی روحانی بے ہوشی طاری ہو گئی تھی... دارا نے کہا... لیکن میرا سر قلم کیے جانے کے بعد کیا کیا ہوا... یہ جاننا میرے لیے ایک ہولناک تجربہ ہے...

— سب سے زیادہ ہولناک منظر تو یہ ہے کہ جس دن دارا شکوہ کا سر قلم ہوا، اسی دن ہندوستان کی بنتی ایک برداشت کرتی اور نئی تہذیب کا سر بھی قلم ہو گیا... تہذیب بہت دکھی آواز میں بولی —
کیونکہ ہندوستان کی بنتی نئی تہذیب کے لیے دارا شکوہ نے جو کچھ کہا اور سوچا تھا، وہ دارا نے نہیں، وہی تو صدیوں پہلے نبی نے کہا تھا! اتنا کہہ کر تہذیب نے اپنے آنسو پونچھے اور وہ اداس سی پیچھے کھسک کر بیٹھ گئی پھر سرگوشی کی — تبھی سے میں ادھوری ہوں!

اُسی وقت چاندنی چوک کی دونوں سمتوں سے دو جلوس نکلنے لگے۔ ایک جلوس کا نظارہ تو بہت

ہی حیرت انگیز تھا۔ اس جلوس میں ہزاروں کی تعداد میں سر کے بغیر جسم تھے جو اپنے سینے دھنتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی کٹی ہوئی گردنوں سے تازہ خون فوارے کی طرح نکل رہا تھا۔ دوسری طرف ننگی تلواریں لیے شہنشاہ کے فوجوں کی پلٹن چلی آ رہی تھی۔

ادیب اور دارا نے ساتھ ساتھ اُن دونوں جلوسوں کو دیکھا اور ادیب نے کلچگ سے دریافت کیا — یہ کیسے جلوس ہیں؟

تو کلچگ نے خلاصہ کیا — حضور عالی! یہ سر کٹے لوگوں کا ماتمی جلوس عوام اور ان عام لوگوں کا ہے جو دارا شکوہ سے پیار کرتے ہیں... اور ننگی تلواریں لیے جو جلوس آ رہا ہے، وہ اورنگ زیب کی فوجوں کا ہے!

— ماتمی جلوس تو سمجھ میں آتا ہے لیکن فوجیوں کا جلوس کس لیے؟

— میری سمجھ میں سب آ رہا ہے اور میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں! دارا بیچ میں بولا — فوجیوں کے جلوس کے بیچوں بیچ دیکھیے — ایک ہاتھی چلا آ رہا ہے!

سب نے دیکھا — ہاتھی کی پیٹھ پر ایک بغیر سر کا آدمی بندھا ہوا تھا، جسے دلی کی سڑکوں اور گلیوں میں گھما کر اب چاندنی چوک لایا گیا تھا!

— دارا شکوہ! تم اس سر کٹی لاش کو پہچانتے ہو؟ ادیب نے پوچھا۔

— جی حضور! یہ سر کٹی لاش میری ہے!

۲۸

اور تب سر کٹی لاش کے ساتھ ساتھ ادیب نے ہندوستان میں ایک اور ہیبت ناک نظارہ دیکھا... وہ نظارہ جو صدیوں کی سرحدوں میں پھیلا تھا۔

ہندوستان نام کا ایک ایسا ملک اُس کے سامنے تھا جس کے باشندوں کی گردنوں پر سر نہیں تھے۔ ہر طرف بغیر سر کے جسم ہی جسم دکھائی دے رہے تھے۔ بازار کھلے تھے، مندروں، مسجدوں کے دروازے بھی کھلے تھے۔ چاندنی چوک کی دوکانیں بھی کھلی تھیں اور بغیر سر والے جسم جگہ جگہ آ جا رہے تھے۔ وہ صرف دھڑ ہی دھڑ تھے۔ وہ بات کرتے تھے، مول بھاؤ کرتے، چیزیں خریدتے، مندروں مسجدوں میں پوجا و عبادت کے لیے جاتے بھی دکھائی دیتے تھے۔ اُن کی آواز بھی سنائی پڑتی تھی لیکن دھڑ پر سر نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے بولتے ہوئے ہونٹ نہیں دکھائی دیتے تھے۔ جھپکتی ہوئی آنکھیں نظر نہیں آتی تھیں۔

اور یہ خوفناک نظارہ صرف ہندوستان میں ہی نہیں، پورے وسط ایشیا سے لے کر ترکی تک پھیلا ہوا تھا۔ پوری انسانی نسل کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ اتنا ہی نہیں، قدرت بھی ناساز تھی۔ پھول تو تھے لیکن اُن کی خوشبو ندارد تھی۔ کھجور کے شجر بھی تھے لیکن وہ سوکھ گئے تھے۔ مدھو مکھیاں آتی تو تھیں لیکن کھجوروں سے پرہیز کر رہی تھیں۔ چڑیاں اڑتی تھیں، منڈیروں کنگوروں پر جا کر بیٹھ جاتی تھیں، لیکن ان میں پرواز کی کمی کی وجہ سے آسمان خالی تھا۔ رات بھی ہوتی تھی لیکن نکلتے ہی سارے تارے بجھ جاتے تھے۔ چاند پت جھڑ کے پتے کی طرح مرجھا جاتا تھا۔ ندیاں بہہ رہی تھیں لیکن اُن میں لہریں نہیں تھیں۔

سورج بھی کالا ماتمی لبادہ اوڑھ کر نکلتا تھا۔ ابابیلیں پریشان تھیں کہ دن کیوں نہیں ہوتا۔ گوریاں سہمی ہوئی فصلوں پر بیٹھی تھیں۔ جمنا ندی کی مچھلیوں نے تیرنا بند کر دیا تھا، کیونکہ لہریں نہیں تھیں۔ خواص پورہ کی تاریخی حویلی ابھی بھی کانپ رہی تھی... تبھی ادیب کی نظریں شاہجہاں آباد کے لال قلعہ کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں قلعے کی فصیل، کنگوروں، پھاٹکوں پر بھی جو پہرے دار تعینات تھے، ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے، لیکن تن پر سر نہیں تھے۔ عجیب سے اس ماحول کو ادیب سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ وہ چیخا— اردلی!

اردلی حاضر ہوا— حضور!

—دیکھو میرے تن پر سر ہے؟ ادیب نے پوچھا۔

—موجود ہے سرکار!

—تمہارے تن پر رکھا ہوا سر بھی مجھے نظر آ رہا ہے، لیکن ایسا کیوں ہے کہ باقی لوگوں کے سر نہیں ہیں؟ ادیب نے پوچھا۔

—حضور! اردلی نے کہا— تاریخ میں ایسے دور بہت بار آتے ہیں جب اُس دور کے لوگوں کے سر غائب ہو جاتے ہیں۔ سوچ سمجھ اور سچ کی تحقیق کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے— ادیب عالی! ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں۔

—تو کیا... تو کیا ایسے دور میں آنکھیں دیکھنا بھی بند کر دیتی ہیں؟ ادیب نے سوال کیا۔

—نہیں حضور! جو بھی وقوع ہوتا ہے، اُسے آنکھیں برابر دیکھتی ہیں!

—تو پھر ان بغیر سروں کے جسموں، ان دھڑوں کی آنکھیں کہاں ہیں؟

—حضور! وہ لاکھوں، کروڑوں آنکھیں ایک دوسرا غمگین اور شرمناک نظارہ دیکھنے کے لیے ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں... آنکھوں کے ان پہاڑوں کو دیکھیے...

اور تب زندہ آنکھوں کے پہاڑ دیکھ کر ادیب کا دل کانپ گیا... آنکھیں ہی آنکھیں... اور تب وہ پھر چیخ پڑا—

—یہ لاکھوں کروڑوں آنکھیں کون سا نظارہ دیکھنے کے لیے بے چین ہیں؟

—حضور عالی! اورنگ زیب اور روشن آرا نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے... اب دارا شکوہ کے دھڑ کو لاہوری دروازے اور اس کے سر کو چاندنی چوک کے چوراہے پر لٹکایا جا رہا ہے... وہ دیکھیے— نظر بیگ اس کام کو انجام دے رہا ہے... اور ادیب نے لاکھوں کروڑوں آنکھوں کی نسبت سے دیکھا— لاہوری دروازے پر دارا شکوہ کا دھڑ جھول رہا تھا اور چاندنی چوک کے چوراہے پر ایک لمبے نیزے کی نوک پر دارا کا سر ٹنگا ہوا تھا۔

وہاں بھی دیکھنے والی آنکھوں کے انبار کا پہاڑ موجود تھا۔

تبھی دارا شکوہ کا وہ کٹا ہوا سر تیز آواز میں ہنسنے لگا۔ ہنستا ہی گیا... ایک بھیانک زلزلہ سا آ گیا! دارا کے شیرازی کبوتروں نے اداسی سے آواز کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں پالتو افریقی شیر جو اس کے دائیں بائیں رہتے تھے، جیسے آواز کو پہچان کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، اس حیرانی کے ساتھ کہ اُن کا مالک ولی عہد سلطنت دور مانے تیموری و چنگیزی، بلند اقبال شہزادہ دارا شکوہ تو کبھی اتنی زور سے ہنستا نہیں تھا...

چاندنی چوک کے چوراہے پر لٹکا ہوا دارا کا سر ابھی بھی زور زور سے ہنس رہا تھا۔ آنکھوں کے پہاڑ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

دیوان خانہ علم میں سنسکرت کے عالم قوت رائے، کوی رنجن داس، ویدوں کے فارسی مترجم کاشی ناتھ، اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کرنے والے دوارکا نندن وغیرہ بھی خاموش و اداس بیٹھے تھے۔ چاندنی خانہ کے آتشی پھولوں کے جھاڑ فانوس مرجھائے ہوئے تھے۔ وہ فانوس جن میں ہزاروں شمعیں ایک ساتھ جلتی اور رات کے اندھیروں کو بھی جو دن کے دوپہر کو قید کر لیا کرتی تھیں آج جلنے اور روشنی دینے سے انکار کر رہی تھیں۔ وہ تمام کمسن کنیزیں، جو طشتریوں میں بھاری بھاری کافوری شمعیں لے کر ہمیشہ حاضر رہتی تھیں وہ بھی اپنے طشت اور طشتریاں، پھینک کر کالے ماتمی لبادے پہنے خاموش کھڑی تھیں۔ سلطنت کی ساری توپیں شرمسار تھیں۔ دارا شکوہ کا گھوڑا ''فلک پیما'' لاہوری دروازے کے پاس اکیلا کھڑا غمگین اور آنسو بھری آنکھوں سے اپنے مالک شہزادے کا لٹکا ہوا دھڑ دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھی 'فتح جنگ' کی آنکھیں نم تھیں۔ جمنا ندی میں کھڑا بیڑہ، 'عقاب سرخ' کے شاہی پرچم مردوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے، کیونکہ ہوا بند تھی۔

تبھی چاندنی چوک کے چوراہے پر دارا شکوہ کا لٹکا ہوا سر پھر ایک بار زور سے ہنسا۔ پھر ایک زلزلہ آیا۔ وہ سر بلند آواز میں بولا— وطن کی خدمت دنیا کی سب سے بڑی سعادت اور دین کی سب سے بڑی عبادت ہے اور وہی ہم نے کی ہے...

وہ بلند آواز کائنات میں گونجتی رہی...

جمنا کنارے کے پوکھروں میں اُگے کنول کے پھولوں نے یہ آواز سن کر دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ پانی کی کونپلوں نے کان کھول کر اس آواز کو سننا چاہا...

تبھی جیسے لاکھوں لوگوں کے نعرے لگاتی آوازیں گونجنے لگیں— ولی عہد سلطنت چراغ دودمانے تیموری و چنگیزی، شاہ بلند اقبال دارا شکوہ اعظم زندہ آباد!

زندہ آباد!

زندہ آباد!

چاندنی چوک میں دارا کے حامیوں کی کچھ لاشیں ابھی بھی پڑی تھیں۔ اُن کے زخموں میں رینگتے کیڑے سہم کر تھم گئے تھے۔ سادھوؤں، فقیروں اور درویشوں کی شکل میں گھومتے اورنگ زیب کے جاسوس سکتے میں آ گئے۔ آخر یہ کیسی آوازیں تھیں اور کن لوگوں کی تھیں؟

چاندنی چوک کے چوراہے پر لٹکا دارا کا سر تو اکیلا تھا۔ وہاں کوئی تھا ہی نہیں، لیکن آوازوں کا شور تھم ہی نہیں رہا تھا۔ ان آوازوں کی آواز اورنگ زیب تک پہنچی تو وہ سوچ میں ڈوبا ہوا روشن آرا کے محل کی طرف چل پڑا۔ شہزادی روشن آرا سے نگاہ ملتے ہی اورنگ زیب نے جھک کر سلام کیا اور پریشانی بھری باتیں بیان کیں—

—یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے... لوگوں کے کان بج رہے ہوں گے... پروردگار تمہارے اقبال کی روشنی پورے سلطنت میں پھیلا چکا ہے۔ روشن آرا نے کہا۔

—لیکن آپا ہمارے جاسوس غلط خبریں نہیں لا سکتے...

—تو پھر نجومیوں، جیوتشیوں کو بلا کر فوراً ان آوازوں کا سبب دریافت کیا جائے...

اور نجومیوں و جیوتشیوں کو آنے میں دیر نہیں لگی۔ گھنا نند جیوتشی نے بہت سوچ وچار کرنے کے بعد بتایا— بات یہ ہے حضور عالی کہ دارا شکوہ کے حامیوں کے دلوں میں جو باتیں موجود تھیں، وہ اُس کے قتل کے بعد بھی مری نہیں ہیں۔ اُن کی زخمی اُمیدیں ابھی بھی اُس کے سر کے ارد گرد منڈراتی ہوئی شور مچا رہی ہیں...

اسی میں نجومی شفیع اللہ نے اور جوڑ دیا— عالم گھنا نند بجا فرما رہے ہیں۔ حضور عالی! اتنا ہی نہیں،

دارا شکوہ کی مردہ کھوپڑی اپنا دربار سجا رہی ہے۔ اُس میں اُس کے سر کٹے وزیر، منصب دار اور امراء حاضر ہو رہے ہیں... نظر نہ آنے والے دربار مسلسل لگ رہے ہیں... یہ تو خطرناک ہے! اورنگ زیب چیخ اٹھا— مردوں کی اس بدامنی کو فوراً سے پیشتر ختم کرنا ہوگا...

—اس کا ایک ہی طریقہ ہے جہاں پناہ! نجومی اشفاق کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

—کیا؟ کیا...؟

—یہی کہ سلطنت کے عام اور اوسط مسلمان کو بتایا جائے کہ شہزادہ دارا شکوہ ہندو پرست ہو گیا تھا... علماء اور مفتیوں سے اسی طرح فتویٰ جاری کرایا جائے جیسا کہ آپ نے اس رات فیصلہ لیا تھا، جس رات دارا شکوہ اور سپہر شکوہ کو خواص پورہ کی حویلی میں قید کر دیا گیا تھا اور آپ سامنے پھیلی گھنی رات کی سیاہی کو دیکھ رہے تھے...

—نجومی اشفاق ٹھیک کہہ رہے ہیں...

—لیکن کوئی دانشمند جیسا درباری مخالفت میں اُٹھ کھڑا ہوا، تو؟ اورنگ زیب اور روشن آرا سے پوچھا۔

—عالمگیر! روشن آرا بولی— دانشمند جیسے دانشمند درباری بہت کم ہوتے ہیں... اُن کی بات اور رائے کا تختہ پلٹنے والے تبرک خاں حکیم جیسے لوگوں کی کوئی کمی کسی بھی سلطنت اور حکومت کے پاس نہیں ہوتی... بہت مل جائیں گے جو مسلسل ہمارے ارادوں کو انجام دیں گے...

رات بے حد اندھیری تھی۔ ستارے بجھے ہوئے تھے۔

چاندنی چوک کے چوراہے کے پاس والے پیپل کے پیڑ کے نیچے آ کر ادیب بیٹھ گیا۔ نظارہ وہی تھا۔ نیزے پر لٹکا دارا شکوہ کا سر اکیلا تھا لیکن لاکھوں آوازوں کا شور جاری تھا۔ وہ آوازیں کبھی تھم جاتی تھیں، کبھی اور تیز ہو جاتی تھیں۔

تبھی ادیب نے دیکھا— خاموش رات کے اندھیرے میں ایک شاہی ستواں جسم، شیروانی پہنے اُس چوراہے کے پاس آ کر رک گیا۔ وہ رکا پھر چہل قدمی سی کرنے لگا۔ وہ شاہی شخص چلتا تو جیسے اُس کی شان میں جاگیر کا پرانا پیتل کا گھنٹہ بجتا تھا۔ ویسے وہاں نہ کوئی گھنٹہ تھا اور نہ کوئی بجانے والا۔ وہاں تو صرف نیزے کی نوک پر لٹکا ہوا دارا شکوہ کا سر تھا۔

وہ شاہی شخص کچھ دیر غمگین سا ٹہلتا رہا، پھر وہیں پاس پڑے ایک پتھر پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

ادیب پیپل کے پیڑ کے منڈیرے سے اٹھ کر اُس کے پاس گیا اور حیرت سے دیکھا، وہ تو اسی

کے معاصر افسانہ نگار قاضی عبدالستار صاحب تھے۔

— قاضی بھائی آپ؟ ادیب حیرانی سے بولا۔

— ارے بھائی جان آپ؟ قاضی بھائی نے بھی اتنے ہی حیران کن انداز میں کہا۔

پھر دونوں ادیبوں نے اچانک دارا کے سر کی طرف ساتھ ساتھ دیکھا۔ نگاہیں نیچی اتریں تو قاضی عبدالستار نے کہا—

— بھائی جان! یہاں کوئی مورخ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا لیکن اپنی برادری کے ہر صدی کے ادیب کو تو یہاں آنا ہی پڑے گا کیونکہ اس دارا شکوہ نے ایک تہذیب، ایک انسانی نظام، ایک تمدن کو زندہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا، لیکن تقدیر نے اس کے ہاتھوں سے قلم چھین لیا اور ایک خونی تلوار نے بنتی ہوئی قوم کی جنم کنڈلی پر خون کی سیاہی پھیر دی...

دارا کا سر یکایک زور سے ہنس پڑا... سمتیں کانپنے لگیں۔ پھر ہنسی رکی تو چاندنی چوک کی سڑک پر ٹپ ٹپ پانی کی بوندیں گرنے لگیں۔ لگا کہ بادل رونے لگے ہیں، لیکن نہیں، وہ بادل نہیں، دارا شکوہ کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو تھے...

ان آنسوؤں کے ساتھ ہی آنکھوں کے الگ الگ پہاڑوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب آیا...

اور غیب سے ایک آواز آئی—

— آنے والی صدیوں، سنو! بنتی ہوئی انسانی تہذیبیں ظلموں تلے اسی طرح روتی اور سسکتی رہیں گی اور دارا شکوہ کی طرح کوئی نہ کوئی مستقبل شناس اسی طرح ہر صدی میں سولی پر لٹکایا جائے گا...

اور... اور اس کی آنکھوں کے آنسو شبنم بن کر زمین کی گھاس پر چھلکتے رہیں گے... جو گھاس پر پڑی اس آنسو بھرے شبنم کو نہیں پہچان پائیں گے وہ اپنے مستقبل، اپنے آنے والے دن کو کبھی بدل نہیں پائیں گے...

دونوں ادیبوں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا، لیکن آواز کا مالک کہیں نظر نہیں آیا کہ اچانک اردلی نے حاضر ہو کر انہیں آگاہ کیا—

— حضور عالی! مستقبل خود اپنے مستقبل کو لے کر پریشان ہے... یہ اسی کی آواز ہے!

آواز پھر گونجنے لگی—

— تم دیکھنا... بدلتی دنیا کے دور میں کوئی ظالم، کوئی متعصب، کوئی کٹر شہنشاہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہونے پائے گا... لیکن خلوص اور انسان پرست طاقتوں کے درمیان یہ جدوجہد ہمیشہ چلتی رہے گی... ہر صدی میں ایک دارا شکوہ کے ساتھ ایک اورنگ زیب بھی پیدا ہوگا... اس دستور کو

بدلنا ہوگا، نہیں تو میرے ساتھ ساتھ تم سب کا مستقبل بھی ڈوب جائے گا... اگر میں مر گیا تو تمہارے ساتھ خواب ختم ہو جائیں گے!

— نہیں مستقبل! ہم گھاس پر پڑے آنسوؤں کے شبنم کو پہچانیں گے... ہم اپنے خوابوں اور تمہیں مرنے نہیں دیں گے! دونوں ادیب چیخ پڑے۔

لیکن مستقبل غائب ہو گیا۔

اور بجتے ڈھول اور نگاڑوں کی آواز کے ساتھ اورنگ زیب کے علماء کے اسلامی فتووں کا اعلان ہونے لگا۔

— برادرانِ اسلام! جو خطرہ ہندوستان کی خلافت اسلامیہ کے سر پر منڈرا رہا تھا، وہ ختم ہو چکا ہے... ہندو پرست دارا شکوہ، جس کو نماز سے نفرت، روزے سے عداوت، حج سے پرہیز اور زکوٰۃ سے چڑھ تھی، وہ تخت طاؤس پر ناپاک قدم رکھ کر شہنشاہی کے منصوبے بنا رہا تھا۔ وہ خدا کا منکر تھا... وہ ہندو پربھو کے نام کی آرسی، انگوٹھی اور مکٹ پہنتا تھا... وہ منکر ہندو یوگیوں، سنتوں کی دعا اور راجپوتوں کی تلواروں کا سہارا لے کر اس جنت نشاں ہندوستان سے اسلام کو خارج کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا... برادرانِ اسلام! ایسے شخص کے بارے میں بھی قاضیوں اور مفتیوں کا فتویٰ ہے کہ اس کے خلاف اٹھائی گئی تلوار ایک جہاد تھا... جہاد اکبر تھا...

فتویٰ سن کر نیزے پر ٹنگا دارا کا سر ہنسا... پھر کائنات میں زلزلہ آیا...

اسی کے ساتھ ساتھ جامع مسجد کے پاس منادی سنائی دی۔ وہی شاہی اعلان جاری تھا۔

دارا کا سر پھر ہنسا...

مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ چاندنی چوک کا وہ بازار جو چراغوں، مشعلوں، شمعوں، جھاڑیوں سے آباد رہتا تھا، خاموش اور بے نور تھا۔ جو سڑکیں اور گلیاں عطر لگے کپڑے پہنے، پھولوں کے گھروں سے سجے دھجے لوگوں کی بھیڑ سنبھال نہیں پاتی تھیں، وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ جامع مسجد کے آس پاس کی دوکانوں میں، جہاں بادامی کاغذ کی کتابوں سے لوگ داستانیں پڑھا کرتے تھے، وہ آنکھ بند کیے بیٹھی تھیں— دوکانوں کے آس پاس چاندی بچھے تختوں پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے جو بزرگ حقے گڑگڑاتے تھے، ان کا خوشبودار دھواں غائب تھا، فالودے اور شربت کے جو چاندی والے گلاس رقص کیا کرتے تھے، وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

تبھی دو تین شاہی فوجیوں کے ساتھ دوسرا منادی والا نگاڑہ پیٹ پیٹ کر اعلان کرنے لگا—

— خلق خدا کا، حکم شہنشاہ کا! یہ حکم شہنشاہِ ہندوستان عالمگیر اورنگ زیب صاحب عالم... رعایا کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ کوئی سرکشا شخص بخشا نہیں جائے گا۔ سارے دھڑوں کو اپنے سر گردنوں پر لگانے ہوں گے! کوئی بازار، کوئی دوکان بند نہیں رہے گی۔ سارے کام بدستور جاری رکھے جائیں گے...

خبر دیتا منادی والا آگے بڑھ گیا، تو باورچی جمن کے قحبہ کدے میں ہلچل شروع ہو گئی۔ بڑی انگیٹھیوں کے دہانے دہکنے لگے۔ دیگیں چڑھا دی گئیں اور پکے گوشت کی مہک چاروں طرف پھیلنے لگی۔ خریداروں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ بحث مباحثہ ہونے لگا۔

شیریں رقاہدار کی دوکان خوشبودار حلووں، مربوں اور مٹھائیوں سے دلہن کی طرح سج گئی۔ لمبی چوڑی سلیں عرق گلاب سے دھو ڈالی گئیں۔ اُن پر پہلوان آدمی بانہوں میں چاندی کے تین تین گھنگھرو باندھے بھنگ پیسنے لگے۔ بجتے گھنگھروؤں کی آواز لوگوں کو بلانے لگی۔ حقے تازے ہو گئے۔ مراد آبادی تمباکو کی خوشبو اڑنے لگی۔ جگہ جگہ آکر کچھ لوگ بات چیت کا بازار گرم کرنے لگے۔

— شکر ہے اللہ کا... عالمگیر اورنگ زیب نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لی، ورنہ کہیں دارا جی مہاراج تخت نشیں ہو جاتے تو سات سو برسوں کی اسلامی حکومت دیکھتے ہی دیکھتے غارت ہو جاتی...

دوسرے مجمع میں کسی اور نے پہنچ کر باورچی جمن کی دوکان پر بحث چھیڑ دی—

— ارے میاں غنیمت ہے کہ یہاں کھڑے خرشے کھا رہے ہو۔ دارا شکوہ اگر تاج پہننے میں کامیاب ہو جاتا تو ہندوستان میں تم گوشت کھانے کے لیے ترس جاتے۔

اور کیا ظلِّ سبحانی تو آخری گھڑیاں گن رہے تھے۔ تینوں شہزادے سیکڑوں میل دور اپنے اپنے صوبوں میں بے خبر بیٹھے تھے۔ دارا جی مہاراج نے بادشاہت کا انتظام پختہ کر لیا تھا... وہ تو شاہی جلوس کیا چاہتا تھا... ایسا!

تیسرے اور چوتھے و پانچویں مجمعے میں بھی لوگ بحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ پہنچ کر بحث کی شروعات کچھ خاص لوگ ہی کر رہے تھے۔ وہ چنگاری لگا کر اگلے مجمع کے لیے کہیں اور بڑھ جاتے تھے۔ باتوں کی مجلسیں جاری تھیں۔

— ارے یہ تو کھلی بات ہے کہ دارا کے دربار میں وید اور اپنشدوں کے ودوان ہمیشہ موجود رہتے تھے... میر منشی چندر بھان تو ان میں خاص تھا۔ ویدوں کا فارسی میں ترجمہ کرنے والا کاشی ناتھ، اپنشدوں کے مترجم دوارکا ناتھ، سنسکرت کا پنڈت قوت رائے اور کوی راج رنجن داس تو تھے ہی اُس کے خاص الخاص...

— سنا ہے کہ اس کے سرہانے قد آدم شمع دان کے سائے میں سنہری و روپہلی تپائیوں پر ویدوں اپنشدوں اور تصوف پر عربی و ایرانی کتابوں کی، سونے کے پانی سے لکھی، جلدیں سجی رہتی تھیں... کفر! کفر...

— ارے، جب وہ قندھار کی جنگ میں گیا تھا تو جنگی ہاتھیوں، ہزاروں گھوڑ سواروں، توپوں، تیر اندازوں، پیدل ہندوقچیوں، توپچیوں، بیلداروں، سنگ تراشوں، بہشتیوں، خادموں کے پورے کارخانے کے ساتھ ساتھ پانچ اونٹوں پر ہندو مذہبی صحیفے اور صوفی سنتوں کی کتابیں لاد کر لے گیا تھا۔ پانچ ہاتھیوں پر سنسکرت، عربی اور فارسی کے پنڈت، عالم، کوی، مفسر، جیوتشی، سنیاسی اور یوگی سوار تھے!

— ویسے بھی اُس کے ذاتی دیوان خانۂ علم میں موجود تخت پر ہندو بھگوان شنکر کی تصویر سایہ کیے رہتی تھی۔ خود اس کے سینے پر پڑی الماس کی آرسی میں شو کی تصویر کھدی تھی... داہنے ہاتھ کی انگوٹھی میں سنسکرت زبان میں پربھو لفظ لکھا تھا... کون نہیں جانتا کہ وہ ہندو ہو گیا تھا...

— نہیں، نہیں... تھا تو وہ مسلمان ہی، لیکن ضرورت سے زیادہ وہ ہندو پرست ہو گیا تھا... اگر وہ تختِ طاؤس پر قابض ہو جاتا، شہنشاہی تاج پہن لیتا تو وہ ہندو گردی ہوتی... مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا۔

دارا کا لٹکا ہوا سر بہت زور سے ہنسا... اتنی زور سے کہ قلعے کی فصیل اور برجوں پر بیٹھے کبوتر گھبرا کر اڑ گئے۔

عالمگیر اورنگ زیب کے محل میں جب ہنسی کی تیز آواز دھمک کے ساتھ گونجنے لگی تو وہ گھبرایا۔ اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے... آنکھیں سکڑ گئیں۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہوا اور روشن آرا کے محل کی ڈیوڑھی میں شور ہوا۔ محل کا رکھوالا خواجہ سرا فہیم چونکا۔ دوڑ کر ایک خواص نے اطلاع دی—

— عالم پناہ عالمگیر ادھر ہی تشریف لا رہے ہیں۔

بھرے جسموں، شرقی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی ازبکی پہریدار عورتیں مستعد ہو گئیں۔ سفید لباس پہنے حبشی کنیزیں حکم بجالانے کے لیے ہوشیار ہو گئیں۔ خبر پاتے ہی روشن آرا دولت خانے سے بہتی نہر کے کنارے سنگ مرمری نہر کے کنارے آکر رکی اور اپنے بھائی کا انتظار کرنے لگی۔ اورنگ زیب آیا۔ سارے خواص، خادموں کو اشارہ کیا گیا۔ تنہائی میں دونوں کی بات چیت ہونے لگی۔

مشورے کے بعد طے پایا کہ دارا کی میت کو دفن کر دیا جائے، تاکہ اس کا کٹا ہوا سر ہنسنے کی گستاخی نہ کرے اور مشورے کے مطابق میت کو غسل اور کفن دیے بغیر ہمایوں کے مقبرے میں زمین دوز کر دیا گیا لیکن حیرت کی بات تھی کہ چاندنی چوک کے چوراہے پر لوگ اب بھی دارا کا ٹنگا ہوا سر

دیکھتے تھے اور انھیں اس کا ہنسنا بھی سنائی پڑتا تھا، بلکہ اب تو وہیں کھڑا پیپل کا پیڑ اس کے ساتھ ساتھ ہاتھ ہلا ہلا کر ہنستا تھا۔ اُس پیپل کے ساتھ ہی سلطنت کے سارے پیپل کے درخت ایک ساتھ ہنستے تھے اور وحشت سی چھا جاتی تھی۔

وحشت کے اس ماحول میں تبھی ایک غمگین ترانہ ابھرا—

"اپنے جن برلے جنگ اندر پرکھ خزانے پایا
جاتی برن تے بھیے اچ ممتا لوبھ چکایا..."

یہ غمگین ترانہ چاروں سمتوں میں گونجنے لگا اور ایک راوی سامنے آیا۔ اس نے اعلان کیا—

—دنیا کے ناظرین! میں صدیوں کا نمائندہ اور ایک ناٹک کا راوی ہوں! جو کچھ تم آج دیکھ رہے ہو... اس کی وجوہات میری صدی میں موجود ہیں... ہندو ذات تنزلی کے دہانے پر ہے... ہندوؤں کے چاروں ورن چھوٹی چھوٹی ذاتوں، ذیلی ذاتوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ ہر ذات خود کو دوسرے سے اونچا سمجھتی ہے... ذات پات کی تفریق عروج پر ہے۔ ہندو جھوٹی انا کا شکار ہے۔ اسی لیے گرو نانک کا وچن بنجارے کی طرح بھٹک بھٹک کر کہہ رہا ہے... اس دور میں ذات پات اور ورن کی جھوٹی انا سے اوپر اٹھا ہوا اور حرص و لالچ سے آزاد کوئی شخص نہیں ہے... برہمن تو کرم کانڈ کا سہارا لے کر باقی جنتا پر ظلم کر رہا ہے...

(۲۹)

پیپل کے درخت مسلسل ہنس رہے تھے، لیکن کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ یہ کہ ڈھائی ہزار سال بوڑھے، انھیں کی برادری کے بودھی ورکش نعرے لگا رہے تھے۔ عجیب تھا یہ منظر— جوان درخت ہنس رہے تھے، بوڑھے درخت نعرے لگا رہے تھے اور پیپل کے نوجوان درخت تالیاں بجا رہے تھے۔ بوڑھوں کا ساتھ نوجوان دے رہے تھے۔

ادیب نے غور سے سنا۔ اُن کی زبان سمجھنے میں تھوڑی دقت تو ہو رہی تھی لیکن پھر سمجھ میں آنے لگی۔ ڈھائی ہزار سال بوڑھے بودھی ورکش کے نعرے تھے—

—ویدک تہذیب!

—مردہ باد!

—ظالم ورن نظام!

—مردہ باد! مردہ باد!

—ویدک برہمن واد!

—مردہ باد! مردہ باد!

—دکھ کی وجہ؟

—ورن واد! ورن واد!

ادیب حیران سا سب کچھ دیکھ سن رہا تھا۔ اس نے اردلی کو آواز لگائی۔ اس سے پہلے کہ اردلی آتا، ایک نوجوان درخت اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

—آپ کچھ جاننا چاہتے ہیں؟

—ہاں، یہی کہ یہ منظر... یہ کیسی بغاوت ہے؟ بوڑھے درخت نعرے لگا رہے ہیں اور تم نوجوان درخت تالیاں بجا رہے ہو...

—جناب! ہوا یہ ہے کہ ویدک آریوں نے اپنے مفاد کے لیے سماج کو تقسیم کر دیا ہے۔ ہمارے بزرگ بودھی ورکش آریوں کی کی گئی اس تقسیم کو قبول نہیں کرتے... ہم برہما کے پاؤں سے پیدا نہیں ہوئے ہیں... آریوں کا یہ دیوی نظام ازگل ہے...

اور تبھی ایک بزرگ بودھی ورکش آگے آ کر بولنے لگا— آریوں کا ورن واد ایک غیر فطری اصول ہے، کیونکہ برہمن کی پتنیوں کو بھی ماہانہ حیض کے دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی حاملہ ہوتی ہیں۔ وہ بھی بچوں کو جنم دیتی ہیں، انھیں دودھ پلاتی اور ان کی پرورش کرتی ہیں... اتنے پر بھی وہ آریہ برہمن جن کی پیدائش عورتوں کی کوکھ سے ہوتی ہے، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ برہما کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں... برہما کے منہ میں رحم نہیں ہے...

تبھی بودھ گیا سے گوتم بدھ کی آواز آنے لگی— توڑو! توڑو! ویدک آریوں کے ورن واد کو توڑو... آریہ ہوں لیکن ویدک آریوں کے ورن واد اور برہمن واد نے ہمیں اپنی تہذیب میں شرنارتھی بنا دیا ہے۔ ہم شرنارتھی ہونے سے انکار کرتے ہیں... ہم ایشور کی حکومت کو نامنظور کرتے ہیں۔ آواگمن کے انسان مخالف پرکشش اصول کو نامنظور کرتے ہیں۔ ہم آریوں کے اُپنشدوں کے نرگن برہما کے تصور کو بیکار اور بے معنی سمجھتے ہیں۔ یہ اپنشد برہمن گرنتھوں کے بعد لکھے گئے آریہ چالبازی کے گرنتھ ہیں... ہم اعلان کرتے ہیں کہ کوئی اقتدار کے باہر نہیں ہے، اس لیے یہ کرم کانڈی پروہت ہمارے لیے ضروری نہیں ہیں... پنرجنم جھوٹ ہے... تم خود اپنے دیپک ہو۔ تم خود کو دنیاوی حقیقت سے آزاد کر سکتے ہو۔ کسی کے اندر سے کوئی دیوتا نہیں بول سکتا۔ دیوتا کا وجود نہیں

ہے۔ دیوتا اور ان کے گرنتھ غلامی کی علامت ہیں... جو ذہن و دل کو مطمئن نہ کرے وہ قابلِ ترک ہے۔ نئے کو قبول کرو۔ نیا کبھی پرانے کی تکرار نہیں ہوتا۔ پرانے کی نئے میں تبدیلی ہی ذہین پرانے کو پناہ دیتا ہے۔ کوئی ماورائی طاقت نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی عظیم طاقت نے ہماری تخلیق کی ہے۔ تو سنو، جو خالص اور غیر مسلسل ہے وہ تخلیق سے عاری ہے۔ تخلیق وہی کر سکتا ہے جو موت کو قبول کرتا ہے۔ تب تک، جب تک پاتال کی گہرائیوں سے فتح یابی کی دو والے کرسمیری تہذیب کا جل جانیش لوٹتا نہیں، تب تک تم موت کو قبول کر کے موت کے خوف سے آزاد ہو جاؤ... یہی نروان ہے! اس نروان کو اسی جنم اور اسی لوک میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس نروان کا راستہ فرد، فرد میں موجود ہے... اسی لیے وہ سب کا ہے... وہ عوامی ہے... دُکھ اور موت سے اجتماعی ازالہ کا راستہ... تم موت پیدا مت کرو، یہی رحم دلی کا عروج اور عدم تشدد ہے...

— لیکن اتنی صدیوں کے بعد بھی دلی میں موت کا رقص جاری ہے... دیکھو ادیب! ان آندھیوں کو دیکھو! گرو تیغ بہادر نے موت کے خوف کو ترک کر دیا ہے... قاضی عبدالستار چاندنی چوک سے بھاگتے اور ہانپتے آئے — چاندنی چوک میں اب صرف نیزے پر ننگا دارا شکوہ کا سر ہی نہیں ہنس رہا ہے بلکہ گورو تیغ بہادر کا سر کٹنے کے باوجود جھکنے اور زمین پر گرنے سے انکار کر رہا ہے... اُن کا خون بارود میں بدل گیا ہے اور وہ ایک آتش کے گولے کی طرح تیزی سے گھوم رہا ہے... جس کی وجہ سے آندھیوں کے جتھے نکل پڑے ہیں...

— تو کیا اورنگ زیب نے پھر کوئی قتل کیا ہے؟ ادیب نے اپنے دوست سے پوچھا۔

— ہاں! اب اس کے اوپر جبرا تبدیلیٔ مذہب کا بھوت سوار ہے... سرکوبی اور تبدیلیٔ مذہب کا مرکز کشمیر کو بنایا گیا ہے کیونکہ وہیں سب سے ذہین کشمیری پنڈت موجود ہیں... ان جاہلوں کو یہ نہیں معلوم کہ کشمیر میں جنھیں اسلام قبول کرنا تھا، وہ ان سے پہلے ہی کر چکے ہیں۔ وہاں پہلے ہی وسط ایشیا سے مسلم مبلغ اور ایران کے صوفی سید علی ہمدانی آ چکے ہیں...

— لیکن حضور! وہ تو صوفی تھے۔ وہابی نہیں۔ اسی لیے کشمیر کے صوبیدار شیر افگن اور شہنشاہ اورنگ زیب کو یہ منظور نہیں کہ کشمیر میں اسلام ہم آہنگی کرنے والا بن جائے! اردلی نے ادب سے کہا۔

— ادیب! آپ کے اردلی صاحب کی یہ بات بالکل درست ہے، کیونکہ صوفی مسلک اپنے اور اللہ کے درمیان کسی سلطان یا خلیفہ کی موجودگی کو منظور نہیں کرتا۔ یہی بیج وہاں کے شیوں کے درمیان بھی موجود ہے۔ بھگوان شنکر کی امرناتھ گپھا کا متولی آج بھی ایک مسلمان ہے... وہ صرف متولی ہے... مولوی، ملا یا پروہت نہیں۔ یہی بات کشمیر کے بودھوں کو بھی راس آئی ہے! قاضی عبدالستار

صاحب نے تائید کی اور بتایا — اور یہی کشمیریت کی پہچان ہے۔ شیوں کے تنترمنتر نے بھی صوفی کو بہت متوجہ کیا تھا۔ کشمیریوں کی ایک خاصیت یہ بھی کہ ان کا شیو مسلک میدانی ہندوؤں کے شیو فرقے سے بہت الگ تھلگ ہے۔ ان کا بودھ دھرم بھی دیگر ممالک یا تبت تک کے بودھوں سے مختلف ہے اور ان کا اسلام بھی باقی ممالک کے اسلام سے زیادہ فراخ دل اور صابر ہے... اسی لیے تو وہاں جہلم پر پرانے بودھ میں شاہی ہمدانی مسجد آباد ہے۔ خان یار میں دست گیر صاحب کی زیارت اور چرار شریف میں نند رشی نورالدین کی درگاہ موجود ہے... جہاں بھی مذاہب کے ماننے والے لوگ پوجا اور عبادت کرتے ہیں۔ جب کوئی کشتی یا شکارہ پانی میں اتارا جاتا ہے تو رشیوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ اسی روایت کو کشمیر کا صوبیدار شیر افگن اور شہنشاہ اورنگ زیب توڑ دینا چاہتا تھا۔

— اسی لیے حضور! جب کشمیری پنڈتوں سے ظلم برداشت نہیں ہوئے تو پنڈت کرپا رام ایک جتھا لے کر گرو جی تیغ بہادر صاحب کے پاس پہنچے تھے۔ انھیں گرو دیو کی طاقت پر پورا بھروسہ تھا۔ ظلم اور جبریہ تبدیلیٔ مذہب کی داستان سن کر گرو دیو نے کہا کہ جب تک کوئی عظیم شخصیت مذہب کے تحفظ کے لیے خود قربانی نہیں کرتا تب تک دھرم کو بچا پانا ممکن نہیں ہے... ابھی سنگت میں بیٹھے لوگ اس مسئلے پر سوچ ہی رہے تھے کہ پاس بیٹھے نو برس کے گرو بیٹے گووند رائے نے کہا — پتا مہاراج! بھارت کی سرزمین پر اس وقت آپ سے بڑھ کر عظیم شخصیت اور کون ہے؟ آپ ہی دھرم کی حفاظت کر سکتے ہیں...

— پھر؟ پھر گورو جی نے کیا فیصلہ کیا؟

— انہوں نے پنڈت کرپا رام سے کہا، تم لوگ بادشاہ اورنگ زیب کے پاس جاؤ اور کہو کہ اس وقت ہمارے نیتا گرو تیغ بہادر ہیں جو گرو نانک کی گدی پر براجمان ہیں۔ اگر وہ اسلام مذہب قبول کر لیتے ہیں تو ہم بھی ہندو اسلام مذہب کو قبول کر لیں گے... یہ خبر ملتے ہی اورنگ زیب بہت خوش ہوا... اردلی بتانے لگا — اس نے فوراً گورو مہاراج کی گرفتاری کا فرمان جاری کیا اور کشمیر میں چل رہے تبدیلیٔ مذہب اور ظلم کو فی الوقت روک دینے کا حکم دیا۔

— پھر؟

— پھر شہنشاہ اورنگ زیب کے فرمان کے مطابق دلی کے قاضی عبدالوہاب کو گرو مہاراج کے تبدیلیٔ مذہب کے لیے تعینات کیا گیا۔

— نہیں، یہ غلط ہے، بالکل غلط ہے! ایک بے حد بزرگ شخص نے ادیب کے سامنے حاضر ہو کر چیختے ہوئے کہا — جو ایرا غیرا نتھو خیرا آتا ہے وہ عالمگیر پر الزام لگا کر مغلیہ سلطنت کے ہمارے سب

سے سرخرو آخری بادشاہ پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ غلط الزاموں کی اس بددیانتی کو برداشت نہیں کرے گی!

— آپ کی تعریف؟ ادیب نے پوچھا۔

— میں ہی دلی کا وہ قاضی عبدالوہاب ہوں جس کا ذکر آپ کے اس کافر اردلی نے ابھی ابھی آپ کی مجلس میں کیا ہے۔

— قاضی صاحب! میں کافر نہیں، میں پانچ وقت کا پکا نمازی ہندوستانی مسلمان ہوں... کفر تو آپ جیسے تنگ نظر وہابی ملاؤں نے ڈھایا تھا... ورنہ خواجہ معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو جیسے بڑے دماغ اور کھلے دل والے اولیاء نے آپ جیسوں اور عالمگیر اورنگ زیب سے صدیوں پہلے اسلام کو ایک عالمی مذہب بنا دیا تھا... لیکن آپ جیسے کٹر چشتی وہابیوں نے مذہب کو جب سے تلوار کے سپرد کر دیا، تب سے آج تک ہمیں آپ جیسے کٹ ملاؤں کے ظلموں کے جواب دینے پڑ رہے ہیں۔ ظلم آپ لوگوں نے کئے ہیں، لیکن اس کی سزا ہم ہندوستانی، پاکستانی، افغانی، داغستانی، چیچنیائی، تاژکستانی، مسلمان بھگت رہے ہیں...

— خاموش! قاضی عبدالوہاب چیخ پڑے — میں آخرت کے دن کے لیے سویا پڑا تھا لیکن تم جیسے کافر مسلمانوں نے میری روح کی نیند حرام کر دی، اس لیے مجھے تمہاری اس نامراد مجلس میں آنا پڑا...

— قاضی صاحب! یہ مجلس نہیں، وقت کی عدالت ہے... تمام صدیوں کے اس وقت کی عدالت، جو انسان کی روح پر بھاری پڑتی ہے... صدیوں کی اسی تحقیق کے مقدمے اس عدالت میں چل رہے ہیں تاکہ اپنے دل کی عدالت میں سچ کے فیصلوں کو حاصل کر کے، دنیا کی ہر روح، خود کو مہاجر ہونے سے بچا سکے اور دنیا کی اس سرائے میں بے خوف سکون سے اپنا وقت گزار سکے! اردلی نے آگے آ کر کہا۔

— ادیب عالی! اگر یہ مجلس نہیں، عدالت ہے تو میں درخواست کروں گا کہ میرے دور کی تاریخ کو طلب کیا جائے! قاضی عبدالوہاب نے کہا۔

— تاریخ کو حکم دو کہ وہ عدالت میں حاضر ہو! ادیب نے کہا۔

سترہویں صدی کی لہولہان تاریخ فوراً حاضر ہوئی۔

— حضور عالی! آپ نے مجھے طلب کیا!

— جی ہاں... لیکن آپ تو اتنے لہولہان ہیں کہ اپنے خون کو چاٹنے میں ہی آپ کو صدیاں لگ جائیں گی...

— یہ تو میرے ساتھ ہمیشہ ہوتا رہا ہے... جب جب انسان کو مارا گیا تو میرا ہی خون بہا ہے... ہر تہذیب کے ساتھ میں ہی مرا ہوں اور ہر اگلی تہذیب میرے اس بہتے خون کے بیج سے پیدا ہوئی ہے... جیسے قدرت کی جڑیں، پہاڑ، سمندر، خلا اور زمین کے درختوں میں موجود ہیں، اسی طرح میری جڑیں انسان کی سوزش، آکاش، خوابوں اور سکھ کی تلاش میں موجود ہیں! اور میں کہہ سکتا ہوں ادیب عالی کہ اضافی مفاد، سکھ، اضافی مذہبیت، اضافی اقتدار کی ہوس نے ہی ہمیں جابر، و لاچار بنایا ہے... خیر چھوڑیے... یہ بتائیے کہ آپ نے مجھے کیوں طلب کیا ہے؟

— اس اصلیت کی تصدیق کرنے کے لیے کہ گرو دیو تیغ بہادر کا قتل کیوں اور کن حالات میں ہوا ہے؟ ادیب نے پوچھا۔

— حالات تو واضح ہیں جناب! جن فتووں اور منادیوں کے ذریعے اورنگ زیب نے دارا شکوہ کو ہندو پرست قرار دیا تھا، اس ذہنی ماحول سے عوام کو واپس لانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اورنگ زیب کو خود ان فتووں کی قید قبول کرنی پڑی، جو اس نے جاری کروائے تھے... وہ شہنشاہ تو ضرور تھا لیکن ان فتووں کا غلام تھا۔ اس لیے گرو تیغ بہادر کی شہادت ایک غلام بادشاہ کی ذہنی غلامی کا نتیجہ تھا...

— نہیں! تاریخ غلط بیانی کر رہی ہے! بیچ میں قاضی عبدالوہاب نے دخل اندازی کی — عالمگیر کسی کمزوری کا غلام نہیں، وہ صرف اسلام کا غلام تھا!

— تو کیا بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر وغیرہ اسلام پرست نہیں تھے؟... تاریخ نے مداخلت کی — ادیب عالی! دلی کے تخت کو پانے کے لیے اورنگ زیب نے مذہب کو تلوار بنایا تھا۔ دارا شکوہ کو مارنے کے بعد وہ ذہنی پیچیدگی کا شکار ہو گیا تھا... اس کی اسی ذہنی پیچیدگی کا نتیجہ تھا کہ اس نے بھارت میں رہ رہے مسلمانوں کو ذہنی طور سے مہاجر بنا دیا تھا۔ وہی ذہنی مہاجرت لگ بھگ دو صدیوں کے بعد تقسیم کی وجہ بنی... اسی مہاجرت کے شکار علامہ اقبال ہوئے جن کے کشمیری پنڈت اسلاف، کول، اسی دور میں مسلمان بنے... شروع شروع میں ان کی شاعری اپنے جڑوں کی بات کرتی رہی، لیکن بعد میں ان کی شاعری نے اسلام جیسے بڑے اور انسان پرست مذہب کو صرف مسلمانوں کے لیے محدود کر دیا۔ اسی ذہنیت نے ہندوستانی مسلمان کو اپنے ہی ملک میں اجنبی بنا دیا...

— نہ معلوم کیوں، آج کے دور میں ہر شخص بھاشن دینے کی عادت کا شکار ہو گیا ہے... اردلی نے قاضی عبدالستار سے سرگوشی کی۔

— تاریخ نے یہ بات سن لی اور اپنی روش پر لوٹ آیا — میں معافی چاہتا ہوں ادیب حضور! آپ جاننا چاہتے تھے کہ گرو تیغ بہادر کا قتل کیوں اور کن حالات میں ہوا... تو ہوا یہ تھا حضور عالی کہ

گورو جی کی گرفتاری کا فرمان جب تک آنند پور صاحب پہنچتا، تب تک گورو جی گرو کے منصب کی ذمہ داری گووند رائے کو سونپ کر لکھ جگاتے نکل پڑے تھے۔ وہ روپڑ، سیف آباد، سامانا، کیتھل، روہتک، اور پلول ہوتے ہوئے آگرہ پہنچ گئے تھے۔ وہیں انہیں حراست میں لے لیا گیا اور دلی لایا گیا اور دلی میں انہیں قاضی عبدالوہاب صاحب کے ذریعہ اُن کے سامنے اسلام قبول کرنے کی پیش کش کی گئی۔ گورو صاحب نے سختی سے اِن کی پیش کش کو نامنظور کر دیا۔ تب اورنگ زیب نے گورو صاحب کو سزائے موت دینے کا فیصلہ کیا اور سامانا سے جلاد جلال الدین کو بلا لیا گیا۔

— یہ غلط ہے! شہنشاہ اورنگ زیب نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں لیا تھا۔ وہ تو دلی میں اُس وقت تشریف فرما بھی نہیں تھے۔ وہ حسن ابدال میں تھے! قاضی عبدالوہاب نے زور دے کر کہا۔

— تو کیا آپ نے اُن کی موت کا فیصلہ لیا تھا؟

— نہیں... میں دلی کا قاضی ضرور تھا، لیکن ایسا کوئی فیصلہ کرنے کا حق مجھے حاصل نہیں تھا۔

— تو پھر تم شہنشاہ کو بچانے کی کوشش مت کرو۔ میں سارے حادثے کا چشم دید گواہ ہوں... یہ ٹھیک ہے کہ فرمان جاری کر کے بزدلوں کی طرح اورنگ زیب دلی سے حسن ابدال چلا گیا تھا... لیکن بھاری بھیڑ کے سامنے چاندنی چوک میں، اس پیپل کے درخت کے نیچے گورو جی کو موت دینے کا جو فتویٰ پڑھا گیا تھا، وہ اورنگ زیب کے نام اور شاہی مہر سے ہی جاری ہوا تھا... اور قاضی عبدالوہاب! تم تو اُس بھیڑ میں خاص شاہی نمائندے کی طرح سب سے آگے کھڑے تھے!

تاریخ کی یہ گواہی سن کر دلی کے قاضی نے گردن جھکا لی۔

— لیکن گورو مہاراج کی گردن تمہاری طرح جھکی ہوئی نہیں تھی۔ اُن کی گردن فخر سے تنی ہوئی تھی... ادیب عالی! سورج کی سوئیاں صبح کے دس بجا رہی تھیں۔ جگہ وہی — چاندنی چوک! دن جمعرات، تاریخ ۱۱ نومبر ۱۶۷۵ء تب اسی قاضی نے جلاد جلال الدین کو اُن کا تنا ہوا سر قلم کرنے کا اشارہ کیا تھا۔ جلاد کے سامنے مشکل پیش تھی۔ جھکے ہوئے بہت سے سروں کو اُس نے قلم کیا تھا... لیکن اتنا بے خوف سر تو اس کی تلوار نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی مشکل بھانپ کر تب اسی قاضی نے اُسے بتایا تھا کہ اوپر سے ممکن نہیں ہے تو نیچے ٹھوڑی کی طرف سے سر قلم کر دیا جائے اور تب جلاد جلال الدین نے الٹے ہاتھ سے تلوار کا وار کر کے اُن کا سر دھڑ سے الگ کر دیا...

اور تب ایک نظارہ پھر حاضر ہوا۔ چاندنی چوک میں گورو تیغ بہادر کا دھڑ پیڑ کے تنے کی طرح کھڑا تھا اور کٹا ہوا سر نیچے کہیں گرا تھا۔ وہ آتش کی چکری کی طرح تیزی سے چکرا رہا تھا۔ خون کی سرخ بوندوں کی جگہ اُس میں سے چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ بھیانک کالی آندھی چل پڑی تھی۔ اُس

میں وہ چنگاریاں ٹوٹتے ہوئے ستاروں کی طرح جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ کالی آندھی کے ساتھ ہی ایک زبردست بھونچال آیا... عمارتیں ہلنے لگیں، چاروں طرف دن میں اندھیرا چھا گیا۔

اس آندھی، بھونچال، دھول اور غبار کا فائدہ اٹھا کر بھائی جیتا نے اپنی جان داؤ پر لگائی۔ گرو جی کا سر اُس نے بیچ ہوا سے تھاما اور جمنا ندی پار کر کے باغپت سے ہوتا ہوا وہ آنند پور صاحب کی طرف چل پڑا۔ پھر اسی بھگدڑ، آندھی، دھول دھکّڑ کے دوران لال قلعہ میں چونا مٹی پہنچانے کی مزدوری پر لگے لکھی والے لکھی شاہ نے چھپتے چھپاتے گورو مہاراج کے کھڑے ہوئے جسم کو لکھی میں لٹایا اور مٹی چونے کے بوروں سے ڈھانپ کر وہ اُسے اپنی جھونپڑی میں لے آیا۔ اپنی جھونپڑی میں ہی اُس نے گورو جی کی چتا تیار کی۔ گھر کا سارا سامان چتا پر لگا کر اس نے گورو جی کی آخری رسومات ادا کیں—

— آخر بھونچال تھما، آندھی رکی، اندھیرا چھٹا، تب مغل سپاہی گورو جی کا جسم اٹھانے آئے، لیکن وہاں نہ تو اُن کا سر تھا نہ جسم۔ بھائی جیتا رنگ ریتا گورو صاحب کا سر لے کر آنند پور صاحب پہنچ چکا تھا۔ ماتا گجری نے پلٹی، گورو صاحب کا سر ہاتھوں میں لیا اور شاگردوں سمیت کیرت پور جا کر آخری رسومات ادا کر دیں۔

— مغل سپاہیوں کا دوسرا دستہ آیا، مگر اُسے بھی گورو جی کے جسم کا کوئی حصہ نہیں ملا۔

اور تب اچانک اردلی نے حیرانی سے دیکھا۔ عدالت تو بھری ہوئی تھی لیکن ادیب غائب تھا! وہ فرار ہو گیا تھا۔

۳۰

اردلی پریشان تھا۔

فرار ادیب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

صرف اُس کی آواز الگ الگ جگہوں اور سمتوں سے آ رہی تھی۔ اردلی پریشانی سے ایک آواز کا پیچھا کرتا، تو دوسری سمت سے آواز آنے لگتی۔ تیسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی سمت سے۔ اردلی حیران تھا۔ آخر کتنی سمتیں ہیں؟ آخر اس نے آواز لگائی — ادیب عالی!... ادیب عالی!... آپ کہاں ہیں؟... کہاں ہیں آپ؟

— میں اپنی زندگی کی پناہ میں ہوں...

— لیکن کہاں؟ کس جگہ؟

— تمام جگہیں ہیں جہاں میں ایک ساتھ موجود ہوں... ابھی میں زینب اور بوٹا سنگھ کے پاس راجستھان کے ریگستان میں تھا... اور ابھی ابھی میں کوئٹہ شہر میں موجود ہوں... یہاں میں سلمیٰ کو تلاش کرنے آیا ہوں... اسے تلاش ہی کر رہا تھا کہ کانپور اسٹیشن پر وِدیا کا رومال پھر گرا... اور میں وِدیا کی تلاش میں نکل پڑا...

— وِدیا سے ملاقات ہوئی؟

— نہیں... لیکن اُس کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہوا...

— کیا؟ کیا کیا پتہ چلا؟

— یہی کہ پڑھائی چھوڑنے سے پہلے اُس نے جس بات کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ صحیح تھا۔ اُس کے چچا بابو رام نرائن نے اُس کی شادی کی بات چلا رکھی تھی۔ لڑکے والے دِلّی کے رام نگر علاقے میں رہتے تھے، صدر کے پاس۔ وہی علاقہ جہاں نئی دِلّی اسٹیشن کے پاس سارے شہر کا کچرا جمع ہوتا تھا اور کوڑے کی گاڑیاں جہاں سے روانہ ہوتی تھیں۔ لڑکے والوں نے کہا تھا کہ بابو رام نرائن لڑکی کو لا کر وہاں دکھا دیں۔ اس لیے وہ وِدیا کو ساتھ لے کر فتح گڑھ سے دلی کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

— شادی کی تاریخیں، لڑکی دکھائی، جنم پتری ملوائی، ساعت نکلوانا وغیرہ رسومات کے لیے خاندان کے سبھی لوگ کھڑے ہوتے تھے۔ وہ چاہے برسہا برس نہ ملتے ہوں، لیکن شبھ کام کے وقت سب ملتے تھے، مع بال بچوں کے بڑے بوڑھے بھی آتے تھے۔ لیکن ابھی شادی تو تھی نہیں، صرف وِدیا کو دیکھنے کی رسم تھی۔ کنبہ ہی کتنا سا تھا۔ وِدیا کے چچا بابو رام نرائن، اس کی ماں اور ایک چھوٹا بھائی۔ قرول باغ میں اُن کے دور کے ایک بہنوئی رہتے تھے۔ انہیں کے گھر پر وِدیا کا خاندان اترا تھا۔ پہلے تو یہ طے ہوا تھا کہ رام نگر کے ایک مندر کے احاطے میں وِدیا کو دیکھنے کی رسم ہو گی، لیکن بعد میں لڑکے والوں نے انہیں گھر پر ہی مدعو کیا تھا۔

— وِدیا کو دکھانے کے لیے تیار کیا گیا۔ بہنوئی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ ساتھ نہیں جا سکے۔ انہوں نے روہتک روڈ والے موڑ تک پہنچا کر رام نگر جانے کے لیے تانگہ منگوا دیا... پھر تانگہ کہاں گیا، یہ نہیں معلوم...

— کیوں؟

— کیونکہ یہ تاریخ ۳ رجون ۱۹۴۷ تھی۔

— مطلب؟

— مطلب یہ کہ جب روہتک روڈ کے موڑ سے وِدیا کا چھوٹا سا خاندان تانگے میں رام نگر کے لیے روانہ ہوا، اُسی وقت وائس رائے کے ہاؤس میں وہ اہم میٹنگ ختم ہوئی جس میں وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ، نہرو، جناح، سردار پٹیل، آچاریہ کرپلانی، سردار بلدیو سنگھ، لیاقت علی خاں اور عبدالرب نشتر شامل تھے... اور بھارت کا انگریز وائسرائے ماؤنٹ بیٹن ایک فیصلہ لے چکا تھا... اصل میں وہ فیصلہ بہت پہلے لے چکا تھا!

— کون سا فیصلہ؟

— ہندوستان کی تقسیم کا!

— یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اردلی نے خالی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

— اردلی صاحب! ادیب کی آواز نے کہا— کتابوں میں جو تاریخ لکھی یا لکھوائی جاتی ہے... اور ملاقاتوں میں جو درج کر دیا جاتا ہے... پیشہ ور قلمکاروں کے ذریعہ جس طرح واقعات کے سہارے دستاویزی تاریخ بنائی جاتی ہے، وہ تاریخ نہیں ہوتی... تاریخ وہ ہوتی ہے جو دل و دماغ کی تختی پر لکھی جاتی ہے... اور اس عبارت کو کوئی پڑھ نہ لے، اس لیے اُسے فوراً مٹایا جاتا ہے... اس مٹی ہوئی عبارت کو صرف وہی ادیب پڑھ سکتا ہے جو سقراط، گوتم، بدھ، عیسیٰ یا گاندھی کی زبان پڑھ سکتا ہے...

— تو پھر آپ اس عبارت کو پڑھنے سے کترا کیوں رہے ہیں...؟ سامنے آئیے اور اُس عبارت کو بے پردہ کیجئے! اردلی نے ادیب کو جیسے چنوتی دی۔

— اردلی صاحب! ادیب کی گونجتی ہوئی آواز آئی— مجھے اپنی زندگی کی پناہ میں رہنے کی مہلت دیجئے... میری زندگی کی ساری کہانیاں ادھوری ہیں... مجھے مہلت چاہیے کہ میں اپنی کہانیوں سے ملاقات کر سکوں۔ مجھے معلوم کرنا ہے کہ وِدیا کے تانگے کا گھوڑا اچکا کر اُسے کہاں لے اڑا...؟ خدا حافظ کہہ کر سلمیٰ مجھے خدا کے حوالے کر گئی تھی، لیکن وہ خود حفاظت سے ہے یا نہیں، یہ معلوم کیے بغیر میرا جینا محال ہے۔ کوئی ماؤنٹ بیٹن، اسمٹس، کرپس، چرچل، نہرو یا جناح مجھے اگلی صدیوں میں انسان کی طرح جی سکنے کا راستہ نہیں دکھاتا... وہ راستہ مجھے صرف سلمیٰ دکھاتی ہے... کیونکہ سلمیٰ ایک کہانی ہے... شاہین ایک کہانی ہے... بوٹا سنگھ اور زینب ایک زندہ کہانی ہیں... ملتان سے بھاگ کر امرتسر جانے والی سرجیت کور ایک زندہ داستان ہے... وہ جو پنچ صاحب سے بھاگ کر بمبئی کے ماؤنٹ میری چرچ میں بھیک مانگتا ہوا کبیر نام کا بھکاری آیا ہے، وہ ایک جیتی جاگتی انسانی کہانی ہے... اردلی صاحب! مجھے اپنی ان کہانیوں کے ساتھ جینے دیجئے...

—وقت نے ذاتی عیاشی کرنے کا یہ حق آپ کو نہیں دیا ہے۔ پردے سے باہر آیئے اور تاریخ کے اِن سوالوں کا مقابلہ کیجئے۔ کیونکہ تاریخ کے غلط منصوبوں نے آپ کی ساری کہانیوں کے انسانی انجام اپنی گرفت میں لے لیے ہیں... اگر آنے والی صدیوں کو انسانی اور روحانی راحت دینی ہے تو آپ کو اپنی کہانیوں کے لیے تاریخ کے غلط منصوبوں سے جھگڑنا ہی پڑے گا!

—تو تم مجھے کسی طرح چین نہیں لینے دو گے! ادیب کی شکستہ آواز نے کہا— تم مجھے اپنی کہانیوں، اپنی زندگی کے ساتھ جینے کا موقع اور وقت نہیں دو گے؟

—نہیں، یہ اس دور میں ممکن نہیں ہے! یہ دور راجستھان میں جا کر بوٹا سنگھ اور زینب کی کہانی مکمل کرنے کا دور نہیں ہے... یہ وقت کوئٹہ میں جا کر سلمیٰ کو آواز دینے کا وقت نہیں ہے اور یہ لمحہ دتیا کے تانگے کو تلاش کر کے لنگڑے گھوڑے کی شناخت کا لمحہ بھی نہیں ہے... ادیب عالی! اپنی کہانیوں سے نکل کر باہر آیئے!

کچھ دیر مذبذب سی خاموشی چھائی رہی۔ پھر اچانک نہ جانے کس جگہ سے نکل کر ادیب اپنے اردلی کے سامنے حاضر ہوا۔

—اردلی صاحب! میں آپ کی عدالت میں حاضر ہوں! آپ جو کہئے میں کروں گا... لیکن میں اُس بھیک مانگنے والے کبیر کا کیا کروں جو پچھو صاحب سے چل کر ماؤنٹ میری کے چرچ تک پہنچ چکا ہے۔ ایک شاعر نے مجھے بتایا ہے کہ بھکاری کبیر جیسے پاکستان میں بھیک مانگتا تھا، ویسے ہی ہندوستان میں بھی ماؤنٹ میری چرچ پر بھیک مانگنے چلا آیا ہے... پھر جب پاکستان میں رمضان کا مہینہ آئے گا، تو وہ وہاں لوٹ جائے گا۔ ہمیشہ کی طرح بھیک مانگے گا، کمائے گا۔ ضرورت پڑی گئی تو بارڈر کراس کرنے کے لیے کشمیر میں موت برپا کرنے والے مجاہدین کے لیے چندہ بھی دے گا اور بھارت آ جائے گا۔ پھر یہاں کمائے گا۔ ماؤنٹ میری چرچ پر میلے میں بھیک مانگے گا یا مہالکشمی مندر پر بھیک مانگنے والوں کی قطار میں بیٹھ جائے گا اور ضرورت پڑ گئی تو کارگل میں شہید ہوئے جوانوں کے لیے بھی چندہ دے گا۔ اردلی صاحب! تقسیم کے بعد بچا کیا ہے۔ بھوک اور بھیک کے سوا؟ یہی تو دو حصوں میں بٹ گئے بھکاری کبیر کی وراثت ہے اور تقسیم ہو گئے ملکوں کا نصیب۔

اردلی نے غور سے ادیب کو دیکھا۔

—کیسے میں بھول جاؤں ملتان کی اُس بے حد خوبصورت عورت سرجیت کور کو! ادیب نے بڑے دکھ سے کہا۔

—کون سرجیت کور؟

وہی سرجیت کور جس کا بیٹا تقسیم کے دن سے آج تک بے ہوش ہے۔ وہ بوڑھی سرجیت کور آزادی کی نہیں اپنے بے ہوش بیٹے کی دیکھ بھال آج تک کر رہی ہے...

—یہ تو عجیب سی پہیلی ہے۔

—یہ پہیلی نہیں، حقیقت ہے— جس وقت دلی کے وائسرائے ہاؤس کے کمرے میں ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کو آزادی کی شرط بنا دی تھی، اُس وقت اُسی کمرے میں لگی کلائیو کی تصویر مسکرائی تھی اور لندن کی اپنی حویلی میں سوتے ہوئے چرچل نے جاگ کر سگار سلگایا تھا اور اُس کا ایک بھرپور کش لیا تھا۔ یہ وہی ۳ رجون ۱۹۴۷ء کی شام تھی، جب ماؤنٹ بیٹن نے آل انڈیا ریڈیو سے آزادی کے ساتھ تقسیم کا اعلان کیا تھا۔ نہرو اور جناح کی آوازوں نے اُس اعلان کی تائید کی تھی...

—یہ تو تاریخ کو معلوم ہے!

—لیکن تاریخ کو نہیں پتہ کہ اورنگ آباد میں اپنی قبر سے اُٹھ کر تب اورنگ زیب نے اپنے بیٹے اعظم کو کیا خط بھیجا تھا؟... میرے بیٹے... یہ چٹھی میں نے اپنی موت سے کچھ دن پہلے لکھی تھی۔ لیکن میں اسے تین صدیوں کے بعد کچھ اور باتوں کے ساتھ آج تمہیں بھیج رہا ہوں۔ میں اس جہانِ فانی میں اکیلا آیا تھا اور اجنبی کی طرح چلا جاؤں گا... آج آسمان میں آوازوں کی کچھ لہریں اٹھیں، تو میری روح جاگ گئی۔ آج معلوم ہوا کہ جو زیادتیاں مجھ سے ہو گئی تھیں، اُن کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ میں بہت سے گناہوں کا قصوروار ہوں... تب تو لگا تھا کہ میں اجنبی کی طرح چلا جاؤں گا، لیکن اب ان آوازوں کو سننے اور ان کے فیصلے جاننے کے بعد لگ رہا ہے کہ مجھے اپنے گناہوں کے بوجھ سے اب چھٹکارہ نہیں ملے گا... نہ معلوم، آخرت کے دن مجھے کیا سزا ملے گی... میں نے دین کی خاطر جو کچھ کیا، وہ یہی سوچ کر کیا تھا کہ اس سے ایکتا بڑھے گی... میرا وہ قدم غلط ثابت ہوا... لیکن دیش کی ایکتا میں نے کبھی ٹوٹنے نہیں دی۔ میں نے خود کو بھی پردیسی یا بدیشی نہیں سمجھا... میں نے مذہب کو ضرور الگ مانا؟ لیکن قومیت کبھی تقسیم نہیں کی...

—لیکن وہ تقسیم انگریزوں نے کر دی؟ راج گھاٹ سے مدھم سی آواز آئی— یہ تو ۳ رجون کی بات ہے... میں نے تو ایک مئی ۱۹۴۷ء کو ہی پرارتھنا سبھا میں کہا تھا، اگر انگریز نہیں چاہے گا تو جناح صاحب کو کبھی پاکستان نہیں مل سکتا... میں نے تو کہا تھا، منت کر کے کہا تھا... انگریزو! تم ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو... بھگوان کے بھروسے چھوڑ دو۔ بدامنی ہوگی، دنگے فساد ہوں گے، خانگی جنگ ہوگی، ہم دیکھ لیں گے... جو قتل و غارت گری ہوگی، اس میں سے ہم تپ کر نکلیں گے... ہماری تہذیب مہابھارت کی جنگ جھیل چکی ہے۔ اس جنگ عظیم کے کشش و پیچ سے ہی گیتا کا بے غرض کرم

واد نکلا ہے۔ اس کرم واد نے ہی برہمن وادی ورن واد کو مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔ اک لوٹیہ کی اہانت اور ذلت کا بدلہ درونا چاریہ کی خون سے ملوث موت نے لیا تھا... میں تو پھر مت کرتا ہوں کہ انگریز وا تم ہماری آزادی کی شرطوں کو طے کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے... تم ہمیں آزادی دینے کا یہ جو ناٹک کر رہے ہو، یہ تمہاری مہربانی نہیں، یہ ہندوستانی عوام کی مہربانی ہے کہ وہ تمہیں مہذب طریقے سے وداع کر رہی ہے... اگر وہ وداع نہیں کرے گی تو خانگی جنگ تو بعد میں ہوگی آپ کا قتل عام پہلے ہو جائے گا! اہنسا کے تحت یہ قتل عام مجھے منظور نہیں ہے...

— کہتے ہوئے راج گھاٹ کی آواز ڈوب گئی؟ لیکن اسی وقت ایک حادثہ ہوا— بھنگی کالونی میں کھڑے گاندھی جی پر تلوار کا ایک وار ہوا۔ اُن کا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا... لیکن امیدیں دونوں حصوں کو سنبھالے رہیں... گاندھی جی اپنے کٹے ہوئے جسم کو لے کر زندہ رہے... اس تقسیم شدہ جسم سے خون بہتا رہا... لیکن وہ مرا نہیں۔

— صلیب پر لٹکے عیسیٰ مسیح نے دیکھا۔ پاک پیغمبر محمدؐ نے بھی دیکھا۔ گاندھی جی کا منقسم جسم جوں کا توں بھنگی کالونی میں کھڑا تھا...

— اور منصوبہ بند تاریخ کھڑی تھی... جو مہاتما گاندھی کے خوابوں کو توڑ کر ماؤنٹ بیٹن کی سازشی کوششوں کو سچ بنانا چاہتا تھا... اس نے ادیب کو دیکھا۔

— ماؤنٹ بیٹن کو عدالت میں حاضر کرو! اپنی کہانیوں کو پیچھے چھوڑ کر ادیب نے حکم دیا۔

۳۱

ماؤنٹ بیٹن ادیب کی عدالت میں موجود ہوا۔

عدالت بھری تھی۔ دنیا کے ہر اُس علاقے کے لوگ موجود تھے، جن میں برٹش حکومت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ حکومت جس میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا تھا۔ ایک نوآبادی، مخصوص ریاست، محکوم ریاست خود مختار ریاست یا علاقے میں سورج ڈوبتا تھا، تو کہیں دوسرے برٹش علاقے میں طلوع ہو رہا ہوتا تھا... ایک چوتھائی دنیا اس حکومت کے قبضے میں تھی۔ ان میں ہندوستانی تھے، نیپال کے گورکھا تھے، افغانی پٹھان تھے، افریقہ کے حبشی، سوڈان کے افریقی، سائپرس، جمائیکا، ملیشیا، چین، ہانگ کانگ، بورنیو، کناڈا کے باشندوں کے ساتھ ساتھ نیوزی لینڈرس اور آسٹریلیائی بھی تھے۔ برٹش حکومت تو ختم ہو چکی تھی، لیکن اس کا آخری شاہی نمائندہ ماؤنٹ بیٹن آج عدالت میں موجود تھا۔

چاروں طرف سوال ہی سوال تھے۔ جرح کرنے کے لیے گھور گھور کر دیکھتی آنکھیں تھیں۔

اردلی نے تاریخ کے کچھ صفحات کھولے— حضور عالی! فاشزم پر فتح پانے کے بعد برطانیہ اور اُس کے دوست ممالک نے راحت کی سانس لی ہے لیکن ۱۹۳۶ء کے کرسمس اور ۱۹۳۷ء کے نئے سال کی رہنمائی کے لیے انگریزوں کے دل میں کوئی خاص امنگ نہیں ہے۔ تانا شاہ ہٹلر نے پورے لندن شہر کو تباہ کر دیا ہے۔ بجلی نہیں ہے، دودھ نہیں ہے، صبح کی چائے نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود لندن کے مغرور، منظم اور بہادر شہری اپنی فتح، تاریکی سے تر کرسمس اور اداس نئے سال کا استقبال کر رہے ہیں۔ عام انگریز شہری کے دل میں صرف جنگ کے خلاف دعائیں ہیں۔ وہ اندھیرے چرچوں میں جاکر انسان کے تحفظ کی دعائیں مانگ رہے ہیں... دوسری عالمی جنگ سے پہلے جن گرجا گھروں میں لاکھوں موم بتیاں جلتی تھیں، وہاں اب صرف ایک موم بتی جل کر بچی ہوئی زندگی کو اجالا دے رہی ہے۔

لیکن اس کے باوجود مہارانی وکٹوریہ کے اولادوں کی مغرور سامراجی ذہنیت اور روایت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ بکنگھم پیلس اور انگریز جاگیرداروں کی حویلیوں میں فتحیابی کی خوشی اور نئے سال کے استقبال میں بے حد مہنگا اور نایاب ٹرکی کا گوشت پک رہا ہے۔ ٹرکی نسل کی پٹھیں فن لینڈ اور مصر سے درآمد کی گئی ہیں۔

ادیب جیسے بکنگھم پیلس کی طرف دیکھنے لگا۔

— حضور عالی! اردلی محمود نے ادیب کو مخاطب کیا— ابھی لندن میں مرے لوگوں کی لاشوں کے کفن اور دفن کا موقع نہیں ملا ہے۔ ٹریفلگر اسکوائر میں نیلسن کے ٹوٹے بت کے نیچے سیکڑوں لاشیں اور مرے ہوئے ہزاروں کبوتر ابھی بھی اپنی موت کا ماتم منا رہے ہیں... لیکن انگریز جاگیرداروں کے محلوں اور حویلیوں میں ابھی بھی ٹرکی ذبح کر کے نئے سال کے استقبال کا جشن چل رہا ہے۔ کہتے ہوئے اردلی محمود نے اپنے سوالوں کی فہرست سنبھال لی۔

تبھی کانگو کے ایک حبشی نے درمیان میں ٹوکا— ادیب عالی! یہ انگریز اور بلجیم کے گورے ہمیں حبشی کہتے ہیں، لیکن جب انہیں ایٹم بم بنانے کے لیے یورینیم کی ضرورت پڑی تھی تو یہی لوگ ہمیں اپنا بھائی کہتے ہوئے کانگو آئے تھے... امریکی ان کے ساتھ تھے اور انہوں نے ہی تب ہماری اس صدی کے سب سے بڑے طبیعاتی سائنس داں آئن اسٹائن سے بلجیم کی مہارانی کو خط لکھوایا تھا کہ کسی بھی قیمت پر کانگو کا یورینیم جرمنوں کے ہاتھ نہ بیچا جائے۔ یہیں سے، آپ کے سامنے اس عدالت میں موجود ماؤنٹ بیٹن کی نسل نے اپنی روایتی سازشوں کا آغاز کیا تھا...

— تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ ادیب نے مداخلت کی۔

—یہی کہ ان انگریزوں کے بیانوں پر بہت بھروسہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ حکمراں خاندان کے نہیں ہیں، لٹیرے اور ڈاکو ہیں۔ ان کے ڈاکو اسلاف نے خاندانی حکومت کی روایت یورپ میں شروع کی ہے۔ پوچھیے اس ماؤنٹ بیٹن سے کہ اس کا یہ نیلا خون کہاں سے آیا ہے؟

ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تاریخ سے جواب پانے کے لیے لارڈ ایز مے اور اپنے سیاسی مشیر کونارڈ کورفیلڈ کی طرف دیکھا۔ لارڈ ایزمے خاموش تھا۔ مشنری کا بیٹا کونارڈ کورفیلڈ بغلیں جھانک رہا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو اپنے نیلے خون کا پتہ تو تھا، لیکن وہ جھجک رہا تھا۔

اُسے خاموش دیکھ کر اردلی محمود نے اُس کا شجرہ پیش کیا— ادیب عالی! ماؤنٹ بیٹن بھگوڑے شاہی خاندان کا آخری نمائندہ ہے۔ اس کے خاندان کے لوگ روس سے نکالے گئے تو وہ جرمنی میں بس گئے۔ وہاں جب انھیں برداشت نہیں کیا گیا تو یہ آخر انگلینڈ کے معصوم باشندوں میں گھل مل گئے... پوچھیے ان سے کہ انگلینڈ میں بسنے سے پہلے ان کے آل اولاد کا وجود اور نام کیا تھا؟

—میرے والد کا جرمن نام تب بیٹن ورگ تھا! ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

—تو انھیں اپنا یہ جرمن نام بدلنے کی ضرورت کیوں پڑی؟

—کیونکہ پہلی عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ اُس وقت برطانیہ میں جرمن مخالف جذبات بھڑک چکے تھے اور جرمن نژاد ہونے کی وجہ سے میرے والد کو برطانیہ کے پہلے سی، لارڈ کے عہدے سے استعفےٰ دینا پڑا تھا۔ اپنی حب الوطنی دکھانے کے لیے تب انھیں جرمن نام بیٹن ورگ سے بدل کر ماؤنٹ کرنا پڑا تھا...

—کیونکہ یہ نام نہاد نیلے خون والے بنیادی طور پر عیاش، لٹیرے اور سامراجی تھے... انھیں کے آل اولاد نے پورے یورپ کو اپنی خاندانی جاگیر بنالیا تھا۔ جاگیر کی خاطر یہ اپنا نام اور پہچان بدلنے میں دیر نہیں لگاتے تھے... یورپ کے سارے راج شاہی خاندان، خونی رشتوں یا شادیوں کے ذریعے جڑے ہوئے تھے... پھر چاہے وہ قیصر ہو، روس کا زار نکولس، اسپین کا الفانسو، یا یونان کا کانسٹینٹائن، رومانیہ کا فرڈی ننڈ، سویڈن کا گستاو، ناروے کا ہکون ہو یا یوگوسلاویہ کا الیگزینڈر... اپنی عیاشی کے لیے ان خاندانوں نے ہر سلطنت میں عوام کا بے رحمی سے استحصال کیا اور انھیں دبائے رکھنے کے لیے انھیں کی عورتوں سے جماع کر کے سامنت اور جاگیردار پیدا کیے... ان راج گھرانوں نے جاگیرداروں کو سہولیات کی رواداری کو قابو میں رکھا لیکن عوام کو لوٹنے اور ستانے کے لیے اُس طبقے کو بے لگام چھوڑ دیا...

—اردلی محمود ٹھیک فرما رہے ہیں! وہاں موجود ایک شخص نے کہا۔

—آپ کی تعریف؟

—میں شہنشاہ اکبر کا وزیر خزانہ ٹوڈرمل ہوں!

عدالت میں موجود سبھی لوگوں نے اس عظیم شخصیت کو حیرانی سے دیکھا— اکبر کے نورتنوں میں سے خاص رتن— ٹوڈرمل!

—آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ ادیب نے پوچھا۔

—جی ہاں میں انگریزی حکومت کے آخری وارث سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کے بزرگوں نے زمین کے لگان کے مغلیہ ڈھانچے کو بدل کر زمینداری اور رعیت کے نظام کی شروعات کیوں کی تھی؟

—اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم! ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

—لیکن آپ کو اتنا تو معلوم ہوگا کہ آپ کے ملک کے پہاڑوں میں معدنیات نہیں تھے... دھرتی کے پاس خام مال نہیں تھا... آپ کے ملک میں بے تحاشہ غریبی تھی... اسی کے خلاف آپ کے غریب کسانوں نے بغاوت کی تھی... کسانوں کے 'دی ڈیگرز' تحریک نے آپ کے زمینداروں کا چین حرام کر دیا تھا... تب کسانوں پر آپ کے شاہی گھرانے اور زمینداروں نے ظلم کیے تھے... تو بتائیے، کیا یہ سچ نہیں ہے کہ کسانوں کو کچلنے کے لیے ہی آپ نے زمینداری بندوبست کو ایجاد کیا تھا؟ وہی آپ لوگوں نے بھارت میں لاگو کیا!

—اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے... میں ماہر معاشیات نہیں ہوں... میں رائل امپریل نیوی کا ایڈمرل ہوں... میں برما کا وسکاؤنٹ ہوں! ماؤنٹ بیٹن نے قدرے ترشی اور فخر سے کہا۔

—لیکن اپنے بزرگوں کی کارگزاریوں کے جواب تو تمھیں دینے ہوں گے۔ تم شاہی بیڑے کے ایک ایڈمرل ہو... اس لیے تم نے اپنے بزرگ ولیم ہاکنس جہازی کا نام تو سنا ہوگا!

—مجھے یاد نہیں... شاید میں نے یہ نام نہیں سنا ہے... ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

—تم تو خود کو شاہی جہازی کہتے ہو پھر بھی تمھیں اپنے جہازی بزرگ کا نام نہیں معلوم؟

ماؤنٹ بیٹن نے راجہ ٹوڈرمل کے سامنے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

—ادیب عالی! راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ ساتھ میں بھی کچھ ضروری سوال ماؤنٹ بیٹن سے کرنا چاہوں گا! اردلی نے ادیب سے کہا۔ ادیب نے اُسے دیکھا۔

—یاد کیجیے حضور عالی! جب آپ ماریشس کے مغربی ساحل والے شیراک ہوٹل میں سلمی کے

ساتھ تھے، تب میں آپ کو تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔

—ہاں، مجھے یاد ہے اردلی صاحب! تم نے بار بار ذاتی زندگی میں دخل اندازی کی ہے... تم نے مجھ سے میرا اور میری خوبصورت کہانیوں کا سکون چھینا ہے... تم نے مجھے بار بار شہنشاہوں اور سلطنتوں کی گھٹیا سازشوں، بے ہودے ریاکاریوں کی دنیا میں پھینک دیا ہے... ادیب نے تلخ لہجے میں کہا۔

—حضور عالی! میں آپ کی تکلیف اور ناراضگی کو سمجھتا ہوں... لیکن جب ایک انسانی تہذیب کا مستقبل سوداگری تہذیب میں بدلا جا رہا ہو، جب انسان کے سکون، سکے، سینوں اور ارمانوں کو منافع کی تجوریوں میں قید کیا جا رہا ہو... جب ایک بڑی انسانی تہذیب کو فریبی سوداگروں کے جال میں پھنسایا جا رہا ہو، وہ وقت بہت نازک ہوتا ہے... ایسے وقت میں صرف بازار کی قدریں ہی نہیں بدلتیں، رشتوں کے معیار اور اقدار بھی بدلتے ہیں... دلوں کے احساس بھی بدلتے ہیں... اور تب ناگفتہ تحریکوں سے کہانیوں کے آغاز و انجام بھی بدلتے ہیں... سوچئے حضور عالی! یہ جو تقسیم ہوئی ہے... کیا اس نے ساری کہانیوں کے اختتام نہیں بدل دیے ہیں۔

اردلی محمود کی اس دلیل نے سب کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ عدالت میں موجود ہر شخص اپنے دل میں جھانک کر خود سے جواب مانگ رہا تھا۔

یہ ماحول ماؤنٹ بیٹن کو راس نہیں آ رہا تھا۔ وہ کسمسا رہا تھا، لیکن اس نے سادگی سے کہا— میں اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کر سکتا۔ میں صرف آدھا گھنٹہ اور آپ کو دے سکتا ہوں... اس سے زیادہ نہیں۔ کہتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن نے اپنی گھڑی دیکھی۔

تبھی رئیہ فوڈرل آگے آئے اور بولے— ادیب خاص! میں کوئی بھی سوال پوچھنے سے پہلے ہندوستان کی تاریخ کا ایک صفحہ نہیں سارے صفحات پلٹنا چاہتا ہوں... ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھئے... اس ہندوستان کی پوری تاریخ پلٹ جائیے اور بتائیے کہ کیا کبھی، کسی بھی صدی میں اس کی تقسیم ہوئی ہے؟ آریوں نے اسے کبھی بھی سندھو دیش، سرسوتی دیش، یا گنگ دیش کے روپ میں تقسیم نہیں کیا۔ ان کے صحیفوں میں ہمیشہ اس برصغیر کو جمبودیپ ہی پکارا گیا... انہوں نے ہمیشہ اس عظیم ملک کے علاقائی سچ کو اس کی جمعیت میں قبول کیا... رامائن کال میں راکشس راون سے جنگ ہوئی تو صرف آریہ نہیں، اس عظیم ملک کے ایک ایک علاقے کا شخص لڑا۔ مہابھارت کی جنگ کے بعد بھی پانڈوں نے اپنے خلاف لڑنے والے کسی بھی ہارے ہوئے راجہ کی ریاست کو اس عظیم ملک سے الگ نہیں کیا... بھارت عظیم ملک بھارت ہی رہا... دوست اور دشمن اسی یک جان خطہ کا وہ حصہ رہے۔

قبل مسیح تیسری صدی میں میسوپوٹامیا کا سکندر آیا، مہاراجہ پورو کو شکست دینے کے بعد بھی اس نے اس ملک کو تقسیم نہیں کیا۔ شک اور ہون حملہ آور تھے، وہ بھی اس عظیم ملک کے ٹکڑے نہیں کر سکے... محمد بن قاسم آیا تو اس نے اسی مہادیش کے سندھ علاقے پر حکومت کی۔ اس نے اس ملک کو نہیں توڑا۔ دوسرا ملک ایجاد نہیں کیا۔ غوری، نادر شاہ، ابدالی تک نے اس ملک کے نقشے کو نہیں بدلا... ترک آئے، افغان آئے، وہ چاہتے تو اسی ملک کو توڑ کر ترکستان یا کوئی دوسرا افغانستان بنا لیتے... مغلیہ سلطنت نے ہمیشہ اس ملک کے اتحاد کو پہچانا اور قبول کیا۔ انہوں نے اس مہادیش میں اپنے کسی دیش کی تعمیر نہیں کی... یہاں تک کہ اورنگ زیب چاہتا تو اپنی سلطنت سے غیر مسلموں کو اپنی طاقت اور تلوار سے خارج کر کے ایک اسلامی ملک کو الگ کر لیتا... اسے اسلامستان کا نام دیتا، لیکن وہ تا زندگی اسی ایک ہندوستان کے لیے لڑتا، جیتتا اور ہارتا رہا... کہتے ہوئے رئیہ فوڈرل نے عدالت میں موجود ایک ایک فرد کو دیکھا اور سناٹے کو توڑتے ہوئے اپنا سوال پیش کیا— تو پھر ادیب عالی! ایسا کیوں ہوا کہ انگریزوں کی سوداگر قوم کے ہاتھوں، پانچ ہزار سال پرانا یہ مہادیش اپنی تاریخ میں پہلی بار تقسیم کا شکار ہوا! اس کا کوئی جواب ہے۔ اس جہازی ماؤنٹ بیٹن کے پاس؟

—ان اور ایسے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس! ماؤنٹ بیٹن نے جھلاتے ہوئے کہا۔

—کیوں؟ کوئی جواب کیوں نہیں ہے تمہارے پاس؟ آخر اس ملک کو تقسیم کرنے تو تمہیں آئے تھے؟ اردلی نے کہا۔

ماؤنٹ بیٹن کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ پھر بھی خود پر قابو رکھتے ہوئے اس نے کہا— میں انڈیا کو آزادی دینے آیا تھا۔

—آزادی؟ اردلی نے طنز سے ہنستے ہوئے کہا— تم کون تھے ہمیں آزادی دینے والے؟ تم نے ہمارے ملک کو جیتا نہیں تھا۔ جھوٹے معاہدوں اور سازشوں سے اپنے ماتحت کیا تھا... اپنے بزرگ ولیم ہاکنس جہازی کو تو تم پہچانتے نہیں... اس کے ساتھ آئے دیگر جہازیوں کو بھی تم کیسے پہچانو گے!... تب تمہارا ملک اتنا ہی غریب تھا جتنا غریب آج ہمارا ملک ہے۔ تب تمہارا خاندان شاہی نہیں لٹیروں اور سمندری ڈاکوؤں کو پالنے اور پناہ دینے والا ملزم خاندان تھا!

—یو شٹ اپ! ساری حیاداری کے باوجود ماؤنٹ بیٹن تلملا اٹھا تھا۔

تب ادیب نے ٹوکا تھا— اردلی صاحب! ہمیں اپنی سلیقگی نہیں چھوڑنی چاہیے... سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ کس دور کی باتیں کر رہے ہو؟

—ادیب عالی! یہ اسی دور کی باتیں ہیں جس دور میں مہا کوی بھاری اپنی ست سئی کے جمالیاتی دوہے لکھ رہے تھے اور آپ خود مارییشس کے شُراک ہوٹل میں سلمیٰ کی بانہوں میں مدہوش پڑے تھے... آپ تو سلمیٰ کے بدن پر کھلے ہوئے بوسے کے نیلے پھولوں کی گنتی کر رہے تھے... تب میں آپ کو تلاش کرتا ہوا وہاں اپنی کشتی سے پہنچا تھا...

ادیب کو جیسے وہ نظارہ یاد آیا... اردلی ہوٹل کے جیٹی سے کشتی لگا کر اترا تھا۔

یاد آیا؟ اردلی نے پوچھا—اور میں نے آپ کو سلمیٰ کی موجودگی کے باوجود آگاہ کیا تھا کہ جس ادیب نے تہذیب کے جسم پر لگے زخموں کو جاننے کی ذمہ داری اٹھائی ہے، وہ اپنی ذاتی زندگی میں کھلے ہوئے نیلے پھولوں کی گنتی کرنے کے لیے آزاد نہیں ہے۔

—ہاں اردلی صاحب... مجھے وہ لمحہ یاد ہے!

—تبھی میں نے آپ کو خبر دی تھی کہ اسپین، انگریز، فرانسیسی اور پرتگالی سمندری لٹیروں کے جہاز مشرق کی طرف بڑھ گئے ہیں... ان بیڑوں نے کون سی تاریخ لکھی ہے، یہ مشرق جانتا ہے... میں اسی تاریخ لکھنے والے کے وارث ان ماؤنٹ بیٹن صاحب کو، جو سالم انڈیا کے آخری وائسرائے اور تقسیم شدہ انڈیا کے آخری اور شاہی گورنر جنرل ہونے کی اکڑ میں جکڑے ہوئے ہیں، میں انہیں ان کے لٹیرے اسلاف ولیم ہاکنس اور تھامس رو جیسوں کی اصلیت دکھانا چاہتا ہوں۔ اردلی نے ماؤنٹ بیٹن کو مخاطب کیا—جانتے ہیں آپ! جب بھارت کے شہنشاہ جہانگیر کی حکومت کے سامنے آپ کے شاہی خاندان کی حیثیت ایک گاؤں کے نمبردار سے بھی بڑی نہیں تھی۔ ڈچ سوداگروں نے جب ایک پاؤنڈ کالی مرچ کا بھاؤ پانچ شلنگ بڑھا دیا تھا، تو تمہاری قوم کے بنیے تلملا اٹھے تھے... تب تمہارے بنیوں نے ۱۵۹۹ء میں ایسٹ انڈیا ٹریڈنگ کمپنی بنائی تھی اور تمہارا وہ لٹیرا جہازی ولیم ہاکنس تمہاری نام نہاد مہارانی ایلزبتھ اول سے لوٹ مار کرنے کی اجازت لے کر چل پڑا تھا...

—میں یہ باتیں نہیں سننا چاہتا! ماؤنٹ بیٹن نے جھلاتے ہوئے کہا—ادیب کچھ کہتا اس سے پہلے ہی اردلی چیخ پڑا—تمہیں سننی ہوں گی کیونکہ دنیا کے سب سے بڑے اور خون آلود تباہی کے لیے تم ذمہ دار ہو... بھارت مہادیش کے عوام الناس کو آنسوؤں کے سمندر میں جل سمادھی تم نے دی ہے... اس ملک کے ذات پات کی یادوں کو شکستہ کرنے کے مجرم تم ہو! جانتے ہو تمہارا وہ جہازی بزرگ ہاکنس، جب ۱۶۰۰ء میں سورت کے بندرگاہ پر اترا تھا تو اس کی جیب میں ایک لسٹ تھی۔ اُن چیزوں کی جو وہ بھارت سے لینے آیا تھا، اس میں کالی مرچ تو تھی ہی، نیل، زیرہ، لونگ اور ادرک کے علاوہ مرغی کے انڈوں جتنے بڑے پنے، پکھراج اور صحیح سلامت جوانی کے لیے ہاتھی کا منی بھی شامل تھا!

ماؤنٹ بیٹن کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا تھا۔ تب راجہ ٹوڈرمل نے اردلی کو روکا—محمود صاحب! انہیں ان کے اسلاف کا شجرہ مت سنائیے... اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے... غلطیاں اور کمزوریاں تو اپنی بھی تھیں... بہتر ہوگا کہ ان سے آپ لوگ اس بات کا جواب مانگئے کہ تقسیم کا جو کام اورنگ زیب نہیں کر سکا، وہ انہوں نے کیسے کر دکھایا؟... میں آگے دخل نہیں دوں گا۔ میں ایک کونے میں بیٹھ کر اس جرح کو سننا چاہوں گا کیونکہ مجھے لوٹ کر اپنے شہنشاہ عالم اکبر کو اس کی رپورٹ دینی ہے!

—تو ماؤنٹ بیٹن صاحب! آپ خود جہازی ہیں۔ آپ نے اپنے جہازی بزرگوں کی تاریخ سن لی۔ آپ اپنی اس تاریخ کو مٹا نہیں سکتے۔ نئی دنیا کی کھوج میں نکلے برٹش، فرانس، اسپین، اور پرتگال کے سارے جہازی کوئی محقق یا تفتیش کنندہ سائنس داں نہیں تھے، وہ بنیادی طور پر سمندری لٹیرے تھے جو دنیا کی دولت کی تلاش میں نکلے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن کچھ شرمندہ تو ہوا لیکن اُسے ظاہر نہ کرتے ہوئے اُس نے ادیب کو دیکھا۔

—مسٹر ایڈمرل ماؤنٹ بیٹن! ادیب نے کہا—جب آپ اس عدالت سے واپس جائیں تو اس سچائی کی تلاش کر لیجئے گا کہ جس وقت ہندوستان کا مغلیہ نظام اپنے کسانوں اور کاشتکاروں کو راجہ ٹوڈرمل کی چلے آرہے معاشی نظام کے تحت مالکانہ حقوق اور آزادی بخش رہا تھا! اس وقت آپ کی نام نہاد مہارانی ایلزبتھ اول، پرتگالی انگریزوں کی کمپنیوں میں پیسہ لگا کر، افریقی حبشیوں کو غلاموں کی طرح بیچ کر خرید و فروخت کے بازار میں منافع کما رہی تھیں!

ماؤنٹ بیٹن کا گلا سوکھ رہا تھا۔ اُسے فوراً کوک کا ایک ٹن دیا گیا۔

—تو خیر... بات چیت شروع کریں۔ آپ وائسرائے بن کر کب انڈیا پہنچے؟

—مارچ ۱۹۴۷ء میں۔

—آپ کا بریف کیا تھا؟

—یہی کہ انڈیا کو آزادی دینی ہے۔

—آزادی دینے کے لیے چلنے سے قبل آپ کس کس سے ملے تھے؟

—ظاہر ہے کہ میں وزیر اعظم ایٹلی سے ملا تھا۔

—اور؟

—میں اپنے کزن اور بھارت کے بادشاہ جارج ششم سے ملا تھا۔

—اور؟

—اور... کچھ سوچتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن نے کہا—میں دوسری عالمی جنگ کو جیتنے والے برٹش

حکومت کے ہیرو اور سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل سے ملا تھا۔

— ان سب نے کوئی اور بریف آپ کو دیا تھا؟

— نہیں... ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ میں مدعو کر کے معاصر وزیر اعظم کلیمنٹ اٹیلی نے مجھ سے گذارش کی تھی کہ میں انڈیا جاؤں اور اسے آزادی دے کر واپس لوٹ آؤں!

— آپ کی سامراجی سرکار نے یہ فیصلہ کن حالات میں لیا تھا؟

— حالات تو میں بیان نہیں کر سکتا، لیکن دوسری عالمی جنگ میں فتح کے باوجود یہ واضح ہو گیا تھا کہ ہم اپنے نوآبادیات کو اب زیادہ دیر تک غلام نہیں رکھ سکتے!

— اسی لیے آپ نے انڈیا کو چھوڑنے سے پہلے اُسے سبق سکھانے کا فیصلہ لیا۔ کیونکہ انڈیا کے آزاد ہوتے ہی دیگر تمام نوآبادیات میں ہر روز طلوع ہونے والا سورج غروب ہونے والا تھا... اور آپ نے چرچل کے ساتھ مل کر برٹش سامراجیت واد کے ٹوٹ پھوٹ کا ذمہ دار مہاتما گاندھی اور انڈیا کی آزادی کی تحریک کو ٹھہرایا تھا... مہاتما گاندھی کو اپنے گھٹیا سامراج شاہی انا کا شکار بنایا تھا... آپ کے بکنگھم پیلس میں تو ننگے فقیر مہاتما گاندھی کو احترام کے ساتھ بلایا گیا لیکن آپ کے انانیت پسند اور عالمی جنگ کے بعد انتخاب میں ہارے ہوئے سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے انڈیا کے "ننگے فقیر" سے ملنے سے انکار کر دیا تھا! کیا آپ چرچل کی اُسی انانیت پسند ذہنیت کو لے کر انڈیا نہیں آئے تھے؟

— نہیں!

— تو پھر یہ لارڈ اِزمے، جو دوسری عالمی جنگ کے دوران مسلسل چرچل کا معاون رہا تھا، یہ بھارت کو آزادی دینے کی مہم میں آپ کا معاون بن کر کیوں آیا تھا؟

— یہ لیبر سرکار کا فیصلہ تھا۔ اس سے میرا کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

— جھوٹ مت بولیے ایڈمرل ماؤنٹ بیٹن! اگر آپ فوری لیبر وزیر اعظم اٹیلی سے اپنی ساری شرطیں منوا سکے تھے اور منوا سکتے تھے تو کیا آپ لارڈ اِزمے کی جگہ اپنی پسند کا معاون نہیں چن سکتے تھے...؟ یہ آپ کی کیسی مجبوری تھی کہ بھارت کی آزادی کی مخالفت کرنے اور بھارت کو سبق سکھانے کا اعلان کرنے والے چرچل کے معاون کو آپ اپنا معاون بنا کر ساتھ لائے تھے؟

— یہ انتظامی فیصلے کے سوال ہیں۔ یہ دنیا کے سب سے بڑے سامراج کے سوال ہیں! بہتر یہی ہوگا کہ آپ کی عدالت ان میں دخل نہ دے! ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

— ماؤنٹ بیٹن! یہ تو انسان کے ضمیر اور اس کی آتما کی عدالت ہے... اس سے بچ کر کوئی

کہاں جائے گا؟ آپ جن سوالوں کے جواب نہیں دیں گے، وہ بھی یہاں حل ہو جائیں گے... آپ کی زبان خاموشی اختیار کر سکتی ہے لیکن یہ ایسی عدالت ہے جو خاموشی کی آواز اور زبان کو سن و دیکھ سکتی ہے!

تبھی تیز دستکیں پڑنے لگیں۔ عدالت میں موجود سبھی لوگوں نے پریشانی سے دستکوں کی طرف دیکھا۔ وہ دستکیں اپنے سوکھے خون کو چاٹ رہی تھیں۔ کچھ دستکیں ہڈیاں ٹوٹ جانے کی وجہ سے لڑکھڑا رہی تھیں۔ کچھ دستکیں کندھوں پر بچوں کی لاشیں اٹھائے ہوئے تھیں۔

اردلی نے آگے بڑھ کر انہیں سنبھالا اور دریافت کیا کہ وہ کہاں کی دستکیں ہیں، تو ایک لاش نے بتایا— ہم ایسٹ تیمور کی دستکیں ہیں۔ انڈونیشیا کے ایسٹ تیمور کی! سن رہے ہیں آپ؟... ہم دہائیوں سے آزادی کا حق مانگ رہے تھے... وہ ہمیں رائے شماری کے ساتھ ملا بھی تو موت اور ہجرت کے ساتھ۔ انڈونیشیا کی فوج اور پرائیویٹ مسلم ملیشیا ہم پر ٹوٹ پڑی... ہمیں بے رحمی سے مارا جا رہا ہے... گھروں میں آگ لگائی جا رہی ہے۔ بستیاں پھونک دی گئیں۔ ہزاروں لوگ اپنا ملک چھوڑ کر ویسٹ تیمور میں پناہ لے رہے ہیں... راجدھانی دلی تو بھوتوں کا شہر بن چکا ہے...

— اگر ایسا ہی ہونا تھا تو پھر انڈونیشیا سے آزادی حاصل کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اگر ایسٹ تیمور کے سبھی باشندوں کو آزاد ہو کر پھر انڈونیشیا کے ویسٹ تیمور میں ہی پناہ گزینوں کی طرح پناہ لینا تھا تو پھر تمھیں آزادی کس لیے چاہیے تھی؟

— یہ آزادی ہمیں اپنے مذہب کے لیے چاہیے تھی!

— مذہب کے لیے؟

— جی ہاں، ادیب اعلیٰ، کیونکہ ہم مسلمان نہیں، عیسائی ہیں!

— یعنی تم بھی نوآبادیوں کی سازش کے شکار ہوئے ہو! تمھیں بھی مذہب کے نام پر پرتگالی نوآبادیوں نے سیاست کا مہرہ بنایا ہے! اُسی طرح جیسے برٹش نوآبادیات نے بھارت میں ہندو مسلمانوں کو مہرہ بنایا تھا! ادیب نے تلخی سے کہا— میں تم عیسائیوں سے پوچھنا چاہوں گا کہ کیا تم انڈونیشیائی نہیں ہو؟

تب تک اردلی نے ایسٹ تیمور کی راجدھانی دلی پہنچ کر وہاں کا حال بیان کرنا شروع کر دیا— حضور اعلیٰ! سنیے... میں ایسٹ تیمور کی راجدھانی دلی سے بول رہا ہوں... ویسے تو یہ دلی بہت بڑے اور کھلے دل والوں کی بستی تھی... یہاں ایسٹر، بڑا دن، نیا سال تو منایا ہی جاتا تھا، ساتھ میں محمد صاحب کی سالگرہ کے جشن میں سب شریک ہوتے تھے۔ رمضان تو منایا ہی جاتا ہے... اتنا ہی نہیں، یہاں

مہابھارت کے ٹکڑوں کو لے کر ناٹک بھی کھیلے جاتے تھے... لیکن اس وقت یہ شہر ویران پڑا ہے... یہاں مارکاٹ کے بعد پریسیڈنٹ حبیبی نے مارشل لا نافذ کردیا ہے— انڈونیشیا کے مسلمان نہیں چاہتے کہ ایسٹ تیمور کے عیسائی اپنا آزاد ملک بنا سکیں... سیکڑوں لوگوں کی لاشیں راجدھانی کی سڑکوں پر پڑی سڑ رہی ہیں۔ مارشل لا کے ساتھ ہی آرمی بھی مسلم ملیشیا کے ساتھ شامل ہو کر عیسائیوں کو کھدیڑ رہی ہے۔ مسلم ملیشیا کے رضاکاروں کو میں چیختے ہوئے سن رہا ہوں— عیسائی کتو! ایسٹ تیمور خالی کر دو آزاد ملک بنانا ہے تو جا کر پیسیفک اوشن میں بناؤ۔ وہ سمندر ہی تمہیں پناہ دے سکتا ہے!

عدالت میں موجود بھی لوگ حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اردلی محمود کی آواز آرہی تھی—

— کل یہاں بشپ کی کوٹھی پھونک دی گئی۔ آج ابھی آسٹریلیا کے سفیر جان میکارتھی پر انہیں کے کونسلیٹ میں جان لیوا حملہ ہوا ہے۔ ان کو تین گولیاں لگی ہوئی ہیں لیکن وہ خطرے سے باہر بتائے جا رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی عمارت پر مسلم ملیشیا نے قبضہ کر رکھا ہے۔ غیر ملکی اپنی حفاظت کے لیے تیمور چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ بشپ کارلوفیلو کے چرچ کپاؤنڈ میں سات ہزار خوفزدہ عیسائی پناہ لیے ہوئے ہیں۔ ریڈ کراس کے احاطے میں دو ہزار سے زیادہ لوگ جان بچانے کے لیے جمع ہیں۔ اسلامی اشتراک ملیشیا کے رضاکاروں نے شہر پر پورا قبضہ کر رکھا ہے۔ کچھ لوگ ایسٹ تیمور بندرگاہ کی طرف فرار ہو رہے ہیں... یہ راستہ جو مسلم اکثریت ویسٹ تیمور کی طرف جاتا ہے، اس سڑک کے کھمبوں پر میلوں تک عیسائیوں کی کھوپڑیاں الٹے گھڑوں کی طرح ٹنگی ہوئی ہیں... ان کی کھلی ہوئی مردہ آنکھیں اپنے آزاد علاقے کے سناٹے کو دیکھ رہی ہیں۔ سمندر کے گاؤں میں لاشوں کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا ہے... ہر لاش دوسری لاش کے جنازے میں شامل ہے... یہ سمجھنا یہاں مشکل ہو رہا ہے کہ کون سی لاش کس لاش کو دفنانے لے جا رہی ہے... جو حالات میں یہاں دیکھ رہا ہوں ان سے لگتا ہے کہ پرتگالی نوآبادی نے آزاد ملک کے نام پر دنیا کے سب سے بڑے قبرستان کو بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے... ایسٹ تیمور دنیا کا ایسا آزاد ملک ہوگا جس میں صرف مردے رہا کریں گے... ان کی قبروں پر جلتی موم بتیوں کی روشنی آنے والی تمام صدیوں کو موت اور قتل کا جادواں اندھیرا دیتی رہے گی!

عدالت میں ماؤنٹ بیٹن اب اور الجھن سے کلبلا رہا تھا۔ لیکن بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ ادیب نے دیکھا، اس کی چاروں کہانیاں موجود تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کہانیاں ایک دوسرے کو نہیں

پہچانتی تھیں۔ ادیب انہیں دیکھتا تو عجیب اضطرابی سے مبتلا ہو جاتا۔

سلمیٰ کی آنکھیں بار بار جیسے خدا حافظ کہہ رہی تھیں۔ وڈیا روہتک روڈ سے تانگے پر آئی تھی۔ اسی تانگے پر جس کے گھوڑے کے پنکھ لگ گئے تھے اور آزادی کے ساتھ ساتھ تقسیم کا اعلان ہوتے ہی وہ وڈیا کو لے کر نہ جانے کہاں اڑ گیا تھا۔ تعجب کہ بوٹا سنگھ اکیلا آیا تھا۔ نہ معلوم زینب کیوں نہیں آئی تھی اور سرجیت کور جو ملتان والے گھر سے سارے گہنے پہن کر بج سنور کر، اپنے معصوم بیٹے کو ایم چنا کر نکلی تھی، وہ اپنے پچاس سالہ بے ہوش بیٹے کو تہہ دار چادر کی طرح کندھے پر ڈالے عدالت میں موجود تھی۔ بھکاری کبیر بھی ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا اور بس وہیں میں ڈالنے والا نظارہ تو یہ تھا کہ بوٹا سنگھ، چیتھڑے چیتھڑے ہوگئی اپنی لاش کو فرش پر لٹائے بھن بھناتی مکھیوں کو اپنے ہی ہاتھ سے اڑا رہا تھا۔

ادیب سوچنے لگا کہ آخر اس کی یہ کہانیاں یہاں کیوں چلی آئی ہیں؟ ان کہانیوں سامراجیت اور نوآبادیات کا آخری ترجمان ماؤنٹ بیٹن تو نہیں لکھے گا۔ وقت ملا تو یا تو وہ خود لکھے گا یا کوئی اور ادیب ان اُداس کہانیوں کو اٹھائے گا...

تبھی ماؤنٹ بیٹن کی کرخت آواز آئی—

— آخر آپ نے مجھے کیوں روک رکھا ہے؟

— یہ پوچھنے کے لیے کہ انڈیا کے پارٹیشن کی بات آپ نے کب طے کی تھی؟

— یہ بات اور الزام غلط ہے! میں نے ہمیشہ انڈیا کو یونائیٹڈ رکھنے کی پیش کش کی تھی! ماؤنٹ بیٹن نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

— کیا آپ کو معلوم اور یاد ہے کہ لندن کے ایک ہوٹل میں ۱۹۳۳ء میں رحمت علی نے جب پہلی بار پاکستان کا تصور پیش کیا تھا، تب جناح صاحب نے کیا کہا تھا؟

— مجھے نہیں معلوم!

— تو میں آپ کو بتاتا ہوں... جناح صاحب نے کہا تھا کہ یہ ایک ناممکن اور غلط خواب ہے...

ماؤنٹ بیٹن نے تاریخ کے اس نوجوان طالب علم کو غور سے دیکھا جو اس سے جرح کر رہا تھا۔

طالب علم نے جرح جاری رکھتے ہوئے پوچھا— شاید آپ کو معلوم ہو کہ ۱۹۳۳ء کے آس پاس جناح صاحب سیاست سے اتنے خفا اور مایوس ہو گئے تھے کہ وہ بمبئی ہائی کورٹ کی لاکھوں کی پریکٹس چھوڑ کر لندن چلے گئے تھے... انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ سیاست کو خدا حافظ کہہ رہے ہیں اور بمبئی میں لاکھوں روپے کا اپنا پھلتا پھولتا عدالتی پیشہ چھوڑ کر وہ لندن میں رہنے اور وہیں وکالت

کرنے کے لیے جا رہے ہیں!

— مجھے مسٹر جناح کے اس فیصلے کی جانکاری نہیں ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

— تو پھر آپ کی پارلیمانی اور انتظامی اہلیت اور معلومات کیا ہیں، جس کے بل بوتے پر آپ انڈیا جیسے عظیم تمدن والے متنوع رنگوں والے ملک کے وائسرائے بن کر اسے آزادی دینے آئے تھے؟ کیا آپ کو معلوم تھا کہ انڈیا میں میزرمتا اور بلسار جیسی معمولی سی ریاست کہاں تھی؟ اور آپ کی سامراجی سرکار نے بھارت کی ۵۶۵ ریاستوں کے ساتھ کس کس طرح کے معاہدے کر رکھے تھے؟ کیا آپ نے بھارت آمد اور بھارت کو آزادی دینے سے پہلے معاہدوں کے اُن دستاویزوں کو پڑھا تھا؟

— نہیں؟

— کیا آپ کو انڈیا میں اپنے اسلاف کی پیدا کردہ ہندو، مسلم مسائل کی معلومات تھی۔

— نہیں؟

— تب تو آپ کو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ سیاست سے مایوس ہوکر جب جناح صاحب نے ۱۹۳۳ء میں انڈیا چھوڑا تھا تب وہ انگلینڈ میں کیا کرتے رہے تھے اور اُن کی سیاسی، سماجی اور پروفیشنل سرگرمیاں کیا تھیں؟

— مجھے اس کی کوئی جانکاری نہیں ہے!

اور یہ جواب پاتے ہی طالب علم بھاشن دینے لگا — دنیا کے حاضرین سنو! شہنشاہ بابر کے بابر نامہ میں سے تیس صفحات غائب ہیں... وہ تیس صفحات جو اس بات کا ثبوت دیتے کہ بابر ایودھیا تک کبھی نہیں گیا تھا۔ وہ افغان باغیوں کا پیچھا کرتے ہوئے گھاگھرا ندی تک گیا تھا اور انہیں کھدیڑ کر وہ گھاگھرا ندی کے جنگلوں میں شکار کھیلتا ہوا، یہ خبر پاکر کہ کابل سے اس کی بیگم اور بیٹی ہندوستان میں پہنچ چکی ہیں، فوراً علی گڑھ شہر کی طرف لوٹ پڑا تھا... بابر کے اس دور تک بربریت کے باوجود جذبات اور احساس کی وہ دھڑکنیں باقی تھیں، جو شہنشاہوں کو انسان بناتی تھیں۔ بابر گھاگھرا ندی کے مغربی کچھاروں اور جنگلوں سے لوٹ پڑا تھا، اپنی بیگم اور بیٹی سے ملنے کے لیے... وہ گھاگھرا ندی مشرقی کنارے کے پار ایودھیا کبھی گیا ہی نہیں تھا۔

— یہ صحیح اور غلط معلومات دے کر آپ مجھے بتانا کیا چاہتے ہیں؟

— یہی کہ آپ کے چرچل جیسے سیاست دانوں نے بھارت کے تقسیم کی تمہید تیار کر رکھی تھی اور اُسی کو انجام دینے کے لیے آپ کو بھارت کا وائسرائے بنا کر بھیجا گیا تھا۔

— یہ سراسر غلط الزام ہے!

— تو کیا آپ اس سنگین صورت حال کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے کہ سیاست کو خدا حافظ کہہ کر انگلینڈ قیام کے تین برسوں کے دوران، جناح صاحب کن خاص خاص ہستیوں، سیاست دانوں اور لیڈروں سے ملتے رہے، اُن کے اور جناح صاحب کے درمیان کیا رازدارانہ باتیں ہوئیں؟

— رازدارانہ باتیں؟

— ہاں! طالب علم نے سختی سے پوچھا — سنئے مسٹر ماؤنٹ بیٹن! جس طرح آپ کے کارندوں نے بابر نامہ کے تیس صفحات غائب کئے ہیں، اسی طرح آپ کی قوم اور مورخین نے جناح صاحب کے تین سالہ انگلینڈ میں قیام کو ایک سازش کے تحت گمنامی کی چادر میں لپیٹ رکھا ہے... کیا آپ یہ بتا سکیں گے کہ گاندھی جی کی تحریکوں اور بھگت سنگھ کی شہادت سے گھبرائی اور لٹ بھگ ہاری ہوئی سرکار تب کیا سوچ رہی تھی اور کیا سازشیں کر رہی تھی؟...

— میں ان حالات کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا!

— کیا ۱۹۳۳ء میں پاکستان کا تصور پیش کرنے والا رحمت علی اپنے منصوبے کو ردی کی ٹوکری میں پھینک کر خاموش ہوگیا تھا؟ یاد کیجئے اس وقت کے ہندوستان کے ماحول کو... یاد کیجئے ہندوستان کے انقلابی تاریخ کے رول کو... ۱۹۳۰ء جولائی کے آخری اتوار کے دن گونجتے انقلابی شہید بھگت سنگھ کے اُن الفاظ کو — وہ سوچتے ہیں کہ میرے مٹی کے بنے جسم کو تباہ کر کے وہ اس ملک میں محفوظ رہ جائیں گے۔ یہ اُن کی بھول ہے۔ وہ مجھے مار سکتے ہیں، لیکن میرے خیالات کو نہیں مار سکتے۔ وہ میرے جسم کو کچل سکتے ہیں، لیکن میرے جذبات کو نہیں کچل سکتے۔ برٹش حکومت کے سر پر میرے خیالات اُس وقت تک بددعا کی طرح منڈراتے رہیں گے، جب تک کہ وہ یہاں سے بھاگنے کے لیے مجبور نہیں ہو جائے گی!...

— میرا شہید بھگت سنگھ سے کبھی کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

— پر اُن دنوں تم تھے تو برٹین میں ہی... اور تم شاہی خاندان کے اولاد بھی ہو... تمہیں کچھ معلومات تو ہونی چاہیے کہ تب برٹین میں انڈیا سے متعلق کیا سرگرمیاں چل رہی تھیں؟ ظاہری طور پر تو جناح صاحب لندن میں پریکٹس کرنے گئے تھے... لیکن کہیں بھی اس بات کا ثبوت یا معلومات نہیں ہیں کہ انہوں نے لندن قیام کے دوران ایک بھی مقدمہ لڑا ہو!... کیا وجہ تھی کہ انہیں برسوں کے دوران انڈین مسلم لیگ کے کچھ خاص نیتا اور بڑے بڑے زمیندار، چھوٹے نواب اور تعلقدار لندن آجا رہے تھے...

—انڈین لوگوں کے لندن آنے جانے یا گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

—وہ تو ٹھیک ہے پر یہ انڈین خاص طور سے ٹوری گروپ کے کونسلروں سے مل رہے تھے اور ان کی خفیہ ملاقاتیں اور مذاکرے چل رہے تھے...

—یہ ہوائی باتیں ہیں۔ برٹین کے محافظ خانہ میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے! ماؤنٹ بیٹن نے تیز لہجے میں کہا۔

—تب تو تمہارے ملک کے محافظ خانوں اور خفیہ ڈپارٹمنٹ کے کاغذات میں جناح صاحب اور چرچل کی تین ملاقاتوں کا کوئی ذکر ہو، اس کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا!...

—میں اس طرح کی بے بنیاد باتوں کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا... ویسے بھی بذات خود مجھے ان باتوں یا ملاقاتوں کی جانکاری نہیں ہے۔

—تمہاری اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے... لیکن یہاں تمہیں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بھارت میں چل رہے انقلابی اور عدم تشدد تحریکوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ بھارت کو اب زیادہ دنوں تک غلام بنا کر نہیں رکھا جا سکتا... اس لیے ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک حکومت برطانیہ نے جو سازشی پروگرام تیار کئے، وہ دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے یکا یک تو نافذ نہیں کیے جا سکے، لیکن جنگ ختم ہوتے ہی، ان سیاسی چالاکی بھرے معاہدوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جنرل ویول کو اچانک ہٹا کر تمہیں بھارت کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ تمہیں ایک سوچے سمجھے اور طے شدہ منصوبے کے تحت بھیجا گیا۔ وہ منصوبہ تھا، جب تک اور جہاں تک ممکن ہو، ہندوستان کی آزادی کو ملتوی کرنا اور ملتوی نہ ہو سکے تو ہندوستان کو تقسیم کر کے اسے کئی ٹکڑوں میں بانٹ دینا...

—یہ الزام ہے... یہ بات سراسر غلط ہے! میں نے ہمیشہ انڈیا کی ایکتا کو بنائے رکھنے کی بھرپور کوشش کی... لیکن میں اس میں مسٹر محمد علی جناح کی ضد کی وجہ سے ناکام رہا... جناح صاحب تو تمہاری حکومت کے ترپ کے پتے بن گئے... سیدھے سیدھے کہیں تو انہیں جان بوجھ کر تم انگریزوں نے ترپ کا پتا بنایا!

—مطلب؟

—مطلب یہی کہ جناح صاحب کو تمہارے ملک کی سازش کے تحت مسلمانوں کا لیڈر بنایا گیا... نہیں تو ہندوستان کا مذہبی نمازی مسلمان جناح جیسے غیر مذہبی، بے نمازی، پورک سے پرہیز نہ کرنے والے مسلمان کو کبھی اپنا لیڈر قبول نہیں کرتا... یہی وہ سامراجی کراماتی کرشمہ ہے جو تم لوگوں

نے کر دکھایا... حیرت کی بات ہے کہ مذہب کے نام پر ایک غیر مذہبی اور ایک ایسے مسلمان کو لیڈر بنایا گیا جو قرآن شریف نہیں پڑھ سکتا تھا، کیونکہ اسے عربی یا اردو تک نہیں آتی تھی۔ جو نمازی نہیں تھا کیونکہ وہ نماز پڑھنا نہیں جانتا تھا... بلکہ اس کے بارے میں تو یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ جناح صاحب مسلمان ہوتے ہوئے بھی مسلمان نہیں تھے... شمالی ہند کے تمام تعلقداروں، چھوٹے موٹے نوابوں اور زمینداروں کے سامنے پاکستان نام کا ملک بنا دینے کا لقمہ پھینک کر اندر ہی اندر جناح صاحب کی لیڈری کو منوا لیا گیا تھا!

—آپ لوگ کچھ بھی سوچنے کے لیے آزاد ہیں۔ میں اس مسئلے پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہوں گا... میں اپنی سچائی جانتا ہوں... میرا ضمیر میرا گواہ ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے بے رخی سے کہا— اور یہ بھی غلط بات ہے کہ میں انڈیا کی آزادی کو ملتوی کرنے آیا تھا۔

—سنئے، سنئے ماؤنٹ بیٹن صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ جنگ کے بعد ٹوری ہار گئے تھے... لیکن سرکار کی تکمیل تب بھی چرچل کے ہاتھوں میں تھی۔ آپ کے چرچل لیبر سرکار کے فیصلے کو ہاؤس آف لارڈس میں لٹکائے رکھ سکتے تھے... کیونکہ اس میں آپ کے جاگیرداروں کی اکثریت تھی... اور آپ کا برٹین اس وقت، جنگ کے بعد تباہ تھا اور بھوکا مر رہا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کو ملتوی کر کے آپ کچھ اور سالوں تک استحصال کرنے کا حق پا سکتے تھے!

—نہیں! ماؤنٹ بیٹن چیخ پڑا— ہمارے پاس آئل آف وہائٹ میں اس وقت بھی اتنی دولت تھی کہ ہماری دس نسلیں آرام سے کھا سکتی تھیں اور زندہ رہ سکتی تھیں!

—آپ کے آئل آف وہائٹ میں آپ کے پسینے کی دولت نہیں، دنیا کے نوآبادیات کی استحصال شدہ دولت موجود تھی... وہ دولت آپ کی دولت نہیں تھی!

یہ کونے سے اٹھ کر آیا بھکاری کبیر بول رہا تھا اور مسلسل ماؤنٹ بیٹن سے جرح کر رہا تھا۔

—میں بھیک مانگنے والوں سے بحث کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں مسٹر ادیب! ماؤنٹ بیٹن نے شاہی ٹھسے والے انداز میں کہا اور اس سے پہلے کہ ادیب مداخلت کرے، بھکاری کبیر بھڑک اٹھا۔

—ماؤنٹ بیٹن! ہم بھیک مانگنے والوں کی نسل تم لٹیروں نے پیدا کی ہے... ہم جیسے بھکاریوں کی نسل تمہارے صنعتی انقلاب سے پہلے دنیا کے کسی ملک میں موجود نہیں تھی۔ امیر اور غریب پہلے بھی تھے لیکن بھکاریوں کا جنم تو آبادیاتی بندوبست کے ساتھ ہوا... جب معاشی اور زندگی سے وابستہ انصاف کے اقدار کا خاتمہ اور منافع پر مرکوز استحصال اور مقابلے کا جنم ہوا... نہیں تو اس سے پہلے غریب تو تھے لیکن بھکاری نہیں تھے۔ دنیا کا انصاف پسندانہ معاشی توازن تم سامراجیوں، نوآبادیات نے شکستہ

کیا ہے... نہیں تو مجھ جیسا لاچار آدمی بھارت اور پاکستان میں بھیک مانگنے کے لیے مجبور نہیں ہوتا، جو ایک دوسرے کے خلاف دعا مانگتے ہیں۔ تم نوآبادیات نے ہماری دعائیں بھی دوغلی بنا دیں...

عدالت میں موجود مردے بھی بھکاری کبیر کی باتیں بہت غور اور متفق ہو کر سن رہے تھے۔

—خیر چھوڑیے ان سنجیدہ باتوں کو، کیونکہ ماؤنٹ بیٹن صاحب... مجھ جیسے بھیک مانگنے والے کے سوالوں کا جواب دینے میں آپ اپنی توہین سمجھتے ہیں لیکن میں صرف بھکاری ہی نہیں، اپنے ملک کا شہری بھی ہوں اور ایک شہری کے سوالوں کا جواب دینے سے تمہیں گریز نہیں کرنا چاہیے۔ تم انڈیا کے آخری وائسرائے تھے لیکن، میں تو تمہاری سلطنت کا آخری بھکاری نہیں ہوں... میری نسل تو تمہارے جانے کے بعد بھی پھل پھول رہی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ اب میرے جیسا ایک بھی مظلوم آدمی نہیں ہے، بلکہ اب افریقہ، لیٹن امریکہ، کمبوڈیا، انڈونیشیا جیسے پچاسوں ملک بھی ہماری جماعت میں شامل ہو گئے ہیں... ہماری قومیت اب بین الاقوامی ہو گئی ہے... یہ ممالک بین الاقوامی خزانہ اور عالمی بینک سے بھیک مانگتے ہیں۔ میں لاہور پاکستان کی جامع مسجد کے باہر بھیک مانگتا ہوا بھارت کے ماؤنٹ میری چرچ اور مہالکشمی مندر کے بھکاریوں کی قطار میں بھی بھیک مانگ سکتا ہوں اور ساؤتھ امریکہ، بیونس آئرس کے چرچ کے سامنے کھڑا ہو کر بھی لوگوں کے مذہبی ترحم کو بھنا سکتا ہوں... لیکن تم لوگوں نے اپنی منافع بازی کے مقابلے کی وجہ سے رحم دلی کو ایک فضول شے بنا دیا ہے... سنو ماؤنٹ بیٹن! رحم دلی میں ہی انسانی انصاف کا مہا منتر موجود ہے جو تہذیبیں رحم دلی سے خالی ہو گئیں، وہ ختم ہو گئیں...

عدالت میں موجود سبھی لوگوں نے اپنے دکھ درد، اذیت اور تنگی کو بھول کر بھکاری کبیر کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ ایسی باتیں کر رہا تھا، جن سے صدیوں کے زخموں کی ٹیس کچھ کم ہو رہی تھی۔

بس مجھے آخری سوال کا جواب دے دیجیے! کبیر نے کہا— کیا جناح صاحب کے مرض الموت کے بارے میں تمھیں کچھ نہیں معلوم تھا؟

—نہیں! ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

—اس سوال کا کیا جواب ہے؟ کسی نے بھیڑ میں سے پوچھا۔

—ہے! جواز بھی ہے اور تقسیم کے المیہ سے بھی اس کا گہرا لینا دینا ہے... ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کی ضد کے لیے جناح کو بار بار ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ سارا الزام اُن پر ڈال کر خود کو بری کیا ہے... اب کہا یہ جاتا ہے کہ جناح صاحب کی مہلک اور جان لیوا بیماری کا اگر پتہ چل گیا ہوتا تو کانگریس کے سرگرم تحریک بنا آزادی کی عجلت کو ٹال سکتے تھے! جناح صاحب کے بعد مسلم لیگ کا کوئی ایسا

قد آور نیتا نہیں تھا جو مذہب کی بنا پر دو قوموں کے نظریے کی پیروی کر کے پاکستان حاصل کر پاتا!... سچائی یہی تھی نہ ماؤنٹ بیٹن صاحب؟ ان کی بیماری کا پتہ ہوتا تو انڈیا تقسیم کے المیے سے بچ جاتا!

—یس! ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

—کیونکہ بمبئی کے ڈاکٹر جال پٹیل کے پاس جناح صاحب کے ایکسرے موجود تھے۔ ڈاکٹر پٹیل نے انھیں جینے کے لیے ڈیڑھ سال سے زیادہ کا وقت نہیں بخشا تھا۔

—یس! اور ڈاکٹر پٹیل نے مسٹر جناح کے اس مہلک مرض کا راز چھپا کر رکھا تھا۔

—لیکن کیوں؟ ڈاکٹر پٹیل سیاست داں تو نہیں تھے... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ راز پورے ملک کو پتہ چل گیا ہوتا تو پارٹیشن سے بچا جا سکتا تھا!

—یس!

—یعنی ڈاکٹر پٹیل انڈیا کا پارٹیشن چاہتے تھے!

—میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا!

—کیا آپ کی وہ سرکاری خفیہ ایجنسیاں جو ہٹلر اور مسولینی جیسے فولادی تانا شاہوں کے اندرونی راز کھود لاتی تھیں، وہ جناح صاحب کی بیماری کے علم سے محروم تھیں؟ ویسے بھی جناح صاحب تندرست آدمی نہیں دکھائی پڑتے تھے۔ دیکھنے سے ہی وہ بیمار لگتے تھے۔ عمر میں بھی وہ ستر پار کر چکے تھے... تب ان کی تپ دق کی بیماری کو راز کی طرح کیوں چھپایا گیا تھا؟

—یہ مسلم لیگ کی داؤ پیچ والی سیاسی چال بھی ہو سکتی تھی، کیونکہ لیگ جانتی تھی کہ مسٹر جناح کے علاوہ اُن کے پاس اور کوئی لیڈر نہیں ہے جو جواہر لعل نہرو اور سردار پٹیل جیسے بڑے دماغوں کا مقابلہ کر سکے... وہ قومی نظریے سے مذہب، ثقافتی شواہد اور منطق کی بنا پر لڑ سکے۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا— اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ مسٹر جناح کی اس ٹرمینل بیماری کے بارے میں خود مجھے یا میری سرکار کو کچھ بھی پتہ نہیں تھا!

—یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے! جناح صاحب کو پلوریسی ہو چکی تھی۔ برانکائٹس کے حملے سے وہ ہمیشہ متاثر رہتے تھے، سانس کی بیماریاں تھیں ہی... اور جب مئی ۱۹۳۶ء میں وہ شملہ سے لوٹ رہے تھے تو ٹرین میں اتنے بیمار ہو گئے تھے کہ فاطمہ جناح، ان کی بہن کو، بیچ راستے میں ڈاکٹر پٹیل کو بلانا پڑا تھا... تب بھی آپ کی سرکار کو جناح صاحب کی بیماری کی سنجیدگی کا اندازہ نہیں ہوا؟

—نہیں! مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے! ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

—ہم آپ کی طاقت ور چالباز سرکار اور آپ کی اس معصومیت پر دل و جان سے فدا ہیں! کبیر

نے طنز کیا— حالانکہ جناح صاحب کی جان لیوا بیماری کو سیاست کی بساط پر ہار جیت کا مہرہ بنانا ایک بے پناہ غیر انسانی نظریہ ہے، لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ان کی بیماری کی وجہ سے آپ کی سامراجی حکومت استحصال کے ماروں، نوآبادیاتی سیاست اور خود آپ نے بھارت کی آزادی کے سلسلے میں حتمی فیصلے ہی کر لیے تھے؟

— میں کہتا ہوں کہ تاریخ کے ساتھ یہ غیر منطقی بے ہودہ کھلواڑ کھیلنا بند کیجئے! ماؤنٹ بیٹن نے تلملا کر کہا۔

— ماؤنٹ بیٹن صاحب اچھی تاریخ صرف وہ نہیں ہے جو سامراجی نسلوں نے لکھی ہے... سچی تاریخ وہ ہے جس کی عبارت استحصال زدہ اور دلت ملکوں کی آتما پر آج بھی درج ہے! کبیر نے دیکھتے ہوئے الفاظ میں کہا— ہمارے پاس تاریخ کی صدیاں موجود ہیں، تمہارے پاس وہ خبریں ہیں جو تم نے دلائل اور مفادات کی کدال سے کھود کھود کر نکالی ہیں، اس لیے تاریخ کا واسطہ ہمیں نہ دو۔ تم نے اپنی تاریخ لکھی ہے، ہم نے تمہاری تاریخ جی ہے!

عدالت میں کھلبلی مچ گئی۔ کچھ لوگوں نے جے جے کار کے نعرے لگاتے ہوئے کبیر کو کندھوں پر اٹھا لیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے گھبرا کر اس نظارے کو دیکھا۔

ادیب نے مداخلت کی اور عدالت میں نظم و ضبط قائم کیا— یہ عدالت صرف سچائی کی پیروکار ہے! اور ساری سچائیاں یہاں کہانیاں بن کر کھڑی ہیں! اصلی کسی بھی ملک میں اپنی دلی سچائی کو لے کر نہیں رہ سکتی... سرجیت کور پارٹیشن کے دن سے اپنے بیہوش بیٹے کو کندھے پر اٹھائے گھوم رہی ہے... اب اس کا یہ بیٹا پچاس باون سال کا ہو گیا... بوٹا سنگھ اپنی کی بچی لاش لیے کھڑا ہے... ودیا کا تانگہ اڑتے اڑتے کہاں پہنچا ہے... اور چنکو لگا گھوڑا اسے کہاں لے گیا ہے، اس کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ یہ اکیلے تو نہیں... لاکھوں ہیں اور یہ کبیر دونوں ملکوں کا جیتا جاگتا نمائندہ ہے... اسے حق ہے کہ...

— اسی لیے ادیب عالی میں ماؤنٹ بیٹن صاحب سے کچھ خاص جوابات کا طلبگار ہوں! کبیر نے ادیب کی بات کو کاٹتے ہوئے درمیان میں کہا— میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے ایسی کون سی دشواری پیش تھی کہ یہ بھارت کو طوفانی جلد بازی اور تابڑ توڑ طریقے سے آزادی دینا چاہتے تھے؟

— یہ فیصلہ میرا نہیں، گریٹ برٹین کے لیبر پارٹی کے وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی صاحب کا تھا۔ وہ بھارت کی آزادی کے حامی تھے! یہ فیصلہ انہیں کا تھا۔

— یہ ٹھیک ہے کہ ایٹلی صاحب نے بھارت کو آزادی دینے کا فیصلہ لیا تھا، لیکن تاریخ بتاتی

ہے کہ بھارت کو کیسی آزادی دی جائے، یہ فیصلہ آپ کے شاہی خاندان اور چرچل نے لیا تھا... کیا آپ بھارت روانہ ہونے سے پہلے چرچل اور اپنے شہنشاہ سے نہیں ملے تھے؟

وہ رسمی ملاقاتیں تھیں!

اور جنگ کے زمانے میں معاون رہے لارڈ اسمے اور شاہی مفادات، سازشوں کے لیے مشہور، ماہر سامراجی سازشی سر کونراڈ کورفیلڈ کو رسمی طور پر آپ اپنا خاص معاون اور صلاح کار بنا کر لائے تھے! ہے نا؟

ماؤنٹ بیٹن نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا، لیکن وہ اندر ہی اندر غصے سے دہک رہا تھا۔

— ایک آخری سوال! کبیر نے کہا تو اسے گہرے تجسس سے دیکھا۔

— آپ کی پارلیمنٹ کے ہاؤس آف کامنس نے تو آزادی جون ۱۹۴۸ء میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن آپ نے تابڑ توڑ جلد بازی دکھاتے ہوئے اگست ۱۹۴۷ء میں آزادی منتقل کرنے کا فیصلہ کیوں لیا؟

ماؤنٹ بیٹن خاموش نہیں رہ سکا—

— اس لیے کہ بھارت میں خانہ جنگی کے سارے حالات موجود تھے! مسلم لیگ کے اعلان پر بنگال ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے نتیجے دیکھ چکا تھا۔

— یہ تو آپ ہمیں بہت بار دکھا چکے تھے... اس لیے عاجز آ کر گاندھی جی نے کہا تھا، آپ ہمیں بھگوان بھروسے چھوڑ دو۔ جو کچھ ہوگا ہم بھگت لیں گے... لیکن آپ تو یہ طے کر کے آئے تھے کہ بھارت کو آزادی دینی ہی پڑے، تو کیسی آزادی دی جائے!... نہرو اور پٹیل کو لنگڑا بھارت سونپ دیا جائے اور جناح کو دیمک لگا پاکستان تھما دیا جائے! اس مہادیش کو تقسیم کر دیا جائے۔

— نہیں... نہیں! یہ سراسر غلط ہے... ماؤنٹ بیٹن چیخا۔

— نہیں! یہ غلط نہیں ہے، کیونکہ تم اور تمہاری سامراجی حکومت، ہم سے، ۱۸۵۷ء کی قومی ایکتا کا بدلہ لینا چاہتی تھی!... آواز تو جیسے کائنات سے آئی تھی۔ آواز کا مالک تو ایک علامت کے طور پر تھا، لیکن آواز گونج رہی تھی۔ اس کی کھنک کو کبیر نے پہچانا۔ اس نے بتایا— یہ آواز شہید اعظم بھگت سنگھ کی ہے!

۳۲

— ۱۸۵۷ء! لیکن اس سے پہلے ۱۷۵۷ء!

ایک گرجتی آواز پھر پورے کائنات میں چھا جاتی ہے—

—لمحوں نے خطا کی تھی

صدیوں نے سزا پائی...

—یہ خطا جہانگیر نے کی تھی! اردلی پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا— جب ہم نے ان انگریز بیوپاریوں کو سورت کے بندرگاہ پر لنگر ڈالنے اور گودام بنانے کی اجازت دی تھی! یاد کیجئے ادیب! جب افریقہ کے دکنی کنارے سے ان سمندری لٹیروں کے جہاز پورب کی طرف بڑھے تھے، تب میں آپ کو تلاش کرتا ہوا اُشر اک ہوٹل پہنچا تھا... لیکن تب تو آپ اپنے ذاتی سکھ اور حسن کی تلاش میں مصروف تھے... اسی کا نقصان اب یہ ۱۸۵۷ء اٹھا رہا ہے... حضور عالی! سکھ اور حسن اُسے ہی حاصل ہے جسے اپنی اور اپنے وقت کی آزادی حاصل ہے... نہیں تو ادھورے سکھ اور بیمار حسن کو ہی شکست ہوئی نسلیں اپنا سارا سکھ اور اعلیٰ حسن قبول کر لیتی ہیں!... وہ دیکھئے ادیب عالی! ان انگریز ایسٹ انڈیا ٹریڈنگ کمپنی کے بیوپاریوں نے جنگل کے دہانے پر کیا کیا ہے؟ تیل، افیم، کالی مرچ، لونگ، الائچی، ادرک اور دارچینی کے بدلے میں انہوں نے اپنی بیکڑوں طوائفیں بنگال کے کنارے پر اُتاری ہیں... یہ بیمار حسن ہے جو بھارت کے کناروں پر اُترا ہے اور رابرٹ کلائیو نے بیمار حسن والی ان چندرہ بدیشی طوائفوں کو بنگال کے نواب سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر کے حرم میں ابھی ابھی بھجوایا ہے... کلائیو کی سازشیں جاری ہیں... اپنا بھاشن جاری رکھتے ہوئے اردلی نے جیسے ایک وسیع تاریخ کا اسٹیج تعمیر کر لیا تھا۔ پردے کی ڈوریاں اُس کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ خود ہی ناظم بھی بنا ہوا تھا۔ پردہ اٹھاتے ہوئے وہ اعلان کرنے لگا—

—ملکہ نور جہاں کے ذریعہ شہنشاہ جہانگیر کا اجازت نامہ لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک طرف تو اپنی جڑیں مضبوط کرنی شروع کر دیں، دوسری طرف وہ ہندوستانی حکومت کی جڑیں کھودنے کے طریقے تلاش کرنے لگے۔ مغلیہ سلطنت بکھرنے لگی تھی۔ چھوٹے چھوٹے رجواڑے اور نواب آپس میں لڑنے بھڑنے لگے تھے... سوداگر بن کر آئی ایسٹ انڈیا کمپنی ان حالات کا فائدہ اٹھا کر زمینداری اور صوبیداری کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ بنگال میں پاؤں جمانے کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے مال گوداموں کے نام پر قلعے بنا لیے۔ مال گوداموں کی چوکیداری کے نام پر فوج کھڑی کر لی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ غیر قانونی حرکتیں بنگال کے نواب سراج الدولہ کو منظور نہیں تھیں...

ناظم اسٹیج اردلی کے الفاظ کے ساتھ اسٹیج کا پردہ اٹھا اور بنگال کا نواب سراج الدولہ غصے سے تمتمایا ہوا سامنے آیا—

—نہیں! ہمیں یہ قطعی منظور نہیں! ہم نہیں چاہتے کہ یہ سوداگر فرنگی کمپنی ہماری سرزمین پر قلعے تعمیر کریں اور فوج رکھیں۔ ہم جانتے ہیں، وہ شاہی اجازت نامے کے بارے میں جھوٹ بول رہے ہیں... ایسا کوئی فرمان شہنشاہ نے جاری نہیں کیا ہے جو انہیں گوداموں کی جگہ قلعے کی تعمیر کرنے کی اجازت دیتا ہو۔ ہم انگریزوں کی غلط بیانی اور جعل سازی کا پردہ فاش کریں گے۔ ہم بنگال میں شہنشاہ کے نمائندے ہیں۔ ہم فرنگیوں کی کوٹھیوں اور ناجائز قلع بندیوں پر حملہ کریں گے... اس ناجائز قبضے کو ختم کریں گے!

پردہ گرتا ہے۔

ناظم پھر مخاطب ہوا—

—ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ معمولی سا کارندہ رابرٹ کلائیو اب کرتا دھرتا بنا بیٹھا ہے۔ اُس نے ریاکاری اور سازشیں شروع کر دی ہیں۔ گوری میموں کے ذریعہ اُس نے نواب سراج الدولہ کے سپہ سالار جعفر کو اپنا غلام بنا لیا ہے۔ میر جعفر کو کلائیو نے سراج الدولہ کی گدی کا لالچ بھی دیا ہے... اور وہ دیکھئے— سامنے کھڑا ہے ۱۷۵۷ء اور پلاسی کا خون آلود جنگ کا میدان! میر جعفر غداری کر رہا ہے۔ وہ فوج کی اپنی بھروسے مند ٹکڑی سمیت کلائیو سے مل گیا ہے...

تبھی اردلی ڈوریاں کھینچتا ہے

پردہ اٹھتا ہے...

سامنے موجود ہے پلاسی کی میدان جنگ۔ گرجتی توپیں، بارود کے دھماکے، دھواں، ہاہاکار، جنگ کا نعرہ، سنسناتی گولیاں، دوڑتے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز، چیخ و پکار۔

پردہ گرتا ہے۔

اور ناظم اپنا اگلا بیان دیتا ہے—

—نواب سراج الدولہ سازش اور غداری کا شکار ہو گیا... وہ جنگ ہار گیا اور... سات برس بعد ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی جیت کر انگریزوں نے اپنی نوآبادیاتی جڑیں ہندوستان میں جما لیں اور بھارت کی آزاد ریاستوں کے خلاف ریاکاری بھرے معاہدے اور سازشیں شروع کر دیں... دور دکن کے میسور ریاست کے حکمران حیدر علی نے انگریزوں کے ارادوں اور سازشوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

پردہ اٹھتا ہے۔

حیدر علی اور اس کی بیگم باتوں میں مشغول ہیں۔

— نہیں بیگم، آپ نہیں جانتیں۔ ان فرنگیوں کی سازشوں نے شمالی ہندوستان میں کیا کیا، کیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپہ سالار کلائیو نے بنگال کے نواب سراج الدولہ کے اعلیٰ وزیر اور سپہ سالار میر جعفر کو خرید کر انہیں دھوکے سے شکست دے دی ہے۔ پلاسی کی جنگ جیتنے کے بعد انہوں نے بکسر کی لڑائی بھی جیت لی ہے!

— لیکن میرے سرتاج! یہاں پانڈیچیری میں فرنگی فرانسیسی بھی تو ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ انگریزوں کے دشمن ہیں، اس لیے وہ ہمارے دوست ہو سکتے ہیں۔

— نہیں بیگم، نہیں، غیر ملکی کبھی بھی ہمارے دوست نہیں ہو سکتے — وہ چاہے فرانسیسی ہوں یا انگریز۔ دونوں ہماری آزادی کے دشمن ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ملک کے جنوب میں فرانسیسی ہیں تو شمال میں فرنگی انگریز...

— خدا میرے سرتاج کو سلامت رکھے...

— بیگم! ہماری سلامتی سے زیادہ ملک کی سلامتی اور آزادی ضروری ہے... انشاء اللہ جب تک ہندوستان میں حیدر علی زندہ ہے اپنا ملک غلام نہیں ہو سکتا!

پردہ گرتا ہے

ناظم کا بیان شروع ہوتا ہے —

— حیدر علی نے لڑتے لڑتے ایسٹ انڈیا کمپنی کا ناطقہ بند کر دیا، لیکن ۷ دسمبر ۸۲ء کو ارکاٹ سے سولہ میل دور چتوڑ کے فوجی میدان میں اس کی زندگی کا چراغ بجھ گیا... تب حیدر علی کے بیٹے ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی کمان سنبھالی۔

پردہ اٹھتا ہے!

— سنو، سنو! آج اللہ کا یہ بندہ اور مادرِ وطن کا یہ خادم ٹیپو سلطان جانتا ہے کہ ملک کے بڑے حصوں میں فرنگیوں کی سازشیں کامیاب ہو گئی ہیں۔ وہ گنگا جمنا کی وادی کو اپنے پاؤں تلے روند رہے ہیں... ہم گنگا جمنا کی گھاٹی تک تو نہیں جا سکتے، لیکن ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ناپاک قدم اپنے پاک و مقدس کاویری ندی کے علاقے میں نہیں پڑنے دیں گے! ہمیں حیرت اور افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ، چاہے وہ پیشوا مراٹھے ہوں، یا حیدر آباد کے نواب، یا دوسری ریاستوں کے والی، وہ فرنگیوں کی کٹھ پتلی بن کر اپنے ہی لوگوں کے گلے کاٹ رہے ہیں... اور گھر کی اس پھوٹ کا فائدہ اٹھا رہے ہیں — فرنگی لٹیرے!

پردہ گرتا ہے

ناظم نے پھر بیان شروع کیا —

— فرنگی لٹیروں کی لوٹ جاری تھی لیکن اس لوٹ اور غلامی کے خلاف جنگ بھی جاری تھی۔ کتور کی رانی چنمّا، تراونکور کے ویلو تھمپی، سانتھال پرگنے کے آدی باسی سردار تلکا مانجھی اور منتھوں کے سنیاسی مسلسل ایسٹ انڈیا کمپنی سے لوہا لے رہے تھے...

— اردلی محمود علی!

طوفان کی طرح لہراتی، گونجتی، پکارتی ہوئی ایک آواز ہمالیہ کی اونچائیوں کو لانگھتی وہاں آئی۔ اردلی نے آواز کو پہچانا۔ یہ تو اس کے ادیب کی آواز تھی۔

— ادیب عالی! آپ کہاں سے پکار رہے ہیں؟

— میں چین ملک کے دکنی بندرگاہ کینٹن سے تمہیں پکار رہا ہوں...

— آپ وہاں کیسے پہنچ گئے؟

— کیوں؟ تمہیں نے تو میری کہانیوں کی تنہائی میں خلل ڈال کر بتایا تھا کہ جنوبی افریقہ کے ساحل کو پار کرتے ہوئے فرنگی لٹیروں کے جہازی بیڑے مشرق کی طرف بڑھ گئے ہیں... تمہاری اس اطلاع کی وجہ سے خود کو گنہگار سمجھتے ہوئے سلمیٰ الوداع کہہ کر چلی گئی تھی۔ زخمی ہوئی شاہین کی دردناک کہانی کہیں ادھوری چھوٹ گئی تھی۔ ودیا کے تانگے کے اڑنے والے گھوڑے کی داستان رک گئی تھی... سرجیت کور اپنے بے ہوش بیٹے کو کندھے پر لادے اس کی قدیم بے ہوشی کی وجہ پوچھ رہی تھی اور بوٹا سنگھ ریل سے کٹی اپنی لاش کو لیے کہانی لکھے جانے کا انتظار کر رہا تھا... اردلی محمود علی! تب تمہیں نے میری کہانیوں کو غیر ضروری بتایا تھا اور مجھے لعنت بھیجی تھی... تبھی سے میں تمہاری لعنت اور ملامت کو لادے ہوئے بھٹک رہا ہوں... ملک، ملک میں خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ یہ بددعا تم نے مجھے دی ہے۔ نہیں تو میں اپنے احساس، رحم دلی اور حسن کو لے کر اپنے دور کی وہ کہانیاں لکھ رہا ہوتا جو لکھنی چاہیے تھیں۔ تم میرے احساسات، رحم دلی اور حسن کے قاتل ہو... تمہیں نے مجھے خانہ بدوش بنایا ہے۔

— لیکن آپ چین دیش کے بندرگاہ کینٹن پر کب اور کیسے پہنچ گئے؟ وہاں جانے کی آپ کو کیا ضرورت تھی؟

— اردلی محمود علی! یہ سوال اور بحث مجھ سے مت کرو... کیونکہ دنیا کے ہر ملک میں میرا ایک ملک ہے۔ میرا ایک ملک پاکستان میں ہے، کوسوو میں، البانیہ میں، روس، داغستان، افغانستان، ایسٹ تیمور میں بھی ہے۔ دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں ہے جس میں میرا ملک نہیں ہے... اسی لیے چین

میں بھی میرا ایک ملک ہے... اور میں یہاں موجود ہوں!

—لیکن کس لیے؟

—اس لیے کہ سوداگروں کی جس جماعت نے اپنے سامراج قائم کر کے ہندوستان کو جکڑ لیا ہے... وہ ہی نوآباد فرنگی اب چین میں بازار بنانے کے راستے تلاش کر رہے ہیں، اس لیے مجھے یہاں آنا پڑا... اور سنو... بازاروں کے لیے ہی بنتے ہیں سامراج! اور سامراجیوں کو زندہ رکھنے کے لیے ہی بنائے جاتے ہیں بازار! سامراجیوں کی ناف بازار سے جڑی ہے۔ سامراج کے روپ بدل سکتے ہیں... وہ جمہوری معاشی سامراج کی شکل لے سکتے ہیں لیکن، ان سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کو جینے کے لیے منافع کے بازاروں کی ضرورت ہے... بازار! بازار! بازار! یہی ہے صنعتی انقلاب کے مسلسل زندہ رہنے کا مجبوری سے پُر نظریہ! یہی ہے سرمایہ داری۔ اسی کا دوسرا نام ہے سامراجیت۔ تیسرا نام ہے نوآبادیات اور آج دستک دیتی ہوئی نئی صدی میں اس کا دوسرا نام بھی ہو سکتا ہے۔ یہ نظام کچے مال کی حصولیابی اور نت نئے بازاروں کی تعمیر کے بغیر جی نہیں سکتا۔ اذیت، نابرابری اور افسردگی کے درمیان یہ دیتے ہیں— مصنوعی تقریبات اور خوشی— سڑتی لاشوں کے انبار پر یہ چھڑکتے ہیں— کرسچین ڈیور، شینل اور اموآگے کرنل کے عطر— کٹی ہوئی لہولہان گردنوں میں یہ پہناتے ہیں— لاتون کی تک ٹائیاں اور میزوریکا کے نیکلس— ٹوٹی ہوئی کلائیوں میں یہ باندھتے ہیں— راڈو اور ریمنڈ ویل کی گھڑیاں اور چکنا چور انگلیوں کو یہ پکڑاتے ہیں مونٹ بلینک اور واٹرمین کے قلم!

ادیب نے لگ بھگ بھاشن سا دے ڈالا۔ سن کر بھی سکتے میں تھے۔ آخر خاموشی کو توڑتے ہوئے اردلی بولا— آپ ٹھیک فرما رہے ہیں ادیب عالی! آج بھی ہندوستان کے ہزاروں گاؤں میں جہاں پینے کا صاف پانی نہیں پہنچ سکا ہے، وہاں پیپسی اور کوک پہنچ چکا ہے...

—تو اس میں غلط کیا ہے؟ قطب کالونی کے ٹمارنڈ کورٹ سے پیارہ مانی کی آواز آئی۔ اسی کے آنگن، میں ماڈل جسیکا لال کی لاش ابھی پڑی تھی۔ اُسے پیار اور ممنونیت سے تھپ تھپاتے ہوئے پیارہ مانی نے کہا— یہ ہمارے ناچنے گانے کلچر کی پہلی شہید ہے... پیدا ہونے کے فوراً بعد اس نے ماں کا دودھ ضرور پیا تھا۔ پھر نہیں پیا۔ یہ لگاتار لمکا یا بیئر پیتی رہی۔ کیونکہ دودھ سے زیادہ پروٹین ہے بیئر میں۔ سیب کے رس سے کم کیلوریز ہیں بیئر میں۔ یہی جسیکا لال کے دلکش اور خوبصورت ہونے کا راز تھا۔ وہ طوفانی خوبصورتی جسے دیکھ کر منو شرما پاگل ہو گیا تھا...

—بند کرو یہ فضول باتیں! ہمارے دکھ اور سکھ کی داستان رکی پڑی ہے اور تم پیارہ مانی سے

الجھے ہوئے ہو! ایک کہانی نے اردلی کو ڈانٹا— بلاؤ ادیب عالی کو واپس۔ ہمیں اُن کی ضرورت ہے تاکہ ہماری زندگی مکمل ہو جائے۔

—ادیب عالی اس وقت چین کے کینٹ بندرگاہ میں موجود اور مصروف ہیں۔ مجھے نہیں معلوم وہ وہاں کیوں گئے ہیں۔ انہیں کینٹ سے بلا سکنا ممکن نہیں ہے! اردلی نے بتایا۔

—نہیں! میں اس وقت سنٹرل انڈیا کے مندسور، جھبوا علاقے میں افیم کے کھیتوں کے درمیان ٹہل رہا ہوں۔ یہاں بہار آئی ہوئی ہے... افیم کے سفید، ریشمی، عنابی، شرتی پھولوں کا سمندر یہاں لہرا رہا ہے اور لوسون میرے ساتھ ہیں۔

—لوسون کون؟

—چین کے سب سے بڑے ادیب!



لوسون افیم کے پھولوں کی شان دیکھ کر حیران اور فکرمند تھے۔ وہ آہستہ سے بولے—

—یہ پھول جتنے نازک اور خوبصورت ہیں، ان کا مشروب اتنا ہی نشہ آور اور پرتشدد ہے... تمہیں شاید نہیں معلوم ادیب، ہندوستان میں پاؤں جمانے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازیوں نے چین میں افیم کی اسمگلنگ شروع کر دی ہے... یہ سمندری لٹیرے ہیں جو کلکتہ کے افیم کے کارخانوں سے اپنے اسٹیمروں میں افیم کی پیٹیاں لے کر ہمارے مکاؤ جزیرے کی خلیج میں چھپ جاتے ہیں۔ وہیں سے وانگیایا کوآنچا کے ذریعہ یہ لٹیرے افیم کی اسمگلنگ کرتے ہیں۔ چوری چھپے ان کے اسٹیمر پرل ندی کے دہانے میں گھس کر کینٹن تک پہنچ جاتے ہیں... یا پھر ان کے اسٹیمر چوری چھپے لنگ ٹنگ یا وامپو امیں لنگر ڈالتے ہیں اور وہاں سے اس نقلی اشیا کی اسمگلنگ کرتے ہیں!

—اصلی ادیب! پہلے بھی تو ہندوستان سے افیم آپ کے دیش میں برآمد ہوتی تھی! ادیب نے لوسون سے کہا۔

—جی ہاں! چنگ شاہی خاندان اس کی درآمد دواؤں کے لیے کرتا تھا۔ وہ بھی سال بھر میں کل دو سو پیٹیاں۔ لیکن اب تو برطانیہ حکومت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس غیر قانونی بیوپار کے لیے کھلی چھوٹ دے دی ہے۔ وہ اب دو سو نہیں دو ہزار پیٹیوں کا دھندا کرتے ہیں۔ یہ افیم کلکتے میں ہی دس گنے داموں میں نیلام ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ ہندوستان سے چین کے بندرگاہوں پر اسمگلنگ سے اُتار کر ہمارے ملک کے اندر بھیجی جاتی ہے...

— چین کے ادیب عالی لوسون صاحب! یہ تو آپ کے ملک اور چنگ شاہی خاندان کی نامردی کا ثبوت ہے کہ آپ اس اسمگلنگ کو روک نہیں پا رہے ہیں!

— وہ اس لیے کہ افیم کا نشہ اب ہمارے چین میں خاندانی اور بڑے عہدیدار ہونے کی علامت بن چکا ہے... دیکھیے ہمارے ملک کو...

اور ادیب نے دیکھا— پراچی کی ایک بڑی تہذیب افیم کی نیم بے ہوشی میں غرق تھی۔ ان کی آنکھوں اور ناک سے کالا دھواں نکل رہا تھا۔ پرل ندی کی دھار کالی پڑ گئی تھی۔ شنگھائی، کینٹن، نان کنگ، اموئے، فوچو، ننگ پو بندرگاہوں کی سڑکوں اور گلیوں میں کروڑوں لوگ چل پھر رہے تھے، لیکن ان کے سائے نہیں تھے... وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے— ہم کس شہر میں ہیں؟ ہم کہاں ہیں؟...

— پرچھائیاں گم نہیں ہوئی ہیں... ہماری ذات کو ناکارہ بنا کر وہ پرچھائیاں ان لٹیروں نے چھین لی ہیں... ہمیں انہوں نے تہذیب سے عاری کرنا چاہا ہے... تمدن ہی اسلاف کی زندہ پرچھائیوں کی دنیا ہے۔ اُن کی موجودگی ہمیشہ پرچھائیں کی طرح انسان کے ساتھ رہتی ہے... بڑی تہذیبوں کو افسردہ کرنے کا یہی طریقہ ان وحشی لٹیروں نے نکالا ہے... یہ پہلے اسلاف کی پرچھائیاں چھینتے ہیں... ابھی لوسون بول ہی رہے تھے کہ اردلی نے مداخلت کی—

— آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں حضور! سب سے پہلے یہ اسلاف کی پرچھائیوں کو قتل کرتے ہیں... ثقافتوں کو تباہ کرتے ہیں، پھر پرانی اور چینی تہذیبوں کو بدلتے ہیں!... یوروپ کے سارے ملک اسپین، پرتگال، ہالینڈ، انگلینڈ، فرانس اقتدار کی ہوس، مادی سکھ اور منافع کی تلاش میں پرتشدد مذہبی جنگوں کو پیدا کرتے رہے ہیں... مذہب کو انہوں نے اقتدار کا ہتھیار بنایا ہے۔

— میں گواہ ہوں اس کا! اوٹومن سامراج کا شہنشاہ سلیم اول چیخا— جیسس کرائسٹ کی رحم دلی، عدم تشدد، پشیمانی اور رحم کے انسانی منتروں کے باوجود انہیں کو لے کر رحم دلی کی جگہ جتنی بربریت، عدم تشدد کی جگہ تشدد، پشیمانی کی جگہ نسلی برتری اور رحم کی جگہ بے رحمی اور قتل کی جتنی غیر انسانی تاریخ ان کے پاس موجود ہے، وہ تو دنیا کے کسی مذہب کے نام پر درج نہیں ہے۔

— تمہارے اسلام کی تاریخ تم کیتھولک عیسائیوں سے کہیں زیادہ ظالمانہ ہے۔ خود تم نے اپنے مذہبی بھائیوں، شیعوں کے ساتھ جو حیوانی ظلم کیے ہیں، ان پر تم پردہ نہیں ڈال سکتے! فرانس کے نوجوان راجہ فرانسس اول نے شہنشاہ سلیم کو للکارا— تم نے فارس کی زمینوں پر قبضہ کیا۔ تبریز، کردستان کو روند ڈالا۔ میسوپوٹامیا اور مصر پر تم نے درندگی کا قہر ڈھا کر انہیں اپنے قبضے میں لے لیا اور

اسلام کی روایت کا انکار کر کے تم خود خلیفہ بن بیٹھے... تم نے تہذیبوں کو برباد کیا... عیسائیوں نے نہیں...

— تو کیا تمہارا اسپینش ہیرنانڈو کورٹس عیسائی نہیں تھا، جس نے میکسکو کی پھلتی پھولتی مایا تہذیب کو تباہ کیا تھا؟ ازٹیک سامراج کے بادشاہ موتیزوما کو دھوکہ دے کر کس نے مارا تھا؟ تم نے کس بے رحمی سے امریکہ کے قبائلی چیفس کو کھدیڑا اور ان کا قتل کیا تھا... انہیں یاد کرو... تمہارا ان پڑھ حرف ناآشنا سردار ہیجیر ولیشن امریکی ملک پیرو میں داخل ہو گیا تھا اور پوٹاسی پہاڑی سلسلے کے چاندی کے پہاڑوں کو توڑ توڑ کر اس نے اسپین پہنچا دیا تھا جو تین تین صدیوں تک پورے یوروپ کی پرورش کر سکتے تھے! تم عیسائی ڈاکو ہو! تم لٹیرے ہو... ترکی سے سلیم نے مخالفت کی... تم نے مذہب کے محافظ کے نام پر کروسیڈرس پیدا کیے!

— تم نے جہادی پیدا کیے!

— تم نے عیسائیت کے نام پر اپنا مذہبی رہنما اگنیشس لوئلا پیدا کیا۔

— تم نے اسلامی جہاد کے نام پر حسن بن صباح جیسا قاتل پیدا کیا۔

— تمہارے اگنیشس لوئلا نے لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا۔

— تمہارے حسن بن صباح نے کروڑوں عیسائیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔

— بند کیجیے الزام، رد الزام کی یہ گندی اور ذلیل بحث۔ لوسون نے اپنی سنجیدہ آواز میں کہا— سچائی یہ ہے کہ ایشیا نے سارے مذاہب اور تہذیبیں پیدا کی ہیں اور یوروپ نے اپنے صنعتی انقلاب کے بعد اپنے منافع کے بدیشی بازار تلاش کرنے شروع کیے ہیں... اسی لیے تم مغربی مادّی پسند لوگوں نے مغربی تہذیب پر حملے شروع کیے ہیں... تمہیں نہیں معلوم تھا کہ تمہارے سمندری کناروں کے اُس پار کوئی اور دنیا بھی ہے۔ تم نے صرف سونے کی چڑیا ہندوستان کا نام سنا تھا... جسے ڈھونڈتے ہوئے تمہارے سمندری ڈاکو ہندوستان کے مالابار ساحل تک پہنچے تھے... اور ہندوستان کی تلاش کرتے کرتے تمہارا کولمبس امریکہ کی اچھوتی دھرتی تک پہنچا تھا۔ اس سچ کو مت بھولو کہ ہندوستان کی تلاش میں ہی نئی دنیا تمہارے ہاتھ آئی تھی۔ تمہارے پاس مذہب نہیں، مذہب کا مکھوٹا تھا۔ آتما کی نجات کی تمہاری مہم ایک ریاکاری تھی... تم اپنے جہازوں پر گھوڑے اور بارود لے کر آتما کو آزاد کرانے نہیں آتماؤں کو غلام بنانے نکلے تھے... تمہاری مادّی ہوس نے قدیم تہذیبوں کو تباہ کیا تھا۔ دیکھو تاریخ کے صفحات کو۔ آخر بودھ دھرم بھی بھارت سے نکل کر سارے ایشیا میں پھیلا تھا، لیکن کہیں کسی بھی ملک میں خون کی ایک بوند تک نہیں گری تھی۔ بودھ سادھو گھوڑوں پر چڑھ کر بارودی حملہ کرنے والے مذہبی بہادر نہیں تھے... وہ ہمالیہ جیسا پہاڑ پیدل پار کر کے آئے تھے۔ وہ سمندری

راہوں سے چلے تھے تو ساتھ میں اسلحوں سے سجے جنگی بیڑے لے کر نہیں نکلے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھالے، تلوار اور بندوقیں نہیں تھیں۔ اُن کے بیڑوں پر توپیں نہیں تھیں۔ اُن کے پاس تھا—

امن، عدم تشدد اور رحم دلی کا پیغام اور ان کے ہاتھوں میں تھا بدھ دھرم کا ورثہ۔ کش! تب بڑے سے بڑے پہاڑ مذہب کے پیروں تلے جھک جایا کرتے تھے۔ بے پناہ پانی والے سمندروں کی لہریں تب خود انسانی مذاہب کے اصولوں اور امن کے پیغام کو ایک تہذیب کے کنارے سے دوسری تہذیب کے کنارے پر پہنچایا کرتی تھیں... بیوپار اور بازار تب بھی تھا۔ جسے جتنی ضرورت تھی اتنا ہی درآمد یا برآمد کرتا تھا۔ ہماری پرانی کی تہذیبیں ایک دوسرے کے معاشی نظام کی مربی اور ضمیمہ تھیں۔ اُن میں منافع کا مقابلہ اور استحصال شامل نہیں تھا... اس کا ثبوت ہیں وہ تین سو برسوں کی ساری صدیاں... جن میں کبھی بھارت چین جنگ نہیں ہوئی...

—لیکن ۱۹۶۲ء میں تو جنگ ہوئی! ایک تلخ آواز آئی۔

—یہ انگریز سامراجیت کی چھوڑی ہوئی غلط سرحدی وراثت کا نتیجہ تھا! لوسون نے کہا۔

تبھی آسمان کالا پڑ گیا۔ سورج چھپ گیا۔ آوازیں خاموش ہو گئیں اور توپ کے گولوں اور بارودی دھماکوں کی دہلا دینے والی آوازیں آنے لگیں۔ ادیب نے گھبرا کر پوچھا—

—ارے! محمود علی! سورج کہاں گیا؟ آوازیں کہاں چلی گئیں؟ یہ آسمان کیوں کالا پڑ گیا؟

—ادیب عالی! واسکوڈیگاما نے کالی کٹ کے بندرگاہ پر توپوں سے حملہ کیا ہے۔ اُدھر کولمبس نے جس نئی دنیا کو کھوج نکالا ہے، وہاں جو قدیم تہذیبیں موجود ہیں اُن پر پرتگالی و اسپینی لٹیروں نے حملہ کیا ہے۔ اس لوٹ میں اُن پڑھ حروف ناشناس، سماج سے نکالے گئے، ملزم، قاتل اور ظالم لوگ ہی شامل ہیں جو اپنی لوٹ کا پانچواں حصہ اپنی سرکاروں کو دے کر بہادر جنگ باز اور محبِ وطن ہونے کا خطاب پا رہے ہیں۔ اپنے ملکوں کے سامنتوں، زمینداروں، راجہ مہاراجوں سے بھی زیادہ دولت مند اور عیاش ست مہنتوں کی پوری حمایت ان قاتلوں و لٹیروں کو حاصل ہے۔ عیسیٰ مسیح نے گناہ و پشیمانی کا جو انسانی مہامنتر دیا ہے اس کی انہوں نے اپنی تشریح کر لی ہے... گناہ ان کے لیے اب پشیمانی کی وجہ نہیں؟ پشیمانی کی قیمت اب چاندی سونے میں ادا کر گناہ سے آزاد ہوا جا سکتا ہے... ہرنانڈو کورٹیس نے مایا تہذیب کو کچل ڈالا ہے... ازٹیک قبیلے کے ہزاروں نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے... جنگلوں کو جلا دیا ہے... امریکہ، ترینداد، کناڈا، میکسکو، کیوبا، پناما، برازیل، پیرو وغیرہ علاقوں میں نوآبادی قائم کی جا رہی ہے... یہاں کے انڈین قبیلوں کا صفایا کر کے افریقہ کے نیگرو مزدوری کے لیے لائے جا رہے ہیں... ان نیگرو غلاموں کا بیوپار ٹھیکیداروں نے لے لیا ہے،

انہیں یہاں جانوروں کی طرح نیلام کیا جا رہا ہے... جلتے جنگلوں کی وجہ سے یہاں کے پرندے اپنا وطن چھوڑ رہے ہیں... اسی لیے سورج کو ان بھاگتے اڑتے پرندوں نے ڈھانپ لیا ہے... آسمان کالا پڑ گیا ہے...

—تبھی ایک کراہتی ہوئی آواز آئی—

—اب آپ سن ہی رہے ہیں تو ہم سے سنئے، ہماری تہذیب کی تباہی اور بربادی کی کہانی!

—آپ کون ہیں؟ ادیب نے پوچھا۔

—میں موتنے جما ہوں... ازٹیک سامراج کا شہنشاہ! میں نے قاتل کورٹیس کا مہمان کی طرح میکسکو میں استقبال کیا تھا، لیکن اس نے جو قہر ہمارے قبیلوں پر برپا کیا، اس کا نتیجہ تھا کہ زندہ بچی رعایا اور ریاستی مجلس میرے خلاف ہو گئی۔ مجھے اقتدار سے بے دخل کر دیا گیا... پھر بھی میں نے منتخب شہنشاہ کو آہتو میک کے حملے سے اسپینی جارحیت پسندوں کی جان بچانے کی کوشش کی... کیونکہ میں جانتا اور مانتا تھا کہ تشدد سے تشدد پنپے گا... میں اپنے قبیلوں اور نئے شہنشاہ کو آہتو میک کا مخالف نہیں تھا... لیکن میں خون خرابہ نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے خود کورٹیس کو بتایا تھا کہ شہنشاہ کو آہتو میک کے حملے سے بچنے کے لیے وہ اپنے فوجیوں کو لے کر مغربی شاہراہ سے محفوظ نکل کر اپنے ملک اسپین لوٹ جائے!

—میں ضروری تو نہیں سمجھتا لیکن پھر بھی میں ازٹیک شہنشاہ موتنے جما کے بیان میں مداخلت کرنا چاہتا ہوں! ایک شاہی ٹھنڈی آواز نے کہا۔

ادیب نے یہ آواز پوچھا— آپ کی تعریف؟

—میں اسپین کا شاہی مؤرخ ہوں— برنیل ڈیاز! اب تم نے ذلت ذاتوں سے آزاد ہو کر اپنی عدالتیں بنا ہی لی ہیں تو میں یہی کہنے، بتانے اور آگاہ کرنے آیا ہوں کہ تم ہماری لکھی تاریخ کو توڑنے مروڑنے کی کوشش مت کرو! مؤرخ برنیل ڈیاز نے بڑے ساقی انداز میں تحریہ تنبیہ کی۔

—جناب برنیل ڈیاز... ہم آپ کی تاریخ کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر انسانیت کی تاریخ کے اصل معنی جاننا چاہتے ہیں... اس میں تو آپ کو آزاد ہوئی ذلت ذاتوں سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ سچ سالم ہے... اسے آپ کے شاہی الفاظ نے ڈھانپ رکھا ہے... الفاظ کے بہتے خون اور پسینے کو پونچھ کر آپ نے انہیں پاک صاف بنا لیا ہے... آپ نے سڑتی لاشوں، خون اور پسینے کی خوشبو کو بدبو بنا کر الفاظ کے پرفیوم سے قتل کے حادثوں اور تہذیبوں کی تباہی کو اپنی تاریخ کی کتابوں کے لیے خوشبودار بنا لیا ہے۔ ساری نوآبادیاتی و سامراجی حکومتیں کھوکھلے نگاڑوں پر انسانی کھال کے

چلے منڈھ کر نکاڑچیوں کی طرح اعلان کر رہی ہیں کہ انہوں نے غیر مہذب دنیا کو مہذب بنایا ہے۔ لوسون نے غصے کی وجہ سے ماتھے پر چھلک آئے گرم پسینے کو پونچھتے ہوئے کہا۔

——لوسون صاحب! پسینہ مت پونچھیے... مجھے آپ کے پسینے کی تحقیق اور تجزیہ کرنا ہے! کہتا ہوا ایک اجنبی خالی شیشیاں لے کر ان کی طرف بڑھنے لگا۔

عدالت کی بینچ کے سبھی لوگوں نے اس اجنبی کو حیرانی سے دیکھا۔

تبھی ادیب نے اُسے پہچانا——ارے، تم شاید وہی اشرو وید ہو جو پچھلی صدیوں میں ہمیں ملے تھے... شاید تمہیں تھے جو اپنی تجربہ گاہ میں آنسوؤں کی جانچ کر کے انسان کی طبعی اور روحانی سوزش کی تحقیق کر اس کے ازالہ کی ترکیب ڈھونڈ رہے تھے!

——ہاں، میں وہی اشرو وید ہوں ادیب عالی! لیکن تب سے اب تک دنیا بہت بدل گئی ہے... اب تو قتل، قاتلوں اور غلاموں کا دور چل رہا ہے۔ اپنی ہی دھرتی پر قبیلوں کے قبیلے مرے پڑے ہیں... اور آپ تو جانتے ہیں جارحیت پسندوں اور مردوں کے پاس آنسو نہیں ہوتے... اس لیے اب میں پسینے کی تاثیر پر تحقیق کر رہا ہوں... قبیلوں کے بعد قبیلے تباہ کر دینے کی وجہ سے ان نوآبادیات والوں کو مزدور نہیں مل رہے ہیں، اس لیے یہ لوگ افریقہ و ایشیا سے اپنی جہازوں میں محنت کش قلیوں کو بھر کر لاتے ہیں۔ دیکھیے چل کر میرے ساتھ... زرخیز غلاموں کا بازار جو ان نوآبادیات والوں نے ڈکار علاقے کے سمندری ساحل کے پاس والے ٹاپو گوری پر قائم کر لیے ہیں۔ گوری ٹاپو سے کولمبس کے امریکہ تک سیدھا سمندری راستہ جاتا ہے... اسی پر بنائے ہیں انہوں نے اپنے عالیشان گھر۔ انہیں گھروں کے نیچے ہیں وہ تھیلے اور باڑے، جن میں سینیگل اور وسط افریقہ سے لائے گئے نیگروز کو ننگا کر کے جانوروں کی طرح زنجیروں سے باندھ دیا جاتا ہے۔ قیمت کے لیے آدمی کا جسم، بچوں کے دانت اور عورتوں کی چھاتیاں دیکھی اور مسلی جاتی ہیں۔ جانوروں کے آسن میں عورتوں کے ساتھ مجامعت کی جاتی ہے۔ پھر انہیں گوری ٹاپو سے کشتیوں میں بھر کر ان جہازوں تک پہنچایا جاتا ہے جو ان غلاموں کو امریکہ لے جاتے ہیں اور واپسی میں یہی جہاز لوٹے ہوئے دھن دولت اپنے دیشوں کو پہنچاتے ہیں۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ گذشتہ ایک سال میں ان جارحیت پسندوں نے اپنے دیشوں کو ۱۹۰۰۰ ٹن چاندی اور ۱۸۰ ٹن سونے سے بھر دیا ہے۔ یہ چیزیں زمین کی کانوں یا پہاڑوں سے نہیں نکلی ہیں بلکہ قبیلوں کے خزانوں اور مردوں کے زیوروں کو بھٹیوں میں پگھلا کر جمع کی گئی ہیں۔ اب انہیں شہد کی لت پڑنے لگی ہے، اس لیے یہ شکر کے شوقین ہو گئے ہیں... مردے تو کھیتی کر نہیں سکتے، اس لیے یہ افریقہ، انڈیا، چین، ساترا، سیلون سے مزدوروں کی نہیں، غلاموں کی بھرتی

کر رہے ہیں۔ ویسٹ انڈیز، کیوبا، برازیل، جاوا، فیجی، ماریشس میں یہ گنے کی کھیتی کر کے یورپ کے بازاروں میں من مانے منافع پر شوگر سپلائی کر رہے ہیں... افیم کی اسمگلنگ کر کے، بدلے میں یہ چین سے ریشم اور چائے لے جا رہے ہیں... چین کے ریشم کے کرگھے بیکار ہو گئے ہیں۔ اسمگلنگ کی افیم کا منافع سوگنا زیادہ ہے کیونکہ اسمگلر کوئی ٹیکس یا محصول نہیں دیتے...

——یہ اشرو وید جو کچھ بتا رہے ہیں، بالکل صحیح ہے۔ ان انگریز اسمگلروں کا سرغنہ ہے، ولیم جارڈین! لوسون نے بتایا——یہی اسمگلر اپنی کالی دولت کی طاقت پر ۱۸۴۱ء میں برٹش پارلیمنٹ کا ممبر بنا۔ دوسرا اسمگلر ہے، جیمس ماتھیسن، جس نے اسی سال واپس لوٹ کر اسمگلنگ کے کالے دھن سے اسکاٹ لینڈ کے مغربی ساحل پر ہزاروں ایکڑ کا ایک ٹاپو خرید لیا تھا... اس ٹاپو کے صرف ساحلی باندھوں کی مرمت پر جیمس نے تین لاکھ انتیس ہزار پونڈ خرچ کیے تھے۔ اسی سے آپ اس کی بے پناہ دولت کا اندازہ لگا سکتے ہیں! اور میں اسے حیرت کی بات نہیں مانتا کہ اس اسمگلر اور سمندری لٹیرے کو ملکۂ وکٹوریہ نے اپنے سامراج کا نائٹ ہڈ دیا تھا۔ اسپین، پرتگال، فرانس، برطانیہ اور ڈچوں کے شاہی گھرانوں اور ان کے مورخین نے ان سمندری لٹیروں اور اسمگلروں کو عظیم سمندری سیاح، نئی دنیا کے کھوجی اور موجد کے خطاب دیے ہیں... کیونکہ ان شاہی گھرانوں کو اس لوٹ کی دولت میں سے پانچواں حصہ بطور نذرانہ ملتا ہے اور اپنی نوآبادی قائم کرنے کے لیے دھرتی کی واحد ملکیت! لوسون بتانے لگے——اسی بیوپار میں شامل تھیں، برٹش، امریکہ کی کمپنیاں پرکنس ورسل جو اسمگلنگ کے لیے مجرم غنڈوں کی گن بوٹس بھی لاتی تھیں۔ ساتھ میں آتے تھے ان کے مذہبی مبلغ، جو ہمیں روایتی اعتقاد سے محروم کر کے ہمارے ثقافتی عقیدے کو منتقل کر دیتے تھے۔ ہم اپنی آتما کو لے کر اپنے ہی سماج اور دیش میں مہاجر بن جاتے تھے... تب ہماری پرچھائیاں ہم سے بغاوت کرتی تھیں...

——بالکل یہی ہماری تہذیبوں کے ساتھ ہوا تھا... ہمارے ساتھ تو اس سے بھی خطرناک کھیل کھیلا گیا! ازٹیک تہذیب کا شہنشاہ موتنے ہما چیخ پڑا——اٹلی اور یوا! ہر تہذیب، ہر ذات، ہر طبقہ، ہر صدی اپنے عظیم خدائی رہنما کے آنے کا انتظار کرتا ہے... یہ انتظار ہی تہذیبوں اور ثقافتوں کو زندہ رکھتا ہے... ہماری دنیا کے سارے قبیلے بھی اسی ابدی یقین کو لے کر جی رہے تھے کہ ہمارا خدا ایک دن ضرور آئے گا... انہوں نے ہمارے اس ابدی یقین کا فائدہ اٹھایا۔ ان کے مذہبی مبلغین نے ہماری زبان، مذہبی عقائد، ریت رواجوں کا مطالعہ کیا... ہم جیسے بن گئے ہیں، یہ وہم پیدا کیا اور تب اُن کے بزرگ مبلغ الاوریز نے ہمیں ہماری ہی زبان میں معجزاتی اطلاع دی کہ ہمارا منتظر خدا آ گیا

ہے... ہمارے شو کے مقرب نشان والے اعلیٰ انسان نے اوتار لے لیا ہے... تو ہم نے آسانی سے یقین کر لیا... تب اُس مبلغ نے ہمیں بتایا کہ ہمارا خدا ہرنانڈو کورٹیس ہے جو گھوڑے پر سوار نازل ہوا ہے... گھوڑا ہمارے تجربے کے لیے عجیب سواری تھا کیونکہ ہمارے قبیلوں نے ایسا عجیب جانور کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ہمارے لیے یہ عجیب بہشتی جاندار تھا... جب گھوڑے پر سوار اپنے خدا کورٹیس کو ہم نے دیکھا تو یقین نہیں ہوا... وہ خدا اپنے خاص نشان اور تصور سے بہت مختلف لگ رہا تھا۔ گھوڑے اور مرد کو ہم نے ایک ہی سمجھا تھا۔ لیکن خدا تو خدا ہے وہ کوئی بھی شکل اختیار کر سکتا ہے... ہمارے قبیلے نے یہی سوچ کر یقین کر لیا تھا...

شاہی اسپینی مورخ برنیل ڈیاز نے غصے اور حقارت سے موتنے جما کو دیکھا۔ تبھی جج کے چیف جسٹس ٹوسون نے برنیل ڈیاز کو گھورا اور ادیبؔ کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، پھر موتنے جما کو۔

موتنے جما نے اپنا بیان جاری رکھا—

—ازتیک کی ریاستی کونسل مجھے معزول کر ہی چکی تھی۔ ہمارے نئے شہنشاہ کو آہچو میک نے کورٹیس کو خدائی پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا۔ اس لیے ہمارے قبیلے کو سبق سکھانے کے لیے کورٹیس نے مجھے پہلے تو رہن رکھا پھر قیدی بنا لیا۔ میں امن کی حمایت میں تھا۔ ہم مایا تہذیب کے لوگوں نے جنوبی برصغیر کے کسی مہاپرش کا عظیم قول سنا تھا— کہ جب پرندے تمہارے دیش کا بسیرا چھوڑ دیں، تب تم اپنی آتما کی طرف دیکھو... اُسے بے لگام آزادی دو... اور جیسے پرندو آسمان میں اپنے سفر کا کوئی سایہ نہیں چھوڑتا، ویسے ہی تم بھی سائے سے آزاد ہو جاؤ!

عدالت میں موتنے جما کی اتنی گہری سنجیدہ اور عالمانہ باتیں سن کر بھی حیران تھے۔

— کورٹیس چاہتا تھا کہ میں اس کی طرف سے نئے شہنشاہ سے معاہدہ کی بات کروں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ کورٹیس فوجی تیاری کے لیے وقت چاہتا ہے۔ میں کورٹیس کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ کورٹیس اب میرا خدا نہیں دوست تھا۔ میں دوست کے ساتھ دھوکہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں ملک کے لیے غدار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے معاہدے کے لیے گفتگو سے انکار کر دیا۔ اسی بات پر کورٹیس نے میرا قتل کر دیا۔ اس نے مجھے دوستی کا یہ صلہ دیا... تبھی سے میں دوستی کی قدروں کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں... کیا پرتوقعات گھڑیوں میں بھی دوستی، امن اور بقائے باہم کی بنیاد نہیں بن سکتی؟

جج نے شاہی مورخ برنیل ڈیاز کی طرف دیکھا تو اس نے کہا—

—انہیں جو کہنا ہے کہہ لینے دیجیے، تاریخ کا سچ کیا ہے بعد میں بتاؤں گا۔

موتنے جما نے اپنا بیان جاری رکھا—

—اعلیٰ ادیبو! اگر کورٹیس مہذب اور خدا کی طرح رحیم ہوتا تو ہمارے قبیلے اس کے ساتھ بھی رہ لیتے... ہمارے پاس زمین تھی، جنگل تھے، پہاڑ تھے، ندیاں اور سمندر تھے۔ آسمان تھا، میدان تھے، کھیت تھے... اناج تھا، پرندے تھے۔ کیا نہیں تھا ہمارے پاس؟ زمین نے ہمیں سب کچھ دیا تھا۔ خالی زمین کی کمی نہیں تھی... میرا خون کر کے اس نے مجھے ایک اندھی گھاٹی میں پھینک دیا اور جان بچانے کے لیے فوج سمیت فرار ہونے لگا... تبھی ہزاروں شخصوں کے اعلان جنگ کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ کورٹیس گھر گیا تھا۔ ہمارے شہنشاہ کے بہادروں نے تیر کمانوں سے دشمن پر حملہ کیا۔ جان بچانے کے لیے کورٹیس کے فوجی خلیج کے پانی میں کود پڑے، لیکن نہ وہ تیر سکے، نہ نکل سکے... کیونکہ اُن کی جیبوں میں لوٹ کا سونا چاندی اور قیمتی پتھر بھرے تھے... وہ انہیں کے بوجھ سے ڈوبے تو پھر زندہ نکل نہیں پائے۔

— کیا یہ واقعہ سچ ہے؟ ادیب نے برنیل ڈیاز سے پوچھا۔

—ہاں یہ سچ ہے اس نے سرد آواز میں جواب دیا۔

ادیب کو گارسیا لورکا کی یاد آ رہی تھی، جو پیدا تو انیسویں صدی کے آخر میں ہوا تھا لیکن اس کی آنے والی آواز ادیب کو اس وقت بھی سنائی پڑ رہی تھی۔ آگے ادیب نے پوچھا—

—پھر؟

موتنے جما نے آگے کہا— حضور عالی! تب سے دوستی بھٹک رہی ہے... جنگل جل رہے ہیں... پرندے فرار ہو رہے ہیں... پرندوں نے بددعا دی ہے اور قسم کھائی ہے کہ وہ ان ظالم حملہ آور نسلوں کی نو آبادیوں، ان کے شہروں، مہانگروں اور گھروں میں کبھی نہیں آئیں گے... دیکھیے یورپ، امریکہ، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا کے آکاش، شہر اور مہانگر... ان میں پرندے نہیں آتے...

کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ اسے موتنے جما کی آواز نے توڑا—

—اعلیٰ ادیبو! اور ایک تھا فرانسسکو پیزارو! اَن پڑھ، جاہل اور ناجائز اولاد... اپنے سماج سے نکالا ہوا۔ اُس نے بھی کورٹیس کی طرح جنوبی امریکہ کے آدی باسیوں کو خدا بن کر دھوکہ دیا تھا۔ وہ بھی مذہبی مبلغین کے ساتھ گھوڑے پر نازل ہوا تھا۔ اُس نے سورج کی عبادت کرنے والے سورج رشی 'انکا' تہذیب کی انوکھی دنیا کو تباہ کیا تھا۔ ظالم پیزارو نے 'انکا' قبیلوں کا وجود مٹا دیا تھا... برازیل اور پیرو کی ندیاں اور خلیجوں کا پانی خون سے بوجھل ہو گیا تھا۔ اُس نے بہنے سے انکار کر دیا۔ ڈیلٹاؤں اور خلیجوں کے دہانے پر پھولی ہوئی لاشیں پھنس گئیں... تھکا پانی جن لاشوں کو دھکیل پایا،

انھیں بھی سمندر نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس سے آبی جانوروں کی دنیا تباہ ہوتی تھی... مہینوں تک ان کی اتنی بدبو پھیلی رہی کہ اس کے زہر سے متاثر ہو کر درختوں نے پھل اور پودوں نے پھول دینے بند کر دیے۔

کبیر نے اداسی سے مونتے جما کو دیکھا۔

اسی پیجارو میں... اسپین کے بادشاہ چارلس پنجم نے ایک بار پھر کورتیس کا روپ دیکھا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی کامیابی حاصل کرے، فرانسسکو پیجارو کو اس نے پناما کا گورنر اور کیپٹن جنرل بنا دیا تھا... کبھی سنا ہے آپ نے کہ کسی مہذب سماج میں ان پڑھ داغ والی اولاد کو اتنا بڑا عہدہ عطا ہو؟ لوٹ مار، قتل اور زمین پر قبضہ کرنے کے لیے بادشاہ سلامت نے اسے لڑاکو اسٹیمر، فوجی اور گھوڑے دیے تھے۔ درندوں کی اسی فوج نے 'انکا' تہذیب کے سامراج کو تباہ کیا تھا۔

—بہت ہوا... اب بند کرو یہ بکواس... اسپین کا شاہی مورخ برنیل ڈیاز آخر چیخ ہی پڑا— جس انکا تہذیب کے یہاں قصیدے پڑھے جا رہے ہیں وہ تہذیب نہیں، غیر مہذب جنگلی قبیلوں کا جماوڑا تھا... ان کے پاس نہ زبان تھی نہ رسم الخط اور نہ سواری کے لیے پہیا... یہ لوگ ان پڑھ تھے... جانوروں سے بدتر تھے...

—تمہیں معلوم ہے یا نہیں کہ تمہارے آنے سے پہلے یہ قبیلے بڑے پیمانے پر آلو اور مکا کی کھیتی کرتے تھے۔ یہ زراعت پیشہ سماج تھا... ان کے اپنے مشترکہ گودام تھے... اندیان پہاڑی سلسلہ کی عظیم وادی کو انھوں نے ہی قابل زراعت بنایا تھا... ان کا ایک راجہ تھا۔ کابینہ تھی۔ سرکاری عملے اور فوج تھی۔ کسانوں کے مشترکہ گودام اناج سے بھرے رہتے تھے... شاہی گھرانے، عملوں اور فوج کی پرورش کسانوں کے اناج کے گوداموں سے ہوتی تھی... ہر 'انکا' شہری صبح اٹھتے ہی پہلا سلام سورج کو کرتا تھا! مونتے جما کی آواز گونج رہی تھی— بولو یہ سچ ہے یا نہیں؟

—بہت حد تک یہ غلط نہیں ہے!

—سچائیوں کو قبول کرنے کا بڑا اصولی انداز ہے آپ کا! ادیب نے شاہی مورخ سے کہا۔

—لیکن میں نے کہا نا، یہ غیر مہذب جنگلی قبیلوں کا جماوڑا تھا۔ بغیر زبان... بغیر رسم الخط... ان کے پاس سفر کے لیے پاؤں، پگڈنڈیاں اور راستے تو تھے لیکن نقل و حمل کے لیے سواری نہیں تھی... یہ غیر مہذب تھے! برنیل ڈیاز نے کہا۔

—ہمیں جتنی اور جیسی زبان چاہیے تھی، وہ ہمارے پاس تھی۔ قدرت کے ساتھ ہم نے خاموش زبان ایجاد کی تھی اور زرعی سماج کے لیے پرندوں کی زبان سے ہم نے نعرہ و آواز لی تھی۔

ہماری زبان تعزیت، امنگ، غم اور فطرت سے مکالمے کی زبان تھی... ہمارے سبھی قبیلوں نے مکڑی کے جالے کی رسم الخط ایجاد کی تھی... جیسے مکڑی جالا بنتی ہے، اسی طرح ہم ریشوں کو جوڑ کر ان میں مکڑی کی طرح گانٹھیں ڈال کر اپنی بات کہتے تھے... سورج اور سمندر کی عبادت کے ریشے رسم الخط کے وہ سارے پھینچے تم جارحیت پسندوں نے مچھلی پکڑنے کے جال سمجھ کر چتاؤں کی آگ میں جھونک کر تباہ کر دیے!... کیا یہی تم حملہ آوروں کی تہذیب ہے؟ کہتے ہوئے مونتے جما پسینہ پونچھتے ہوئے تھک کر بیٹھ گیا— ہمیں پہیوں سے زیادہ اپنے پاؤں پر بھروسہ تھا!

عدالت کے احاطے میں سوال در سوال گونجنے لگے۔ اس ماحول کو شانت کرتے ہوئے لوسون نے شاہی مورخ سے سوال کیا۔

—مہذب اور غیر مہذب ہونے کا آپ کا پیمانہ کیا ہے؟

شاہی مورخ چپ نہیں رہ سکا، وہ غصے سے بولا— میں پیمانوں، مہذب سماج اور غیر مہذب سماج کی اس فضول بحث میں نہیں پڑنا چاہتا... اور بات ختم کرنے کے لیے آخری بات کہنا چاہتا ہوں کہ ازٹیک تہذیب کے اس نام نہاد شہنشاہ مونتے جما کے قبیلوں کے سارے لوگ جانور کھانے والے ہیں!

عدالت میں جیسے سب کی سانسیں اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔

—اس کا کوئی گواہ اور ثبوت؟ لوسون نے لوگوں کی تجسس کا جواب پانے کے لیے پوچھا۔

—پوچھیے اسی شہنشاہ مونتے جما سے۔ یہی مجھے اور ہرنانڈو کورتیس کو لے کر گیا تھا... اپنے خاص مندر میں... مندر کا راستہ اور فرش خون کا دلدل تھا۔ احاطے کی دیواروں کو انسانی خون سے رنگا گیا تھا... مندر کے گربھ گرہ میں تازہ انسانی خون کا ایک تالاب تھا... چاروں طرف خون اور سڑتے گوشت کی سڑاند بھری ہوئی تھی... اور آخری منزل پر خونخوار دکھتی مورتیوں کے چرنوں میں پانچ انسانی دلوں کے تازہ گوشت کے لوتھڑے پڑے تھے... وہ اس وقت بھی دھڑک رہے تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا... درندوں کا اتنا بھیانک اور ہیبت ناک منظر میں نے یا کورتیس نے کبھی نہیں دیکھا تھا... اسپین کے شاہی مورخ برنیل ڈیاز کے اس تفصیل سے عدالت میں تجسس، نفرت، غصے سے لبریز ردعمل کے طور پر ہلچل شروع ہو گئی تھی۔ تبھی ایک اسپینی شہری نے خنجر نکال کر مونتے جما پر پھینکا تھا وہ اس کے سینے میں سما گیا تھا۔ مونتے جما نے اس خنجر کو سینے سے نکالتے ہوئے کہا—

میرے دوست! حالانکہ تم نے دشمنی کا یہ خنجر میرے سینے میں مارا ہے، لیکن مردے دوبارہ نہیں مرا کرتے... پوچھو اپنے مورخ سے کہ وہ اور کتنا جھوٹ بولنا چاہتا ہے...

— یہ جھوٹ نہیں حقیقت ہے! شاہی مؤرخ نے آواز اونچی کرتے ہوئے کہا— مورتیوں کے سامنے نشے میں دھت جو ازٹیک پجاری موجود تھے، انہوں نے ان دھڑکتے انسانی دلوں کے کچے لوتھڑوں کو اٹھا اٹھا کر کھایا تھا اور اپنے دیوتاؤں کو خوش کیا تھا... ان کی تہذیب کے دیوتا انسان کی قربانی قبول کرتے تھے اور یہ لوگ خود درندے تھے!... جتنی بدبو اس کے اس خاص مندر سے آرہی تھی، اُتنی تو ہمارے اسپین کے سارے بوچڑ خانوں سے نہیں آتی تھی...

سنو شاہی مؤرخ برنیل ڈیاز تمہاری ذات بھی گوشت خور ہے، ہمارے قبیلے بھی۔ تم اپنے جانوروں کو بوچڑ خانے میں کاٹتے ہو کیونکہ تمہیں جینے کے لیے جاندار کے قتل کا کوئی حساب اپنے خدا کو نہیں دینا ہے... ہم ازٹیک اور 'انکا' تہذیب کے لوگ اپنے جثو کے مقرب نشانوں اور دیوتاؤں کو بتانے کے لیے پابند تھے کہ ہم نے زندہ رہنے کے لیے کتنے جانوروں کا خون کیا ہے... اسی لیے ہم جانوروں کی قربانی اپنے دیوتاؤں کے سامنے دیتے تھے... جسے تم انسانی قربانی کہہ رہے ہو وہ جانور کی قربانی تھی... تم بوچڑ خانے میں جانوروں کو کاٹتے تھے، ہم اپنے مندروں میں قربانی دے کر گوشت کو دیوتاؤں کی مہربانی کے طور پر قبول کرتے تھے۔ ہماری اور تمہاری تہذیب میں یہی بنیادی فرق تھا... موتتے جما نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

— لیکن جانور خور ہونے کے الزام سے یہ ازٹیک اور 'انکا' تہذیب ابھی بری نہیں ہوئی ہے... یہ انسانیت کے خلاف وحشیانہ الزام ہے... اس کی تفتیش ضروری ہے الوسون نے کہا تو ادیب نے اسپین کے شاہی مؤرخ سے پوچھا—

جناب عالی! جانور خور ہونے کا جو الزام اور مندر میں انسان کے قربانی کی جو تفصیل تم نے دی ہے، اس میں تم نے مندر کے فرش پر پڑے دلوں کے زندہ لوتھڑوں کا ذکر کیا اور یہ بھی کہ پجاریوں نے انہیں اٹھا کر کھایا اور اپنے دیوتا کو خوش کیا... اس کا کوئی گواہ؟

— میں اکیلا گواہ کافی ہوں! شاہی مؤرخ برنیل نے کہا۔

— نہیں! دو بڑی تہذیبوں کے خلاف ایک شخص کی اکیلی گواہی کافی نہیں ہے!

— اور پھر اُن تہذیبوں کے خلاف، جو اپنے روحانی اور فلسفیانہ اصول کی ترقی کر چکے ہوں! لوسون نے کہا— ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اس ترقی یافتہ تہذیب کے شہنشاہ موتتے جما کے بیان سنے ہیں... انہوں نے ابھی کہا تھا کہ یہ تشدد کے خلاف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ تشدد سے تشدد جنم لیتی ہے... خونریزی روکنے کے لیے انہوں نے کورٹیس کو محفوظ واپس نکل جانے کا راستہ بتایا تھا۔ یہ قبیلے اگر غیر مہذب اور جانور خور ہوتے تو کبھی اپنے ایشور کا انتظار نہیں کرتے۔ سنا تھا آپ نے ان کا وہ

بیان کہ جب پرندہ تمہارے دیئش کا بسیرا چھوڑ دیں، جب تم اپنی آتما کی طرف دیکھو، اُسے بے مہار آزادی دو... اور جیسے پرندہ آکاش میں اپنے سفر کا کوئی سایہ نہیں چھوڑتا، ویسے ہی تم بھی سایہ سے آزاد ہو جاؤ!... اور اپنے قتل کے بعد سے یہی موتتے جما روحانی قدروں کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں...

— ٹھیک اسی طرح جیسے یونانی تہذیب پرمیتھو آگ کے لیے، میری تہذیب کا گل جامیش زندگی کی دوا کے لیے بھٹک رہا ہے... ادیب نے کہا— ٹھیک اسی طرح جیسے کبیر بھارت اور پاکستان میں خیریت کی دعاؤں کے لیے اور سرجیت کور اپنے بے ہوش بیٹے کے ہوش کے لیے بھٹک رہی ہے... مہاشے برنیل ڈیاز! یہ ہجرت آپ کی گوری نسلوں نے کی ہے... آپ کی یہ مہم تہذیب کی نہیں، قتل کی مہم تھی... آپ نے قبیلائی تمدنوں پر جانور خور ہونے کی تہمت لگا کر اپنے منہ اجلے کرنے چاہے ہیں۔ سچائی تک پہنچنے کے لیے ہمیں اور گواہوں کی ضرورت ہے۔ کہتے ہوئے ادیب نے اردلی محمود علی کو آواز دی۔

— حاضر ہوں حضور! اردلی نے ادب سے کہا۔

— میکسیکو کے فاتح ہرنانڈو کورٹیس کو پیش کرو اور ان تمام لوگوں کو بھی پیش کیا جائے جو ازٹیک کے مندروں میں جانوروں کی قربانی کے چشم دید گواہ ہو سکتے ہیں!

اردلی نے عملہ گواہوں کو پکارا—

سامنے سے جیسے پردہ ہٹا۔ صدیوں پرانے قبرستان کی ساری قبروں کے دروازے کھلے اور ان میں سے مباشرت میں مشغول برہنہ جوڑوں کا جلوس عدالت کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ منظر اشتعال انگیز اور رذیل قسم کا دلکش تھا۔ شہوت کی پرجوش اور حیوانی تصویر۔ جانور آسنوں کی بے نقاب رذیل دنیا۔ گورے پانڈو مردوں کا قبیلہ کی سانولی عورتوں کے ساتھ شہوانی رقص۔ سب سے آگے تھا ہرنانڈو کورٹیس، اپنی سانولی مرینا کے ساتھ مباشرت میں مشغول۔

منظروں کے ساتھ ہی موتتے جما اور دیگر لوگوں نے آنکھیں بھینچ لیں۔ لگ بھگ سبھی چیخ پڑے—

یہ کیا ہو رہا ہے؟

— ہم انہیں مہذب بنا رہے ہیں! یہ کرخت آواز کورٹیس کی تھی۔

— لیکن تمہاری کتابوں کے مطابق یہ تو جانور خور قبائل کی عورتیں ہیں! اور تم ان کے ساتھ... ادیب نے آنکھیں بند کیے ہوئے ہی آدھا سوال پوچھا۔

— کتابوں کی باتیں کتابوں میں رہنے دو۔ ہم سچ ہی سب سے بڑا سچ ہے... سچ سے سامراج نہیں بچتے... ہمیں مباشرت سے روگرداں مت کرو... کورنیس نے کہا اور وہ بھرنگی کے ساتھ مباشرت میں مشغول ہو گیا، جس کا عیسائی نام اُس نے مریا رکھ لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو ناخنوں سے لہولہان کرنے لگے۔

تبھی دھرتی میں جیسے زلزلہ آیا۔ زمین کے اندر کی چٹانیں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ کھلے میدانوں میں دراڑ پڑ گئے... درخت بری طرح کانپنے لگے۔ خوفزدہ آنکھوں سے ادیب نے دیکھا، ہیروشیما ہانپتا بھاگتا چلا آ رہا تھا۔ چمڑی جلی ہوئی۔ پیالوں سی آنکھیں جھینگے کی طرح نکلی ہوئیں۔ ناخن جلے ہوئے اور بدن کے ہر حصے سے پیپ نکلتا ہوا... سارے لوگ اُسے دیکھ کر حیران تھے۔

— کیا ہوا ہیروشیما؟ تم اتنے بدحواس کیوں ہو؟ ادیب نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

— پھر وہی حادثہ!

— کہاں؟

— تو کیا سورا میں! ٹوکیو سے سو کلومیٹر دور!

— کون سا اور کیسا حادثہ؟ موتے جما نے فکرمندی سے پوچھا۔

— وہی ایٹمی توانائی کے دھماکے کا حادثہ... میرے اوپر جو ایٹم بم گرایا گیا تھا، وہ حادثہ نہیں، جنگ ختم کرنے کے نام پر سوچا سمجھا تجربہ تھا... انسان پر کیا گیا وحشیانہ حملہ... ارے درندو! دیکھو میرے اس زار زار ہوئے جسم کو۔ ناگاساکی کے لہولہان جغرافیے کو۔ ماؤں کی کوکھ میں اپاہج ہو گئیں غیر مولود ہوئی اولادوں کو... شدید حرارت میں پگھل کر بھاپ کی طرح اڑ جانے والے لاکھوں انسانوں کو... جل جل کر ٹکڑوں ٹکڑوں میں ٹوٹ کر گرنے والے جسموں کو... منہ تک آ کر نہ نکل سکنے والی موت کی چیخوں کو... گھٹتی سانسوں میں دم توڑتی بے بس سانسوں کو... ہچکی لیتی ہچک ہچک کر مرتی زندگی کو!... دیکھو مجھے! اگر تم میں سانس لینے کی ہمت ہے تو دیکھو مجھے! میں ہیروشیما ہوں!...

ہیروشیما! میرے بے خون جسم سے پھوٹتی پیپ کی ان گاڑھی دھاراؤں کو... رستے ہوئے اسی چپ چپے پیپ نے جوڑ رکھا ہے۔ میری جلی ہوئی چمڑی کو... میں نے خود برداشت کیا ہے انسانی تباہی کو۔ موت کو۔ سانس لینے کی ہمت ہے تو مجھے دیکھو! میں اور ناگاساکی جب ۱۹۴۵ء میں شہر تھے، لیکن آج میں ایک پُر احتجاج گریہ ہوں!

— ہیروشیما، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں! موتے جما نے اس کے رستے پیپ کو گنگا جل کی

طرح چلو میں لیتے ہوئے حلف لیا۔۔ ہیروشیما! جو پانچ لاکھ مارے گئے، جو ماؤں کی کوکھ میں پگھل کر بغیر پیدا ہوئے رہ گئے... ہم اپنے آنسوؤں سے اُن کا ترپن کرتے ہیں... لیکن ہمیں دکھ ہے اُن میں لاکھ لوگوں کا جو نیوکلیائی تابکاری سے معذور ہو کر، زندگی کی خواہش چھوڑ کر موت مانگنے لگے!...

— کروکشیتر کے میدان میں صدیوں پہلے یہی ہوا تھا! ادیب نے صدیوں کے پار دیکھا۔

مہابھارت کی جنگ کا دور ویدک تہذیب کے عروج اور زوال کی انتہا کا اعلیٰ اور اولیٰ نکتہ ہے۔ اسی دور میں کرشن کے عمل اور زندگی کے اصول کے ساتھ سچ کے اعلیٰ لمحے کا آغاز ہوا تھا اور اٹھارہ دنوں کی جنگ کے دوران بار بار اور طرح طرح سے اُسی سچ کا خون ہوا تھا... جنگ کے پہلے دن جب عظیم فاتح ارجن اپنے نندی گھوش رتھ پر میدان جنگ میں آیا تھا، تب اس کے ساتھی کرشن نے اُسے دی تھی، زندہ رہنے کی وجوہات کے اعلیٰ سچ عرفان۔ تب کرشن نے کی تھی۔۔ موت سے موت کو جیتنے کی نئی ایجاد۔ موت کوروں نے پیدا کی تھی، اُسے جیتنا ضروری تھا۔ موت کو جیتنے کے لیے جنگ کے پہلے ہی دن ہوئی تھی رشتوں کی موت۔ دوسرے دن ہوا تھا عزت اور احساس کا قتل۔ تیسرے دن ہوا تھا رحم دلی کا خاتمہ۔ چوتھے دن ساری اخلاقیات اور دھرم کے پیمانوں کی شکست اور پھر بچا کیا تھا؟ جنگ کے لیے جنگ کا انتخاب! اسی لیے پانچویں دن ہوا تھا جنگ کی خبط کا آغاز۔ اور چھٹے دن طاقت اور ہمت کی جگہ تشدد اور بے رحمی کا نزول۔ ساتویں دن پیدا ہوئی تھی نفرت۔ آٹھویں دن ہوئی تھی موت دینے کی جلادی مقابلے کی پیدائش اور نویں دن سارے انسانی اقدار کی سرکوبی اور زوال۔۔ جب بھیشم پتامہ نے خوفناک روپ دھارن کر کے پانڈو بہادروں کو بری طرح زخمی کیا تھا، تب گیتا کے عظیم تخلیق کار اور جنگ میں غیر جانب دار کرشن خود غصے میں آ کر بھیشم پر دوڑ پڑے تھے، ایک ٹوٹے ہوئے رتھ کا پہیہ اٹھا کر۔ جنگ تو اٹھارہ دن چلی تھی، لیکن دسویں دن زخمیوں اور معذوروں کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے زندہ رہنے کی خواہش کو خارج کر دیا تھا۔ اسی طرح جیسے جاپان میں نیوکلیائی تابکاری سے معذور ہوئے میں لاکھ افراد زندگی کی خواہش چھوڑ کر موت مانگنے لگے تھے...

سبھی لوگوں نے مایوس ہو کر موتے جما کو اُداسی سے دیکھا تھا۔

تبھی یہ منظر دیکھ کر پاتال ساگر میں اترتے ہوئے مجھے جل جانیش نے آواز دی تھی اور کہا تھا۔۔ جب تک میں سنجیونی لے کر زمین پر پہنچوں، تم موت سے جنگ کرو... ہیروشیما نے کہا۔۔ جل جانیش نے یہی کہا کہ موت کی خواہش کو ترک کرو... میں تب سے وہی کر رہا ہوں! میں تب سے وہی کر رہا ہوں!

— آمین! اموئنے جمانے کہا— ویدک آریوں نے اپنے ہی آل اولاد کو موت دی۔ کرانت کی رحم دلی نے گوتم بدھ کی رحم دلی کا قتل کر دیا... لیکن اس کا قتل کوئی نہیں کرسکتا جو ویدوں سے پہلے کا آریہ ہے، جیہوا سے پہلے کا یہودی ہے۔ زرتشت سے پہلے کا پارسی ہے۔ گوتم بدھ سے پہلے کا بودھ، عیسیٰ سے پہلے کا عیسائی اور پیغمبر محمدؐ سے پہلے کا مسلمان ہے!

— لیکن موت ہار نہیں مان رہی ہے... ہیروشیما نے کہا— تو کیا مورا میں یورینیم انقلابی ہو گیا۔ تابکاری عام سے بیس گنا زیادہ بڑھ گئی ہے... میرے اوپر گرے بموں کے بعد یہ پانچواں خطرناک حادثہ ہوا ہے...

— یہ ریڈیو ایکٹو زہریلی ترنگیں جاپان کی سرحد کو پار کر کے چین اور کوریا تک تو نہیں پہنچ جائیں گی؟ فلرسندلسون نے پوچھا۔

— شاید نہیں! ہیروشیما نے کہا— افسران کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے خطرے پر قابو پالیا ہے... یہی ونڈاسکیل یو کے میں ہوا تھا۔ امریکہ کے تھری مائل یا واشنگٹن میں، تیسرا روس کے پروسیسنگ پلانٹ میں اور چوتھا روس کے ہی چرنوبل میں ہوا تھا اور اب پانچواں یہ۔ خطرے کی خطرناک ساتویں سطح کا حادثہ... ہیروشیما غصہ سے بول رہا تھا... یہ ابھی ورندے مانیں گے نہیں، اس لیے میں نے بھی طے کر لیا ہے کہ موت والی نیوکلیائی معصیت کو جنم دینے والے جتنے خالق اور مجرم ہیں، میں انہیں اُن کی قبروں میں چین سے سونے نہیں دوں گا... ٹرومین کو تو میں چھوڑوں گا نہیں۔ مین ہٹن پروجیکٹ کے سائنس دانوں اور اس کے منتظم بریگیڈیر جنرل گروز کو میں چین نہیں لینے دوں گا! آئنسٹین کو بھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ رابرٹ اوپن ہائمر فرمی، ہنس بیتھے، ایڈورڈ ٹیلر اور ان کے ساتھ کے بھی سائنس داں، چاہے وہ فرانس کے ہوں، جرمنی، برطانیہ یا روس کے— وہ انسان مخالف اور شاطر مجرم ہیں۔ انہیں قبروں میں چین سے سونے کی عیاشی بخشی نہیں جاسکتی! نہیں... نہیں... کبھی نہیں! کہتا، چیختا، دستا موا پوچھتا ہیروشیما مشرق کی طرف چلا گیا۔

٣٤

وقت ہیروشیما کے پیچھے پیچھے مشرق کی طرف بھاگا، لیکن ہیروشیما اس کے ہاتھ نہیں آیا۔ آخر وقت نے ایک دوسرا ہی نظارہ دیکھا۔ ایک قوم اپنی ذاتی ہجرت اور مذہب پر مرکوز تقسیم کو رد کر کے دنیا کے سب سے بڑی نو آبادی طاقت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔

اس قوم نے اپنے کٹے ہوئے اعضا کو دیکھا اور پہچانا تھا۔

قلم کے لفظ تو پڑھے جانے کے منتظر تھے، لیکن قلم چلنے کی نازک سرسراہٹ کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ یہ قلم دلّی کے کوچہ بلیماران کی ایک حویلی میں چل رہا تھا... جہاں قوم کا ترک اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ تخلص غالب، جس کے دادا کوکین بیگ خاں سمرقند سے دلّی آئے تھے اور بادشاہ شاہ عالم کے دربار میں پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے نوکر ہوئے تھے، انہیں کے اکبرآباد، آگرہ کے گھر میں اسد اللہ خاں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا سگا چچا نصر اللہ بیگ خاں اُس وقت مراٹھوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبیدار تھا۔ یہ آپسی وضعداری اور ایک ہندوستانی قوم بننے کی تیاری تھی... انہیں دنوں اسد اللہ خاں غالب امراؤ بیگم سے شادی کے بعد دلی پہنچے۔ دن اچھے تھے، برے تھے۔ چچا نصر اللہ بیگ خاں ہندو مراٹھوں کے صوبیدار بنے اور ہندو مسلم رنجش کی جگہ آپسی یقین اور دوستی کے پلوں کی تعمیر شروع ہوئی، لیکن یہ انگریزی حکومت کو پسند نہیں تھا اور پھر فرنگی فوج کے جنرل لیک نے ایک نظارہ دیکھا تو سکتے میں آ گیا—

دارا شکوہ کا وہ دھڑ جو قتل کے بعد لال قلعہ کے لاہوری دروازے پر لٹکایا گیا اور تین دن بعد جس کی میت کو غسل اور کفن دیے بغیر، نماز جنازہ ادا کیے بغیر ہمایوں کے مقبرے میں دفن کر دیا گیا تھا، وہ تین روز دھڑ کروٹ لیتا ہوا جاگا تھا۔ اور اُدھر اُس کا وہ سر، جو نیزے کی نوک پر چاندنی چوک کے چوراہے پر لٹکایا گیا تھا، آنکھیں کھول کر ہلکی سی امید لیے مسکرایا تھا۔ ہمایوں کے مقبرے سے وہ دھڑ، دھرتی توڑ کر بستی دریا گنج کی طرف چل پڑا تھا اور چاندنی چوک میں لٹکا وہ سر نیزے سے اُتر کر، اپنے دھڑ سے ملنے کے لیے اُسی سمت میں بڑھ گیا تھا...

یہ ١٨٥٧ء کے ١١ مئی کا دن ہے...

دلّی کا لال قلعہ۔ آخری مغلیہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی آواز ہواؤں پر تیرتی ہوئی آرہی تھی۔

— ہندوستان کی جنگ آزادی کا اعلان کیا جاچکا ہے۔ بکسر کی لڑائی کے بعد غلامی کی جو ذلت ملک نے برداشت کی ہے اُس سے نجات پانے اور غلامی کے خاتمے کا وقت آ گیا ہے... تاریخ نے کروٹ بدلی ہے... اب فرنگی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا ہی ہمارا مقصد ہے... ہمارا یہ بیان درباری زبان فارسی میں نہیں، عوام تک پہنچانے کے لیے ہندی اور اردو میں جاری کیا جائے!

اور جگہ جگہ منادیاں پٹنے لگیں—

خلق خدا کا، ملک بادشاہ کا! سنو، سنو، اطلاع سنو! ہر خاص و عام سنو! ڈھم... ڈھم... گدّی نشین مغل بادشاہ کے فرمان پر کان دھرو... ڈھم... ڈھم... ڈھم ڈھماڈھم... حکم ہے کہ غیر ملکی فرنگیوں کو اپنے ملک سے کھدیڑ دو... ڈھم... ڈھم... شہنشاہ نے سنبھالی ہے ہندوستان کے غازیوں کی مشترکہ

کمان... کھدیڑ دو فرنگیوں کو ملک سے باہر، یہی ہے شہنشاہ کا اعلان اور فرمان! ڈھم... ڈھم... ڈھاڈھم... ڈھم... ڈھم...

اُدھر پوربی علاقے سے آوازیں اٹھنے لگیں—

— لکھنؤ اور اودھ کے باشندو! جنگ کا اعلان ہو چکا ہے!... بیگم حضرت محل کے سائے میں کمزور ۱۳ سال کا نواب برجیس قدر اعلان پڑھ رہا ہے—

— سب ہندو اور مسلمان جانتے ہیں کہ ہر انسان کو چار چیزیں بہت عزیز ہیں۔ پہلی، مذہب اور ایمان۔ دوسری، عزت اور شان۔ تیسری، اپنی اور اپنے لوگوں کی جان۔ چوتھی، اپنی آزادی اور اپنے پُرکھوں کی جائیداد! یہ سبھی کو اپنی حکومت میں حاصل تھیں۔ کوئی حکومت اپنے باشندوں کے مذہب اور حقوق میں دخل اندازی نہیں کرتی تھی... لیکن ان فرنگیوں نے ہماری روایتوں کو توڑا ہے۔ سیاسی سازشوں سے ہمارے مشترکہ وجود پر حملہ کیا ہے، اس لیے آپ چاہے مسلمان سید، شیخ، مغل یا پٹھان ہوں یا ہندو برہمن، چھتری، کائستھ یا مہاجن ہوں... جنگ آزادی کا اعلان ہو چکا ہے... ان فرنگیوں کو اپنے ملک سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دیجیے!

لکھنؤ کی چنگاریاں بریلی پہنچیں اور روہیل کھنڈ کے افغانوں نے بھی جنگ کا اعلان کیا۔ کالپی میں نانا صاحب اور تانتیا ٹوپے نے انقلاب کے لیے کمر کس لی اور اُدھر جھانسی کی مہارانی لکشمی بائی نے انگریزی حکومت کے من مانے فیصلوں کی مخالفت کرتے ہوئے انقلاب کی راہ پر قدم بڑھا دیے۔

جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے اعلان کیا— میں اپنی جھانسی نہیں دوں گی!

اور توپوں کے دہانے کھل گئے۔

مہارانی لکشمی بائی نے کمان سنبھالی— توپچی غلام غوث خاں... آپ دکنی بُرج پر رہیں گے، کنور ساگر سنگھ کمانڈر راو پھاٹک کو سنبھالیں گے۔ خدا بخش رہیں گے سید پھاٹک پر اور اور چھا پھاٹک کو سنبھالیں گے دلیا جو صاحب۔ دن میں سارے مورچوں اور توپ خانے کی ذمہ داری آپ کی رہے گی اور رات میں انہیں سندر، مندر، کاشی بائی، لکشمن، جوہی اور موتی بائی سنبھالیں گی!

پھر جنگ کا بگل بجنے لگا۔

تانتیا ٹوپے اور نانا صاحب نے انگریزی فوجوں سے لوہا لیا۔ آرا، بہار میں جگدیش پور کے راجہ کنور سنگھ نے جنگ کا اعلان کیا۔

فیض آباد نے للکارا— بے دخل کر دو ان ظالم فرنگیوں کو... آزادی کی یہ جنگ سب کی ہے۔

میں مولوی ہوں، لیکن میں کہتا ہوں— اپنے اپنے دین اور دھرم سے اوپر ہے اپنے ملک اور اپنی قوم کی آزادی!

اور دلّی سے شہنشاہ بہادر شاہ نے آواز دی— اب پورا ہندوستان ایک زندہ دل قوم کی طرح جاگ اٹھا ہے۔ اب نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان! اب اس ملک کا ہر فرزند صرف ہندوستانی ہے! صرف ہندوستانی!

— لیکن ہمیں معلوم ہے... فرنگیوں نے سازش کر کے ہمارے کچھ غدار ملاؤں، مولویوں، ریاکار پنڈتوں، مہنتوں اور خود ہمارے شاہی خاندان کے امیر امراء کو توڑ لیا ہے! فوجی کمانڈر لارنس اور چالاک کمشنر مارٹن گبنس نے ان غداروں کے سامنے تخت و تاج، جائیداد اور بیش قیمتی خلعتوں، جاگیروں کا لقمہ پھینکا ہے...

وقت نے تائید کی—

— گوالیار نے لکشمی بائی کا ساتھ دینے سے گریز کیا۔ پناہ دینے سے پرہیز کیا۔ کالپی بھنور کے ایک کمپنی پرست جاگیردار نے تانتیا ٹوپے کے ساتھ غداری کی، اُسی طرح جیسے کابل کے ملک جیون عرف بختیار خاں نے دارا شکوہ کے ساتھ کی تھی۔ شہنشاہ بہادر شاہ کے ایک سپہ سالار نے دلّی کشمیری دروازہ انگریزی فوج کے لیے کھول دیا۔ اودھ میں پرانے دشمنوں اور ناراض خاندانی امراء کی میٹنگ مارٹن گبنس کی کوٹھی پر ہوئی۔ اس میں معطل نواب احمد علی خاں، پرانے وزیر محمد ابراہیم شرف الدولہ کے علاوہ بزرگ چچا صاحب نواب مرزا حسین خاں بھی شامل رہے ہیں... یہی ہندوستان کے سامنتوں، نوابوں، ریاست داروں کی سب سے رذیل شکل ہے... انہیں اور اسی طرح کے لوگوں کی وجہ سے شہنشاہ بہادر کو ہمایوں کے مقبرے سے قید کیا گیا۔ انہیں جلاوطنی دے کر رنگون بھیج دیا گیا۔ بابو کنور سنگھ شہید ہوئے۔ تانتیا ٹوپے کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ جھانسی کی رانی کو گوالیار میں اپنی قربانی دینی پڑی۔ بیگم حضرت محل اور نانا صاحب کو نیپال میں پناہ لینی پڑی... پھر اُن کا کچھ پتہ نہیں چلا۔

ہندوستان کی ۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی خود ہندوستانیوں کی وجہ سے ہار میں بدل گئی۔ خود بادشاہ بہادر شاہ اپنی جان بچانے کے لیے صوفی حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر پہنچے۔ آزادی کی جس لڑائی کی کمان انہوں نے سنبھالی تھی، اُسے لے کر اب وہ پچھتاتے نظر آ رہے تھے۔ اصل میں بادشاہ بہادر شاہ شاعر نہیں بزدل تھا...

— یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اردلی محمود علی نے وقت سے پوچھا۔

—اس کے لیے درگاہ نظام الدین اولیا کے صوفی درویش خواجہ حسن نظامی صاحب سے دریافت کرلو... وہ تو یہیں ہمارے ساتھ موجود ہیں۔ اردلی نے حسن نظامی صاحب کو پوچھتی آنکھوں سے دیکھا۔

—میں بتاتا ہوں... حسن نظامی صاحب نے کہا— میری مرحومہ ماں نے اپنے قابل احترام والد حضرت شاہ غلام حسن صاحب سے سنی یہ کہانی بتائی تھی کہ جس دن بہادر شاہ دلی کے قلعے سے نکلے تو سیدھے درگاہ حضرت نظام الدین اولیا میں حاضر ہوئے۔ میرے نانا صاحب نے دیکھا کہ وہ مزار مبارک میں سرہانے دروازے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں... شہنشاہ تین وقت سے بھوکے تھے۔ ان کی سفید داڑھی دھول اور پسینے سے اٹی ہوئی تھی۔ وہ بولے—

—اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ میں ہندوستان کے تخت پر تیمور کی آخری نشانی ہوں۔ میں جانتا تھا کہ میرٹھ کے یہ کم بخت باغی سپاہی منہ زور ہیں اور ان پر یقین کرنا غلطی ہے، وہ خود بھی ڈوبیں گے اور مجھ کو بھی لے ڈوبیں گے۔ آخر وہی ہوا... اور میں قلعہ چھوڑ کر چلا آیا ہوں... اور...

—آپ تین وقت سے بھوکے ہیں... آپ دو نوالہ کھانا تو کھالیں!

ٹھیک ہے... آپ کا احسان جو آپ ایسا کہتے ہیں... نیاز حاصل کر چکا، امامت آپ کو سونپ دی، اب دو نوالے حضرت اولیا کے لنگر سے کھالوں تو ہمایوں کے مقبرے میں چلا جاؤں گا۔ جو قسمت میں لکھا ہے وہاں پورا ہو جائے گا...

گھر میں صرف بیسنی روٹی اور سرکے کی چٹنی تھی۔ بادشاہ نے وہی کھایا۔ تین وقت کے بعد پانی پیا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد ہمایوں کے مقبرے میں جا کر گرفتار ہوئے اور رنگون بھیج دیے گئے...

وقت نے یہ کہانی مکمل کی تو اردلی نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کا ادیب فرار تھا... اردلی نے آواز لگائی—

—ادیب عالی! آپ کہاں ہیں؟ وقت آپ کے انتظار میں کھڑا ہے... ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شرمناک شکست میں بدل چکی ہے۔ تاریخ رکی کھڑی ہے اور آپ غدار ہیں۔ ادیب عالی! آپ کہاں گرفتار ہیں؟

۳۵

ادیب سلمیٰ کی باہوں میں گرفتار تھا۔

—سنو ادیب! یہ جسم ایک مندر بھی ہے اور شمشان بھی۔ دونوں میں دیے جلتے ہیں۔ تم کون سا دیا جلاتے ہو میرے جسم میں اور میں کون سا دیا جلاتی ہوں تمہارے جسم میں... اُن کا اجالا ہی بچا رہتا ہے... کوئی صرف یاد بن کر رہ گیا ہے یا زندگی کا فقط ایک باب بن کر ختم ہوگیا، وہ دیت جاتا ہے۔ وہ مسلسل اجالا نہیں دے پاتا... ادیب! میرا جسم تو بجھے ہوئے دیپوں کا گھر تھا، اس میں اجالے کا احساس تم نے پیدا کیا، لیکن اب میں زندگی کے اس موڑ پر کھڑی ہوں جہاں ایک مسلسل جلنے والا دیا ضروری ہے...

کہتے ہوئے سلمیٰ نے اُسے سنبھالا تھا اور سامنے تھا ایک اپھنتا سمندر... اور منجھدار میں بہتا، مسلسل حل کے اجل میں لے جاتا لہروں کا ایک بونڈر!... مضطرب لہروں کا شور... کھلتی بند ہوتی سیپیوں کا سنسار... اور پھر تھمتی لہروں کی کوکھ میں روشنی دیتا ایک دیا...

پھر اپنی ڈھیلی باہوں میں اُسے لیتے ہوئے ادیب نے کہا— کیا تھا یہ سلمیٰ؟ ہر بار کچھ نیا ہوتا ہے... تمہارے جسم میں یہ روشنی دیتے دیے آج کہاں سے آگئے؟

—ادیب! جب دل میں نیک خیالات پیدا ہوتے ہیں تب کھلتی بند ہوتی سیپیوں میں سے کوئی ایک موتی روشنی دینے والا دیا بن جاتا ہے... اور وہ دیا ہی محویت کو پوجا میں بدل دیتا ہے... شاید وہی آرتی اور عقیدے کا دیا ہوتا ہے یا جمعہ کی رات مسجد کو روشن کر کے اللہ کی موجودگی کو منور کرنے والا قدیم چراغ۔

—سلمیٰ! تمہارے اندر مندروں کے منتر گونجتے ہوں یا مسجد کی اذان... یہ دونوں مقدس ہیں... تمہیں نے میرے لیے اذان کی اس روحانی کشش کی راہ کھولی ہے۔ دنیا کے سارے مظلوم اور ستائے ہوئے لوگ جو احتجاجی نعرے لگاتے ہیں... کوسوو، عراق، داغستان، چیچنیا، ایسٹ تیمور، یا کارگل میں چیختے، کراہتے، پکارتے لوگوں کی آوازیں اذان کے علاوہ کیا ہیں؟... وہ اپنے اپنے اللہ کو پکارتے ہیں اور اللہ ایک ہے۔ اس لیے سارے مظلوموں کی آوازیں اسی تک پہنچتی ہیں...

—ادیب! یہ تو آپ نے ٹھیک کہا... لیکن آج میں ایک فیصلہ لیے آئی ہوں...

—فیصلہ! کیسا فیصلہ؟ ادیب نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

—یہی کہ آج کے جلتے دیے کی روشنی لے کر میں آپ کو آزاد کر دینا چاہتی ہوں! سلمیٰ نے کہا۔

—مطلب؟

—مطلب یہ کہ اب میرا بیٹا بڑا ہو رہا ہے اور وہ مجھ سے آپ کے بارے میں کچھ پوچھے گا تو میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا!

— یعنی؟

— یعنی یہی کہ اب مجھے آپ کے اور اپنے بیٹے کے بیچ کسی ایک کو چننا ہوگا!

— سلمٰی! تم نے مجھے مکمل کر دیا۔ میرے عمل اور مہاجر وجود کو تنہائی پسند ہونے سے بچا لیا... لیکن تمہارا بیٹا ابھی عمر کے لحاظ سے ادھورا ہے... اُسے اپنی پہچان اور وجود کی زیادہ ضرورت پڑے گی۔ اس لیے تم میرا انتخاب نہ کرو...

— اگر میں آپ کو منتخب کرنا چاہوں تو؟

— تب بیٹا کہاں رہے گا؟

— وہ نانا، نانی کے ساتھ پٹنہ میں رہ سکتا ہے یا پھر بڑے نانا کے ساتھ کوئٹہ پاکستان میں۔

— یعنی ہم اپنے بیٹے کے لیے ایک تقسیم اور کر دیں! نہیں سلمٰی، یہ تاریخ کے ساتھ دوبارہ دغا کرنا ہوگا... تمہارا بیٹا، نانا، نانی کے ساتھ ہندوستان میں جیے یا بڑے نانا کے ساتھ پاکستان میں... وہ اپنے وجود کی بلندیاں حاصل کر سکے، یہی ہمارے فیصلے کا مرکز ہونا چاہیے! اب یہ تم پر ہے کہ تم کسے منتخب کرتی ہو!

— ادیب! تم نے مجھے ایک روشن زندگی دی ہے... تم نے میری کوکھ میں جلتا ہوا دیا دیکھا ہے... سہراب میری کوکھ کا جلتا ہوا چراغ ہے... لیکن ضرورت پڑی تو... کہتے ہوئے سلمٰی خاموش ہو گئی۔

— تو؟ ادیب نے پوچھا۔

— تو میں آپ کو نہیں، اپنے بیٹے سہراب کو منتخب کروں گی...

ایک لمحے کے لیے وہ حیران سا سلمٰی کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ اس کا دل رکھنے کے لیے جھوٹ بھی بول سکتی تھی۔ جب وہ خوبصورت جھوٹ بولتی ہے، تب وہ بہت خوبصورت لگتی ہے، جب وہ سچ بولتی ہے تو اس سے بھی زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔ اس نے سلمٰی کی خوبصورتی کو پھر آنکھ بھر کر دیکھا اور سلمٰی نے اُسے۔

— آمین! ادیب نے دعا کی، پھر پوچھا— میں تمہارے بغیر کیسے رہ پاؤں گا سلمٰی؟

— اس کے لیے میں نے ایک آسان سی راہ تلاش کر لی ہے۔

— کون سی راہ؟

— یہی کہ آپ کسی رقیب کے ساتھ مجھے اسی طرح دیکھیے، جس طرح آپ نے مجھے اپنی باہوں کی نیلی جھیل میں پایا ہے۔ انہیں نہایت ذاتی لمحوں میں مجھے دیکھنے کا تصور کیجیے، جن میں میں

آپ کے ساتھ وابستہ اور ہم بستر رہی ہوں... میری محبت سے نجات کی یہی راہ ہوگی...

— سلمٰی یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟

— ادیب! ابھی آپ مجھ سے لاتعلق ہوں گے اور زندگی کا ایک نیک فال اسی برعکس محبت سے نکلے گا۔

— ادیب نے سلمٰی کو دیکھا۔

— ادیب! میری زندگی کے فقط تم روشن چراغ! آخر موت ہی ہمیں ہمارے فیصلے سونپے، کیا اس سے بہتر یہ نہیں ہوگا کہ موت سے پہلے ہم اپنی زندگیوں کے اہم فیصلے لے لیں۔ یہ مسئلہ روحانی یا مذہبی نہیں، ہمارے عقیدے کا ہے، لیکن یہ من کے مذہب کی شان کو اور بلند کرتا ہے! اس میں کہیں کوئی تضاد نہیں ہے!

— آمین! ادیب نے دعا مانگی۔

— الوداع! سلمٰی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور تیزی سی چلی گئی۔ وہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ یہ ہوا کیا تھا... وہ سکتے میں تھا کہ تبھی اُسے تلاش کرتا ہوا اردلی محمود علی حاضر ہو گیا۔ وہ ناراض ہو کر بولا—

— میں آپ کی خصلت جانتا ہوں... جب بھی آپ کو موقع ملتا ہے، آپ اپنی کہانیوں کے لیے فرار ہو جاتے ہیں!

— اردلی محمود علی! مجھے جینے دو... جو کہانیاں بچی ہیں... پلیز، اُن کے ساتھ مجھے جی لینے دو... پلیز... محمود علی... ایک دن تو مجھے اپنے ساتھ جی لینے دو...

— اردلی نے ادیب کی آنکھوں کی مایوسی اور ویرانی کو دیکھا۔ اس کا بھی دل بھر آیا۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا— حضور عالی!... یہ دور ہی نہیں بچے گا تو آپ کی کہانیاں کہاں بچیں گی... لیکن آپ چاہتے ہی ہیں تو میں آپ کے لیے ایک دن کی مہلت مانگ کر لانے کی کوشش کرتا ہوں۔

تھکا ہوا ادیب وہیں بیٹھا رہا۔ وہ سلمٰی سے بچھڑنے کا صدمہ ابھی برداشت نہیں کر پایا تھا۔

کچھ دیر بعد اردلی لوٹ کر آیا۔ بولا—

— بہ مشکل تمام میں آپ کے لیے ایک دن کی مہلت مانگ لایا ہوں۔ گزرتے دور نے آپ کے لیے ایک جلتا بجھتا دن دیا ہے۔ اس ایک دن آپ دنیا کے سارے قتل، تڑپتی روحوں کی چیخوں، جنگوں اور حملوں کے خون سے سنی داستانوں، موت کی کراہوں کی درد بھری آوازوں سے بے خبر ہو جائیں گے... آپ کو کوئی آنسو، کوئی چیخ، کوئی آہ پریشان نہیں کرے گی... اگر آپ کے ادیب کا

ضمیر آپ کو اس بات کی اجازت دیتا ہے تو آپ آرام سے بیٹھ کر اپنی کہانیاں لکھئے! انسان پرست ہونے کے خول سے باہر آ کر اپنے دور کے عیاشوں اور رذیل لوگوں کی کہانیوں کے تاج محل بنائیے۔

ادیب نے دیکھا۔

— لیکن حضور عالی! آپ تو عام آدمی کے پیروکار رہے ہیں...

— محمود علی! بوٹا سنگھ اور زینب، معمولی سیدھے سچے لوگ ہیں۔ شاہین ایک اوسط غریب گھر کی لڑکی ہے۔ کبیر بھکاری ہے۔ سرجیت کور بھی معمولی گھرانے کی ہے جو اپنے بیٹے کو کندھے پر لادے اب تک زندہ ہے۔ وہ اپنے بے ہوش بیٹے کی سلامتی کے ساتھ ساتھ، اپنے حضرت رُکن عالم کی درگاہ اور اپنی بستی ملتان کی سلامتی بھی مانگ رہی ہے!

— یہ تو عجیب بات ہے ادیب عالی! اردلی محمود علی نے کہا۔

— محمود علی! اس کہانی کو جیتے اور لکھتے میرا دل پھٹتا ہے... تمہیں یاد ہوگا— تقسیم میں سرجیت کور اپنے معصوم بیٹے کو افیون چٹا کر ملتان کے اپنے پشتینی گھر سے نکلی تھی... اس نے سنگار کیا تھا۔ سارے زیور پہنے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ سب سے پہلے فسادی اس کے زیور لوٹیں گے، بیٹا بچ جائے گا۔ اس کے بعد جب زیور نہیں ہوں گے تو اس کی عزت لوٹی جائے گی، لیکن بیٹا بچ جائے گا اور شاید وہ تب تک نئے بنے ملک پاکستان کی سرحد پار کرے گی اور اپنے بیٹے کو بچا سکے گی... اسی لیے سرجیت کور نے اپنے نوزائیدہ بیٹے کو افیون چٹائی تھی کہ وہ روئے نہیں، بے ہوش رہے... لیکن اس کا بیٹا افیون چاٹ کر تب سے بے ہوش ہے اور جب بھی بھارت پاکستان جنگ ہوتی ہے تو وہ مجھ سے یہ پوچھنے آتی ہے کہ ملتان پر تو کوئی بم نہیں گرا؟

میں نے اُسے بہت سمجھایا— 'ملتان سے اب تمہیں کیا لینا دینا... وہ تمہارے ملک کا شہر نہیں۔ اب پاکستان نام کے نئے ملک کا شہر ہے... لیکن وہ پاگل عورت سرجیت کور سمجھتی ہی نہیں... ۱۹۴۸ء میں آئی۔ تب بھی اس کی گود میں بے ہوش بیٹا تھا۔ پوچھنے لگی— بھارت پاکستان جنگ ہو رہی ہے... لیکن میرے ملتان پر تو کوئی بم نہیں گرا؟

میں نے اُسے مطمئن کیا— جنگ کشمیر میں چل رہی ہے۔ تمہارا ملتان محفوظ ہے...

— پھر وہ ۱۹۶۵ء میں آئی... چیخ چیخ کر پوچھنے لگی— ایوب خاں کو سبق سکھانے کے لیے فوج نے ملتان پر تو حملہ نہیں کر دیا ہے؟ میرے ملتان پر تو کوئی بم نہیں گرا ہے؟

میں نے اُسے بہ مشکل تمام واپس بھیجا۔

— وہ ۱۹۷۱ء میں پھر آ گئی۔ اس کے کندھے پر وہی بے ہوش بیٹا لدا ہوا تھا۔ وہ پوچھنے لگی—

جنگ پھر چھڑ گئی ہے... لیکن میرے ملتان پر تو کوئی بم نہیں گرا؟

— سرجیت کورا ملتان شہر اب جس ملک میں ہے، وہ تمہارا ملک اور شہر نہیں ہے۔ اب تم بھارت کی راجدھانی دلی کے راجوری گارڈن میں رہتی ہو... اب تم بھارت کی شہری ہو... اب ملتان نہیں دلی تمہارا شہر ہے... اسے اپنا مانو۔

وہ تو میں مانتی ہوں... لیکن ملتان تو ملتان ہے... اس پر تو کوئی بم نہیں گرا؟

— نہیں ملتان محفوظ ہے اور شملہ سمجھوتہ ہو گیا ہے...

اردلی نے اُسے غور سے دیکھا۔

— محمود علی! وہ پھر اپنے باون سالہ بے ہوش بیٹے کو کندھے پر لادے ۱۹۹۹ء میں آئی اور پوچھنے لگی— کارگل میں سرحد کی جنگ چل رہی ہے۔ سنا ہے کہ یہ جنگ بھارت پاکستان کی جنگ میں تبدیل ہو گئی ہے... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ کہیں میرے ملتان پر تو کوئی بم نہیں گرا ہے؟

— اور محمود علی، میں اس پاگل عورت پر چیخ اٹھا تھا— سرجیت کورا ملتان اب تمہارا شہر نہیں ہے...

— وہ مجھے حیرت سے دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ میں کیا کہہ رہا تھا۔ یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بیرل ریڈکلف کی کی ہوئی سرحد کی تقسیم میری اور سب کی سمجھ سے باہر تھا۔

— بیرل ریڈکلف؟ یہ کون سی بلا ہے؟ اردلی نے پوچھا۔

— یہ وہ شخص ہے جس نے ہندوستان پاکستان کی سرحدیں طے کی ہیں...

یہ جولائی کا ایک بے حد حبس بھرا دن ہے۔ بیرل ریڈکلف ماؤنٹ بیٹن کی اسٹڈی میں کھڑا ہے۔ وہ نہ تو ماہر سماجیات ہے نہ ماہر جغرافیہ۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن نے اس وکیل کو سرحدیں کھینچنے کا کام سونپتے ہوئے کہا تھا— پنجاب اور بنگال کی تقسیم آپ کو کرنی ہے... انڈیا اور پاکستان کی بین الاقوامی سرحد آپ کو طے کرنی ہے...

— لیکن میں اس کام کا اہل نہیں ہوں! بیرل نے کہا— یہ پنجاب اور بنگال ہے کہاں؟

— وہ نقشے میں موجود ہیں! ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

— اس کے لیے مجھے پنجاب اور بنگال کا باقاعدہ دورہ کرنا ہوگا تاکہ میں ان صوبوں کو دیکھ سکوں...

—وہ ممکن نہیں ہے۔ وقت بالکل نہیں ہے۔ جولائی چل رہا ہے اور اگلے مہینے اگست کی چودہ تاریخ تک ہر حال میں ہمیں پارٹیشن کا کام پورا کر دینا ہے! ماؤنٹ بیٹن نے سختی سے کہا۔

تبھی وائسرائے کی اسٹڈی میں کبیر داخل ہو گیا اور چیخ پڑا— لاٹ صاحب! جس بیرسٹر کے ہاتھ میں تم نے قصائی کا چھرا پکڑا دیا ہے، اسے تو یہ تک نہیں معلوم کہ جو اور گیہوں میں فرق کیا ہوتا ہے... یہ قصائی پنجاب کا بٹوارہ کرے گا!

ابھی ماؤنٹ بیٹن اور ریڈکلف کچھ بھی سمجھ نہیں پائے تھے اور کبیر اسی سانس میں چیختا گیا—

—اس قصائی کو یہ نہیں معلوم کہ رہو اور ہلسا میں فرق کیا ہوتا ہے... یہ بنگال کا بٹوارہ کرے گا!

اس سے پہلے کہ ماؤنٹ بیٹن کے محافظ محتاط ہوں، وہ بھکاری کبیر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا اور اس شام بہت مضطرب اور پریشان سِرل ریڈکلف دھولا کنواں کی اس رج پر گھوم رہا تھا، جہاں سے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی فوج نے بریگیڈیر جان نکلسن کی کمان میں لال قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے کوچ کیا تھا۔ وہیں سے اُسے تغلق اور حبس بھری گرمی میں رائے سینا پہاڑی پر کھڑا سامراج شاہی کی عظیم علامت وائسرائے ہاؤس بھی دکھائی دے رہا تھا جو بھارت کے ٹکڑے کرنے کے لیے کمربستہ تھا۔ ٹکڑے ہوئے۔ صرف دھرتی کے ہی نہیں، ان تمام بے قصور معصوم لوگوں کے، جن کی لاشیں پورے شمالی ہند کی دھرتی پر بکھر گئیں... جنہیں کھانے کے لیے تمام دنیا کے گوشت خور پرندے اور جانور ہندوستان کے سفر پر آئے تھے۔ یہ مہا بھوج دنیا کی تاریخ میں اکیلا تھا۔

—ہم اپنے کروڑوں لاشوں کا کفن دفن نہیں کر پائے تھے لیکن وائسرائے کا صلاح کار چارلس کا معتقد کورلنڈ انڈیا کے نئے نوکر شاہوں سے ہندوستان بھر میں پھیلے اپنے اسلاف کی قبروں کا احترام اور شاندار رکھ رکھاؤ کی یقین دہانی لے رہا تھا...

یہ آواز کبیر کی تھی جو ایک ہاتھ میں بانس کی ٹیڑھی میڑھی چھڑی لیے ادیب اور اردلی کے سامنے کھڑا تھا۔

—ارے کبیر تم! ابھی ابھی تو تم وائسرائے کی اسٹڈی میں کھڑے سِرل ریڈکلف کو ڈانٹ رہے تھے!

—وہ تو بہت دن ہوئے۔ اُسے چھوڑو ادیب... مجھے تو تم اس بوٹا سنگھ کی کہانی بتاؤ جو زینب سے شادی کرنے کے بعد بہت خوش تھا۔ تقسیم کے بعد شاید پہلی خوشی زینب اور بوٹا سنگھ کے حصے میں آئی تھی۔

—ہاں کبیر! شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو... قتل، زنا اور تباہی کی خونی قیامت کے بعد بوٹا سنگھ اور زینب ہی پہلے آدم اور حوا تھے، جنھوں نے ممنوعہ پھل کھانے کا ثواب کیا تھا، نہیں تو پیار اس دنیا میں زندہ نہیں بچتا۔ صرف زنا اور ہوس کے بیج بجاتے ہوئے نالے ور نالے یہاں بہہ رہے ہوتے! ادیب نے کہا۔

—ہاں... اُن دنوں میں پاکستان میں تھا۔ تب میں نے اُسے ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ دیکھا تھا... لیکن کوئی بات نہیں کر پایا۔ نہ معلوم کیوں وہ پاکستان آیا تھا...

—تمہیں نہیں معلوم... میں بتاتا ہوں۔ ادیب نے کہا— ہوا یوں تھا کہ بوٹا سنگھ اور زینب کے سنگھ کو اس کے بھائی واحباب نہیں دیکھ پائے تھے۔ اُن دنوں ایک سمجھوتے کے تحت پاکستان میں لوٹ لی گئی ہندو عورتوں اور ہندوستان میں اغوا کر لی گئی مسلمان عورتوں کی تلاش کی جا رہی تھی۔ بوٹا سنگھ کے سگے بھتیجے نے جا کر فوج کے تلاشی دستے کو خبر کر دی... اسی شام بیاہتا زینب کو اس کے گھر سے اٹھا لیا گیا۔ فوج نے اُسے دلی کے ایک پناہ گزین کیمپ میں پہنچا دیا۔ بوٹا سنگھ پر تو جیسے مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس نے اپنی معصوم بچی تنویر کور کو اٹھایا اور اپنی بیوی و تنویر کی ماں کی تلاش میں نکل پڑا۔

—درمیان میں اردلی محمود علی نے مداخلت کی۔

—ادیب عالی! آپ کو ایک دن کی مہلت ملی تھی... سورج اب ڈوبنے والا ہے... اگر اجازت ہو تو میں جلدی جلدی وقت رہتے سورج ڈوبنے سے پہلے زینب اور بوٹا سنگھ کی کہانی سنا ڈالوں؟

—لیکن میں تو یہ کہانی اس کے تمام بے حد خوبصورت اور تکلیف دہ حوالوں کے ساتھ لکھنا چاہتا ہوں... یہ انوکھی کہانی تخلیق بن سکے گی تو صدیوں زندہ رہے گی... اسے لکھنے کے لیے مجھے وقت چاہیے! ادیب بولا۔

—خدمت کیجیے حضور! یہ تخلیق کا دور نہیں ہے۔ جو کہنا ہو جلدی جلدی کہہ لیجیے نہیں تو آپ کی کہانیاں گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیں گی...

—تو ٹھیک ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی قبر کھودو اور میرے قلم کو دفن کر دو۔ اس کے بعد تم کہانی سنانے کا سلسلہ جاری رکھو۔ ادیب نے ناامید اور مایوس ہوتے ہوئے کہا۔

—تو کبیر! ہوا یہ کہ... اردلی نے بوٹا سنگھ کی کہانی کا اگلا سرا پکڑا— بوٹا سنگھ تو اَن پڑھ کسان تھا، لیکن تمام مشکلوں کو پار کرتا ہوا اور زینب کو تلاش کرتا ہوا، وہ اس پناہ گزین کیمپ میں پہنچ ہی گیا جہاں زینب کو رکھا گیا تھا۔ اس کیمپ کی انچارج مردلا سارابھائی تھیں۔ جب وہ اُن کے دفتر میں پہنچا تو مردلا سارابھائی زینب سے جرح کر رہی تھیں—

— تمہارا مذہب؟

— اسلام!

— شادی کے بعد؟

— اسلام!

— بدلا نہیں گیا؟

— نہیں

— تمہیں بوٹا سنگھ نے اغوا کیا؟

— نہیں!

— تمہارے گھر والے سرحد پار پاکستان چلے گئے؟

— ہاں... آدھے لوگ چلے گئے... باقی لوگ یہیں ہیں۔

— تو تم آدھے لوگوں کے ساتھ پاکستان کیوں نہیں گئیں؟

— یہ ضروری نہیں تھا۔ مجھے اپنی پسند کا مرد مل گیا تھا...

— لیکن تم تو مسلمان ہو اور بوٹا سنگھ سکھ... تمہیں انڈیا میں رکنا نہیں چاہیے تھا۔

— کیوں؟ اسی انڈیا میں کروڑوں مسلمان ابھی بھی رُکے ہوئے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان پاکستان چلا ہی جائے؟ مجھے پاکستان کی ضرورت نہیں ہے... زینب نے کہا۔ تب تک آنسو بھری آنکھوں کو بوٹا سنگھ نے پونچھا اور اپنی بیٹی تنویر کور کو مردلا سارا بھائی کے قدموں میں ڈالتے ہوئے کہا—

— یہ ہماری اولاد ہے... ہم شادی شدہ ہیں۔ مجھے میری بیوی اور بیٹی کی ماں واپس دے دیجئے... میں اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ میرے ساتھ انصاف کیجئے۔ کہتے ہوئے بوٹا سنگھ رو پڑا۔

— نہیں! تم مردوں کی محبت پر یقین نہیں کیا جا سکتا!

— یہیں پر محبت کی ایک اور کہانی موجود ہے... ادیب نے مداخلت کی— مردلا سارا بھائی ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی معشوقہ تھیں... وہ دنیا کے دکھ درد سے دور ایک بے حد خوبصورت عورت تھیں۔ لیکن تقسیم کے ساتھ خون کا جو سیلاب آیا تھا، اس نے تین مورتی بھون میں نہرو کے بستر کو اس قدر بھگو دیا تھا کہ ان جیسا جذباتی اور انسان پرست انسان اس پر سو نہیں سکتا تھا۔ اس وقت نہرو جیسے مثالیت پسند انسان کو ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن کا روحانی کندھا ملا تھا... مردلا سارا بھائی

جیسی مجسم پیار کی پتلی نہرو جی کی اس روحانی اذیت کو قبول نہیں کر پائی تھی... اس نے ایڈوینا کو اپنا رقیب مانا تھا اور نہرو کو ایک بے وفا عاشق! اسی لیے اس نے بوٹا سنگھ کی محبت پر یقین نہیں کیا تھا اور دل ہی دل میں مردوں کی بے وفائی سے بدلہ لینے کے لیے اس نے نہرو کا انتقام بوٹا سنگھ سے لے لیا تھا!

— یہ سچ ہے اردلی نے کہا— سورج ڈوبنے والا ہے اور کہانی جلد سے جلد ختم کرنی ہے...

— تو پھر ہوا کیا؟ کبیر نے پوچھا۔

— مسلمان ہونے کے نام پر زینب کو پاکستان میں اس کے گھر والوں کے سپرد کر دیا گیا۔ زینب کو پانے کے لیے بوٹا سنگھ نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ اپنا نام اس نے جمیل احمد رکھ لیا اور بیٹی تنویر کور کا نیا نام اس نے سلطانہ رکھا اور جب اُسے پاکستان جانے اور اپنی بیوی سے ملنے کا ویزا نہیں ملا، تو وہ چھپ کر راجستھان کی سرحد سے پاکستان میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد یہ کہانی محبت، قربانی، وصال، فراق، عقیدے، ذلت اور نیم بے ہوش محبت کی ایک نایاب عظیم کہانی ہے...

— اسے تفصیل سے بیان کرو محمود علی... انسانی حدت اور پیار کی وحشی روحانی گھٹن تو انسان کے احساس و جذبات کی عظیم کہانی ہے... ادیب نے ٹوکا۔

— ادیب عالی! اب کہانیوں کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ سورج غروب ہونے والا ہے... اس کا انجام کبیر کو بتا دوں، نہیں تو آپ کی یہ کہانی بھی بیچ میں ادھوری چھوٹ جائے گی۔

— ٹھیک ہے... ٹھیک ہے... تم کہانیوں کا خون کر سکتے ہو... کہہ کر ادیب اداس ہو گیا۔

اور تب اردلی محمود علی نے بوٹا سنگھ عرف جمیل احمد کی کہانی کو ختم کرتے ہوئے کہا— بوٹا سنگھ عرف جمیل احمد نے ہر چند کوشش کی لیکن زینب اسے حاصل نہیں ہو سکی۔ زینب کے گھر والوں نے بوٹا سنگھ کو مسلمان قبول نہیں کیا۔ عدالت میں زینب کو بیان نہیں دینے دیا... حضور! تقسیم کے ساتھ انسان کی روح کے تقسیم ہو جانے کی یہ بھیانک کہانی ہے کیونکہ جمیل احمد عرف بوٹا سنگھ کو، مسلمان ہوتے ہوئے مقدمہ ہارنے کے بعد پاکستان کے قبرستان میں جگہ نہیں ملی۔ اُسے اس کی قبر سے کھود کر بے دخل کر دیا گیا... جس اسٹیشن کی پٹری پر آتی ٹرین کے سامنے کود کر اس نے اپنی بیٹی سلطانہ کے ساتھ خودکشی کی تھی، وہ اسٹیشن اور پٹری موجود ہے... لیکن اپنی لاش کی گود میں بیٹی سلطانہ کو اٹھائے ہوئے وہ بوٹا سنگھ عرف جمیل احمد منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی طرح آپ کی عدالت میں انصاف پانے کے لیے موجود ہے۔

— چلو ٹھیک ہے، محمود علی تم نے گلا گھونٹ کر بوٹا سنگھ اور زینب کی کہانی تو بیان کر دی، لیکن

ابھی وِدّیا کی کہانی باقی ہے۔ ادیب بولا۔

— کون وِدّیا؟

— وہی وِدّیا... جو اپنے ماں باپ کے ساتھ سگائی کے لیے روہتک روڈ سے تانگے میں رام نگر جا رہی تھی۔ تبھی قصاب پورہ کے پاس فسادی بھیڑ کا تھا اور تانگے کا گھوڑا بدکا لگا کر نہ معلوم وِدّیا کو کہاں اڑا لے گیا تھا... اپنی زندگی کی اُس سب سے خاموش کہانی کی تلاش میں میں آج بھی بھٹک رہا ہوں...

— سورج ڈوب چکا ہے اور ادیب عالی... اب کہانیوں کو دیکھنے یا لکھنے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔

— ایسا مت کرو محمود علی! کبیر نے کہا — مجھے ادیب کی ساری کہانیاں سننی ہیں...

— کبیر! اب کہانیاں سننے سنانے کا دور نہیں ہے۔ تم کہانیوں کو دیکھ سکتے ہو تو دیکھ لو...

— یہی تو مشکل ہے... میرے دوست محمود علی! کبیر بولا — میری آنکھوں کی روشنی چلی گئی ہے۔ میں بھیک مانگتے مانگتے اندھا ہو گیا ہوں... اس سے میری آمدنی تو بڑھ گئی ہے، لیکن اب میں کہانیوں کو صرف سن سکتا ہوں... دیکھ نہیں سکتا! دکھ یا سکھ کی آوازیں سن سکتا ہوں، دکھ یا سکھ کو دیکھ نہیں سکتا!

۳۶

اور بھارت نے آزادی کے دکھ اور سکھ کا جشن اور قتل کا نظارہ ایک ساتھ دیکھا۔ کئی باراتوں کے پیچھے پیچھے کئی جنازے مسلسل چل رہے تھے۔ نہ شادی کا منڈپ آتا تھا نہ شمشان۔ چاروں طرف جشن تھا، چاروں طرف ماتم تھا۔ سرل ریڈکلف نے کہاں سے زمین کو کاٹا تھا، کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن جشن اور ماتم منانے والوں کو سرحد صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جہاں ہندو اور سکھوں کی لاشیں پڑی تھیں وہ پاکستان تھا۔ جہاں مسلمانوں کی لاشیں پڑی تھیں وہ انڈیا تھا۔ لاشوں نے خود ہی سرحدوں کو طے کر دیا تھا۔

لیکن ابھی جو طے نہیں ہوا تھا، وہ تھا انگریزی سامراجیت کی پانچ سو پینسٹھ غیر قانونی ریاستوں کا مستقبل۔ وائسرائے کا صلاح کار کورفیلڈ لندن میں بیٹھا اپنے جاگیرداروں کو سمجھا رہا تھا کہ بھارت کی ساری ریاستوں کا معاہدہ برٹش کراؤن سے ہے۔ انڈیا انڈیپنڈنس ایکٹ کے تحت انہیں انڈیا یا پاکستان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ برٹش کراؤن اس ذمہ داری کو خارج نہیں کر سکتا۔ اس سے اتفاق کرتے ہوئے برٹش وزیر اعظم چرچل چیخا تھا — یہ راجے مہاراجے، نواب اور نظام ہمارے دوست اور تابعدار رہے ہیں۔ ان کے معاہدے ہمارے ساتھ ہیں... انہیں آزاد کرنا ہماری ذمہ داری ہے!

لیکن نہرو، پٹیل اور جناح نے اس سوچ کی مخالفت کی۔ وہ ان ناسوروں کو پالنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ برٹش حکومت کو اس سے اتفاق کرنا پڑا۔ لیکن بٹوارہ تو شروع ہو گیا تھا... انگریز افسر واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ آرمی کے افسروں کا بٹوارہ بھی ہونے لگا تھا۔ ادلا بدلی کا سلسلہ جاری تھا۔ دہلی چھاؤنی سے ہندو، سکھ اپنے مسلمان ساتھیوں کو رخصت کر رہے تھے... آرمی میس میں اتنی جگہ بھی نہیں، اس لیے چھاؤنی کے کھلے میدان میں بڑا کھانا ہو رہا تھا اور ادھر راولپنڈی چھاؤنی میں کرنل ادریس آنکھوں میں آنسو بھرے بچھڑنے والے اپنے ہندو اور سکھ سپاہیوں سے کہہ رہے تھے —

— میرے افسر اور جوان دوستو! دوسری عالمی جنگ میں ہم نے ساتھ ساتھ خون بہایا ہے... ہر مورچے پر ہم نے ساتھ ساتھ فتح حاصل کی ہے۔ ہم میں سے جو شہید ہوئے، انہیں ہم نے ایک ساتھ سلام کیا ہے... آپ کہیں بھی جائیں لیکن ہمارا یہ خون اور شہادت کا یہ رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا... ہم بھائی بھائی ہی رہیں گے اور ہمیشہ آپ سب کو یاد کریں گے۔

سب گلے ملے تھے اور آنسو پونچھتے ہوئے الوداع کہہ کر چل پڑے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ تذبذب اور کشمکش تو بھارت کی چھاؤنیوں سے جانے والے مسلمان فوجیوں میں تھی۔ انہیں کسی بھی ملک کی فوج میں رہنے اور انتخاب کی آزادی دی گئی تھی، لیکن پاکستان میں حالات دوسرے تھے — وہ ملک ہی اسلام اور مسلمان قوم کے نام پر بنا تھا۔ وہاں اوروں کے رُک سکنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہندوستان میں ایسی کوئی شرط نہیں تھی۔ اُسے سیکولر اعلان کیا گیا تھا، لیکن تذبذب تو اپنی جگہ تھا۔ پوری ہندوستانی فوج سیکولر تھی۔ سارے سپاہی صرف ہندوستانی تھے۔ وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی یا پارسی نہیں تھے۔ لیکن انہیں اب فیصلہ کرنا تھا کہ وہ کون ہیں، کس مذہب کے ہیں اور انہیں کہاں رہنا ہے۔

اس کشمکش اور تذبذب نے ہر ایک چھاؤنی کے سپاہی کے دل و دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔ فیصلہ لینا آسان تو نہیں تھا۔ یادیں جتنی شدت سے سپاہی کے دل میں رہتی ہیں، دنیا میں کہیں نہیں رہتیں۔ وہ جان، آن بان اور یادوں کے لیے لڑتا ہے۔ اس کی خواہش کا وہ پہلا اور آخری مرید ہوتا ہے۔ اُس کا ایک پاؤں مورچے کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے تو دوسرا پاؤں گھر کی یادوں کی طرف لوٹ رہا ہوتا ہے... اور ایسا ہی کچھ کرنل عنایت حبیب اللہ کے دل پر گزر رہا تھا، جب انہوں نے اپنے لکھنؤ کو دیکھا تھا۔ یہیں تو اُن کے اسلاف ۱۸۵۷ء میں شہید ہوئے تھے... شاہی عمارتوں پر گولوں کے بارودی نشان ابھی جل رہے تھے۔ قتل عام میں بہے خون کے چھینٹے ابھی سوکھے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی یادوں کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

لیکن رامپور ریاست کے اعلیٰ وزیر کے دو جوان بیٹوں نے الگ الگ فیصلے کیے تھے۔ بڑا بیٹا میجر یعقوب خاں، جو وائسرائے کے محافظین کا نائب سربراہ تھا، وہ بہتر مواقع اور عہدے کی تلاش میں پاکستان چلا گیا تھا۔ چھوٹا بیٹا کیپٹن یونس خاں اپنی یادوں کو چھوڑ نہیں پایا تھا۔ اُس نے ہندوستان میں ہی رہنا منظور کیا تھا۔

تقسیم ہو چکی پیشاور چھاؤنی میں اپنے ساتھیوں کو رخصت کرتے کرنل ادریس کا بیان اب بھی گونج رہا تھا—— میرے ساتھی افسران اور جوان دوستو! یہ بٹوارہ ہمارے دلوں کو نہیں بانٹ سکتا... دوسری عالمی جنگ میں ہم نے ساتھ ساتھ خون بہایا ہے۔ اپنے شہیدوں کو ہم نے ساتھ ساتھ سلام کیا ہے۔ فتح کے پرچم ہم نے ساتھ ساتھ لہرائے ہیں... آپ کہیں بھی جائیں، ہمارا خون اور شہادت کا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ کیونکہ ہم بھائی بھائی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

لیکن تاریخ نے ۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ میں تقسیم کے المیے کا دردناک منظر دیکھا تھا۔ کشمیر میں پونچھ کی پہاڑیوں پر گھمسان جنگ ہوئی تھی۔ پاکستان کے فوجی دستے کا کمانڈر تھا—— وہی رامپور کا یعقوب خاں اور ہندوستان کی گورکھا رجمنٹ کی کمان سنبھالے تھا—— اُسی رامپور کا یونس خاں۔ دونوں سگے بھائی ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ تقسیم کی قیمت دونوں چکا رہے تھے... سوال اپنے اپنے ملک کا تھا۔ ہندوستانی میجر یونس خاں حملہ کرتے ہوئے چیخا تھا——

——بھائی جان بچیے!

پاکستانی فوج کا یعقوب خاں زندہ نہیں بچ پایا تھا۔ میجر یونس خاں نے اپنے 'دشمن' بڑے بھائی کو ہرانے کے بعد اُسے وہیں دفن کیا تھا اور فاتحہ پڑھ کر بھاری دل سے اپنے کیمپ لوٹ آیا تھا۔ تب اُس کے دل نے بغاوت کی تھی اور وہ جانباز ہندوستانی سپاہی میجر یونس خاں، پری میچیور ریٹائرمنٹ لے کر رامپور لوٹ گیا تھا۔

لیکن جناح صاحب تو واپس دلّی لوٹ نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے اپنا پاکستان بنایا تھا اور وہ آخری بار بمبئی میں اپنی بیوی رتی کی قبر پر خاموش کھڑے رہے تھے۔ لیکن وہ کب تک کھڑے رہتے۔ انہیں بمبئی سے واپس دلّی جانا تھا اور پھر انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جانا تھا اپنے ملک پاکستان۔

طے ہوا تھا کہ پاکستان بننے اور اُس کی آزادی کا دن ۱۴ اگست ہوگا اور بھارت کی آزادی کا دن ۱۵ اگست۔ ان تاریخوں کو طے کرنے میں کوئی سوچ یا منطق نہیں تھی۔ یہ تاریخیں تو ماؤنٹ بیٹن کی جلد بازی اور سنک کا نتیجہ تھیں۔ کسی صحافی نے اُس سے پوچھا تھا کہ انڈیا کو آزاد کرنے کی کوئی تاریخ آپ نے طے کی ہے؟ تو اپنی سنک میں ماؤنٹ بیٹن نے بغیر سوچے سمجھے وہی تاریخ

۱۵ اگست کا اعلان کر دیا تھا، جس دن اُس کی کمانڈ کے سامنے جاپانیوں نے برما میں خودسپردگی کی تھی۔ ایسے طے ہوئی تھی بھارت کی آزادی کی تاریخ!

پانچ ہزار برسوں کی تہذیب کو ماؤنٹ بیٹن، چرچل اور ریڈکلف نے پانچ مہینوں میں توڑ دیا تھا۔ ایک سازش کے تحت انہوں نے پاکستان بنا دیا تھا۔

اور ابھی زمین پر نہیں، کاغذ کے نقشے پر بنے پاکستان کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے جناح صاحب دلّی سے کراچی کے لیے چل پڑے تھے۔ ابھی عوام کو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ سرحد کہاں ہے، لیکن لاشوں سے پٹی پڑی زمین بتا رہی تھی کہ ایک ملک کی سرحد کہاں ختم ہوتی ہے اور دوسرے ملک کی سرحد کہاں شروع ہوتی ہے...

جناح صاحب کا ڈی سی تھری جہاز دلّی کے پالم ہوائی اڈے سے کراچی کی طرف اڑ چلا تھا۔ وہ بیحد خاموش بیٹھے تھے۔ حالانکہ فاطمہ جناح اُن کے ساتھ تھیں، لیکن وہ کسی سے بات نہیں کر رہے تھے۔ وہ اتنے خاموش تھے کہ پرسنل سکریٹری وغیرہ آپس میں بھی بات کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ تھکے اور اداس تھے۔ فاطمہ جناح نے اُن کی طرف دیکھا تھا تو انہوں نے گہری سانس لی تھی اور اتنا ہی کہا تھا—— جو ہونا تھا وہ ہو گیا... یہی ہونا تھا...

کراچی ایئرپورٹ پر اترتے جہاز سے فاطمہ نے لاکھوں لوگوں کی بھیڑ دیکھتے ہوئے اپنے بھائی سے کہا—— سمندر اُمڈ آیا ہے آپ کے استقبال کے لیے...

جناح صاحب پھر بھی خاموش رہے... نہیں معلوم، وہ تھکے تھے، اداس تھے یا فلسفیوں کی طرح دنیا سے بے خیال تھے... ۱۴ اگست کو تو راجدھانی کراچی میں یوں بھی تمام سرکاری تقریبات کا اہتمام تھا اور پھر عید تو تھی ہی۔ پاکستان بننے کا تاریخی دن! مشیروں نے ایک یادگار شاہی دعوت کی پیش کش کی تو جناح صاحب نے دوپہر کی دعوت منظور کر لی اور انہوں نے ۱۳ اگست کی تاریخ طے کی۔ تب اُن کے بھروسہ مند اے ڈی سی نے ادب سے بتایا تھا—— یور ایکسیلنسی! ۱۳ اگست کو رمضان کا آخری روزہ ہے... دوپہر کی دعوت شاید مناسب نہ ہوگی...

آخر شاہی سرکاری دعوت کا پروگرام رد کر دیا گیا۔

لیکن سرحد پر قبضہ کر کے لوٹے مردوں نے عید کا جشن منایا۔ انہوں نے نئے کپڑے پہنے اور سرحد پر ہی پڑے ہندو، سکھ مردوں سے گلے ملے!

اس حیرت انگیز کرشمے کو دیکھ کر دنیا دنگ تھی۔ کوئی یقین ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ ہوا کیسے؟ ہندوستان کے نامزد گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کی اسٹڈی سے رابرٹ کلائیو کی جو بڑی تصویر ابھی صبح

اتار کر کباڑ خانے میں پہنچائی گئی تھی، وہ غصے سے اچھل پڑی — یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے ۱۸۵۷ء میں ہی دو قوموں کے نظریے کی بنیاد رکھ دی تھی...

گلکرسٹ نے آگے آ کر کہا — فورٹ ولیم کالج میں ہم نے منشی سدا سکھ لال اور مولوی میر امن کو بلا کر ان کی مشترکہ زبان کی ریختہ توڑ دی تھی...

میکالے نے کہا — میں نے انگریزی تعلیم ضروری بنا کر فارسی کو بے دخل کیا تھا اور پورے ہندوستان کے دانشوروں اور تہذیب یافتہ طبقے کو ان پڑھ اور جاہل بنا دیا تھا۔

اپنی قبر سے نکل کر مٹی جھاڑتا ہوا لارڈ کرزن آگے آیا تھا — جو کام آج ماؤنٹ بیٹن نے کیا ہے، اس کی شروعات میں نے ۱۹۰۵ء میں ہی کر دی تھی۔ میں نے ہندو مسلمانوں کی تقسیم کر کے ہی بنگال کو تقسیم کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے لیے پاکستان بنا دیا تھا لیکن بنگال کے مسلمان اپنا مستقبل نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ انہوں نے بنگال کی تقسیم کو خارج کر دیا۔ تب میں نے بنگ بھنگ واپس کر کے ڈھاکہ کے نواب سے کہا تھا کہ وہ ہندو برتری سے بچنے کے لیے اپنی الگ مسلم پارٹی بنائے... وہی پارٹی ہے مسلم لیگ، جس نے آج پاکستان بنایا ہے!

میکالے نے پھر مداخلت کی — ۱۸۵۷ء کی ہندو مسلم ایکتا کو توڑنے کے لیے میں نے راجاؤں، مہاراجاؤں، نوابوں، تعلقداروں کی عیاش اولادوں کے لیے انہیں کی ریاستوں میں بورڈنگ اسکول قائم کیے تھے... اور ان خاندانی اسکولوں میں میں نے انہی شہریوں کی مذہبی تعلیم لازمی بنائی تھی... جنہیں آج آپ افغانستان کے طالبان کہتے ہو، ویسے ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی طالبان ہم نے ہندوستانی ریاستوں میں پیدا کر دیے تھے۔ یہ ہندوستان کی ریاستیں قوم اور مذہب کی اس تقسیم کو انجام دینے والی ہماری سامراج شاہی کے کارگر مرکز بن چکے تھے۔ ہندو ریاستوں میں مسلمان کا ستایا جانا اور مسلم ریاستوں میں ہندو کے ستائے جانے کی حکمت عملی کی کامیابی ہم نے حاصل کر لی تھی... ۱۸۵۷ء کی ایکتا ہمیں منظور نہیں تھی... اس لیے تاریخ کو شکستہ کرنا ضروری تھا...

میکالے اپنی بات کہہ ہی رہا تھا کہ آسمان میں سونا جڑے اڑن کھٹولوں کے آنے کی آواز چاروں طرف بھر گئی۔ ان سونے کے اڑن کھٹولوں میں لندن کے وہ چوبیس بنیا آئے تھے جو آئرلینڈ کے قحط کی وجہ سے، موت سے منافع کما کر مالا مال تھے لیکن انہیں ڈچ بیوپاریوں سے شکایت تھی، جنہوں نے یورپ اور بھارت کے مسالوں پر اجارہ داری کر کے کالی مرچ کی قیمت بڑھا دی تھی۔ تب یہ ۲۴ بنیے ۲۴ ستمبر ۱۵۹۹ء کی دوپہر لیڈن ہال اسٹریٹ کی ایک خستہ حال عمارت میں ملے تھے اور انہوں نے ہی ایسٹ انڈیا ٹریڈنگ کمپنی قائم کی تھی۔

اور یہ حیرانی کی بات نہیں تھی کہ ہندوستان کا وائسرائے تو شاہی خاندان کی تائید سے منتخب ہوتا تھا، لیکن ہندوستان کی ریاستوں کے گورنروں کو ایسٹ انڈیا ٹریڈنگ کمپنی کے مالکان کے آل اولاد میں سے ہی منتخب اور مقرر کیا جاتا تھا۔

۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کو گورنروں نے اپنے بنیے اسلاف کے سونے جڑے اڑن کھٹولوں کا استقبال کیا تھا۔

جب ان ۲۴ بنیوں کے اڑن کھٹولے بھارت کے آسمان میں ساکن ہوئے، اس وقت فوجی چھاؤنیوں، سرکاری عمارتوں، بحری فوجوں کے مرکزوں، سامراجی حکومتوں کی عمارتوں، کلائیو کی سازشوں کی علامت کلکتہ کے فورٹ ولیم، مدراس کے فورٹ جیورجیس، شملہ کے وائس ریگل لاج، ریزیڈنسی لکھنؤ اور دوسری ہزاروں جگہوں سے ان کے نوآبادیائی سامراج کی علامت جھنڈے، یونین جیک اتارے جا رہے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ اداس ہو رہے تھے۔ وہ جھنڈے بھارت میں ہی بنتے تھے۔ انگریز درزیوں کے ایک خاص بنیا خاندان کے پاس جھنڈے بنانے کے حقوق تھے۔ ہر نو آبادی میں جھنڈے ہر سہ ماہی یا ششماہی بدلے جاتے تھے... یہ لاکھوں کروڑوں پونڈ کا کاروبار تھا، اسی کو لے کر ایک بنیا خاندان اپنے آل اولاد کے لیے پریشان تھا کہ دنیا کے نوآبادیوں پر لہرانے والے لاکھوں جھنڈوں کے اس کے خاندانی کاروبار کا خاتمہ ہو رہا تھا... اس مردے کو دل کا دورہ پڑ گیا... اسے ان بنیوں نے سنبھالا اور تب الزام در الزام کا دور شروع ہو گیا۔ تعجب یہ تھا کہ انڈیا کی طرف سے الزامات کے جواب ازلی تہذیب کا شہنشاہ سوتے جگا دے رہا تھا۔

الزام عائد ہوا —

— ہم تمہیں آزاد تو کر رہے ہیں لیکن تم اس لائق نہیں کہ اپنی آزادی کو سنبھال سکو!

— تم کون ہو انڈیا کو آزادی دینے والے؟ ہر شخص آزاد پیدا ہوتا ہے... اس ہندوستان نے آج سے پانچ ہزار سال پہلے ضمیر اور اخلاقیات کو ایجاد کیا تھا... اس تہذیب نے قدرت کے ساتھ خوف کی وجہ سے توازن قائم کیا تھا اور خوف سے آزاد ہو کر اعتقاد کو جنم دیا تھا۔ اس نے ہی خوف کو عقیدہ میں بدلا تھا۔ کبھی سنا تھا تم نے روح، اخلاقیات یا اعتقاد کا نام؟ یہ الفاظ ہی تمہارے پاس نہیں ہیں۔ تمہارے پاس ہے صرف فرد، ان کے پاس ہے پورا سماج۔

— اور آزادی کے وقت ان ہندوستانیوں کے پاس ہیں کروڑوں دلت۔ کروڑوں اسلام پرست مسلمان، لاکھوں عیسائی، پارسی اور یہودی اور چھ کروڑ سے زیادہ یہاں کے غیر مہذب، ان پڑھ قدیم باشندے۔ انہیں میں شامل ہیں شمال مشرق ریاستوں کے جانور خور۔

— بکواس مت کرو۔ یہ غلط جانکاریاں ہیں... بھارت نے سبھی کو زندگی کا حق دیا ہے۔ تم تو اپنے ملک میں ایک بھی بدھشٹ کو آج بھی داخل نہیں ہونے دیتے، لیکن اس بھارت نے صدیوں سے سب کو جینے کا وسیلہ اور رہنے کو پناہ دی ہے... تم نے تو اپنے اپنے پاکستان بنائے ہیں اور جب ہماری تہذیبوں نے تمہارے ظالم غارت گر حملوں کو برداشت کیا تھا، جب اپنی فتح کو مشتہر کرنے کے لیے ہم نے ان جارحیت پسندوں کی کھوپڑیوں کو اپنا پرچم بنایا تھا... تب تم نے دنیا کی قدیم تہذیبوں پر جانور خور ہونے کا الزام اور تہمت لگایا تھا... وہی تہمت تم آج بھارت کے شمال مشرقی صوبوں پر لگا رہے ہو... وہ جانور خور نہیں، تمہارے سروں کو کاٹ کر پرچم کی طرح لہرانے والے قدیم جنگجو تھے...

موہنے جا جب صدیوں میں پھیلے سوالوں کا جواب دے رہا تھا تو ادیب کو اپنی کہانی سے ملنے کا وقت ملا تھا۔ وہ پھر فرار ہو کر دلی کے روہتک روڈ کی طرف بھاگا تھا، جہاں سے رام نگر جاتا ہوا ودیا کا تانگہ غائب ہوا تھا اور اس کا گھوڑا اپنے پنکھ پھیلا کر نہ جانے کہاں، اس کمسن کو لے اڑا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ جب رام نگر جاتا ہوا ودیا کا تانگہ قصاب پورہ کے علاقے سے گزر رہا تب تک وہاں مار کاٹ شروع ہو چکی تھی۔ قصاب پورہ کے قصائی اپنے گنڈاسے اور چھریاں لے کر کافروں کے قتل عام کا ثواب کما رہے تھے۔ اسی میں ودیا کا تانگہ پھنس گیا تھا۔ ایک دھماکہ ہوا تھا اور دھوئیں کے ساتھ آگ پھیل گئی تھی۔ اس کی زد میں کئی راہگیر آ گئے تھے۔ چیخ پکار، مار کاٹ۔ تبھی ودیا نے ایک چمکتا ہوا چھرا دیکھا تھا... جو بجلی کی طرح چمک کر اس کے باؤجی کی پسلیوں میں اتر گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس کے ماں باپ اور چھوٹا بھائی مارے گئے تھے۔ گھوڑا اسے لے کر اڑنا چاہتا تھا لیکن بارودی چھروں سے وہ زخمی تھا۔ بدحواس ودیا جلتے ہوئے تانگوں کے نیچے پھنسی ہوئی تھی کہ تب نہ جانے کتنی دیر بعد اسے ایک آواز نے پکارا تھا—

— بیٹی! میرا ہاتھ پکڑو... گھبراؤ مت... ہمت رکھو، اس آگ سے نکلنے کی کوشش کرو۔ کوشش تو کرو... اور نیم بے ہوشی کے عالم میں ودیا نے خود کو ایک ایسے خاندان کے درمیان پایا تھا جو خون کی ندیاں پار کرتا ہوا پاکستان جا رہا تھا۔ اس نے ودیا کو زندہ بچا لیا تھا۔ قصاب پورہ کے پاس اس خاندان نے خون کی دوسری ندی پار کی تھی اور رات ہوتے ہوتے وہ میوات کے نوح نام کے قصبے میں پہنچ گئے تھے۔ وہیں انہوں نے کسی دور کے رشتہ دار کے گھر پناہ لی تھی۔ نوح کا یہ کنبہ میواتی مسلمان تھا، راجپوت مسلمان۔ ویسے تو ودیا کو دماغی طور پر ہوش نہیں تھا، لیکن یہ گھر اسے کچھ کچھ اپنا لگا تھا۔ یہاں دنگے فساد، ہندوستان پاکستان کی کوئی بات نہیں تھی۔ بات یہی ہو رہی تھی کہ پچھلے دو سالوں سے بارش نہ ہونے کی وجہ سے سارے جوہڑ اور تالاب سوکھ گئے ہیں۔ مٹر، جو، چنا، پیدا ہی نہیں ہوا

ہے۔ پچھلے برس بیساکھ میں کچھ امید بنی تھی، لیکن پانی کی ایک بھی بوند نہیں گری تو اربر بھی سوکھ گئی... ودیا کو یہ سب سن کر راحت ملی تھی۔ گھر کے لوگ وہی باتیں کر رہے تھے جو فتح گڑھ کے پڑوسی آڑھتیا کیا کرتے تھے یا اس کے باؤجی کے پاس آنے والے موکل بتایا کرتے تھے۔ وہاں بھی تو ایسی ہی گرمی ہوتی تھی اور انہیں گرمیوں میں ہوتی تھیں شادیاں۔

ہندوستان کے کسان کا مذہب کچھ بھی ہو، اس کے موسم ایک ہیں۔ بیساکھ چل رہا تھا اور میوات میں یہ شادیوں کا مقدس موسم تھا۔ چاند کی چار تاریخ تھی۔ یٰسین نے پاکستان جانے کا رخ کے سید سراج سے پوچھا تھا— سید صاحب! ہم نے تو جناح صاحب سے منع کر دیا تھا، ہم نہیں جائیں گے۔ آخر پاکستان میں ایسا کیا ہے جو یہاں نہیں ہے؟

تب سید سراج نے کہا تھا— بھائی جان! پاکستان ایک خواب ہے... ہم اسی خواب کو پانے کے لیے وہاں جا رہے ہیں... اور اب نکل پڑے ہیں تو واپس جانا ممکن نہیں ہے۔

اسی وقت درمیان میں آ کر مشتری نے یٰسین کو خبر دی— ابا! چاک پوجن کی رسم بھی ابھی ادا ہوئی ہے اور بھات لے کر چاروں ماما بھی پہنچنے والے ہیں... آپ کپڑے بدل لیجئے۔

سید سراج نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا، کچھ اس انداز سے کہ اس کے میواتی یٰسین بھائی کس طرح کے مسلمان ہیں۔ یٰسین نے مسئلہ اور الجھا دیا—

— یہ جو لڑکی آپ ساتھ لے آئے ہیں... یہ آپ کے لیے مصیبت بن سکتی ہے۔

— لیکن میں کیا کرتا... اس زندہ یتیم کو تانگے کے نیچے آگ کی چتا میں جلنے کے لیے تو نہیں چھوڑ سکتا تھا... ودیا نے یہ سنا تو سوچنے لگی— وہیں آگ میں جل مرتی تو بہتر ہوتا— اپنے شہر سے تو اسے بہت ڈر لگتا تھا۔ کچھ بھی سوچتے ہی اسے جیسے کاٹھ مار جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ شام کھڑی ہو جاتی تھی، جب کالی میم کی عیسائی بستی میں وہ بچوں کو پڑھا کر لوٹ رہی تھی۔ کئی دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ کچھ ہندو لڑکے اس کا پیچھا کرتے تھے... وہ لڑکے جو سامنے کے پارک میں صبح صبح ورزش کرنے کے نام پر جمع ہوتے تھے... ایک دن انہوں نے اسے روکا تھا اور پوچھا تھا—

— تم ہندو ہو؟

— ہاں، کیوں؟

— پھر تم عیسائی بستی میں روز کیوں جاتی ہو؟

— میں وہاں پرائمری اسکول میں پڑھاتی ہوں۔

— یہ جھوٹ بول رہی ہے... یہ جانتی نہیں، لیکن یہ عیسائی ہو چکی ہے۔ یہ ان کے گرجا گھر میں

پرارتھنا کرنے جاتی ہے...

اُن لڑکوں نے اُسے جلتی نظروں سے دیکھا تھا، تو اس نے غصے سے کہا تھا — کالی میم ڈاکٹر ہیں... وہ دھرم تبدیل نہیں، مریضوں کا علاج کرتی ہیں۔

— کچھ بھی ہو... اگر تم ہندو ہو تو کل سے وہاں جانا بند کردو۔

اُسے کیا معلوم تھا کہ ایسا ہوگا۔ اُس کے سامنے وہی شام پھر آکر کھڑی ہوگئی، جب انہیں میں سے دو لڑکوں نے اُسے پکڑا تھا اور آلو کے ایک گودام میں لے جا کر اُسے اپنی ہندو ہوس کا شکار بنایا تھا۔ ڈر اور شرم کے مارے وہ اپنے بابو جی کو کچھ نہیں بتا سکی تھی... ایک بار پھر انہیں دو نے اُسے بے آبرو کیا تھا۔ تب سے اُسے دورے پڑنے لگے تھے... وہ اپنے شہر سے گھبرانے لگی تھی...

— تو اسے بیاہتا بنا لیجئے... اسے دوسری یا تیسری بیوی کا درجہ دے دیجئے، نہیں تو سرحد پار کرنا مشکل ہوگا۔ ملٹری والے بھاگی ہوئی عورتوں کی تلاش سختی سے کر رہے ہیں۔ یٰسین میواتی نے رائے دی۔

بیگم نے سید سراج کو ترچھی نظروں سے دیکھا تھا تو انہوں نے ڈرتے ہوئے کہا تھا — یہ لڑکی ہندو ہے... میں نہیں چاہتا کہ یہ کسی کی ہوس یا چھرے کا شکار ہو جائے... پاکستان پہنچتے ہی میں کسی مناسب نوجوان سے اس کی شادی کردوں گا...

تبھی جلدی جلدی یٰسین کی بیوی نفہ بی نے انہیں برقعہ اور لکڑی کی ایک چھوٹی سی رنگین ڈبی تھما دی تھی۔

— یہ کس لیے بھوجی جان! اس میں ہے کیا؟ سید سراج نے پوچھا تھا۔

وہ جلدی میں تھیں۔ گنواریوں کے بول گھر کے دروازے پر گونج رہے تھے۔ ناچتی گاتی ہندو عورتیں دولہے کو دعا دینے اور اپنا نیگ لینے آچکی تھیں۔ نفہ بی کے سر پر سو کام تھے۔ چاک پوجن تو باقی تھا ہی، انہیں کنوئیں کی جگت پر جا کر بھی بیٹھنا تھا، جہاں سے نوشہ میاں کو انہیں اٹھانا، منانا اور عہد کرنا تھا کہ اماں تمہیں کنوئیں میں کود کر خودکشی کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں ہمیشہ تمہاری بہو کو قابو میں رکھوں گا۔ وہ کبھی بھی تم سے اُلٹے بین نہیں بولے گی... اسی طرح کے تمام کاموں اور دماغی اُلجھنوں کے درمیان نفہ بی نے سراج کو راز کی بات سمجھا دی تھی — یہاں سے اسے برقعہ اڑھا کے لے جاؤ... منہ کھلا رہے گا تو ہندو مسلمان کا فرق پیدا ہوگا، یہاں سے مسلمان کے طور پر جائے گی تو تمہارے ساتھ ساتھ شاید بچ کر نکل جائے۔ راضی خوشی سرحد پار کر لو تو اس ڈبیہ میں سے سندور لے کر اس کی مانگ بھر دینا۔ اُدھر کا سپاہی پوچھے تو کہہ دینا — ہندو بیاہتا ہے... ہم اسے اٹھا

لائے ہیں... سپاہی خوش ہو جائیں گے... خوشی خوشی جانے دیں گے...

— بھوجی! بات تو آپ نے پتے کی بتائی ہے! سید سراج نے کہا۔ تب تک نفہ بی نیگ اور نچھاور کی رسمیں نپٹانے چلی گئی تھیں۔

— ایسا کیجئے نا... بیگم سراج نے گلے پڑی مصیبت سے بچنے کا راستہ نکالا تھا — اسے یہیں نفہ آپا کے حوالے چھوڑ دیجئے۔ اسے اپنا گھر، گاؤں تو معلوم ہوگا... جب حالات سدھریں گے تو نفہ آپا اسے گھر بھجوا دیں گی...

— بیگم... یہ اتنا مشکل دور ہے کہ کہیں کسی کا گھر نہیں ہے... سب بے گھر ہو گئے ہیں... چل تو ہم بھی پڑے ہیں لیکن کیا ہمیں معلوم ہے کہ پاکستان میں ہمارا گھر کہاں ہے؟

اور پھر نہ جانے وِدیا کا سفر کیسے طے ہوا تھا۔ اُسے ٹکڑے ٹکڑے میں کچھ باتیں یاد تھیں۔ صبح جب اذان کی آواز آئی تب فوج سے سرحد کے لیے روانہ ہونے والی کرائے کی لاری کھڑی تھی۔ فتح گڑھ کے بارے میں سوچتے ہی اُسے وہ ہندو لڑکے یاد آتے تھے... آلو کا وہ منحوس گودام یاد آتا تھا... اور اب تو اماں بابو جی بھی نہیں تھے... وہاں کے بارے میں سوچتی تھی تو دماغ سونا پڑنے لگتا تھا... اور جب اس نے سنا — چلو بیٹی... تو وہ اپنے نئے خاندان کے ساتھ اُس پھٹرا لاری میں سوار ہوگئی تھی... ابھی کچھ اور چلنے والوں کا انتظار تھا۔ تب تک سید سراج نے سامنے والی مسجد میں جا کر حوض کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ نماز پڑھی اور پھر لمبے لمبے سجدے کئے تھے...

سفر شروع ہوا۔ کالے پہاڑ کی پرچھائیں کچھ کچھ اجلی ہونے لگی تھی۔ سورج نکل رہا تھا۔ راستے میں سوا کیکر کے کوئی دوسرا درخت نظر نہیں آتا تھا۔ ایک آدھ بیریوں کے پیڑ بھی ملے تھے۔ اُن پیڑوں کے خالی گھونسلے لٹک رہے تھے۔ سفر جاری تھا۔ پھر سرحد آئی تھی۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ چائے کی ایک گمٹی بھی تھی۔ سپاہیوں نے تھوڑی بہت پوچھ گچھ کی اور چائے پلانے کے بعد رائے دی تھی —

— آپ لوگ لائل پور نکل جاؤ۔ اُدھر زمینیں بھی ہیں اور گھر مکان بھی خالی پڑے ہیں۔ شاید گھر والے بھی مل جائیں۔

— گھر والے... تب ہمیں گھر مکان کون دے گا؟

— لاشیں پھینک دینا۔ کیڑے مکوڑے صاف کر لینا۔ اُدھر پانی کی کمی نہیں ہے۔ ستلج سے نئی نہر بہت پہلے نکل چکی ہے۔ جڑانوالا ہوتے ہوئے نکل جاؤ۔ وہاں غلہ منڈی بھی ہے، چاہو تو کچھ رسد خرید لینا۔ پیسہ کم ہو تو پلے داری کر کے کما لینا۔ کوئی دقت نہیں ہوگی۔ ملک میں سب آرام ہی

آرام ہے۔ سپاہی نے ان کی مشکل حل کر دی تھی۔

آخر ان کا چھوٹا سا خاندان لائل پور پہنچ ہی گیا۔ گھر، مکان بھی مل گیا۔ اُن سے پہلے چار پانچ مہاجر گھرانے وہاں پہنچ کر بس چکے تھے۔ اُن کے گھر میں پرانے مالکان کی کچھ ایک پیچان نہیں ہی باقی تھیں۔ ٹوٹے تندور والے کونے میں کپاس کی چھڑیاں ایک کیل پر ٹنگی، دھاگے میں پروئے ہوئے شلجم کے قتلوں کی مالا۔

دو پڑوسیوں نے آ کر گرمجوشی سے سید سراج کے چھوٹے سے خاندان کا استقبال کیا تھا۔ تب معلوم ہوا تھا کہ ان کا خاندان پرانی دلّی دریا گنج سے اُٹھ کر آیا تھا، کوچہ سعد اللہ خاں سے۔ نہر والی حویلی میں ان کی رہائش تھی۔ وہیں تو اپنے وزیرِ اعظم جناب نواب لیاقت علی خاں صاحب کی حویلی تھی — گل رعنا۔ سر سید احمد خاں کی حویلی تراہا بہرام خاں کے پاس تھی۔ وہ جب بھی علی گڑھ سے آتے تو اسی میں قیام کرتے تھے...

— اللہ کا لاکھ لاکھ شکر... پہلے پڑوسی ندیم صاحب نے کہا — ہمیں تو علی گڑھ میں پڑھنے کا موقع ملا نہیں، میں تو وہیں اجمیری گیٹ کے اینگلو عربک اسکول میں پڑھا ہوں۔ یہاں آتے ہی فارن آفس میں نوکری مل گئی۔ سرکار کو ایسے مہاجروں کی بہت ضرورت ہے جو ہندوستان جیسی فارن کنٹری کی معلومات رکھتے ہوں... اپنا کام تو بن گیا... آپ بھی کوئی نوکری پکڑ لو...

— ہمیں تو کوئی کام دھندا ہی پکڑنا ہوگا... ہم میں اتنی لیاقت نہیں کہ نوکری مل جائے... سید سراج نے بتایا۔

— لیاقت کے لیے تو اپنے وزیرِ اعظم لیاقت علی خاں صاحب ہی کافی ہیں... اردو تو پڑھی ہوگی؟

— جی ہاں... اردو تو آتی ہے۔

— تو بھائی جان، آپ کے گھر میں جو سندور والی لڑکی ہے، اُس کے بارے میں کچھ اردو میں بتائیے! دوسرے پڑوسی عنایت علی خاں نے دریافت کیا۔

یہ جملہ سنتے ہی بیگم سراج کا ماتھا ٹھنکا۔

آنے والا مشکل وقت رہ رہ کر کوندنے لگا۔ نہ معلوم کس وقت بجلی ٹوٹ پڑے۔ مرد کا ناڑہ ٹوٹتے کتنی دیر لگتی ہے۔ کمرے تو کئی ہیں، لیکن فی الحال چارپائی تو ایک ہی ہے۔ کہیں ناڑہ ٹوٹ گیا تو پھر زندگی بھر چارپائی نصیب نہیں ہوگی۔

وہ تو خدا کا شکر۔ کام دھندے کی تلاش میں سید سراج کو کئی دنوں کے لیے پڑوس کی منڈیوں کی جانکاری لینے کے لیے جڑاں والا کی بڑی منڈی تک جانا پڑا۔ اسی درمیان بیگم رقیہ سراج نے مولوی

کو بلا کر کلمہ پڑھوایا اور وِدیا کا ماتھا چوم کر اُس کا بہت ہی خوبصورت سا نام رکھ دیا — پری! پروین سلطانہ۔ سید سراج جب لوٹے تو اس خبر سے بہت ہی خوش ہوئے۔

انہوں نے بیگم کی سلوٹ دار کمر میں پیار سے ہاتھ ڈالا اور کہا — بیگم! تم نے یہ ثواب کا کام کیا ہے... ایک اعلیٰ ترین کام!

اور دوسری بار سید سراج پردیس گئے تو رقیہ بیگم نے دوسرا اعلیٰ ترین کام کر ڈالا۔ اس کی تیاری وہ کئی ہفتوں سے کر رہی تھیں۔ خاص طور سے انہوں نے اپنی کمر میں پڑنے والی سلوٹوں کی کشش کو یکایک پہچانا تھا۔ اس کشش کی پہچان انہیں ندیم صاحب کی نظروں نے دی تھی۔ ایک دن تو اسی خاطر انہوں نے کمر بندی کی طرح چاندی کی لڑ باندھ کر اپنی سلوٹوں کو سجایا تھا۔ ندیم صاحب کی آنکھیں بندھی رہ گئی تھیں، تب رقیہ بیگم نے حیا کا نقاب پہن کر بڑی شوخی سے انہیں بتایا تھا —

— کمر کی یہ پرتیں مرد کی بے پناہ محبت اور جسمانی قوت کی نشانیاں ہیں... یہ لہریں تبھی پڑتی ہیں، جب کوئی مرد محبت کی گہری جھیل میں اُترتا ہے۔

ندیم صاحب نے رقیہ کو بڑی تیز نظروں سے کسمسا کر کے دیکھا اور کچھ سوچنے لگے۔

— کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟

ندیم نے پھر انہیں دیکھا۔ ان کے اندر جسمانی قوت کا لاوا مچلنے لگا۔ انہوں نے اندازہ لینے کے انداز میں رقیہ بیگم کو غور سے دیکھا اور دھیرے سے کہا —

— لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ...

— آدمی دل میں ٹھان لے تو سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں... یہ مسئلہ تو چٹکی بجاتے حل ہو جائے گا... پری تو موجود ہے۔

پری! پری!!! ندیم خاں کا پورا وجود اس نام سے شرابور ہو گیا اور نہانے کے منتظر ندیم خاں حمام میں اکیلے نہ رہ جائیں، اس لیے رقیہ بیگم نے سید سراج کے واپس آنے سے تین دن قبل سارا کام سرانجام کر دیا۔ دو بیویوں کے رہتے انہوں نے پری اور ندیم خاں کو مسجد میں لے جا کر نکاح پڑھوا دیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی 'بیٹی' کی رخصتی بہت دھوم سے کریں گی، لیکن اگلی جمعرات کی شام، جب سید سراج دھندے کی خوش خبری کے ساتھ لوٹیں گے۔ سارے بڑبونگ اور بھونچال کے باوجود ندیم صاحب کو اُسی شام کا انتظار تھا۔

۳۷

وہ شام بھی آ ہی گئی۔ دونوں گھروں میں لعنت ملامت، گالی گلوج کے گیت گائے گئے۔ تھوڑی

بہت مار پیٹ کا ناچ بھی ہوا۔ پھر جو ہونا تھا، وہی ہوا۔ پروین سلطانہ عرف پری عرف وڈیا، بیگم ندیم خاں بن گئی۔ بیگم پری کو اپنی زندگی سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ جب اپنے شہر فتح گڑھ کی وحشت اور روہتک روڈ پر موت سامنے تھی، تب تو سب کچھ مناسب تھا ہی۔

پڑوسن نادرہ بیگم تو شادی کے جشن میں شامل ہونے، بہو کی بلائیں لینے اور پنجاب کی زمین میں نار گاڑے جانے کی دعائیں دینے آئی تھیں۔ ہاتھ میں فیروزہ کی انگوٹھی، کان میں فیروزہ کی بالی، ناک میں فیروزہ کی کیل اور اسی رنگ کا ریشمی غرارہ جس میں ان کے کولہے پن چکی کے پاٹوں کی طرح رگڑ کھا رہے تھے۔ انہوں نے جو تم بیزار کا نظارہ دیکھا تو بگڑ اٹھیں—

—ارے یہ کیا کر رہے ہو تم لالہ لوگ... دالیے کہیں کے... بہت ہو گیا خون خراب، اب تو چین سے زندگی شروع کرو! میں تو جشن منانے اور دعائیں دینے آئی تھی، نہ کسی قور پلاؤ، شیر مال اور قورمے کی دعوت... یہ عورت کو عزت دیے جانے کا دن ہے، اس کا تو خیال کرو!

تب ندیم صاحب کی بڑی بیوی نے سسکیوں، بددعاؤں اور کوسنوں کے درمیان کہا تھا—

—یہ تو ہندو وائن ہے... ناپاک ہے...

—نہیں... گھوڑے کا سم، آگ کی لپٹ اور عورت کی کوکھ کبھی ناپاک نہیں ہوتی۔

اور برسوں بعد تک پری عرف وڈیا اپنی کوکھ کے لیے اللہ کا شکر ادا کرتی رہی۔ حالانکہ اس کی کمر میں سلوٹیں تو نہیں پڑیں، لیکن ندیم صاحب نے اسے بھرپور محبت اور عزت دی۔ پری نے بھی انہیں تین اولادیں دیں۔ پھر انہیں فالج مار گیا اور سرکار نے اتنی مہربانی کی کہ ان کے بڑے بیٹے پرویز کو اسی فارن آفس میں ان کی جگہ دے دی۔

پری کا زیادہ تر وقت تب ان کی خدمت اور دیکھ بھال میں بیتنے لگا۔ وہ صبح ان کا منہ ہاتھ دھلاتی، چائے اور بسکٹ دیتی۔ دوپہر کو کیلے کا دلیہ یا کھچڑی کھلاتی۔ گھر میں آئے رسالوں سے انہیں شعر و شاعری اور افسانے سناتی۔ رات کو گوشت کا شوربہ پلا کر سلا دیتی۔ انہیں کسی ایک رسالے میں پری نے ادیب کی ایک کہانی کا ترجمہ پڑھا تھا، تب اس کا ماتھا ٹھنکا تھا— کہیں یہ وہی تو نہیں... جسے اس نے بہت پہلے کانپور اسٹیشن پر چھوڑا تھا...

اسی شام پرویز نے آکر خبر دی تھی—

—امی! میری پوسٹنگ بھارت میں ہو گئی ہے، اپنی ایمبیسی میں۔ اگلے مہینے مجھے دلی جانا ہوگا...

—دلی! چارپائی پر پڑے ندیم میاں کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی اور وہ لڑکھڑاتی آواز

میں بولے تھے—دلی... وہیں تو اپنے گھر ہیں، کوچہ سعد اللہ خاں میں... نہر والی حویلی!

—اور جب بھی موقع لگے تو ایک جگہ اور دیکھتے آنا...

—کون سی جگہ امی؟

—کانپور اسٹیشن!

—کانپور اسٹیشن! پرویز نے تعجب سے کہا—یہ کون سی بات ہوئی اماں؟

—بات تو کوئی نہیں، بھارت کی ایک کہانی کا ترجمہ پڑھا تھا، اس میں کانپور اسٹیشن کا خاصا ذکر آیا تھا... تو لگا کچھ خاص ہوگا وہاں... میں نے تو ویسے ہی کہہ دیا، نہیں تو اپنے لاہور سے بہتر تو کوئی شہر نہیں...

—ٹھیک ہے اماں... ہم کوچہ سعد اللہ خاں بھی جائیں گے اور کانپور اسٹیشن بھی دیکھ آئیں گے...

—ہاں بیٹے... اپنے گھروں کو اچھی طرح پیار سے دیکھنا... ندیم نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

—اور سنو، وہیں اجمیری گیٹ کے کوچہ چیلان میں ایک حکیم جی ہوا کرتے تھے، حکیم اشرف علی خیراتی صاحب... فالج کی اکسیر رام بان پڑیا ان کے پاس ہوتی تھی، وقت ملے تو ان کے دواخانے سے ہمارے لیے دوا بھجوا دینا۔ شاید وطن کی پڑیا سے میرا لقوہ ٹھیک ہو جائے... ندیم کی زبان بری طرح لڑکھڑا رہی تھی—وہیں سامنے مسجد ہے، وہاں کے دیے میں میری طرف سے گیارہ پیسے کا تیل ڈلوا دینا۔ چھٹیوں میں آنا تو قطب نرسری سے بیر کے پودھے کی ایک پود لیتے آنا۔ یہاں بیر ہوتا ہی نہیں...

—ابا، آپ ہمیں لسٹ بنوا دینا... کیا کیا دیکھنا ہے، کس کس سے ملنا ہے، کیا کیا لانا ہے... میں سب لے آؤں گا۔ بس تاج محل اور اولیاء معین الدین چشتی کی درگاہ لانے کو مت کہنا، وہ میں اٹھا کر نہیں لا پاؤں گا...

یہ سن کر پری کے یاقوتی ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ ندیم اداس ہو گئے تو پری نے ان کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا— میری طرح اب اپنی یادوں کو نہیں لگا بیٹھے... ادھر دیکھیے... کھڑکی کے باہر... کتنا خوبصورت ہے وہ کھجور کے درختوں کا جھنڈ۔ جن دنوں کھجور پھلتے ہیں تو کتنی مدھومکھیاں گاتی، گنگناتی آتی ہیں... ندیم نے پری کو دیکھا، پھر دھیرے سے بولے—

—بیگم، شہد کے چھتے تو ٹیکری کے بلند دروازے میں لگتے ہیں۔ کبھی جاؤ تو دیکھنا۔ ان دنوں تو وہاں جمنا اور بیتوا کے کچھار میں ٹیسو پھول رہے ہوں گے... ڈھاک کے جنگل دہک رہے ہوں گے...

پری نے ان کی اداس آنکھوں کو دیکھا۔

— بیگم! یادوں کی ٹیم کاری میں صدیاں لگتی ہیں... ندیم کی زبان بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ اور جو یاد آئے وہی اپنا ہوتا ہے... بیگم، میرے آدھے جسم کی یادیں کھو گئی ہیں، اسی لیے یہ سونا پڑ گیا ہے۔

پری نے اپنے مرمری گداز بانہوں میں انہیں لپیٹ لیا اور سونے پڑے جسم کو جگہ جگہ چومتے ہوئے کہا— میرے سرتاج، میں آپ کو ٹھیک کرلوں گی... اللہ پھر ہمیں اچھی اچھی یادیں بخشے گا...

قرۃ العین حیدر کا 'آگ کا دریا' تب اُسے سامنے بہتا نظر آیا تھا...

تبھی پڑوس کی بستی سے تیز ماتمی آوازیں آنے لگیں۔ پری اور ندیم نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا... یہ ماتم... وہ تیزی سے اٹھی اور کھڑکی پر آکر کھڑی ہو گئی۔ کھجور کے درختوں کے پار سے رونے کی آوازیں اور تیز تیز آنے لگیں۔ اس کا دل کسی سنجیدہ اندیشے سے دھڑکا... نہ جانے کس گھر پر کون سی بجلی ٹوٹ پڑی ہے... اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ابابیلوں کا جھنڈ اڑتا ہوا اُس کے سامنے سے گزر گیا۔

گلی سے گزرتے ایک آدمی نے خبر دی—

— بی بی! جنگ چھڑ گئی ہے۔ سرحد سے عبدالغنی کے بیٹے کے مرنے کی خبر آئی ہے۔

پری کا دل بیٹھ سا گیا۔

پیچھے سے ندیم کی لڑکھڑاتی آواز آئی—

— کیا بات ہے بیگم! کیا پھر کوئی پاکستان بن رہا ہے؟

پری نے سامنے دیکھا۔ آسمان میں ابابیلیں تو نہیں، لیکن لاکھوں تتلیاں اڑتی چلی آرہی تھیں۔ کچھ ہی لمحوں میں نظارہ واضح ہو گیا۔ وہ زندہ تتلیاں نہیں، تیز بارودی ہوا پر اُڑ کر آئے تتلیوں کے پنکھ تھے۔ وہ کھجور کے پیڑوں پر ستانے بیٹھ گئے۔ جنہیں جگہ نہیں ملی وہ تیرتے ہوئے پتھریلی زمین پر ہی لیٹ گئے۔

پری نے اُن ٹوٹے پنکھوں کو دیکھا۔ پھر کھجور کے درختوں کو۔ پھر ٹوٹے پنکھ کی طرح لاچار پڑے ندیم کو اور جیسے خود سے ہی خاموش سوال کیا—

— کیا پتہ شہد کی مکھیاں اس بار آئیں گی یا نہیں؟

— بارودی موسم میں وہ شاید آنا پسند نہ کریں... خاموشی نے جواب دیا۔

— معلوم کرو بیگم... یہ جنگ کیوں شروع ہو گئی ہے؟ بستر پر پڑے ندیم نے بھاری آواز میں کہا۔

— ابا، آپ پریشان مت ہوئیے... پرویز نے آکر کہا، تو ندیم کو تعجب ہوا۔

— تم تو ہندوستان جارہے تھے، کیا ہوا؟

— جنگ کی وجہ سے اڑانیں بند ہیں۔ میں ابھی ابھی ایئرپورٹ سے لوٹ کر آیا ہوں۔

— لیکن یہ جنگ...

— بنگالی اپنا پاکستان چاہتے ہیں...

— تو اس میں ہندوستان کیا کر رہا ہے؟

— وہ بنگالیوں کو اُن کا پاکستان بنانے میں مدد دے رہا ہے...

— تو اب کتنے پاکستان بنیں گے بھئی؟... خود پاکستان میں سے کتنے پاکستان پیدا ہوں گے؟ پنجاب کے سرائیکی اپنا صوبہ مانگ رہے ہیں۔ پرانے سندھی اپنا سندھو دیش بنانا چاہتے ہیں۔ جیسے یہاں لوگوں نے پنجابی و اردو کی لڑائی چھیڑ دی ہے، ویسے ہی وہاں سندھی، اردو کی لڑائی چل رہی ہے اور... پختون اپنا پختونستان چاہتے ہیں۔ عطاء اللہ مینگل آزاد بلوچستان مانگ رہا ہے اور اپنے مہاجر بھائی سندھ کراچی میں اپنا ایک اور پاکستان بنانا چاہتے ہیں... سنا ہے کہ وہاں ہندوستان میں ہندو بھی ہندوستانیوں سے اپنا ہندوتو وادی پاکستان مانگ رہے ہیں... لنکا میں تمل اپنی لنکا الگ کرنا چاہتے ہیں...

— پوری دنیا میں یہی ہو رہا ہے ابا جان... اسرائیل کی سرحد پر فلسطینی مارے جارہے ہیں۔ روانڈا میں قتل عام چل رہا ہے۔ ہوتو قبیلوں نے پانچ لاکھ تتسیوں کو مار ڈالا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ سندھی لوگ اپنے قائداعظم جناح صاحب کو بھی مہاجر مانتے ہیں... انہوں نے قائداعظم کی تصویروں تک کی بے قدری کی ہے... سرحد پر مار کاٹ چل رہی ہے۔ چھمب جوڑیاں، چھمب کرن کی پہاڑیاں اور میدان خون سے نہا رہے ہیں... ابھی پرویز یہ کہہ ہی رہا تھا کہ چاروں طرف پٹاخے چھوٹنے لگے۔

کراچی کے آس پاس، بنگلہ دیشیوں کی بستی میں چوری چھپے جشن منایا جانے لگا۔ بنگلہ دیش بن گیا تھا—

اور قائداعظم کے مزار کی دیوار پر کسی ٹوبہ ٹیک سنگھ نے یہ عبارت لکھ دی تھی—

— قائداعظم! آپ کا آدھا احسان ہم نے اتار دیا...

اور ادھر بنگلہ دیش کے بنکروں سے ننگی نوجوان لڑکیوں کی قطاریں نکل رہی تھیں۔ اُن کی کوکھیں خون کے سوکھے چکتوں سے سنی ہوئی تھیں۔ وہ چلتی پھرتی مردار مورتیوں میں بدل گئی تھیں۔

انہیں دیکھ کر دوسرا ٹوبہ ٹیک سنگھ، لکھنؤ کا مدرا راکشس چیخا تھا—

— وحشیو! یہی ہیں تمہاری ہار اور جیت کی نشانیاں۔ جنگ کہیں بھی ہو، کسی زمین پر ہو کسی بھی

وجہ سے ہو... یہی ہوتا ہے... اور اُس نے ادیب کو اپنی کہانی کا مسودہ تھما دیا۔

—پڑھو اسے، زور زور سے پڑھو، تاکہ دنیا کا ہر انسان اسے سنے... پڑھو... یہی ہر سرحد پر ہوتا ہے...

اور ادیب نے آس پاس کا سامان کھسکا کر اُسی مسودے کو پڑھنا شروع کیا—

—بیوی چپ چاپ اپنے بال سنوارتی رہی، اُس کے بعد اُس نے احتیاط سے اپنے ہونٹوں کو رنگا اور انگلی میں بچا رنگ اپنے ملائم گالوں پر رگڑنے لگی...

—اچانک تبھی ایک ساتھ کئی دھماکے ہوئے۔ کمرے کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ کر نیچے آ گرا۔ اِدھر اُدھر سے دھماکوں اور چیخ پکار کا شور آتا رہا... کبھی مورٹار... کبھی گولیاں، کبھی بم، پھر اُس کے بعد موت کی خاموشی... بستی خالی ہو چکی تھی۔ جنہیں بھاگنے کا موقع نہیں ملا، وہ کہیں چھپنے کی کوشش میں تھے۔

دھماکے پھر ہوئے۔ شوہر نے کہا—

—میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہماری طرف کی فوج ان سے مقابلہ نہیں کر رہی ہے تو پھر وہ لوگ، اس طرح گولہ باری کیوں کر رہے ہیں؟

—اُن کی مرضی... بیوی نے لاپروائی سے کہا— یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ صرف یہ بتانے کے لیے گولہ باری کر رہے ہوں کہ وہ آ رہے ہیں۔ آخر وہ یہاں باجے بجاتے ہوئے تو نہیں آئیں گے...

کئی گھنٹے بعد باہر کچھ آہٹیں ہوئیں۔

شوہر نے کہا— وہ آ گئے...

دروازے پر کئی سائے دکھائی دیے۔ وردی والا افسر اندر آیا اور شوہر سے بولا— ڈرنے یا بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے، اگر تم نے ہماری مدد اچھی طرح کی تو ہم تمہیں کچھ انعام بھی دیں گے۔

اسی درمیان پیچھے کے کچھ فوجیوں میں ہلچل ہوئی۔ شاید اور زیادہ لوگ آ گئے تھے۔ وہ چیخے—

—ہے ای! عورت! عورت!

بیوی تھوڑی پریشان سی ہوئی، پھر سنبھل گئی۔ سپاٹ آواز میں اُس نے وردی والے افسر سے پوچھا— یہ تمہارے ہی سپاہی ہیں؟

—ہاں...

—تو تم انہیں نظم میں نہیں رکھ سکتے؟ بیوی نے کہا۔

فوجی جیسے مشتعل ہو کر آگے لپکے۔ افسر اُن کی طرف تیزی سے پلٹا اور کڑکتی آواز میں اُس نے فوجیوں کو قابو میں رہنے کا حکم دیا۔ فوجیوں کو کوفت ہوئی—

—ہم نے اس علاقے کو جیتا ہے... یہ لوٹ کا مال ہے۔ ہم اسے لیں گے۔ وہ چیخے۔

—باہر نکل جاؤ! افسر دہاڑا۔

فوجی دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتے ہوئے باہر نکل گئے۔ باہر نکل کر کسی ایک نے اُس عورت اور افسر کو لے کر بھونڈی سی گالی دی۔ مضطرب افسر لپک کر باہر آیا، لیکن تب تک وہ بھی کہیں غائب ہو چکے تھے۔ افسر اُس عورت کی طرف لوٹا۔ اب اُسے اچانک لگا کہ اُس کمرے میں کوئی عورت ہے اور وہ ایک فاتح فوجی افسر ہے۔ عورت کی طرف اُس نے دھیان سے دیکھا۔ عورت کا چہرہ احساس سے عاری تھا۔ پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھیں... اس نے اسے پھر دیکھا، اس کے بالوں اور کپڑوں پر گرد تھی، لیکن عورت کم خوبصورت نہیں تھی...

افسر اُس کی طرف بڑھا اور اُس کے بالوں اور کپڑوں پر پڑی گرد اُس نے جھاڑنی شروع کر دی... عورت کے چہرے سے لے کر اُس کے جسم تک میں کوئی جنبش نہیں ہوئی... تبھی اس کی نگاہ اُس کے شوہر پر پڑی۔ وہ اُس کے شوہر پر چیخا۔

—ابے گدھے! میری صورت کیا دیکھ رہا ہے۔ گھر میں جو بھی کھانے کا سامان ہو لے کر آ۔

شوہر تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔ تبھی اُس نے پھر کہا—

—اور دیکھو بھاگنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ ساری بستی میں میری فوج موجود ہے۔ گولی مار دی جائے گی۔

شوہر حکم سن کر اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جیسے وہ مورت کی طرح کھڑی عورت میں حرکت ہوئی... افسر نے دیکھا... وہ کچھ اور زیادہ حرکت میں آئی اور پھر اچانک باہر کی طرف بھاگی۔ پلک جھپکتے ہی افسر اُس کی طرف جھپٹا اور اُس نے اسے کمر سے پکڑ لیا۔ عورت نے افسر کی کلائی میں دانت گڑا دیے۔ افسر نے اُس کی کمر پر ایک گھونسا مارا۔ عورت چیخی نہیں۔ کراہی بھی نہیں، اُس نے دونوں ہاتھوں کے ناخنوں سے اس کا چہرہ کھروچ ڈالا... لیکن جلدی ہی جیسے تیسے اُس لمبے چوڑے افسر نے اُسے قابو میں کر لیا... اس کے ہاتھ پیچھے جکڑ لیے... اس حالت میں عورت کی چھاتیوں کے ابھار اور زیادہ وحشی ہو اٹھے۔ افسر نے اُس کے سارے کپڑے نوچ ڈالے... ایک ایک دھجی اُس نے چیر کر پھینک دی... وہ بے حد مشتعل ہو چکا تھا... اُس نے عورت کو اٹھا کر نیچے کر لیا اور... اور... پھر افسر نے عورت کے ننگے جسم کو دو ایک بار زور زور سے بھینچا اور جھٹکے سے الگ کر کے اُسے

نیچے لڑھکا دیا۔ گری ہوئی عورت دھیرے دھیرے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہیں فرش پر، جوں کی توں۔
تبھی اس کا شوہر جو دروازے کے پاس ٹھٹھکا کھڑا تھا، کھانے کی پلیٹ لے کر اندر آگیا۔
افسر نے اپنی اسٹین گن اٹھا کر گود میں رکھ لی۔ اس کے بعد وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا... کھانے کے بعد وہ پانی پی ہی رہا تھا کہ دروازے پر پھر شور ابھرا۔ وہی تمام فوجی پھر آدھمکے تھے... وہ چیخنے لگے۔

— سر!... سر... ہمیں پوری بستی میں صرف چار عورتیں ملیں جو اس قدر بوڑھی ہیں کہ کتا بھی انہیں سونگھ نہیں سکتا...

— سر! آپ کا کام ہو چکا... یہ عورت ہمیں دے دیجئے...

اور وہ برہنہ عورت اسی طرح بغیر کسی جھجک کے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی... بجلی کی طرح خوبصورت وہ عورت دھیرے دھیرے فوجیوں کی بھیڑ کی طرف بڑھی اور... جب طوفان سا آگیا۔ وہ سارے کے سارے ایک ساتھ اس پر ٹوٹ پڑے۔ کتنی ہی باہوں میں ہوتا ہوا عورت کا سنہرا گلابی جسم ان کے درمیان کبھی کبھی اس طرح چمک جاتا، جیسے سیلاب کے گندے پانی میں کسی بچے کا کھلونا ڈوبتا، ابھرتا سا بہہ رہا ہو...

دوسری صبح وہی وردی والا افسر لوٹا۔ اس کے ساتھ کچھ اور ایسے لوگ تھے جو بت کی طرح کام کر رہے تھے۔ انہیں میں دو تین صحافی تھے۔ افسر نے عورت کو بتایا — یہ ہمارے ملک کے معزز انگریزی صحافی ہیں۔ ان کا کہا اور لکھا دنیا پڑھتی ہے، کہتی ہے... انہیں تمہارا بیان چاہیے... سمجھیں...
ٹیپ ریکارڈر چلنے لگے، اس عورت کا بیان درج ہونے لگا — ہم تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دشمن ملک کے سپاہی ہمارے ساتھ اتنا اچھا سلوک کریں گے... ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔
ٹیپ ریکارڈر چلے گئے۔ انگریزی صحافی بھی چلے گئے اور وہ افسر بھی شکریہ کہہ کر چلا گیا۔
رات اندھیری تھی۔ سائیں سائیں کر رہی تھی۔ تبھی اچانک پھر دھماکے شروع ہوئے۔ بم گرنے لگے۔ گولے پھٹنے لگے۔ مشین گن فائر پھر دیواروں کھڑکیوں سے ٹکرانے لگی... پھر اچانک ایسا پر زور دھماکہ ہوا کہ مکان کی چولیں ہل گئیں۔ شوہر نے گھبراتے ہوئے بھی راحت کی سانس لی اور کہا —

— لگتا ہے ہماری فوجیں آگئی ہیں... اور اب ہم آزاد ہو جائیں گے!

— کس سے؟

— دشمنوں اور بدقسمتی سے!

اچانک پاس ہی مشین گنوں کی گولیاں چلنے لگیں۔ ساتھ ہی گولے بھی پھٹنے لگے۔ اسی موت

اور دہشت کے درمیان اس کے شوہر نے کھڑکی سے دیکھ کر وردیوں کو پہچانا، اسی کے ملک کے فوجی تھے۔ وہ فتح حاصل کرتے ہوئے، دشمن کا صفایا کرتے ہوئے ایک ایک مکان میں داخل ہو کر جانبازی سے اُسے کھدیڑ رہے تھے اور اپنے ملک کی بستی کو آزاد کرا رہے تھے۔
اچانک انہیں یہ گھر بھی مل گیا۔ ایک عورت والا گھر۔ ملکی افسر نے اپنے سپاہیوں کو قابو میں رکھتے ہوئے باہر جانے کا حکم دیا اور اس عورت کے ساتھ وہی سب کچھ کیا اور اس کے بعد اس کے فوجیوں نے بھی اس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو دشمن فوج کا ہارا ہوا افسر اور اس کے سپاہی اس کے ساتھ کر کے بھاگ گئے تھے۔
پھر اس کے ملک کے کئی انگریزی داں صحافی آئے۔ ٹیپ ریکارڈر چلنے لگے اور اس کا بیان درج ہونے لگا تھا — میں اپنے ملک کی فوج کا استقبال کرتی ہوں۔ انہوں نے بڑی دلیری سے ہماری حفاظت کی ہے... ہماری عزت کی حفاظت کی ہے... ان کا سلوک، انسان پرستی اور اخلاق قابلِ تعریف ہے...
بیان درج کر کے صحافی اور فوجی افسر چلے گئے تھے۔ لیکن وہ روندی ہوئی ننگی عورت بار بار سوچ رہی تھی — آخر حملہ آور تھا کون؟

۳۸

حملہ آوروں کی پہچان مشکل ہے...
کائنات کے مشکل ترین غاروں سے نکلا... مواد سے بھیگا ہیروشیما چیختا ہوا آرہا تھا — حملہ آوروں کی پہچان مشکل ہے... یہ سب مل کر اب انسان کی عزت کو برباد کر دینے پر آمادہ ہیں... انہوں نے عہد کر لیا ہے کہ زندگی کے حقوق کے سوال اب یہ طے کریں گے... طاقتور تاکشس کو شکست دینے کے بعد آریوں کی موت کے دیوتا یم راج نے ایک میٹنگ بلائی تھی۔ اس میں میری تہذیب کا ہیڈیز موجود تھا۔ رومن تہذیب کا پلوٹن بھی اس میں شامل ہوا تھا۔ اس میٹنگ میں جیس کا بھائی پاسائڈن بھی آیا تھا...

— کون پاسائڈن؟ اردلی محمود علی نے پوچھا۔

— جیس کا تیسرا بھائی، جسے دیوسمراٹ بننے کے بعد جیس نے کائنات کے پانی کی حکومت سونپی ہے... یہی ہے آریہ دیوتا عیاش اندر کا سوتیلا بھائی... تاکشس پر فتح حاصل کرنے کے بعد سب مدہوش تھے۔ اس عظیم جنگ کے بعد بھی یہی ہوا تھا۔ جیسے وردی والے فوجی افسروں نے اس

بیوی کے ساتھ بلاتکار کیا تھا، اُسی طرح پاسائڈن کے ساتھ لوٹتے ہوئے ایریس نے، اتھینی کے بُت سے لپٹی کزینڈرا کو گھسیٹ کر اُس چرکنیا کی عصمت لوٹی تھی... کزینڈرا کے ساتھ ہوئے بلاتکار کو دیوی اتھینی برداشت نہیں کر پائی تھی۔ بلاتکار صرف کزینڈرا کے ساتھ نہیں، اُس کے ساتھ بھی ہوا تھا، کیونکہ کزینڈرا سورتی سے لپٹی ہوئی تھی۔ آریوں کی اہلیا تو پتھر کے بت میں بدل گئی تھی اور اتھینی کاٹھ کے بُت میں تبدیل ہو گئی تھی...

— تبھی سے دیوی سامراج کے سبھی دیوتاؤں نے زمین کی بے حرمتی کو اپنا شغل بنا لیا ہے... آدی باسی سوتنتے جما نے تبصرہ کیا — اپولو خود چرکماری کزینڈرا کی عزت لوٹنا چاہتا تھا جس کا اُسے موقع نہیں ملا... جنگوں کے ساتھ لوٹ پاٹ اور اجتماعی بلاتکار کی یہ روایت ابھی تک چلی آ رہی ہے... یہی مہذب کہے جانے والے انگریزوں نے برازیل میں کیا تھا... یہی ہماری تہذیب کی خواتین کے ساتھ ہوا تھا۔ خود کو مہذب پکارنے والی ان گوری نسلوں کی یہی تہذیب اور اخلاقیات ہے... خیر... اسے چھوڑو۔ ہمیں معلوم ہے کہ اسی غیر انسانی پورانک تہذیب کے خاندان والوں نے اپنے اپنے سامراج کو تقسیم کر لیا تھا۔ جس نے دیوسرات کا عہدہ اوڑھ کر آسمان کو اپنے اختیار کا علاقہ بنایا تھا۔ اُسی نے پاسائڈن کو پانی کی حکومت سونپی تھی اور ہیڈیز کو پاتال کا افسر بنایا تھا... لیکن یاد کرو ان امانتوں کا وہ معاہدہ، جس میں طے ہوا تھا کہ زمین پر ان سبھی نام نہاد دیوتاؤں کا برابر کا حق ہوگا۔ انھیں دیوتاؤں کے جدید خاندان اُسی پورانک معاہدے کا واسطہ دے کر آج بھی زمین کو اپنے قبضے میں رکھنے کی سازش کر رہے ہیں...

— میں اُسی کا حوالہ دے رہا تھا! ہیروشیما بولا — آریوں کے یم راج نے جو میٹنگ بلائی تھی، اُس میں تینوں تہذیبوں کے خدائی سامراج کے موت کے دیوتاؤں کے علاوہ زمین کے تاناشاہ ہٹلر، موسولینی اور خود میرے ملک کا تو جو بھی شامل تھا۔ انھیں کے ساتھ شامل تھے وہ طبعیات کے ایٹمی سائنسداں جو نسل پرستی سے خود پریشان تھے، لیکن قومیت یا سائنسی ترقی پسندی کے نام پر اجتماعی قتل اور تباہی کا نیا موت کا فلسفہ ایجاد کر رہے تھے... ان سائنسدانوں کا ایک کنبہ تھا۔ حالانکہ یہودیوں کے خلاف جرمنی اور اٹلی میں قوانین کی وجہ سے مخالف ماحول بن چکا تھا، انھیں اعلیٰ تعلیم سے محروم کر دیا گیا تھا، لیکن سائنسدانوں کے کنبے پر اس نسلی تفریق کا اثر نہیں پڑا تھا۔ انسانیت کی عظیم موت کا سائنسی فارمولا تلاش کرنے میں سب جٹے ہوئے تھے... ہیروشیما کی بات سن کر ایک زندہ بچ گئی بے چین تتلی پنکھ پھڑپھڑاتے ہوئے آئی اور بولی —

— انسانی تاریخ کی یہ مہیب تاریکی کا دور تھا... دوسروں کو موت دینے کے لیے امریکہ، جرمنی،

انگلینڈ اور روس کے سارے سائنسداں موت کی تحقیق میں جٹ گئے تھے... سارے ماہر طبعیات موت کے آریہ دیوتا یم راج، گریک دیوتا پاسائڈن اور پاتال شخص ہیڈیز کے زر خرید غلام بن گئے تھے... انہوں نے اپنی آتمائیں گروی رکھ دی تھیں۔ وہ تاناشاہوں کے ہاتھوں میں موت کے کارگر اوزار سونپ کر سائنس کے ترقی پسندی تصور کی دلیل دیتے ہوئے اپنے عہدے اور ذاتی سہولیات بٹور رہے تھے...

— تتلی نے ٹھیک کہا ہے... ہیروشیما نے تائید کی — اس دور کے سائنسدانوں، ماہر طبعیات کی پوری جماعت اپنے تجربہ گاہوں میں صرف موت پیدا کرنے کے خوفناک نظریات کا کمال حاصل کرنے میں لگی تھی۔ اس لیے ان ایٹم سائنسدانوں کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس کی ترقی کے نام پر موت کے ان سوداگروں کو کھلی چھوٹ نہیں دی جا سکتی... یم راج، ہیڈیز اور پاسائڈن کی اس مجلس میں تینوں تاناشاہ تو شامل تھے ہی، جرمن ماہر طبعیات وان وینچ ساکر، ورنر ہائزنبرگ کے ساتھ ایڈورڈ ٹیلر، رابرٹ اوپن ہائمر، رودر فورڈ، مربی، ایز یکوفری، لیوز یلارڈ، نیلس بوہر، روڈولف پیلرس اور آئنسٹین جیسے عظیم سائنسداں بھی موجود تھے...

— میں بتاتا ہوں... ان کی سائنسی شہرت کو لگ بھگ آخری عروج تک پہنچانے والی تحقیق سے جڑی بے مثال اور انوکھی تاریخ کی کہانی۔ اس غیر انسانی تاریخ کی کہانی، جس نے سائنس جیسی ترقی پسند اور مقدس صنف کو زندگی مخالف بننے کے لیے مجبور کیا۔ ازٹیک تہذیب کا میکسیکن سمراٹ موتنتے جما سامنے آ کر عہد تاریکی کی تاریخ کے سرے سلجھانے لگا —

— یہ شہرت اور رسوائی کی پرتضاد تاریخ ہے۔ سائنسدانوں کا کنبہ انسانیت کے حق میں اپنے عظیم تجربوں کو پیش کر رہا تھا۔ وہ قدرت کے رازوں کو بے نقاب کرنے میں لگا تھا... انسان کی نیک خواہشات کے ساتھ۔ تبھی تو ماری کیوری نے ریڈیم ایجاد کیا تھا اور کیمبرج کے اپنے معاصر ماہر طبعیات رودر فورڈ کے لیے کیوری نے کہا تھا — رودر فورڈ ایسے تنہا ماہر طبعیات ہیں جو اپنے سائنسی تحقیق سے انسانیت کو زندگی کے بے مثال تحائف سے مالا مال کر سکتے ہیں!... ماری کیوری نے رودر فورڈ کی بے مثالی تحقیق میں زندگی اور دنیا کے لیے ایک نئی امید دیکھی تھی۔ رودر فورڈ نے اپنے تجربہ گاہ میں مسلسل توانائی والے جوہر کی تلاش کر لی تھی...

— اتنا ہی نہیں... میرے سائنسداں استاد رودر فورڈ نے جوہر کے بھی ٹکڑے کر لیے تھے... انہوں نے جوہر کے مرکز نیوکلیس کے راز کا پتہ لگا لیا تھا، جو جوہر سے دس ہزار گنا چھوٹا اور ٹھوس تھا۔ لیکن اپنی توانائی طاقت میں جوہر سے ہزار گنا زیادہ متحول اور طاقتور... ایک سائنسداں سے لگتے

شخص نے مداخلت کی—
سبھی لوگوں نے اُسے حیرانی سے دیکھا—
— آپ کی تعریف؟ ہیروشیما نے سختی سے پوچھا۔
— میرا نام پیوتر کپتزا ہے... میں روسی ہوں... میں انگریز سائنسداں استاد ارنسٹ روڈرفورڈ کا شاگرد ہوں!
— تم انسان مخالف ایٹم سائنسدانوں کو ہماری مجلس میں آنے کی اجازت نہیں ہے! ہیروشیما نے غصے سے کہا— بہتر یہی ہوگا کہ آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں۔
اُسے موسٹے جمانے شانت کیا—
— ہیروشیما! میں تمہارے زخموں کے درد پہچانتا ہوں... لیکن ہمیں کپتزا جیسے سائنسداں کا خیر مقدم کرنا چاہیے... موجود لوگوں نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
— میں ٹھیک کہہ رہا ہوں! شدید دکھ اور بے پناہ اذیت کے وقت بھی ہمیں اپنا ضمیر نہیں کھونا چاہیے... انہیں پہچانئے... یہ وہی پیوتر ایل، کپتزا ہیں جو ارنسٹ روڈرفورڈ کے ساتھ کیمبرج میں تحقیق کرتے رہے ہیں۔ یہی کچھ سائنسداں تھے جن کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز تھی۔ ایٹم کو توڑنے کا راز حاصل کر لینے کے بعد، روڈرفورڈ دکھی اور اداس ہوا تھا... اُس نے اپنے فرانسیسی دوست کیوری جوڑے سے کہا تھا— ہمیں اس تحقیق کے نتائج کو پوشیدہ رکھنا چاہیے، اگر یہ مکاروں کے ہاتھ لگ گیا تو قدرت کی طاقت کا یہ بیج انسانیت کی تباہی کا سبب بھی بن سکتا ہے... اور تب انہی سائنسداں کپتزا اور ایڈن برگ میں کام کر رہے میکس بورن نے ایٹم کے ٹکڑے اور مرکزیت کی عظیم طاقت کا راز سیاست کے سامنے پیش کرنے سے انکار کر دیا تھا...

موسٹے جما ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں تاریخ حاضر ہونے لگی... خودغرض خواہشات کی آندھیاں یوروپ میں چلنے لگیں... نسلیت اور قومیت کے راکشس جگہ جگہ بیدار ہونے لگے۔ فرانسیسی اور روسی انقلابات کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام اپنے زرہ بکتروں اور خودوں کی مرمت کرنے لگے۔

سابق فوجی بینیتو مسولینی کے 'جدو جہد اتحاد' کے لام بند بیوقوف رضاکار اچانک سیاست کے میدان میں اتر پڑے۔ اٹلی کے شہروں بڑے شہروں میں انہوں نے مزدوروں اور غریبوں کے خلاف غنڈہ گردی کا دہشت برپا کر دیا تھا۔ گرجا گھروں کے معمولی پجاریوں اور پادریوں کے وہ سرپرست بن گئے۔ قصبوں کی شہری مجلسوں میں انہوں نے انقلابی قرنٹ کے تحت اپنی برتری قائم

کی۔ ٹریڈ یونینوں پر قبضہ کیا۔ انتظامیہ کے بابوؤں اور محکمہ پولس سے مل کر اپنی داداگیری قائم کی...
اس لاقانونی ماحول میں موسولینی تب ثقافتی قومیت کی علامت بن کر ابھرا اور حکومت کی نقل کا غیر قانونی مرکز بن گیا۔ تب اس نے راج کاج اور حکومت کی پالیسیوں میں مداخلت شروع کی۔ کسی بھی طرح مسولینی نے اقتدار حاصل کرتے ہی سب سے پہلے چرچ سے سازباز کی۔ تب پوپ نے کہا— ہم نے اٹلی کو اُس کا خدا دے دیا ہے، اور خدا کو اٹلی!
اور ادھر نسلی نفرت اور مذہبی قومیت نے جرمنی کو ہٹلر دے دیا اور ہٹلر کو جرمنی!
— رکو! تاریخ رکو! موسٹے جمانے آواز دی۔
اور تاریخ رک گئی۔
— اور سنو... تین سو سالوں سے چلی آتی ادب کی مشترکہ ثقافت اور باہمی تجربے کی انسانیت پرست دھارا تب رک گئی۔ نوآبادیاتی اور صنعتی دولت نے انسانیت پرستی کو رومانویت میں تبدیل کر دیا۔ فن کی دلچسپیاں عوامی احساس کے عروج سے اُتر کر تنہائی کی رومانی گھاٹیوں میں گم ہونے لگیں۔ اصل فنکاروں، تخلیق کاروں کی جگہ جابر فن کا زخمی گزند نہ برداشت کر پانے والے جرمانی فنکار، تخلیق کار متحد ہونے لگے۔ وہ اپنے وجود کی حفاظت کے لیے فراخ دلی سے ایک دوسرے کو تحسین اعلان کرنے لگے... امریکہ اور یوروپ کی اقتصادی مندی سے پینٹنگس کی منڈی چوپٹ ہو گئی... بیتھوون کے آداس کار سنگیت کی دنیا قدرت کی آوازوں میں تحلیل ہو گئی... فن انسان کے حسن یا المیہ کو سمجھنے کی جگہ اپنی تباہی کو سمجھے جانے کو نظر انداز کرنے لگا... پکاسو کا کیوبزم ذہنی خاکوں کو توڑ کر انسان کے فنی شعور کو کھنڈروں میں جانے کے لیے مجبور کرنے لگا... حقیقت کے نیک مرکزی تصورات کی جگہ خوفناک شدید حقیقت کی اذیت سے پریشان ماورائی صورتیں آنے لگیں... دادا اور ڈالی کی دنیا تباہی میں اپنے وقت کے سچ کو تلاش کرنے لگی۔ ڈالی کے وقت کے شعور کی گھڑی پگھلنے لگی، لیکن وہ وقت کی سوئیوں کو نہیں روک پایا... تانا شاہ بینیتو مسولینی کی فوجیں ایتھوپیا پر قبضہ کر کے تھوڑا رک گئیں۔ ہٹلر کی فوجیں رائن لینڈ، آسٹریا اور پولینڈ کو روند کر کھڑی ہو گئیں۔
موسٹے جمانے دیکھا... سامنے پھیلا تھا ایک ایذائی مقام۔ اوبڑ کھابڑ۔ زمین چھلنی چھلنی اور شگافوں سے تہس نہس۔ انہیں شگافوں سے جگہ جگہ آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ انہیں کے ساتھ سانپوں کی طرح پھنکارتی بھاپ کی زہریلی لہریں... اسی زہریلی بھاپ میں بے ہوش ہوتے اور دم توڑتے لوگ...
ہٹلر کے پیچھے اُس کا خونخوار کتا کھڑا تھا اور وہ کبوتروں کو دانا کھلاتے ہوئے بول رہا تھا—

کاکیشین آریوں کا سورج اور سامراج ان غیر آریوں کے لیے نہیں ہے... ہمارے پاس اپنا علم و فہم اور سائنس ہے۔ ہمیں سامی، یہودیوں کی گھٹیا سائنس کی ضرورت نہیں ہے!

ابتدائی مقامات میں پھر زہریلا دھواں سسکیاں بھرنے لگا... لوگ پھر بیہوش ہو کر دم توڑنے لگے۔ برلن، لیپ زگ، گوٹنجن اور میونخ کے تجربہ گاہ شکنجے میں آ گئے۔ سبھی تجربہ گاہوں کی سانسیں رکنے لگیں...

— سنو ہیروشیما! سومتے جتا نے کہا— تمہاری اذیت کی کہانی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یہیں سے ایٹم کے ٹوٹے نیوکلیس کی تاریخ بدلتی ہے... ذہنی قوت اور نئے سائنس کے علم سے مالا مال کوئی ذات ذلت برداشت نہیں کر سکتی... شے کے باطن میں اپنے کل اقتدار کے ساتھ موجود جوہر اور جوہر میں موجود اس کا اور بھی طاقتور نیوکلیس، اس کی ناف میں جمع متواتر توانائی کا ذریعہ، بکھرنے کے تسلسل کا راز، جو زمین کو سیکڑوں سورج کی روشنی اور ہر طبعی ساز و سامان کو صدیوں سرگرم رہنے کی توانائی دے سکتا تھا... جو موت، ضعیفی، مصیبت، پریشانی، دکھ، اذیت، ناداری، خوف، گناہ اور پشیمانی سے انسان کو آزاد کر سکتا تھا... متواتر توانائی کے ان ذرائع کی سمت مبارک سے نحوست میں بدل گئی، کیونکہ یہودی ذات کی ناف میں بکھراؤ شروع ہو گیا تھا۔ ہیروشیما! جس ایٹم بم کی درد اور اذیت تم نے اور ناگاساکی نے برداشت کی ہے، اس کا نشانہ تو ہٹلر، برلن اور میونخ تھا۔ لگ بھگ سبھی ایٹم سائنسداں تو یہودی تھے... ان کی ناف بدل دی گئی تھی۔ انہیں لگ بھگ اچھوت مانا گیا۔ اتنی عظیم ذہنی ذلت اور ہجرت تو دنیا کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ ہجرت بھی تھی اور جلاوطنی بھی... تذلیل، نسلی تفریق، خوف، اذیت، اہانت اور روحانی گزند کے احساس سے تب کنٹرول ہوا تھا— یہودی ذہن۔ اس میں پیدا ہوا تھا انتقام کا سلسلہ وار بکھراؤ۔ اور تب کوانٹم نظریہ سے پیدا ہر نظریہ انسان کی قسمت سے مطلق اور آزاد ہو گیا تھا۔ ہٹلر نے آریہ برتری کے زعم میں یہودی سائنس والوں کی جو اہانت کی تھی... اس نے بڑی تباہی کے شاہراہ کو ہموار کر دیا تھا... دیکھو اس منظر کو!

اور بکھرے ہوئے ہیروشیما نے دیکھا— تجربہ گاہوں میں ریاضت کرنے والے رشیوں کی ہیئتیں بدل رہی تھیں۔ ریاضت کرنے والے راکشسوں میں تبدیل ہو رہے تھے...

ہیروشیما نے اپنی خوفزدہ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیا... وہ جسم بے ہوش سا ہو گیا تھا۔

رکی ہوئی تاریخ پھر سرگرم ہوئی۔

آریہ ہٹلر نے تجربہ گاہوں کا شدھی کرن شروع کر دیا۔ چن چن کر غیر آریہ برخاست یا سبکدوش

ہونے لگے۔ انسان کی ناقابل شکست عقل نسلی تشدد کا شکار ہو گئی۔ یہودی سائنسداں فرار ہونے لگے۔ البرٹ آئنسٹائن برلن چھوڑ کر امریکہ کی طرف چل پڑا۔ کچھ سائنسداں کوپن ہیگن، پیرس، زیورچ، اور کیمبرج کی طرف بھاگ نکلے۔ میکس بورن، جیمس، فرینک اور ڈیوڈ ہلبرٹ نے جرمنی چھوڑ دیا۔ ایٹم بم کے اہم خالق ایزیکو فرمی کو اپنی یہودی بیوی کی وجہ سے بھاگنا پڑا۔ ہائڈروجن بم 'فیٹ مین' کا متوقع خالق ایڈورڈ ٹیلر بھی رک نہیں پایا... وہ جا کر اوپن ہائمر کے ساتھ امریکہ کی لاس الموس تجربہ گاہ میں شامل ہو گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے ساتھ ساتھ آریوں اور غیر آریوں کے درمیان بھی جنگ شروع ہو گئی۔ یہودیوں کی بکلی انتقام مانگنے لگی اور... اور...

— اور میری زمین نیو میکسیکو کے الاماگوردو کے ریگستان میں... صبح چار بجے جولائی ۱۶/۱۹۴۵ء، کو وہ ہوا جو کبھی نہیں ہونا چاہیے تھا... بے چین سومتے جتا جیسے کسی بہت گہری چوٹ سے کراہنے لگا—

— ایٹم بم کا پہلا تجربہ! اور دور سے اپنی ترشول پروجیکٹ کے تجربے کی کامیابی کو دیکھ کر اوپن ہائمر درندوں کی طرح رقص کرنے لگا۔ سنسکرت کا جانکار ہونے کے ناتے تب اُسے ہندو آریوں کے گیتا سے ایک اقتباس یاد آیا— میں ہی موت ہوں! اور میں ہی زندگی... اب میں موت کی شکل میں نازل ہوا ہوں... زمین کی تباہی کے لیے... میں ہی موت ہوں...

زمین کے اوپر ریڈیو ایکٹو زہریلی چھتری نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ اس صبح سورج نے طلوع ہونے سے انکار کر دیا اور اس دھماکہ کے تسلسل میں فوری ردعمل پاتال میں ہوا۔ پاتال کا پانی ابلنے لگا۔ مچھلیاں تڑپنے لگیں۔ پاتال کی سطح میں مونگا، موتیوں سے بنے، پانی کے پھولوں سے بنے پانی کے محل تباہ ہو گئے۔ پانی کی دوشیزاؤں کے نازک جسم پھپھولوں اور بلبلوں میں بدل گئے۔ زندگی کی دوا لانے گیا جل جانیش پاتال کے اس ابلتے پانی میں اُبلنے لگا... اس کا دم گھٹنے لگا۔

— تب میں پاتال میں اترا تھا، اپنے دوست جل جانیش کو بچانے کے لیے! سومتے جتا نے کہا— ابلتا پانی... جلتی کپاس کی طرح اندھا جھاگ۔ آہیں بھرتی، دم توڑتی بے بس مچھلیوں کے بے جان ہوتے ٹکڑے۔ سرسوں کی طرح پھیلتے مونگوں کے محل۔ جھلسے ہوئے پانی کے پھول۔ جلتے ہوئے پانی میں تڑپتی جل پریاں... میں نے جل جانیش کو سنبھالا... وہ تو اچھا ہوا کہ آگ کی ندی کے کنارے ہمیں تلسی کا ایک پودا ملا۔ اس کے سیاہ پتوں نے جل جانیش کو پناہ دی۔ آتشیں لہروں نے اُسے تلسی کی کونپلوں نے بچایا...

تبھی کائنات کے کسی کونے سے آہنی زنجیروں کے کھڑکنے کی تیز آواز آئی اور پھر آئی پرمتھیو کی آواز—

—جل جاتیش کو محفوظ رکھنا... اسے بتانا... تلسی کی داہنی سمت سے پاتال کی آخری سطح کی طرف ایک پانی کا راستہ جاتا ہے... راستے میں آگ کا جنگل پڑتا ہے۔ اسی آگ کے جنگل کے ایک طرف سورج غروب ہونے کا مقام ہے اور دوسری طرف ہے خوابوں کی نگری... اسی نگری میں چھپا بیٹھا ہے— دھنونتری شورو پک کا حیسدو... زندگی کی دوا کا اجارہ دار... وہ دوا ہی موت سے نجات دلا سکتی ہے!

۳۹

—حضور عالی! موت سے نجات کے لیے کچھ تو کیجئے! گھبرایا ہوا اردلی ادیب کی عدالت میں حاضر ہوا—

—اُدھر دھنونتری شورو پک کا حیسدو زندگی کے طب پر اجارہ قائم کئے بیٹھا ہے۔ ادھر دنیا کے سارے تجربہ گاہوں میں شدید تر اور زیادہ تر موت کی پیداوار شروع کرنے کا مقابلہ ہو رہا ہے... کامیاب تجربہ کے بعد اب جنگ میں شامل سیاسی اقتدار موت کی تھوک پیداوار کرنا چاہتی ہے... کچھ کیجئے ادیب عالی! نہیں تو کائنات سے زمین کا نام و نشان مٹ جائے گا!

— کیا کہہ رہے ہو تم؟ ادیب نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔

—میں ٹھیک کہہ رہا ہوں حضور! میں ابھی موتے جا کی مجلس سے جانکاری لے کر آیا ہوں... لوس، الاموس کی تجربہ گاہ میں اب ایٹم اور ہائڈروجن بموں کی تشکیل ہو رہی ہے۔ اوپن ہائمر، جان میتلی، ٹیلر اور فری کائنات کو تباہ کرنے والے بموں کی تشکیل میں لگے ہیں۔

—جرمنی تو اب لگ بھگ ہار چکا ہے... روسی فوجوں نے ہٹلر کے گھٹنے توڑ دیے ہیں... وہ کبھی بھی سپردگی کر سکتا ہے، تب بم کی ضرورت کیا ہے؟ ادیب نے پوچھا۔

—جنگ کا جنون کچھ بھی کروا سکتا ہے اور حالانکہ جرمن سائنس داں ویز ساکر اور ہائزن ورگ ہٹلر سے متفق نہیں ہیں، لیکن وہ پکے نیشنلسٹ ہیں اس لیے وہ جی جان سے جرمن بم کی تشکیل میں لگے ہوئے ہیں۔

—اور سوویت یونین؟

—وہاں کُرچا توف کو موت کی پیداوار کا کام سونپا گیا ہے۔ وہ ویز ساکر اور ہائزن ورگ کی ترقی سے خائف ہیں، لیکن پیوتر کپتزا نے بم بنانے سے انکار کر دیا ہے۔ اس جرم میں اُسے اسٹالن نے سات سال کی سخت سزا دی ہے۔ اس کا پاسپورٹ رد کر دیا گیا ہے اور وہ گھر میں ہی نظر بند ہے۔

—برطانیہ؟

—برطانیہ میں بیشتر غیر ملکی سائنس داں کام کر رہے ہیں۔ فرش اور پلرس تو ہیں ہی لیکن فرانس سے جولیٹ کیوری کے دو معاون آ گئے ہیں— آسٹرین داں بلبان اور روسی کووارسکی۔ ویسے کپتزا کی طرح ہی پناہ گزیں ماہر طبعیات میکس بورن نے اب بم پر کام کرنے سے انکار کر دیا ہے... بموں کو کپتزا اور بورن انسان اور زندگی مخالف مانتے ہیں۔

ادیب نے راحت کی سانس لی۔ کم از کم کوئی تو زندگی کا ساتھ دے رہا ہے اور تبھی قریب ماضی کی لہولہان تاریخ لوٹ آئی...

کہ یکا یک زبردست دھماکہ ہوا۔ زمین کانپ اٹھی۔ جیسے کوئی بہت بڑا شہاب ثاقب زمین سے ٹکرایا ہو۔ دھول، دھواں، ہاہاکار۔ آگ کی لپٹیں، جلتی ہوا۔ سورج کی حرارت سے مقابلہ کرتی حرارت۔ زہریلے تابکاری دائرے میں پھیلتی ریڈیو ایکٹو کرنیں۔ دھرتی کی پھٹی شریانوں سے نکلتی خون کی ندیاں...

ساری دنیا سکتے میں آ گئی۔

اخباروں کی لہولہان اور جھلسی ہوئی خبریں چیخنے لگیں—

—۶ راگست ۱۹۴۵ء! امریکہ کے ذریعہ ہیروشیما پر ایٹمی حملہ۔ زمین پر قیامت، پورا شہر تباہ۔

ڈیڑھ سو میل دور کھڑی ایک اندھی لڑکی نے کہا— میں نے جلتا ہوا سورج دیکھا۔

ایٹم بم کی تباہی سے بے خبر، گھر لوٹنے والے ایک شہری نے کہا— گھر تو کہیں تھا ہی نہیں... ہیروشیما میرے مغربی جاپان کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن تھا۔ نہ معلوم وہ اسٹیشن کہاں گم ہو گیا... شمال، مشرق اور جنوب میں ہرے بھرے جنگل اور پہاڑ تھے... نہ معلوم وہ کہاں غائب ہو گئے... یہاں تو میرا شہر ہے ہی نہیں... کہیں میں گھر کا راستہ بھول کر غلط جگہ تو نہیں آ گیا...

— نہیں، تم غلط جگہ نہیں آئے ہو۔ ناگاساکی پر ۹ راگست ۱۹۴۵ء کو گرنے والے ہائڈروجن بم نے اُسے بتایا— اب تم اپنے ناگاساکی شہر کو بھی نہیں پہچان پاؤ گے۔

دہشت زدہ ادیب نے چیخ کر اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اردلی نے بھی بدحواسی میں عدالت کا دروازہ بند کر لیا۔

تبھی دروازے پر تیز دستک ہوئی۔ گھبرائے ہوئے اردلی نے ادیب کو دیکھا۔ ادیب نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا—

— آنے دو...

اور ادیب نے دیکھا، وہی زار زار ہیروشیما پھر سامنے کھڑا تھا۔

ادیب نے اُسے دیکھا۔ رستے ہیپ کو دیکھا۔

— تم... تم پھر لوٹ آئے!

— مجھے لوٹنا ہی تھا، کیونکہ میں آپ کو اپنے پرانے زخم نہیں دکھا سکا تھا... جو انصاف میں پانا چاہتا تھا، مجھے نہیں مل سکا تھا!

— تو اب کیا کیا جائے؟

— تباہی برپا کرنے والے ان بموں کو جن سائنسدانوں نے بنایا ہے اور وہ سارے سیاسی نیتا جنہوں نے انہیں چلایا ہے وہ ابھی تک کھلے عام گھوم رہے ہیں... ان کی کوئی سزا تو تجویز کیجیے نہیں تو ان کے حوصلے بے قابو ہو جائیں گے۔

اور اردلی اُن ملزموں میں سے ایک ایک کو باعزت حاضر کرنے لگا۔

امریکی صدر روزویلٹ اپنا تھری پیس سوٹ سنبھالتے ہوئے آئے۔ ٹرومین بڑی اکڑ کے ساتھ اپنی ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتا ہوا داخل ہوا۔ اسی کے ساتھ مین ہٹن پروجیکٹ کا سربراہ لوئر شاہ گرووز اپنی باہر نکلی توند کو سنبھالتا حاضر ہوا۔

سارے ایٹمی سائنسداں بھی حاضر تھے۔ اوپن ہائمر تھا۔ فرمی اور ٹیلر تھا۔ آرتھر کومپٹن اور کونینٹ کے ساتھ زیلارڈ بھی تھا۔

اُن سب کو دیکھتے ہی ہیروشیما چیخ اٹھا— یہی ہیں وہ سب راکشس، قاتل۔ انسانی تہذیب و تمدن کے ناقابل معاف دشمن... چیختے ہوئے ہیروشیما نے امریکی صدر ٹرومین کا گلا پکڑ لیا۔ اردلی نے جیسے تیسے اسے الگ کیا۔

ٹرومین کی ساری پوشاک ہیروشیما کے بہتے ہیپ سے تھڑ گئی۔

عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ پہلے ایٹمی تجربے میں مرنے والی تتلیوں کے پنکھ موجود تھے۔ دم توڑتے مونگے اور موتی بھی بیٹھے تھے۔ تہس نہس پانی کے پھول ایک طرف کھڑے تھے اور جل کنیائیں مچھلیوں سے پریشان اپنے جسم پر تتلی کے پنکھوں سے ہوا کرتی موجود تھیں۔

— یہ معاملہ تو سیدھے سیدھے بے رحم انسان کے قتل کا ہے، کیونکہ امریکی صدر ٹرومین کے پاس ایٹمی حملے کا کوئی سبب اور جواز نہیں تھا۔ ٹرومین! جواب دو... بحر اکاہل سمندر میں مسولینی تباہ ہو چکا تھا۔ سوویت فوجوں کے سامنے ہٹلر اور اس کا برلن گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ ہٹلر اپنی محبوبہ ایوا براؤن کے ساتھ خودکشی کی تیاری کر چکا تھا اور جاپان سپردگی کے لیے تیار تھا... تب تمہیں اتنے

طاقت ور اور غارت گر ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کے ذریعہ حملہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

— یہ ہمارا فوجی فیصلہ تھا! ٹرومین نے کہا۔

— لیکن تمہارے فوجی انتظامیہ نے تو حملے کے لیے ٹوکیو، یوکوہاما، اوساکا، کوبے، ناگویا، یواتا اور کیوٹو کا انتخاب کیا تھا... وہ کیوٹو، جہاں جاپان کا شہنشاہ رہتا تھا۔

— وہ ایک متنازعہ سوال تھا۔ میں صدر روزویلٹ کی موت کے بعد جنگی امریکہ کا صدر بنا تھا...

— تب تم صرف تو دن پرانے صدر تھے، جب تم نے جاپان پر ایٹمی حملے کا بے حد اہم فیصلہ لیا تھا۔

— یہ صحیح ہے۔

— ایٹم بم کی ضرورت تو تمہیں جرمنی کے خلاف تھی، پھر تم نے اسے جاپان پر گرانے کا فیصلہ کیوں لیا؟

— اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلا تو یہ کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ شکست خوردہ جاپان پر سوویت روس کا قبضہ ہو۔ ہم نے ۶ اگست کو ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا تھا... ہم شکست خوردہ جاپان کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے، لیکن ۸ اگست کو جاپان کے خلاف جنگ کا اعلان کرکے روس نے منچوریا پر حملہ کر دیا تھا... روس کو روکنے اور جاپان کی حکومت پر موت کا خوف طاری کرکے ہم اپنے بموں کی تباہی کا اندازہ بھی کرنا چاہتے تھے۔

— اس کے لیے تم یہ تجربہ کسی سمندر، ریگستان، یا پہاڑی علاقے میں بھی کر سکتے تھے۔

— میں فوجی اور نیم فوجی فیصلوں میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا۔ ویسے بھی ہم پہلا تجربہ نیو میکسیکو کے ریگستان میں کر چکے تھے... اس لیے...

— اس لیے؟

— اس لیے کہ فوجی انتظامیہ کو بموں کی انسانی اموات کی گنجائش کے آنکڑے جمع کرنے تھے۔ ہائیڈروجن بم کے بانی سائنسدانوں ایڈورڈ ٹیلر نے سامنے آ کر کہا— میں اصولاً اس عمل کے حق میں نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انسان کو کیڑے مکوڑوں کی طرح مارا جائے... لیکن رابرٹ اوپن ہائمر اور گرووز کے سامنے میری ایک نہیں چلی۔ میں خود اپنے ایجاد کی غارت گری اور مارنے کی صلاحیت کے ممکنہ نتائج کو لے کر پشیمان تھا۔

— تو پھر تم نے یہ ہائیڈروجن بم بنایا ہی کیوں تھا؟

— یہ تو خالص سائنس کی بنیادی ترقی کا ایک پہلو تھا... سائنس اخلاقی یا غیر اخلاقی نہیں ہے۔

اُس کی اخلاقیات یا غیر اخلاقیات کا سوال تب اٹھتا ہے جب انسانی مفاد یا نقصان سے متعلق اس کی افادیت طے کی جاتی ہے... کہتے ہوئے ٹیلر نے ادیب کو دیکھا۔ ادیب عالی! جب میں نے دیکھا کہ بموں کا تجربہ انسانی بستیوں پر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، تب میری روح کانپ اٹھی تھی۔ میں نے خود اپنے آپ کو ملامت کیا تھا...

— پریسیڈنٹ ٹرومین! تم تو تب صرف نو دن کے سلطان تھے... جب تمہیں پہلی بار ان خطرناک بموں کی اطلاع دی گئی تھی... کیا تب تمہارے ضمیر پر اخلاقیات نے کوئی دستک نہیں دی تھی؟

ٹرومین نے نظریں بچاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

— یہ غیر انسانی اور بربریت کا فیصلہ ان تینوں درندوں نے لیا تھا! اس نے! اور اس نے! اردلی محمود علی نے ٹرومین کے سیاسی مشیر اسٹمسن، لوس — الاموس تجربہ گاہ اور مین ہٹن پروجیکٹ کے ڈکٹیٹر گروز اور ماہر طبعیات اوپن ہائمر کی طرف انگلی اٹھا کر حقارت سے کہا — ادیب عالی! یہ تینوں ہٹلر، موسولینی، توجو کی طرح فقط جنگی ملزم نہیں، یہ ان سے بھی سنگین انسانی ملزم ہیں۔ یہی ہے وہ درندہ اسٹمسن، جس نے سیاست کے لیے سائنس کے اس نایاب کھوج کی سمت بدل دی تھی اور اسی جنرل گروز نے کہا تھا —

— ہمارے بم فوجی اقتدار کی علامت ہیں۔ جاپان پر ان کا استعمال جلد سے جلد کیا جانا چاہیے، تاکہ ہم ان بموں سے مارنے کی صلاحیت پر مطمئن ہو سکیں۔ ان کا استعمال ان گھنی آبادی والی بستیوں پر ہونا چاہیے، جہاں ہتھیاروں کے کارخانے اور مزدوروں کے رہائشی علاقے ہیں۔

جنرل گروز نے آنکھیں چرا کر اوپن ہائمر کو دیکھا۔

— اور یہ ماہر طبعیات رابرٹ اوپن ہائمر! اس نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا — مجھے دو ہی چیزیں سب سے زیادہ پسند ہیں — طبعیات اور ریگستان! میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ ان دونوں کا ملن کبھی نہیں ہو سکتا... لیکن آج میرے سامنے دونوں یکساں ہو کر موجود ہیں۔ معجزاتی طبعیات اور سامنے پھیلا ہیروشیما کا ریگستان!

— یہ قاتل ہیں!

— یہ انسان کے دشمن ہیں!

— ان کو کیڑے پڑیں!

— ان کا خون سڑاند دیتے پیپ میں بدل جائے...

— ان خونی درندوں کو اسی عدالت میں سزائے موت دی جائے! ہیروشیما چیخا۔ اُس کے

پاس ہی زخمی ناگاساکی کھڑا تھا۔

— نہیں... دھوکے باز، مکار، فریبی، انسانی قاتلوں کے لیے موت تو دعا بن جائے گی، کیونکہ یمراج کا دوزخ اور ہیڈیز کی اذیت گاہ بھی ان گنہگار روحوں کو قبول نہیں کرے گا۔ کائنات کی تاریخ میں یہ بھیانک اور ناقابل تصور گناہ کی اکیلی مثال ہے۔ گنہگاروں کے گناہ کا یہ عروج ہے... یہ ایٹمی عہد کے پوران کتھا کے پرتشدد حیوان کی شکل میں جانے جائیں گے۔ ان کی اخلاقی ارواح کی کوئی آخری پناہ گاہ نہیں ہوگی... قتل کے غم سے یہ آزاد نہیں ہوں گے۔ خودکشی سے انہیں پشیمانی نہیں ہوگی۔ بھوت بھی ان سے الگ نہیں ہوتے اور یہ بھی کائنات کے خاتمے تک سر پٹکتے رہیں گے۔ ان بدارواح کے سر پٹکنے کی آواز انسانی ضمیر پر ہمیشہ دستک دیتی رہے گی۔ اور... اور... ابھی ادیب کچھ اور بول ہی رہا تھا کہ اُس کے چہرے پر پسینہ آ گیا۔ اُسے لگا کہ اس کی سانس گھٹ رہی ہے...

اردلی چونکا۔ دوڑ کر اس کے پاس آیا۔

— کیا ہوا حضور!

— محمود علی... دل کی بستی میں بہت تیز درد اٹھ رہا ہے...

۴۰

دلوں کی بچی کھچی بستیاں اب صرف اسپتالوں میں آباد ہیں۔ اردلی محمود علی نے ادیب کو ایک ایسی ہی بستی میں داخل کرا دیا۔

تین دن بعد آئی۔ سی۔ یو میں ادیب کو ہوش آیا۔ اُسے لگا کہ وہ کسی تیرتے ہوئے جزیرے کی نرم زمین پر لیٹا ہوا ہے۔ پھر کچھ اور ہوش آیا۔ سامنے دیوار پر ایک تصویر تھی۔ بڑی بڑی عمارتوں کی بستی۔ اس تصویر میں سامنے کی زمین خالی تھی۔ اس خالی زمین میں جھونپڑی نما ایک کوٹھری تھی۔ اونچی اونچی عالیشان عمارتوں کے درمیان وہ ایسی لگ رہی تھی، جیسے شمشان میں کوئی ادھ جلی لکڑی پڑی ہو... پھر اُسے تھوڑا اور ہوش آیا۔ اس نے دیکھا بائیں طرف ایک بوتل الٹی لگی ہے اور اُسے ڈرپ دیا جا رہا ہے۔

تبھی میٹرن نرس کا دھیان اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مسکراتی ہوئی مریم کی طرح اس کے پاس آئی اور ماتھے پر پیار بھرا ہاتھ رکھ کر بولی۔

— سو یو آر او کے... ویری گڈ...

— میں کہاں ہوں سسٹر؟

— آئی۔ سی۔ یو میں۔

— اوہ... میں کب سے سو رہا تھا؟

— پچھلے تین دنوں سے...

— اس بوتل میں کیا ہے سسٹر؟

— آپ کا بلڈ پریشر بہت کم ہو گیا تھا اُسی کے لیے ڈرپ دے رہے ہیں...

— کب سے؟

— کل شام سے...

— کل شام سے... اوہ... ڈرپ...

— کیوں؟

— اس کی جگہ آپ وہسکی کی بوتل لٹکا دیتیں... بلڈ پریشر آدھے گھنٹے میں نارمل ہو جاتا۔

سسٹر بے ساختہ ہنس پڑی۔ آئی۔ سی۔ یو میں پہلی بار اتنی تیز ہنسی سن کر نرسوں نے اُسے تعجب سے دیکھا اور وہ بھی مسکرانے لگیں۔

— یہ پیشنٹ بہت جلد اچھا ہو جائے گا! میٹرن نے ساتھی نرسوں سے کہا— ہی از ناٹ وریڈ اباؤٹ ہز ہارٹ...

پھر آئی۔ سی۔ یو میں رہتے ہوئے ہی اس کے سارے ٹسٹ چلتے رہے۔ اس سے ملنے کے لیے اس کی بیوی کو صرف پندرہ منٹ کا وقت دیا جاتا تھا... اُسی وقت میں کبھی اس کی بیٹیا مانو بھی آ جاتی تھی۔ کھانے کا سوال ہی نہیں تھا، اسپتال کے باہر کا پانی تک الاؤ نہیں تھا، لیکن کاٹری اپنے پرس میں چھپے چھپے ایک چکن پیٹی چھپا کر لاتی تھی اور اُسے کھلا جاتی تھی۔ ادیب کو واحت اور منٹی کی یاد آتی تھی، تو آلوک نیچے سڑک پر گاڑی کھڑی کر کے اس کی چھت پر دونوں بچوں کو بٹھا دیتا تھا... وہ دونوں اپنے نانا کو دیکھ تو نہیں پاتے تھے، لیکن اپنے معصوم اور پاک ہاتھ ہلا ہلا کر نیک خواہشات پیش کرتے رہتے تھے...

ویسے ادیب ابھی بھی آئی۔ سی۔ یو میں تھا اور اُسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ سامنے والی دیوار کسی تصویر کی دیوار نہیں بلکہ ایک حقیقت تھی۔ عالیشان عمارتوں کے درمیان، میدان میں ایستادہ وہ ایک جھونپڑی نما کوٹھری! ایک تبدیلی اس تصویر میں ضروری ہوئی تھی... شیشے کے چوکھٹے میں کبھی، جب کبھی شاید باہر ہوا چلتی تھی تو گل مہر کی ایک شاخ، سرخ پھولوں کے ساتھ فریم میں آتی، ہاتھ ہلاتی اور چلی جاتی تھی۔

بستر پر پڑے ہوئے وہ سوچنے لگا— پہلے گھر چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ درخت بڑے... گھروں پر درختوں کا سایہ ہوا کرتا تھا۔ اب عمارتیں بڑی اور پیڑ بہت چھوٹے... اب عمارتوں کے سائے میں درختوں نے رہنا سیکھ لیا ہے... لیکن وہ جھونپڑی نما کوٹھری ابھی بھی ایک درخت کے سائے تلے تھی۔ وہ درخت شاید نیم کا تھا۔

تبھی ایک عورت جروٹ کی طرح نیم کی داتون منہ میں دبائے سامنے سے گزری۔ اس کے ہاتھوں میں تام چینی کے کچھ برتن تھے۔

بلڈ پریشر لیتی سسٹر نے کہا۔

— یہی ہے وہ...

— کون؟

— جھونپڑی والی... یہاں فراش کا کام کرتی ہے۔ آپ کل پوچھ رہے تھے نا... کہتے ہوئے سسٹر نے ہارٹ مانیٹر پر نگاہ ڈالی۔

— آپ سب کی دھڑکنیں وہاں بیٹھی بیٹھی دیکھتی رہتی ہیں... ادیب نے کہا۔

سسٹر ہلکے سے مسکرا دی۔ بولی— اسے بلاؤں...

— کسے؟

— کوشلیا کو... وہی جھونپڑی والی... جس سے آپ ملنا چاہتے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد کوشلیا اُس کے بیڈ کے پاس کھڑی تھی۔

— اب تو آپ کی طبیعت بہت ٹھیک ہے بابو... شاید آج آپ کو کمرے میں شفٹ کر دیں گے... میں تو بھگوان جی سے یہی مانگتی رہتی ہوں... سب ٹھیک ہو کر اپنے اپنے گھر جائیں...

— کب سے کام کر رہی ہو یہاں؟

— جب سے ننکو فوج میں گیا۔

— ننکو؟

— ہمارا ایک ہی بیٹا ہے بابو... آپ نے کا ہے کے لیے بلایا ہے؟

— ایسے ہی... وہ کوٹھری تمہاری ہے؟

— ہاں بابو... کوشلیا کچھ محتاط ہوئی— ای آپ کا ہے کو پوچھ رہے ہو؟ کہتے ہوئے اس نے ادیب کو شک سے دیکھا۔ بولی— میں بیچوں گی نہیں... آپ کتنا بھی پیسہ دے دو... ہم بیچیں گے ناہیں۔

— کوشلیا، ہم بیچنے خریدنے کی بات نہیں کر رہے۔ ہم تو ایسے ہی...

—ایسے ہی نہیں بابو... جو بھی ہماری کوٹھری دیکھتا ہے، خریدنے کی بات کرنے لگتا ہے۔ منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہو جاتا ہے... پر ہم سب کو کہہ دیا ہے ہماری کوٹھری بکاؤ ناہیں ہے۔ ایک بڑی گاڑی میں بہت بڑا ٹھیکیدار آیا رہا۔ ارے... وہی جون ہماری کھوپڑی پر ای سب بڑی بڑی عمارت بنوایا ہے۔ اس کا لوگ پھنجانے کے پیمائش کرنے لگا۔ ہم ڈانٹ دیا۔ دوسرے دن اس کا غنڈہ لوگ آیا۔ ہم کو بے دخل کرنے کا دھمکی دیا اور تیسرے دن اوہی ٹھیکیدار یہاں آکر لیٹ گیا... چار نمبر میں۔ ڈاکدر بولا— کچھ ناہیں ہے... اس کا وکیل بولا— بڑا ہارٹ ہے۔ ڈاکدر لوگ کو ماننا پڑا۔ باہر پولس... اوپر پولس۔ اب ادھر ایسا لوگ بہت آتا ہے بابو...

ادیب نے کوشلیا کو دیکھا۔

—ہم اوکا دلدر بھی اٹھایا بابو... بھگوان جی سے اس کا بھی روگ کیا تو ایک دن چار نمبر بولا— کاہے کو یہاں کھٹتی ہے... دو کمرے کا فلیٹ لے کے آرام سے رہو... پیسہ اوپر سے دے دیں گے... سمجھکر ہوکے جتنی بھر کھاؤ...

ادیب نے اُسے پھر غور سے دیکھا۔

—تو ہم کہہ دیا بابو... پہلی بات تو ای ہے کہ آپ کچھ بھی کہو، پر آپن کوٹھری تو بیچیں گے ناہیں... لابھ سے ہمکو نہیں آیا۔ او دوسر بات ہے، اتنا برس سے پھوج اوکو چھٹی ناہیں دیا، پر ہمکو لوٹے گا اور کوٹھری ناہیں دیکھے گا تو ہم کو کہاں کھوجے گا... ہم ٹھیک بولا نا بابو؟

—ہاں کوشلیا... ادیب کی آواز بھاری ہو آئی۔

—اب ہم یہاں رہت ہیں، پر ہم کی جان چوبیسوں گھنٹے اپنی کوٹھری میں رہت ہے...

بہت بھاری من سے ادیب نے کوشلیا کو دیکھا۔ پھر کانچ کی دیوار کے پاس اُس کی کوٹھری کو۔ تبھی کوشلیا کو سسٹر نے پکارا۔ وہ جانے لگی تو کانچ کے فریم میں آکر گل مُہر کی سرخ پھولوں والی شاخ پھر جھانکنے لگی... اور اس کے بستر کے آس پاس دہشت کی سطریں تیرنے لگیں—

جئیں تو اپنے بغیچے میں گل مہر کے تلے
مریں تو غیر کی گلیوں میں گل مہر کے لیے

شاخ نے دوبارہ جھانک کر دیکھا۔ شاید باہر پھر ہوا چلی تھی...

(۴۱)

لیکن اس بار باہر کی ہوا بے حد زہریلی تھی۔ گل مہر کے پھول زرد پڑ گئے تھے۔ ادیب صدیوں

کے پار دیکھ رہا تھا... ایک بار یہی ہوا گیارہویں صدی میں غزنی سے چلی تھی، اس نے سومناتھ مندر توڑا تھا۔ اس بار یہ ہوا سومناتھ سے چلی تھی، جس نے بابری مسجد کو توڑ ڈالا تھا۔ ان زہریلے طوفانوں کا چلنا رکا نہیں رہا تھا۔

۱۹۹۰ء میں سومناتھ مندر پربھاش پاٹن سے پھر جو طوفان چلا تھا وہ ایودھیا، مہاراشٹر، اترپردیش کرناٹک آندھرا ہوتا ہوا ۱۹۹۸ء میں پوکھرن پہنچ گیا تھا۔

بدھ پورنیما ۱۱ مئی ۱۹۹۸ء، دوپہر تین بج کر پینتالیس منٹ۔ ریگستان کی شریانیں پھٹ گئی تھیں۔ دھرتی کانپ گئی تھی۔ پوکھرن کی کوکھ میں نو سوفٹ نیچے ایک کے بعد ایک تین دھماکے ہوئے تھے۔ ہوا خاموش ہو گئی تھی۔ حرارت دس لاکھ ڈگری ہو کر سورج کی حرارت تک پہنچ گئی تھی اور ریت کے نیچے لاکھوں لاکھ ٹن کا پہاڑی سلسلہ پھٹا، پگھلا اور بھاپ میں تبدیل ہو گیا اور ایک میل لمبا چوڑا ریت کا میدان اوپر اٹھتا ہوا عظیم دھماکہ خیز چھتری کی طرح چھا گیا۔

ادیب کو پھر دل کا دورہ پڑا۔

پھر بلوچستان چاغی میں دھماکہ ہوا۔

ہوا خاموش ہوئی۔ پہاڑوں کی شریانیں پھٹیں۔ درجۂ حرارت دس لاکھ ڈگری تک پہنچا اور چاغی کے پہاڑ سفید راکھ کے ٹیلوں میں تبدیل ہو گئے۔

پھر پوکھرن میں ایک اور دھماکہ ہوا۔

پھر چاغی میں ایک اور دھماکہ ہوا۔

ادیب کو اس بار دل کا زبردست دورہ پڑا۔

اردلی دوڑا ہوا آیا—

—حضور... کیا پھر وہی ہوا...

—ہاں محمود علی... اس بار درد تو کم ہے پر لگتا ہے دل کی بستی راکھ ہو گئی...

بدحواس سلمیٰ آئی، چلاتی پوچھتی ہوئی—

—ادیب یہ تو بتاؤ، میرے نانا کا کیا ہوا ہوگا؟ لیکن ادیب کی حالت دیکھ کر وہ سہم گئی۔

آخر پھر اُسے آئی۔ سی۔ یو میں پہنچا دیا گیا۔ اُسے نہیں معلوم کہ وہ کتنے دن بے ہوش رہا۔ بے ہوشی ٹوٹی تو اس کی نیند میں ایک خواب آیا... بد دعاؤں سے پریشان اوپن ہائمر کی بدحواس روح سر پٹکتی تھی، پھر ہنستی تھی...

اس کی آنکھیں کھلیں۔ جسم پسینے سے شرابور تھا۔ سلمیٰ نے سنبھال کر تولیے سے اس کا بدن پونچھا۔

سسٹر نے آ کر دوا کی خوراک دی۔ پھر سلمیٰ نے بہت آہستہ سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔۔۔

— ایک بات بتاؤں...

ادیب نے اُس کی طرف دیکھا۔

— ان دنوں میں ایک عجیب سا خواب دیکھتی ہوں...

ادیب نے پریشانی سی محسوس کی، لیکن آنکھوں کی پلکیں جھپکا کر جیسے 'ہاں' کہا۔

— میرے خواب میں بار بار ایک بھٹکی ہوئی روح آتی ہے... کچھ دیر وہ سر پٹکتی ہے پھر ہنستی ہے... ادیب نے اُسے دیکھا۔ پھر اٹکتے ہوئے کہا۔

— خواب تو ایک ہی ہے سلمیٰ، لیکن لگتا ہے اب خوابوں کی تعبیر بدل گئی ہے...

کہ یکبارگی اشرو وید پاگلوں کی طرح آ کر کھڑا ہو گیا۔

— ارے تم... کیسے ہو؟

— ٹھیک ہوں اشرو وید نے کہا — آپ کو تو یاد ہوگا... میں آنسوؤں کی جگہ پسینہ جمع کرنے لگا تھا... لیکن اب میں پسینے کی جگہ خواب جمع کرنے لگا ہوں... بکھرے... ٹوٹے... آدھے ادھورے خواب...

— اچھا... یہ ضروری بھی ہے... لیکن تم انہیں رکھتے کہاں ہو؟

— وہیں... جہاں پریتھو نے بتایا تھا۔ اگنی ون کی دوسری طرف... سورج کے غروب ہوتے مقام کے اس طرف...... جہاں خوابوں کا شہر ہے...

— یہ تم نے اچھا کیا۔

کچھ دیر ادیب سوچتا رہا۔ سسٹر بلڈ پریشر لینے آئی تو اس نے پوچھا —

— کوشلیا نہیں دکھائی دی۔

— وہ اپنے بیٹے کی تلاش میں ادھم پور چھاؤنی گئی ہے۔

— اُس کی جھونپڑی؟

— وہ اس طرف ہے... یہاں سے نہیں دکھائی دیتی۔ بلڈ پریشر نوٹ کر کے سسٹر نے بتایا —

— ہم کچھ دیر بعد آپ کو کمرے میں شفٹ کر دیں گے۔

اور پھر کمرے میں تو سبھی ملنے اور جلد سے جلد صحت یاب ہونے کی نیک خواہشات لے کر پہنچنے لگے۔ کامنی پھر پرس میں چھپا کر چکن پیٹی لے آئی تھی۔

کچھ ہی دیر میں اردلی محمود علی پریتھو کو لے کر داخل ہوا۔ ادیب نے پریتھو کو حیرانی سے دیکھا۔

وہ آہنی زنجیروں سے آزاد تھا، لیکن کندھے پر بیٹھا گدھ اب بھی اُس کا گوشت نوچ کر کھا رہا تھا۔

— پریتھو تم!

— ہاں ادیب، میں تمہیں جلد سے جلد صحت یاب ہونے کی نیک خواہشات پیش کرنے آیا ہوں۔

— اور وہ تمہاری زنجیریں، جن میں دیوتاؤں نے تمہیں قید کر رکھا تھا۔

— دوست! ہیروشیما اور ناگاساکی پر اٹمی حملے کو میں برداشت نہیں کر سکا تھا... مجھے بہت غصہ آیا... میرے غصے... تاپ کی حرارت سورج کی حرارت سے دس گنا بڑھ گئی تھی۔ اسی میں وہ دیوتائی آہنی زنجیریں موم کی طرح پگھل گئیں۔ ان دیوتاؤں اور حیوانوں کو ابھی معلوم نہیں کہ زمین کے انسان کا غصہ اور آکروش کیا کچھ کر سکتا ہے... اور یہ گدھ! یہ بھی گوشت نوچتے نوچتے ایک دن تھک جائے گا... اسے انسان کے صبر و تحمل کا پتہ نہیں... ایک دن یہ بھی گوشت کھاتے کھاتے پست ہو کر گر پڑے گا۔ اس دن جا کر میں نیل ندی میں غسل کروں گا۔ پھر ڈینیوب ندی کو، ہیروشیما کی اوٹا ندی اور ناگاساکی کی خلیج میں نہا کر اُسے پاک کروں گا...

ابھی پریتھو کھڑا ہی تھا کہ موہنتے جانے آتے ہی ادیب کے جلد سے جلد صحت یاب ہونے کی نیک خواہشات پیش کیں اور بتایا —

— پریتھو! تم نے تلسی کے پودے کی داہنی سمت سے پاتال کی آخری سطح تک پہنچنے کی جو پانی کی راہ بتائی تھی، جل جاپیش اُس پر بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت خواب کی گھری میں پہنچ سکتا ہے۔ وہاں پہنچتے ہی وہ دھوتری شرونیک کے جیوندو کو ضرور تلاش کر لے گا۔

ہیروشیما اور ناگاساکی بھی آ گئے تھے۔ وہ ادیب سے مل کر واپس جاپان جا رہے تھے۔

— تم لوگ اکیلا مت محسوس کرنا۔

— شکریہ... اور پھر اب تو تمہارے اشرو وید نے ہماری آنکھوں میں کچھ خواب ڈال دیے ہیں... انہیں یہ جانے کہاں کہاں سے مرنے والوں کی آنکھوں میں سے زندہ بچا کے لایا تھا...

— اچھا تو میں ابھی چلوں! موہنتے جانے ادیب کے پاس آ کر کہا۔

— تو تم بھی چلے جاؤ گے؟

— نہیں، جانے کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنے ملک لوٹ جاؤں گا... نہیں... میں یہیں رہوں گا۔ یہی ایک تنہا تہذیب ہے جس نے اپنے قدیم آدی واسیوں کو زندہ رکھا ہے... یہاں میں جی سکوں گا...

شام ہونے لگی تو اردلی محمود علی نے ایک سسٹر کے ساتھ آ کر بتایا —

—ایک محترمہ آپ سے دومنٹ کے لیے خاص طور سے ملنا چاہتی ہیں۔

— محترمہ؟ اس نے تعجب سے پوچھا۔

—جی ہاں... وہ بھی یہیں، آپ ہی کے ساتھ پہلے آئی۔ سی۔ سی۔ یو میں تھیں۔ آج انہیں چھٹی دے دی گئی ہے...

—وہ بھی یہیں آئی۔ سی۔ سی۔ یو میں تھیں... ادیب نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا— تعجب کی بات ہے... یعنی میرے اور ان کے دل کے ساتھ ساتھ دھڑکتے رہے ہیں۔ ان کا استقبال ہے۔

اور ان محترمہ نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا تو سب کچھ جھک اٹھا۔ ادیب حیران رہ گیا۔ یقین ہی نہیں کر سکا۔

—جی... آپ...

—جی، میں پاکستان سے آئی ہوں، میرا بیٹا یہاں پاکستان ہائی کمیشن میں سکریٹری کلچر اینڈ انفارمیشن ہے۔ ہندوستان دیکھنے کی بہت خواہش تھی۔ اس بار وہ مجھے بھی لے آیا...

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن نہ جانے کون سی جھجک اُسے روک رہی تھی۔

—جی... یہاں آئی تو ایک مہینے تو خوب گھومی پھری...

— کہیں آپ... آپ... ادیب کا گلا سوکھنے لگا۔

—میں کانپور بھی گئی... اسٹیشن بہت بڑا ہو گیا ہے... بدل بھی گیا ہے...

—بڑا ضرور ہو گیا ہے... لیکن بدلا تو کچھ بھی نہیں ہے... ادیب نے اُن سے اتنا کہہ کر خود اپنے آپ سے کہا، میرے لیے ایک رومال اب بھی وہاں گرتا ہے۔

— کانپور سے لوٹی تو دل کا دورہ پڑ گیا... بیٹے نے یہاں داخل کرا دیا...

ادیب بے ساختہ چیخ پڑنا چاہتا تھا—

—وڈیا! وڈیا!! وڈیا!!!

لیکن اس نے اپنی اکھڑتی سانسیں روکتے ہوئے پوچھا—

— آپ کے صاحبزادے کہاں ہیں؟

—جی وہ بل کا مٹنٹ کرنے گیا ہے... ابھی آئے گا تو ملواؤں گی... ویسے پاکستانی رسائل میں آپ کی کہانیاں کبھی کبھی چھپتی رہتی تھیں... میں پڑھتی تھی تو لگتا تھا شاید آپ وہی ہیں...

—وہی...

پری دھیرے سے مسکرا دی—

—نہ جانے آپ کو ملا یا نہیں... شروع شروع میں میں نے آپ کو ایک خط بھی لکھا تھا... بچپنے سے بھرا خط تھا وہ...

—خط مجھے ملا تھا!

—زہے نصیب... نہیں تو پتے تو اتنے کٹ پھٹ گئے ہیں، اس قدر بدل گئے ہیں کہ پیغام تو چھوڑیے سلام تک نہیں پہنچتا... اُسی وقت اس کا بیٹا آ گیا۔ پری نے ملوایا—

—پرویز! میرا بیٹا... اور پرویز... آپ وہی ادیب ہیں جن کی ایک کہانی میں نے تمہیں پڑھوائی تھی...

— آداب!

— آداب...

—پری کرسی سے اٹھی تو اس کا رومال نیچے گر گیا۔ ادیب نے دیکھا، رومال پھر گرا تھا۔ اُس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

— آپ کا رومال...

شکریہ... کہتے ہوئے پری نے رومال اٹھایا، خدا حافظ کہا اور بیٹے پرویز کے ساتھ باہر چلی گئی۔

ادیب دیکھتا رہ گیا۔ وہ کہنا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ پوکھرن کے بعد ہمارے سارے مور یا تو ختم ہو گئے یا دیش چھوڑ کے چلے گئے... لیکن کیا چاغی کے بعد تمہارے کھجور کے پیڑوں پر مدھ مکھیاں ابھی بھی آتی ہیں...

۴۲

مدھ مکھیاں، مور، کپوت، بلبل، گوریا، کھنجن، نیل کنٹھ، پپیہا، لالی، تتلیاں اور جگنو اب ہمارے چوباروں اور چھتوں کی منڈیروں پر کبھی نہیں آئیں گے... اندھا کبیر کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا اکتارا اُٹھایا اور گانے لگا—

—ویشنو جن تو تینے کہیے جے پیڑ پرائی جانے رے...

کچھ دیر تک وہ گاتا رہا، پھر اس نے سفید چھڑی اٹھائی اور چل پڑا۔ اس کے کندھے سے ایک بھیگا ہوا جھولا بھی لٹک رہا تھا۔ اس میں سے گندے پانی کی ایک آدھ بوند جب تب ٹپک پڑتی تھی۔

ادیب نے اُسے تعجب سے دیکھا۔ قدم بڑھا کر قریب پہنچا۔ دریافت کیا—

— کبیر تم کہاں جا رہے ہو... باندرہ مسجد یا اذنت میری؟

—وہاں نہیں... میں اس بار لمبے سفر پر جا رہا ہوں۔ پہلے پوکھرن جاؤں گا پھر چاغی!
ادیب نے اُسے حیرانی سے دیکھا۔ پوچھنا چاہا— کیوں؟
کبیر نے اس کا سوال بھانپ لیا اور خود ہی جواب دے دیا— کچھ پاگل لوگ ہیں جو پوکھرن میں 'شکتی پیٹھ' قائم کرنا چاہتے ہیں۔ دھماکہ کی زہریلی راکھ خاک کی طرح بانٹنا چاہتے ہیں۔ تم نے اخباروں میں دیکھا نہیں... یہ سب اُنہی مذہبی کٹر پاگلوں کے چہرے ہیں جنہوں نے کئی سال پہلے سومناتھ سے رتھ یاترا نکالی تھی... اور وہاں سے چل کر بابری مسجد گرائی تھی۔
—لیکن تم... تو... میرا مطلب ہے...
—اندھا ہوں، یہی نا... اندھا ہونے کی وجہ سے ہی میں سب کچھ صاف صاف دیکھ لیتا ہوں...
—لیکن تم وہاں جا کر کرو گے کیا؟ تم کیا کر سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے وہاں جانے کا مقصد؟
—وہاں جا کر میں درخت لگاؤں گا۔
—درخت؟
—ہاں نروان کا درخت... میرے اس جھولے میں اُسی کا پودا ہے۔ معرفت کے درخت کی جڑیں نیل کنٹھ کی طرح سارا وِش پی لیتی ہیں۔ پہلا درخت میں پوکھرن میں لگاؤں گا، پھر سرحد پار کر کے دوسرا درخت میں چاغی کی پہاڑیوں میں لگاؤں گا... تو میں چلوں...
ادیب نے اُسے دیکھا۔
پہلے کبیر کی سفید چھڑی اٹھی پھر اس کے قدم چل پڑے۔



صلاح الدین پرویز کی تصانیف

شاعری:

◆ ژاژ	۱۹۷۲
◆ تکلیو	۱۹۷۳
◆ جنگل	۱۹۷۸
◆ دھوپ، سمندر، سایہ	۱۹۸۰
◆ لوپتنگ	۱۹۸۲
◆ دھوپ سرائے	۱۹۸۳
◆ لوریاں	۱۹۸۶
◆ خطوط	۱۹۸۷
◆ کنفیشن	۱۹۹۰
◆ سبھی رنگ کے ساون	۱۹۹۳
◆ پرماتما کے نام آتما کے پتر	۱۹۹۸
◆ دشت تحیرات	۱۹۹۹
◆ کتاب عشق	۲۰۰۲

فکشن:

◆ نمرتا	۱۹۹۳
◆ سارے دن کا تھکا ہوا پرش	۱۹۸۵
◆ ایک دن بیت گیا	۱۹۸۷
◆ آئیڈنٹی کارڈ	۱۹۹۰

Isteara Publications

Presents

MAHABHARATA RELIVED

By

SALAHUDDIN PERVEZ

A PRESTIGIOUS COLLECTION CREATED OUT OF HIS EPIC POEMS AND NOVELS IN ORIGINAL URDU THEME ON MAN'S CONTINUING CULTURAL JOURNEY THROUGH THE AGES.

SELECTED, EDITED AND PRESENTED IN ENGLISH

BY

YOGENDRA BALI

مکتبہ استعارہ کا اشاعتی سلسلہ

راوی پار	گلزار	150.00
اندر اک آسماں	گیانیشور موبے	100.00
من بانی	شبنم عشائی	250.00
کتاب عشق	محمد صلاح الدین پرویز	150.00
برف پر ننگے پاؤں	شاہد اختر	200.00
ما کو آتا دو	احمد صغیر	100.00
جنگ جاری ہے	احمد صغیر	100.00
چنگاریوں کے درمیان (ہندی)	احمد صغیر	150.00
جرأت افکار	کوثر مظہری	150.00
ایک ادھوری کہانی	وریندر پٹواری	150.00
شعور نقد	راشد انور راشد	150.00
جذباتی شناسی	مشتاق صدف	170.00
مغیث الدین فریدی...	ڈاکٹر شیخ عقیل احمد	200.00
حسن نعیم اور نئی غزل	احمد کفیل	200.00

زیر طبع:

جلاوطن آبادیاں	محمود ہاشمی	(تنقید)
آئیڈنٹٹی کارڈ	صلاح الدین پرویز	(ناول)
نمرتا	صلاح الدین پرویز	(ناول)
بدن کی جمالیات	حقانی القاسمی	(تنقید)
ریت کے شہر میں	حقانی القاسمی	(تنقید)
تخلیقی تنقید	حقانی القاسمی	(تنقید)
شہر میں سمندر	شاہد اختر	(ناول)



This novel by **Kamleshwar**, one of the most daring creative writers of our times, raises questions which would make cowards and hypocrites squirm on either side of the border which artificially divides once a great nation which was an ideal collage of a noble multi-religious and multi-cultural society. It is not an outpouring of hatred and prejudice by an angry Indian against the Pakistanis. It is a daring effort of a creative writer to pierce through layers of prejudice, hypocrisy and blind hatred created by "poison within" and "pollution without" as **Salahuddin Pervez**, himself a sensitive Urdu novelist, puts it. Pervez considers this unusual work, which uses fiction to tell reality, a "montage of past and present" of our sub-continent. Knowing this sub-continent, Kamleshwar and Pervez, all too well, I would just add the words "He does it with a shattering impact".

The novel was first published in Hindi and sold out fast. The house of ***Isteara*** with its flag bearers like **Salahuddin Pervez** and **Haqqani Al-Qasmi**, took a daring step in publishing this Urdu edition for discerning and sensitive readers across the border that divides one nation into two countries.

For the Urdu readers, and for that matter for contemporary Indian literature, this novel by Kamleshwar, is a stunning creative work even for its sheer form and content. People tell lies behind the smokescreen of truth. Kamleshwar has tried to tell stark and staggering truths, in the form of fiction. It is only Kamleshwar who could do that with such courage and deep investigation into the psyche and traumas of our time which create a humanity crucified, betrayed and bleeding, not because of the mere manipulation of a former colonial master and his stooges but because of several other maladies ranging from the clash of civilizations, ignorance, insensitivity, intolerance, cultivated prejudice and crass devotion to lies and deceits including shocking self-deception. If you are honest, sensitive, human, just and courageous, this is the novel for you. Its format is fiction, but its characters are real, truthful and the events in it are those which actually happened. Many like I and you have seen them with our own eyes. Kamleshwar wants you to look at them with honesty and dares you to realize the causes of the malady which strangles millions in the Indian subcontinent, like [illegible]

Cont.....

Isteara Publications

Presents

MAHABHARATA RELIVED

By

SALAHUDDIN PERVEZ

A PRESTIGIOUS COLLECTION CREATED OUT OF HIS EPIC POEMS AND NOVELS IN ORIGINAL URDU THEME ON MAN'S CONTINUING CULTURAL JOURNEY THROUGH THE AGES.

SELECTED, EDITED AND PRESENTED IN ENGLISH

BY

YOGENDRA BALI